UNIVERSAL LIBRARY
OU_224881
UNIVERSAL LIBRARY

ہندوستان میں مسلمانوں کا

نظامِ تعلیم و تربیت

جلد اوّل

تالیف

حضرت مولٰنا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)

مکتبہ خانہ

عابد بلڈنگ حیدر آباد

ہندوستان میں مسلمانوں

کا

نظامِ تعلیم و تربیت

جلد اوّل

جس میں نہایت تحقیق و تفصیل کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں
قطب الدین ایبک کے زمانے سے لے کر اب تک تاریخ کے مختلف دوروں
میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کیا رہا ہے، اسی کے ساتھ جگہ جگہ اہم اور
معرکۃ الآراء مباحث آ گئے ہیں

تالیف

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی
صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
رفیق اعزازی ندوۃ المصنفین

قیمت مجلد پانچ روپے
غیر مجلد چار روپے
مطبوعہ محبوب المطابع وجمال پرنٹنگ پریس دہلی
طبع اوّل ۱۳۶۳ھ

عنوانِ معذرت

جناب مؤلف مدظلہم کی اس عظیم الشان تالیف کا موضوع جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہی یہ ہی کہ ہندستان میں قطب الدین ایبک کے وقت سے آج تک مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کیا رہا ہی، اس سلسلہ میں جگہ جگہ نہایت اہم اور دلچسپ اور حد درجہ مفید بحثیں آگئی ہیں، اس سلسلہ میں بیان کا تسلسل کچھ اس انداز کا ہی کہ کوشش کے باوجود عنوانات کی فہرست مرتب نہیں کی جا سکی، کتاب جن گوناگوں مورخانہ اور متصوفانہ مباحث پر مشتمل ہی اُن کو سامنے رکھ کر سیکڑوں عنوان دماغ میں آتے ہیں لیکن بحالت موجودہ اُن کو فہرستِ مضامین کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر نہیں رکھا جا سکتا، اس معذرت کے ساتھ چند بڑے عنوانوں کی فہرست پیش کی جاتی ہی۔

فہرستِ مضامین

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
تعارف	۱	معقولات کا الزام	۱۳۲
دیباچہ	۳	درجۂ فضل کی کتابیں	۱۳۹
تمہید	۹	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۴۷
ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام کا خاکہ	۹	اس معاشی انقلاب کا نتیجہ	۲۱۴
فراہمی کتب	۳۲	درس حدیث کی اصلاح	۲۳۴
ایک ذیلی بحث	۷۰	ابتدائی تعلیم کا اجمالی نقشہ	۲۵۲
تعلیمی مضامین	۱۰۴	اعادہ یا تکرار	۳۳۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کے قدم ہندستان کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال وانحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین و مذہب اور اُن کی قومی زندگی کی بھی خیر نہیں ہے کیونکہ تاریخ کی مسلسل شہادتوں کے مطابق جب کوئی قوم کسی ملک کو فتح کرتی اور اُس مُلک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ واستیلاء پالیتی ہے تو فاتح قوم کا اثر و نفوذ صرف مفتوح اقوام کے جسموں تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو بھی تسخیر کرلیتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح اقوام اپنے قومی خصائص و روایات اور ملّی شعائر و علامات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کر دیتی ہیں بلکہ ایک مدت تک عملِ تجاذب کے مسلسل جاری رہنے کے باعث آخر کار وہ اُن سے نفرت کرنے لگتی ہیں اور اب اُن کے لیے فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید ہی سرمایۂ افتخار رہ جاتی ہے ہندوستان کے بیدار مغز مسلمان اربابِ فکر و علم نے اس خطرہ کا اُسی وقت احساس کرلیا۔ اور اُس کا سدِّ باب کرنے کے لیے اُنھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان اربابِ فکر کا یہ اقدام نہایت عاقبت اندیشی اور دور بینی پر مبنی تھا، کیونکہ سیاسی طاقت و قوت سے محروم ہو جانے کے بعد تعلیم کے سوا کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی جس کے ذریعہ مسلمان اپنی قومیت کا تحفظ کر سکتے اور مغلوب و محکوم ہونے کے باوجود بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہ سکتے۔ لیکن اس ایک ضرورت کے احساس میں شریک ہونے کے باوصف خود اربابِ فکر میں دو طبقے ہو گئے۔ ایک طبقہ جو علماء کرام

کا تھا اُس نے اپنی تمام تر توجہ قدیم نصابِ درس کی تعلیم پر مرکوز کر دی۔ اس مقصد کے لیے عربی مدارس قائم کیے گئے اور ان کے ذریعہ دینیات یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے ساتھ عربی زبان سے متعلق بعض اور عقلی فنون کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ آج کل کی عام اصطلاح میں اس طبقہ کو قدیم تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ گروہ علم اور عمل، وضع اور سیرت دونوں کے لحاظ سے بالکل قدیم ہے۔ اس کے برخلاف دوسرا طبقہ متجددین کا تھا، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کی خیریت اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور ان کے علوم و فنون کو سیکھیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی انہیں کے رنگ میں رنگے جائیں۔ اس گروہ کو عام بول چال میں جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے کہ یہ لوگ چال ڈھال، وضع قطع اور فکر و دماغ کے اعتبار سے علماء کے گروہ کی ضد ہیں۔ بہر حال اس طرح مسلمانوں میں تعلیم کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک قدیم، دوسری جدید۔ ان دونوں قسم کی تعلیم کے لیے درسگاہیں بھی الگ الگ قائم ہوئیں۔ تعلیم جدید کی درس گاہ اسکول اور کالج کہلائی اور قدیم تعلیم کی درس گاہ کا نام بھی وہی پرانا مدرسہ رہا۔ اگرچہ یہ دونوں درس گاہیں مسلمانوں کی بھلائی اور اُن کی کسی ایک نہ ایک ضرورت کی تکمیل کرتی تھیں، لیکن یہ امر نہایت افسوسناک تھا کہ دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک زنی پیدا ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو جدید گروہ سے نفرت تھی اور اسی طرح جدید گروہ قدیم تعلیم کے اصحاب کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا، یہ صورتِ حال ایک عرصہ تک قائم رہی۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کا زور ہوا تو اس تحریک نے علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ دونوں طبقوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اور اب دونوں طبقوں کی باہمی کشمکش اور آویزش خود بخود کم ہونے لگی، آپس کے میل جول باہمی تبادلۂ خیالات، وطنی اور ملکی سیاسیات، بین الاقوامی حالات سے واقفیت ان تمام چیزوں کا ایک نہایت اچھا

اثر یہ ہوا کہ ہر طبقہ کو اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا احساس پیدا ہوگیا، اس سلسلہ میں کبھی مسلم یونیورسٹی کے حلقہ سے آواز اُٹھی کہ مسلمانوں کو مغرب کی کورانہ تقلید نے ایک نہایت خطرناک راستہ پر ڈال دیا ہے، اُن کے نصاب تعلیم میں اسلامیات و دینیات کو غیر معمولی اہمیت ہونی چاہیے، اسی طرح علماء کرام کی زبان سے یہ بارہا سُننے میں آیا کہ مدارس عربیہ کے نصابِ تعلیم سے قدیم فلسفۂ یونان وغیرہ ایسی غیر ضروری چیزوں کو خارج کرکے اُن کی جگہ جدید علومِ عصریہ کو شامل کرنا چاہیے۔ مسلم یونیورسٹی کے حلقہ میں اصلاح کا جو نعرہ بلند ہوا تھا اُس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں جنم لیا اور اُدھر اصلاحِ نصابِ عربی سے متعلق علمائے کرام کے جو خیالات تھے وہ ندوۃ العلماء کے محسوس پیکر میں ظاہر ہوئے۔ اب اس وقت یہی چار درسگاہیں ہیں جو مسلمانانِ ہند کی تعلیم کے مرکزی ادارے سمجھے جاتے ہیں، خالص دنیوی درس گاہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، خالص دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند دینی مگر دنیوی درس گاہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ دنیوی مگر دینی درس گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حالات میں اب بھی کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی تعلیمی مشکلات کا حل اب تک زعمائے اسلام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کی ضرورت اس شد و مد کے ساتھ پہلے کبھی محسوس نہیں کی گئی تھی کہ اب کیجاتی ہے۔ آئے دن اس موضوع پر اخبارات و رسائل میں تحریروں اور تقریروں میں گفتگوئیں ہوتی رہتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان سب امور کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات کا کوئی خاطر خواہ حل دستیاب نہیں ہوسکا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقبل کے لیے اپنی تعلیم کا خاکہ مرتب کرتے وقت کبھی اپنی گذشتہ تعلیم کا پورا نظام پیش نظر نہیں رکھا، ورنہ اُن پر یہ حقیقت مخفی نہ رہتی کہ گذشتہ تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کا نصاب تعلیم ایک ہی رہا ہے جو علوم دینیہ اور دنیویہ دونوں پر مشتمل ہوتا تھا، علوم دینیہ سے مُراد تفسیر و حدیث اور فقہ اور ان کے لوازم و

مبادی ہیں اور علوم دنیویہ سے مراد وہ علوم ہیں جن کا ہر زمانہ میں چرچا اور رواج رہا ہے
اور جن کا پڑھنا پڑھانا، تہذیبی و تمدنی، اقتصادی اور سیاسی مسائل میں فکری یا عملی طور پر
ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اپنی گذشتہ تعلیم کے اس خاکہ کو پیش نظر رکھیں اور پھر
اُس کی روشنی میں مستقبل کے لیے کوئی نظامِ تعلیم مرتب کریں تو اُن کی بہت سی مشکلات
اور بہت سے وساوس و شبہات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب اسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے فاضل مصنف
حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد
(دکن)، اسلامی ہند کے علمی اور دینی حلقوں میں ایک بلند مقام کے مالک ہیں، سیکڑوں بلند
پایہ محققانہ مقالات اور متعدد علمی اور وقیع تصنیفات آپ کی وسعتِ نظر اور علوم اسلامیہ و
دینیہ میں آپ کی محققانہ بصیرت کی شاہد عدل ہیں حجم کی موزونیت کے لیے کتاب کو دو
حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے، دوسرا حصہ بھی مکمل ہو چکا ہے اور توقع ہے کہ آپ کو اس کے لیے
کچھ زیادہ دنوں تک زحمت کش انتظار نہیں ہونا پڑیگا، جیسا کہ آپ خود محسوس کرینگے۔ اس کتاب
میں مولانا موصوف نے نہایت جامعیت اور تفصیل سے اپنے مخصوص طرزِ انشا میں یہ بتایا
ہے کہ ہندوستان میں شروع سے لے کر اب تک مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت کیا رہا ہے، نصاب تعلیم میں
کن کن علوم و فنون کا درس شامل ہوتا تھا۔ طریق تعلیم کیا تھا؟ طلبا کے قیام و طعام کا کیا انتظام
ہوتا تھا؟ اساتذہ اور طلبا کے آپس کے تعلقات کس نوعیت کے ہوتے تھے، عام لوگ اور امراء
و اعیان ملک ان طلبا کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے، پھر تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت اور تزکیۂ
نفس کا بھی کتنا اہتمام ہوتا تھا۔ غرض یہ ہے کہ تعلیم اور تعلم سے متعلق بحث کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے
جو تشنہ رہ گیا ہو، جس پر فاضل مصنف نے سیر حاصل کلام نہ کیا ہو۔ بے شبہ اردو لٹریچر میں یہ
پہلی کتاب ہے جس میں اس جامعیت سے ہمارے گذشتہ نظامِ تعلیم و تربیت پر بحث کی گئی ہے

۶ جمادی الاول ۱۳۶۳ھ

عتیق الرحمٰن عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

دیباچہ

عجب اتفاق ہے، دارالعلوم دیوبند کے مجلہ شہریہ "دارالعلوم" کے مدیر کا عنایت نامہ آیا کہ مضمون لکھ کر بھیج دو، دارالعلوم ایک تعلیمی ادارہ ہے، اسی مناسبت کا خیال کرکے چار پانچ صفحوں کے مختصر مضمون کا ارادہ کرکے میں نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی مرحوم کی کتاب مآثر الکرام کو الٹنا پلٹنا شروع کیا، بعض کارآمد دلچسپ باتیں ہاتھ آئیں، قلم اٹھایا، لکھنا شروع کیا، اب میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہوا، قلم رواں ہوا، چلا چلتا گیا، بات میں بات کا خیال آتا جاتا تھا، اور میں لکھتا جاتا تھا، پانچ صفحوں کے لکھنے کے لیے بیٹھا تھا، وہی اس وقت ۷۵۰ صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

یہ کیا ہے، کوئی مضمون ہے، مقالہ ہے، کتاب ہے، تجویزوں کا مجموعہ ہے یا تاریخی واقعات کا ذخیرہ مجھے خود نہیں معلوم، کیا ہے۔ ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گذری اور وہ بھی ایک خاص حال میں، تعلیم کے ابتدائی دن اپنے دیہاتی مستقر گیلانی (بہار) میں گذرے، وہاں سے اٹھا، راجپوتانہ ٹونک کی ایک معقولی اور منطقی آزاد درس گاہ مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں پہنچایا گیا، آٹھ نو سال وہاں گذارے، قسمت نے ٹونک سے دارالعلوم دیوبند کے دینی ماحول میں پہنچا دیا، وہاں حدیث پڑھی، شیخ الہند حضرت سیدی و مرشدی مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

کی صحبت کی سعادت میسر آئی، علامہ کشمیری رح سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اصغر حسین نیز دیگر اساتذہ کی عنایتیں شامل حال رہیں، دیوبند ہی میں دار العلوم کے ماہوار مجلات القاسم والرشید کی ادارت، کچھ درس و تدریس کی خدمت انجام دیتا رہا۔ وہاں سے بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ مونگیر پہنچا دیا گیا، تقریباً سال ڈیڑھ سال کے قریب قریب خانقاہی زندگی جس میں ندوۃ العلمائی رنگ بھی بہرحال جاری و ساری تھا، گذاری، اور مقدر نے بالآخر میرا آخری ٹھکانہ مشرق کی اس جامعہ کو بنایا جس نے پہلی دفعہ مغربی علوم و فنون طور طریقہ رنگ و ڈھنگ میں مشرقیت کے اجزاء و عناصر شریک کیے ہیں بیس سال سے زیادہ مدت گذری جب سے زیر ظل عافیت سلطان العلوم، سلطان الشعراء، شاہ جم جاہ معارف پناہ مخدوم الملت، محبوب الامۃ، سراج الشرق، وارث السلطنت للغلیہ، شہر یار دکن جلالۃ الملک النواب میر عثمان علی خاں بہادر ایدہ اللہ بنصرہ العزیز و خلد اللہ ملکہٗ اسی جامعہ میں معلم الصبیانی کی خدمت انجام دے رہا ہوں۔ خالص مشرقی مدارس کی تعلیم کے بعد مغربی طرز کی اس جامعہ کے ہر شعبہ میں میرے عملی اشتراک نے خیالات کا ایک سلسلہ تعلیم کے متعلق پیدا کردیا ہے، خود نہ مجھ میں عزم ہے نہ ارادہ، عمل کی قوت سے تقریباً محروم ہوں، اور عمر بھی جو کام کرنے کی ہوسکتی ہے، گذر چکی، منتشر طریقہ سے برسوں کے یہی مدفونہ خیالات آپ کو ان اوراق میں بکھرے ہوئے نظر آئینگے، مقصد میرا صرف عہد ماضی کے تعلیمی نظام کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنا تھا، لیکن واقعات کو درج کرتے ہوئے میرے ذاتی خیالات بھی بے چین ہو ہو کر قلم سے ادھر ادھر ٹپکتے چلے گئے ہیں، اسی لیے اب اس کتاب کی حیثیت نہ کسی تجویزی مضمون کی باقی رہی اور نہ کسی تحقیقی مقالہ کی، اور سچ تو یہ ہے کہ تجویز ہو یا تحقیق دونوں سے مجھے کوئی خاص لگاؤ ہی بھی نہیں بچوں کو مسلم الثبوت، ہدایہ، بخاری، ترمذی جیسی درسی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے والوں سے کسی تاریخی مضمون کی توقع بھی نہ کرنی چاہیے، وہ بھی کل بیس دن کی بہ محنت ہی طلبہ امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اسی میں کچھ فرصت ہمدست ہوئی، لکھتا چلا گیا، اور اسی مسودہ کو پریس

میں بھیج رہا ہوں عجلت ہی کی وجہ سے فارسی کے اقتباسی واستدلالی نقرات کا ترجمہ بھی نہ کر سکا کچھ اس پر بھی اعتماد ہو کہ اُردو پڑھنے والی جماعت ابھی فارسی سے اتنا زیادہ بیگانہ نہیں ہوئی ہو کہ است وبود کے ترجمہ کی بھی حاجت ہو، اسی لیے جہاں جہاں کوئی نادر ونا موس الفاظ آئے ہیں اُن کے معانی لکھ دیے گیے ہیں، بعض فقرے اگر مشکل تھے تو ان کا ترجمہ یا حاصل ترجمہ درج کر دیا گیا ہی، اس پر بھی اگر لوگوں نے دشواری محسوس کی تو آئندہ اشاعت میں ان شا اللہ سب کا ترجمہ کر دیا جائیگا، اگرچہ ضخامت کتاب کی بلا وجہ بڑھ جائیگی اور بہت زیادہ بڑھ جائیگی بہرحال جس حال میں کام ہوا ہی، نقائص کا رہ جانا ایسی صورت میں خلاف توقع نہیں ہی۔ یہ بھی ممکن ہی کہ بعض مواقع میں بے ربطی بھی نظر آئے، ایک تو یونہی میرا دماغ کچھ غیر مربوط سا فطرتًا ہی، اسی کے ساتھ پندرہ بیس دن میں فنی ترتیب آسان بھی نہ تھی، اب تو جو ماحضر ہی پیشکش ہی، دل صدپارہ کی چند ٹوٹی پھوٹی قاشیں ہیں، شاید کہ ان کا بھی کوئی خریدار نکل آئے کہ ولکل ساقطۃ لاقطۃ۔ پڑھنے والوں سے اتنی التجا ضرور ہی کہ حسب ذیل امور کا خصوصی طور پر توجہ کے ساتھ مطالعہ فرمائیں۔

(۱) اس وقت ملک میں دو مستقل تعلیمی نظامات کے برخلاف وحدت نظام کی جو تجویز خاکسار نے پیش کی ہی، اور جن امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہی، کیا وہ واقعی قابلِ توجہ محل نظر وفکر نہیں ہیں؟

(۲) وحدتِ تعلیم کے نفاذ سے پہلے عربی کے غیر سرکاری آزاد مدارس میں غیر مقابلاتی صناعات اور معاشی فنون کے اضافہ کا جو مشورہ دیا گیا ہی وہ کس حد تک قابلِ عمل ہی۔

(۳) جامعاتی اقامت خانوں کے فردوسی نظامات کیا ہندستانی طلبہ کے آئندہ معاشی توقعات کی بنیاد پر قابلِ نظر ثانی نہیں ہیں۔

(۴) مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا جو نقشہ خاکسار نے پیش کیا ہی، مروجہ طریقوں کے مقابلہ میں کیا وہ زیادہ نتیجہ خیز اور مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۵) دماغی تنور کے ساتھ ساتھ اس زمانہ میں قلبی تنوم وخوابیدگی کا جو عارضہ پھیل رہا ہے کیا اس کے نتائج اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی طرف توجہ کی جائے۔

یہ چند کلیاتی امور ہیں جنہیں اس کتاب کے مختلف مقامات پر آپ کو ڈھونڈھنا چاہیے ان کے سوا تصوف اور صوفیاء کے متعلق جن بدگمانیوں کے ازالہ کی کوشش کی گئی ہے میں چاہتا ہوں کہ وہی لوگ نہیں جو ان بزرگوں سے عقیدت رکھتے ہیں بلکہ روٹھے ہوؤں سے بھی عرض ہے کہ ٹھنڈے دل سے مخلّی بالطبع ہو کر آپ کو واقعات پر غور کرنا چاہیے۔ ان امور کے سوا اصل کتاب میں یا حواشی اور فٹ نوٹس میں جن جزئیات کا موقع بہ موقعہ سے ذکر کرتا چلا آیا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ ان شاء اللہ مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ ان سے ہوگا خصوصاً اس ملک میں جس کا سب کچھ چھن چکا ہے۔ لے دے کر پچھلوں کا اپنے اگلوں، اُن کی عظمتوں اور کارناموں پر جو تھوڑا بہت ناز باقی تھا، اس پر بھی ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں، غیروں سے کہلوایا جاتا ہے کہ

ہندوستانی اسلام کا مطالعہ کرتے وقت ایک محقق کو (ایسا محقق جس نے ہندوستان کی شاید ہی کبھی صورت دیکھی ہو بلکہ پیرس کی گلیوں میں ہندوستان کو ڈھونڈھتا رہا) ہاں تو اسی محقق کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں اس مذہب (اسلام) کی بری طرح مٹی پلید ہوئی۔ (تمدن ہند از محقق لیبان صاحب ص ۳۲)

اور جو اپنے ہیں وہ اسی کو شہادت قرار دے کر تشریح کرتے ہوئے اقرار کرتے ہیں کہ

"اس ملک کی قسمت میں اسلام کے ایسے پیامبر (صوفیا وعلما) تھے جو اس کے (یعنی اسلام کے) احکام سے بھی صحیح طور پر واقف نہ تھے، اور تھوڑی بہت واقفیت تھی بھی تو اس پر عامل نہ تھے"

(الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر)

کتنی مطابقِ واقعہ توجیہ ہے کہ

"اللہ کی کتاب عربی زبان ہے، اور یہ خدا کے بندے (ہندوستان میں اسلام کے پیامبر) فارسی لکھتے اور بولتے تھے، عربی سے اُن کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا (مجلہ الفرقان)

سب کا خلاصہ آخر میں ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔

"نتیجہ ظاہر ہے بھارت کی سرزمین پر حجاز سے نکلے ہوئے نکھرے ہوئے توحیدی مذہب کی مٹی پلید ہو گئی"

الغرض اسلام کی مٹی کو پلید ہوتے ہوئے غریب لیبان نے تو دور سے دیکھا تھا، وہ بیچارہ خدا جانے اسلام سے بھی واقف ہے یا نہیں، اور ہمارے بزرگوں کو تو وہ کیا جان سکتا ہے، جب ان ہی سے پیدا ہونے والی نسلوں کو اپنے بھارت کی پوتر سرزمین میں یہ نظر آرہا ہے کہ جن سے ان کو صرف وجود اور وجود کے سارے لوازم ہی نہیں بلکہ اگر انصاف کریں گے تو نظر آئیگا کہ ان ہی سے دین بھی ملا ہے اور ایمان بھی، علم بھی اور فضل بھی، وہی اسلام کی مٹی پلید کرنے والوں کی شکل میں دکھائی دے رہے ہیں، اللہ اللہ حکومت کی جادوگری، تیرا کیا کہنا ہے، کہ

ناموس چند سالہ اجداد نیک نام — درزیر پائے غرب ور یسرچش نہادہ ایم

جن صاحب کے مضمون سے میں نے مذکورہ بالا چند فقرے نقل کئے ہیں، کوئی ناواقف عامی آدمی نہیں، انگریزی درسگاہوں کے بگاڑے ہوئے بھی نہیں بلکہ ایک مشہور مرکزی اسلامی دارالعلوم کے چند ممتاز رشتہ پاروں میں آپ کا شمار ہے، ان کے علم و فضل کا مجھے بھی اعتراف ہے، نیازمندی کا تعلق رکھتا ہوں، اسی لیے تکلیف بھی زیادہ ہوئی، عزیزوں کے اس حال پر جگر پھٹتا ہو کلیجے کے ٹکڑے اڑتے ہوں تو اس پر تعجب کیوں کیجیے، خیال تو کیجیے ایک اچھے لکھے پڑھے عالم کے قلم سے جب یہ الفاظ نکلیں کہ ہندوستان میں

(حاشیہ صفحہ ۶) سے غیر ذمہ دارانہ قلم کی ان بے باکیوں کو ملاحظہ فرمائیے ہندستانی علماء و صوفیہ کو عربی سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا، جن صاحب نے یہ الفاظ لکھے ہیں، کیا وہی بتا سکتے ہیں کہ خود انہوں نے یا ان کے اساتذہ در اساتذہ کو جو کچھ بھی عربی آتی ہے، وہ بیرون ہند کے کسی عالم سے سیکھی گئی ہے، خیر اس کی تفصیل تو آئندہ آپ کتاب میں پڑھینگے لیکن سردست میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جن اسلامی ممالک کی زبان عربی ہے جو فارسی نہیں عربی ہی میں لکھتے اور بولتے ہیں کیا وہاں کے عوام نے اسلام کو اپنی اصلی صورت پر باقی رکھا ہے، مصر ہو یا عراق، شام ہو یا الجیریا، بلکہ خود عرب ہی کا کیا حال ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا اسلام اب بھی بسا غنیمت ہے، آج بھی غنیمت ہے اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کل بھی غنیمت تھا، چند جزئی واقعات سے کلیات بنا لینے کی مشق جن استادوں نے سکھائی ہے اب اس مشق سے اس کے برعکس بھی تو کام لے سکتے تھے، بجائے مسجد کنی کے اُنھوں کے اس تیشہ سے ہیزم شکنی کا بھی تو امکان تھا، فہل من مدکر!

"دین توحید ہندوانہ آلودگیوں سے لت پت ہوگیا، اللہ کی کتاب سامنے نہ ہو تو پھر ہندوانہ عقیدوں ویدانت کی دور دراز کارموشگافیوں کا اسلامی عقائد میں گھل مل جانا کیا تعجب ہے"

کیا تماشے کی بات ہے، دعویٰ خود کرتے ہیں اور دلیل میں پھر ان ہی آسمانی شہادتوں کو پیش فرماتے ہیں جو یورپ کے آسمانوں سے نازل ہو رہی ہیں، یہ لکھتے ہوئے کہ شہادتیں سن لیجیے "کتنی پاکیزہ شہادت سناتے ہیں، لیبان لکھتا ہے"

"اگر ہندوستان میں دین محمدی نے اپنے کچھ اثرات چھوڑے ہیں، اور یہاں کے مذہب و عقائد میں کچھ تبدیلی کی ہے تو اس سے زیادہ وہ خود یہاں کے تمدن اور مذہب سے متاثر ہوا ہے" بلکہ "ہندوان سے (مسلمانوں سے) اس قدر متاثر نہیں ہوئے جتنا یہ (مسلمان) ہنود سے" ص ۱۳۵

تقریباً نصف صدی بلکہ کچھ زیادہ ہی مدت سے اس قسم کی ناوک اندازیوں کا ایک بے پناہ سلسلہ ہے جو جاری ہے۔

اس کتاب میں رہ رہ کر ان ہی ٹیسوں، اور ہوکوں کی ہچکیاں آپ کو محسوس ہونگی جو ان ہی تیروں کے زخموں نے مجھ میں پیدا کیے ہیں، مجھے رلایا گیا ہے، تب رویا ہوں، ستایا گیا ہے تب کراہا ہوں ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں بعض مواقع پر میرے نالے ذرا زیادہ بلند ہو گئے ہوں، قابو سے قلم کہیں باہر ہو گیا ہو، اس میں مجھے معاف رکھا جائے گا، میں احسان فراموش ہوتا، اگر جاننے کے باوجود بھی نہ جاننے والوں کے سامنے واقعات کی حقیقی روئداد نہ پیش کرتا۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

بہر حال۔ زدیم صف رنداں و ہر چہ بادا باد

عبدہ الاٰمھن الجانی المغرور بالاماني

السید مناظر احسن الگیلانی غفر اللہ لہ ولمن رباہ

حیدرآباد دکن ـ جوار الجامعۃ العثمانیہ

صباح یوم الجمعہ ۲ ذی قعدہ ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۳ نومبر ۱۹۴۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبْحَانَ اللہِ وَبِحَمْدِہٖ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدٍ رَسُوْلِہٖ وَعَبْدِہٖ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ

کہنے والے نے کہا تھا اور کتنا سچ کہا تھا ؎

اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بُلبلیں گلزار میں ۔۔۔ جی میں کیا آئی کہ پابند نشیمن ہو گئیں

(عارف مشرق)

نہ ریل تھی، نہ موٹر، نہ تار اور نہ ٹیلی فون، اور نہ امنِ راہ کے یہ بلند بانگ دعوے، لیکن

"شیخ طاہر جد شیخ عبدالعزیز قدس اللہ اسرار ہما از ولایت ملتان رفتہ در بلدۂ بہار[1] رسید" (آثرالکرام وغیرہ)

---

[1] عجیب بات ہے کہ لفظ "بہار" جو "وہار" کا ایک تلفظ ہے، یہ بدھ مذہب کی تعلیمی خانقاہوں کا نام تھا، اس صوبہ میں چونکہ اس مذہب کی تعلیم گاہوں کی کثرت تھی، حتیٰ کہ اسی میں ہندوستانِ قدیم کا سب سے بڑا مرکز نالندا بھی موجود تھا جس میں کہتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبار کی تعداد بارہ بارہ ہزار تک پہنچ جاتی تھی، حال میں حکومتِ ہند نے راجگیر کے پاس مولانا سجاد نائب امیر شریعت بہار رحمۃ اللہ علیہ کے مکان کے قریب اس کے کھنڈروں کو نمایاں کیا ہے میلوں میں معلوم ہوا کہ ہندوستان کے اس قدیم جامعہ کی عمارتیں دفن تھیں، جن لوگوں نے دارالعلوم دیوبند کو دیکھا ہے اور اس کے بعد نالندے کے اس مدرسہ کی عمارت کو دیکھنے جاتے ہیں، اس کے دروازے اور اس کے اندر میں دارالطلبہ کے جو مختلف قطعات بنے ہوئے ہیں جب ان کو دیکھتے ہیں تو دیر تک حیرت ہوتی ہے کہ آخر وہ کہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ نالندہ کے مدرسہ کا نقشہ جو تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کو دیکھ کر کسی نے دیوبند کی عمارتوں کا نقشہ قائم کیا ہے۔ وہی سُرخ سُرخ موٹی موٹی اینٹوں سے نالندہ کی بھی عمارتیں بنی ہوئی ہیں جن سے دیوبند کے مدرسے کی عمارت بنی ہوئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ قدیم ہند میں حالانکہ عموماً پتلی اینٹوں کا رواج تھا لیکن خلاف دستور نالندہ میں موٹی اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ مٹی کے لوٹوں کا وہ ذخیرہ ہے جو اس "موکفہ" آبادی سے برآمد ہوئے ہیں یعنی مسلمانوں کی مسجدوں میں مٹی کے بدھنے جیسے ہوتے ہیں بجنسہ اسی شکل و صورت کے ہزاروں کی تعداد میں نکلے ہیں۔ ڈھائی تین ہزار سال کے فاصلہ کے بعد ہندوستان میں تاریخ نے واقعہ کو عجیب طریقہ سے دُہرایا ہے۔ کم از کم دارالعلوم دیوبند سے دلچسپی رکھنے والوں کو ایک دفعہ تو نالندہ کے "وہار" کا معائنہ ضرور کرنا چاہیے۔ خدا کی شان نظر آتی ہے، اگر نالندہ کی آخری 'ہ' کو زائد (باقی برصفحہ ۱۰)

یعنی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دودمانِ عالی کے مشہور بزرگ شیخ عبدالعزیز شکربار کے دادا شیخ طاہر ملتان سے چلتے ہیں۔ پڑھتے ہوئے، سیکھتے ہوئے بالآخر بہار پہنچ جاتے ہیں اور "پیش شیخ بدھ حقانی تحصیل علم نمود" (اخبار الاخیار۔ ص ۱۹۵)

یوں ہی "ملا موہن بہاری قدس سرہ کہ نام اصلی او محب الدین است مولد و منشا بلدۂ بہار در نہ سالگی کلام اللہ حفظ کرد و بخدمت پدر خود ملا عبداللہ کسب علوم نمود و در ہفدہ سالگی فاتحۂ فراغ خواند و چندے در وطن خود بہ درس و افادہ پرداخت بعد ازاں بہ ملازمت شاہجہاں بادشاہ رسید، و بہ تعلیم شاہزادہ محمد اورنگ زیب معین گردید" (مآثر الکرام ص ۴۳)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹) قرار دیا جائے جیسا کہ ہندی زبان کا دستور ہے تو دیو بندو ناند ہم قافیہ الفاظ بھی ہیں۔ بہر حال اسی مدرسہ یا اس کے ساتھ دوسرے ذیلی مدارس کی وجہ سے بہار کا نام بہار ہو گیا ہے۔ اسلامی عہد میں بھی ابوالفضل نے بہار کے شمالی حصہ ترہت کے متعلق لکھا ہے "ترہت از دیرگاہ بنگاہ (مرکز) ہندی دانش" آئینِ اکبری ج ۲ ص ۶۷) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ہندی دانش" (فلسفۂ ہند) کا بہار مدت تک مرکز رہا۔ میں نے جو عبارتیں مآثر الکرام سے نقل کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی علوم کی مرکزیت کا مقام بھی بہار کو اسلامی عہد میں حاصل تھا، ملتان سے لوگوں کا بہار پڑھنے کے لیے آنا صاحبِ قرآن شاہجہاں کا اپنے سب سے بڑے اقبالمند بیٹے اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے بہار ہی سے ایک عالم ملا موہن کو بُلانا آخر کس بات کی دلیل ہے کون کہہ سکتا ہے کہ عالمگیری عہد میں اسلام نے جو سنبھالا اس ملک میں یا اُس میں ملا موہن کی تعلیم کو دخل نہ تھا خصوصاً جب ملا موہن کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ ان کی تعلیم کی ابتدا، اور انتہا دونوں بہار ہی میں ہوئی، بہار ہی سے وہ پڑھ کر دلی آئے اور شاہزادہ کی تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ بہر حال مجھے تو اس لفظ بہار کی وجہ تسمیہ کو ظاہر کرنا تھا، عجیب بات ہے کہ بخارا جو مشرقی ممالک کا علمی و اسلامی مرکز تھا کہتے ہیں کہ وہ بھی اسی "دبہارا" کا ایک تلفظ ہے جس کی تصدیق ان سرحدی پٹھانوں کے تلفظ سے ہوتی ہے جو ح کو ہمیشہ خ کی شکل میں تلفظ کرتے ہیں۔ بلخ کا مشہور تاریخی نو بہار بھی بودھسٹ مذہب ہی کی خانقاہ کا نام تھا۔ ابوالفضل نے بودھ کے ذکر میں بُدھا کا نام شاکیہ منی بتا کر اُس کے باپ کا نام درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پدر او (بدھا) راجہ سدھودن مرزبان بہار" جس کا مطلب یہی ہوا کہ سدھودن یعنی بدھا کے والد کی راجدھانی بہار ہی میں تھی، لیکن شاید انگریزی تقسیم میں اس کو گورکھپور میں شامل کر دیا گیا ہے، مگر بُدھا اور بدھسٹ مذہب کو جو تعلق بہار سے ہے اُس سے ابوالفضل ہی کے قول کی تصدیق ہوتی ہے، خصوصاً اس لیے بھی کہ اسلامی عہد میں بہار کا صوبہ جونپور تک کے علاقہ کو شامل تھا، زمانیہ، غازی پور، بلیا یہ سب بہار ہی کے اضلاع تھے۔۔

پڑھنے کے لیے ایک شخص ملتان سے بہار جا رہا ہے اور پڑھانے کے لیے دوسرا بہار سے دلّی آ رہا ہے، یہ تھا آمد و رفت کا وہ سلسلہ جس کا تانا بانا ہند کے اس فراخنائے اعظم میں بندھا ہوا تھا مشرق سے مغرب، مغرب سے مشرق، جنوب سے شمال، شمال سے جنوب، قافلوں پر قافلے تھے جو چلے آ رہے تھے چلے جا رہے تھے تاکہ سیکھا جائے یا سکھایا جائے، پڑھا جائے یا پڑھایا جائے۔ ہزار ہا میل مربع سرزمین کی اس وسعت کا اندازہ کیجیے، سوچیے کہ ہر صوبہ، ہر صوبہ کی ہر سرکار، ہر سرکار کے ہر پرگنے میں قضاۃ بھی ہیں، مفتی بھی ہیں، مدرسین بھی ہیں اور صاحبانِ ہدایت وارشاد بھی ہیں، کیسا عجب زمانہ اور کیسا دلچسپ تماشا تھا۔ حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی رقمطراز ہیں، گویا اپنی آنکھوں دیکھی شہادت پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ہندوستان کی عام نہیں خاص اور اعلیٰ تعلیم کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

اگرچہ جمیع صوبہ جات ہند بہ وجود حاملانِ علوم تفاخر دارند سیما حصار پایۂ تخت خلافت (یعنی دلّی) کہ بواسطہ جمعیت صاحب کمالان ہر قسم در آنجا فراہم می آیند و از تراکم افکار و اجتماع عقول اہلِ عصر کمالات نفس ناطقہ را چہ علم عقلی و نقلی و چہ غیر آں بہ پایہ بالاتر می رسانند۔[۲۲۱]

ان مختصر الفاظ میں اسلامی ہندوستان کے علمی ارتقاء کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے ایک ایسے شخص کے قلم سے جو افکار کے اس تراکم اور عقول اہلِ عصر کے اسی اجتماع سے خود بھی مستفید ہو کر علم کو ایک زینہ سے اُٹھا کر دوسرے زینہ تک چڑھانے میں مصروف تھا اپنے اندر بہت کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا آزاد چونکہ خود "پورب" یعنی بلگرام کے رہنے والے ہیں، ہندوستان کی حد تک اُنھوں نے وہیں پڑھا، اور پورب ہی میں سیکھا جو کچھ سیکھا۔ اس لیے جن لوگوں میں خود تھے کافی قرب کی وجہ سے اُنھی لوگوں کے معائنہ کا ان کو کافی موقع ملا تھا۔ سبحۃ المرجان میں الفوار بہ جو خود ان ہی کا گھڑا ہوا لفظ ہے یعنی فورب (پورب) سے بنایا گیا ہے مراد پورب کے علماء ہیں۔ اس لفظ کی

تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

الفواربة جمع الفوربي نسبة الى الفورب	الفواربہ الفوربی لفظ کی جمع ہے یعنی پورب کی طرف
معرب پورب بضم الباء الفارسية و	جو پورب کا معرب ہے یہ نسبت ہے، اور پورب دلّی
هو ملك وسيع في الجانب الشرقي من	سے بجانب مشرق ایک وسیع ملک کا نام ہے دراصل
دهلي وعبارة عن ثلاث صوب صوبه	پورب کا اطلاق تین صوبوں پر ہوتا ہے صوبہ اودھ اور صوبہ
اودھ وصوبہ الہ آباد وصوبہ عظیم آباد	الٰہ آباد، صوبہ عظیم آباد (یعنی جواب پٹنہ کے نام سے مشہور ہے)

پھر لفظ صوبہ کی تشریح ان الفاظ میں کرنے کے بعد

والصوبة عبارة عن ارض وسيعة محدودة	الصوبہ دراصل بڑی فراخ محدود زمین کا نام ہے جس میں
فيها دار الامارة وبلدان اخر لها توابع	صوبہ کا دارالامارۃ (کیپٹل) اور دوسرے شہر ہوتے ہیں
وكل بلدة لها قصبات تضاف اليها	ہر شہر کے ساتھ چند قصبے (پرگنے) اور ہر قصبہ کے علاقے میں مختلف
وكل قصبة لها قرى تضاف اليها	دیہات ہوتے ہیں جو اپنے اپنے پرگنوں کی طرف منسوب ہیں۔

مولانا آزاد غلام علی بلگرامی[1] رحمۃ اللہ علیہ اسی کے بعد پھر فرماتے ہیں :۔

وقصبات الفورب في حكم البلدان لانها	دراصل پورب کے قصبات کی حیثیت شہروں کی ہے
مشتملة على العمارات العالية وعلى	کیونکہ اونچی اونچی عمارتوں سے عموماً یہ معمور ہیں اُن
محلات الشرفاء والنجباء والمشائخ والعلماء	میں شرفا، نجبار، مشائخ (صوفیا) علماء کے مستقل محلے
وغيرهم من الاقوام المختلفة وارباب	ہیں جن کا تعلق مختلف قوموں سے ہے۔ ان قصبوں

[1] اس زمانہ میں بلگرام کے باشندے چونکہ امامیہ مذہب رکھتے ہیں، اس لیے اس کا گوش گذار کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود اپنا تذکرہ مولانا غلام علی نے جہاں درج فرمایا ہے وہاں لکھتے ہیں: الفقیر غلام علی بن السید نوح الحسینی نسبًا والواسطی اصلاً والبلگرامی مولدًا ومنشاءً والحنفی مذہبًا والچشتی طریقۃً۔ صرف الچشتی نہیں بلکہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے معتقد، آخر جس کے الفاظ یہ ہوں "المجدد الثانی والبرہان الساطع علی شرفیۃ النوع الانسانی سحاب ہاطل روی العرب والعجم امطارہ نیر اعظم بلغ المشارق والمغارب انوارہ الخ سبحۃ المرجان۔ ان کے مشرب کے لیے اتنی شہادت کافی ہے۔

الحرف المتنوعة وعلى المساجد المدارس	میں مختلف پیشوں اور دستکاریوں کے جاننے والے بھی
والصوامع ومساجدها معمورة بصلوٰة	رہتے ہیں ان میں مساجد بھی ہیں مدارس بھی ہیں خانقاہیں
الجمعة والجماعات يصح ان يطلق على	بھی ہیں۔ ان قصبوں کی مسجدیں جمعہ اور جماعت سے
القصبة اسم البلدة (ص ۵۳)	ہمیشہ آباد رہتی ہیں۔ ان قصبوں کو بجائے قصبہ کے شہر [illegible]

یہ بیان تو فورب اور فوار بہ کے متعلق سبحۃ المرجان میں ہے۔ مآثر الکرام میں اسی پورب کے متعلق شاہجہاں بادشاہ اسلام انار اللہ برہانہ کے مشہور شاہانہ فقرہ "پورب شیراز مملکت ماست" کو نقل فرمانے کے بعد ہندوستان کے صرف اس ایک حصہ "پورب" کے علمی چرچوں کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ اس علاقہ میں

"بہ فاصلہ پنج کروہ نہایت دہ کروہ[1] تخمیناً آبادی شرفا و نجبا راست کہ از سلاطین و حکام وظائف وزمین مدد معاش داشتہ اند، ومساجد ومدارس وخانقاہات بنا نہادہ ومدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بر روئے دانش پژوہاں کشادہ و صدائے اطلبوا العلم در دادہ"

پھر اطلبوا العلم کے اس صلائے عام کی تعمیل جس شکل میں ہوتی تھی اس کی تصویر مولانا ہی کے قلم نے یہ کھینچی ہے۔

"طلبۂ علم خیل خیل (گروہ در گروہ) از شہرے بہ شہرے می روند وہر جا موافقت دست دہد بہ تحصیل مشغول می شوند"

ان طلبہ کے طعام وقیام کے نظم کی جو صورت تھی اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

"صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبۂ علم را بجا می دارند وخدمت ایں جماعت را سعادت عظمیٰ می دانند"[2]

گویا آج بورڈنگ ہاؤس اور اقامت خانوں کے کپکپا دینے والے مصارف سے تعلیم کے جس مسئلہ کو حل کیا جا رہا ہے، پڑھنے والے بچوں کے ماں باپ جن مصارف کی تکمیل میں دیوانے بنے ہوئے ہیں

---

[1] مغل عہد میں میل اور کوس کے سوا کروہ سے بھی مسافت کا اندازہ کیا جاتا تھا موجودہ زمانہ میں دو میل ہی کے قریب قریب اسے سمجھنا چاہیے۔ [2] مآثر الکرام۔ ص ۲۲۲۔

جائدادوں کو بیچ بیچ کر بلکہ بسا اوقات ماں اور بہنوں کے زیوروں کو بھی فروخت کرکر کے جس مقصد کو آج ہندوستان میں حاصل کیا جارہا ہے۔ صرف دو ڈھائی صدی پہلے یہ مسئلہ اس قابل ہی نہ تھا کہ اُسے سوچا جائے بلکہ ہر آبادی کے باشندوں کا باورچی خانہ علم کے پیاسوں کا باورچی خانہ بنا ہوا تھا اور ان کے مکانات محلہ کی مسجدوں کے حجرے ان طلبہ کے لیے اقامت خانوں کا کام دے رہے تھے، بڑے بڑے شہروں ہی کی حالت یہ نہ تھی بلکہ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی چھوٹی سی کتاب مآثر الکرام میں جن بزرگوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور اُن کے جو حالات درج کیے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ بلگرام، کوڑا، سہالی، کچند، قنوج، دیوہ، مسولی، خیرآباد وغیرہ جیسے قصبات میں بھی فری لاجنگ اور فری بورڈنگ کا یہ نظم قائم تھا اور اسی پر دلّی، لکھنؤ، سیالکوٹ، لاہور، ملتان، بہار، عظیم آباد، احمد آباد، بریلی وغیرہ شہروں کو قیاس کرنا چاہیے۔

یہ تو صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان میں مدارس کے قیام کا رواج مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں نہ تھا "ہندوستان کے اسلامی مدارس" کے عنوان سے میرے مرحوم دوست ابوالحسنات ندوی (رکن دارالمصنفین) نے کافی مواد تاریخوں سے مدارس کے متعلق جمع کردیا ہے۔ اگرچہ ان کا جو مطلب ہے اس کا جواب آپ کو آئندہ اوراق میں ملیگا۔

لیکن اس کے ساتھ سچی بات یہی ہے کہ زیادہ تر اس ملک میں مساجد اور شہروں یا قریٰ وقصبات میں امراء کی حویلیوں، اور ڈیوڑھیوں سے بھی مدرسہ کا کام عموماً لیا جاتا تھا۔ میر طفیل محمد بلگرامی جنہوں نے "قریب ہفتاد سال بر مسند تدریس و بہ احیاءِ علوم پرداختند" یعنی ستر سال تک بلگرام میں درس وتدریس کا بازار جنہوں نے پوری قوت کے ساتھ گرم رکھا تھا، بقول مولانا آزادؔ

"طلبہ را از حضیض شاگردی بہ اوج اُستادی رسانیدند"

لیکن طلبہ کی ایک دنیا کو شاگردی کی پستی سے اُٹھا کر جو اُستادی کی بلندیوں تک پہنچا

رہا تھا، کیا اس کے مدرسہ کی تعمیر کے لیے چندوں کی فہرست کھولی گئی تھی اور شہر شہر گاؤں گاؤں میں سفرا دوڑائے گئے تھے؟ مولانا آزاد جو کہ از تلامذہ میر طفیل محمد ہیں خود اپنی چشم دید گواہی ان الفاظ میں قلمبند فرماتے ہیں کہ۔

"بعد از تکمیل تحصیل در بلگرام طرح اقامت ریختند در اوائل بہ خانہ سید محمد فیض زمیندار کہ از اعیان سادات بلگرام است اقامت داشتند"

یعنی سید محمد فیض زمیندار کی ڈیوڑھی ان کا پہلا مدرسہ تھا، اور اس کے بعد۔

"قریب نہ سال تا دم واپسیں در محلہ میدان پورہ در دیوان خانہ علامہ مرحوم میر عبدالجلیل نور اللہ مرقدہ سکونت ورزیدند"

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ میر طفیل محمد صاحب گلستاں اور بوستاں کے پڑھانے والے میاں جی تھے، خود مولانا غلام علی کا بیان ہے۔

"کتب درسی از بدایت تا نہایت بہ جناب استاذ المحققین میر طفیل محمد روح اللہ روحہ گذرانیدم"

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس کے حلقۂ درس میں حسان الہند مولانا غلام علی جیسے یگانہ و فرزانہ علامۂ دہر نے اول سے آخر تک درسی کتابیں تمام کی ہوں اس کے تعلیمی نصاب کا کیا پیمانہ ہو سکتا ہے لیکن یہ ستر سالہ مدرسہ کہاں قائم رہا۔ بلگرام کے ایک زمیندار، اور ایک رئیس عالم کے دیوان خانہ[1] میں میر صاحب کی علمی جلالت شان کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مولانا آزاد ان کا ترجمہ ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔

---

[1] کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ شہر یا محلہ یا قصبہ یا موضع کا رئیس اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے کسی عالم کو ملازم رکھ لیتا تھا لیکن ان رئیس زادوں کے ساتھ دوسرے غربا کے بچے بھی مفت تعلیم حاصل کر لیتے تھے، صاحب "مشارق الانوار" حسن لاہوری صغانی کے متعلق فوائد الفواد میں حضرت سلطان جی کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے کہ پسر والی کول (علی گڈھ) را تعلیم کردے صد تنکہ بیافتے۔ ص ۲۰۳۔

"مجمع البحرین معقول و منقول و مطلع النیرین فروع و اصول"

بلکہ اپنی ساری کتاب میں مولانا آزاد نے استاذ المحققین کے لقب سے اُن کو ملقب کیا ہے شاگردوں کا تذکرہ تقریباً بیسیوں صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ میر صاحب کے اساتذہ میں قاضی علیم اللہ گجنڈوی اور سید قطب الدین شمس آبادی کا بھی نام ہے۔ سلم و مسلم کے مصنف ملا محب اللہ بہاری کے اُستاد بھی قطب الدین شمس آبادی ہیں جس کے معنی یہی ہوئے کہ ملا محب اللہ بہاری اور میر طفیل محمد صاحب دونوں ایک ہی دسترخوان کے زلہ رباؤں میں ہیں۔

اساتذہ کا یہ گروہ جو ملک کے قصبہ قصبہ گاؤں گاؤں میں پھیلا ہوا تھا، کیا کسی سے تنخواہ وغیرہ طے کرنے کے بعد کسی جگہ بیٹھتا تھا، آج اُس کو کون باور کر سکتا ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے صاحبزادے مولانا نور الحق "تیسیر القاری" بخاری کی جنہوں نے فارسی زبان میں شرح فرمائی ہے اور متعدد جلدوں میں نواب محمد علی مرحوم[1] (اسیر بنارس) رئیس ٹونک نے کثیر مصارف سے اسے طبع بھی کرایا تھا

ان ہی مولانا نور الحق کے ایک شاگرد سید محمد مبارک محدث بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مولانا آزاد نے ارقام فرمایا ہے کہ ان کے وہی استاذ المحققین استاذ یعنی مولانا طفیل محمد بلگرامی نے اپنا یہ چشم دید واقعہ مولانا آزاد سے بیان کیا۔

"روزے شرف خدمت حضرت میر (مبارک) دریافتم برائے تہیۂ وضو برخاستہ بود ناگاہ بر زمین اُفتاد بہ سرعت تمام شتافتہ نزدیک رفتم بعد ساعتے افاقت آمد"

لیکن جانتے ہو، کہ یہ میر مبارک محدث بے ہوش ہو کر کیوں گر پڑے تھے، میر طفیل محمد ہی کی

[1] جیسا کہ معلوم ہے ٹونک کی ریاست سنبھل کے ایک پٹھان امیر خاں کی قائم کی ہوئی ہے۔ انہی امیر خان کے پوتے اور موجودہ والی ریاست کے دادا محمد علی خاں مرحوم کو حکومت برطانیہ نے بنارس میں بجرم بغاوت نظر بند کر لیا تھا۔ نواب مرحوم کا مشغلہ اس زمانہ میں علمی و دینی رہ گیا تھا۔ ۱۲

زبانی اس کا افسانہ سُنیے "کیفیت استفسار کردم، بعد مبالغہ بسیار فرمودٗ مبالغہ بسیار کے بعد کیا فرمایا۔ سہ روز است کہ مطلقاً از جنس غذا میسر نیامدٗ" گویا تین دن سے کھیل اُڑ کر مُنہ میں میر صاحب کے نہیں پڑی تھی۔ پھر کیا اس فاقہ کے بعد انہوں نے چندہ کا اعلان کیا تھا۔ خود ہی فرماتے ہیں" دریں سہ روز بائیچ کس لب بہ اظہار نہ کشودہ دوام نہ گرفت"
قرض"

علم کی غیرت کا یہ حال ہے اور دین کی پاسداری کا قصّہ اس سے بھی آگے بڑھا ہوا۔ میر طفیل محمد فرماتے ہیں کہ

مرا بسیار رقت دست داد فی الفور از آنجا بہ مکان خویش رفتم وطعام شیریں کہ مرغوب ایشاں مہیا ساختہ حاضر آوردم اول بشاشتِ بسیار ظاہر نمودہ دعا کرد"

مگر یہ تو اپنے سعادتمند شاگرد کی ہمت افزائی کے لیے بشاشت تھی، دینی ذمہ داریوں کا احساس اب بیدار ہوتا ہے اور فرماتے ہیں۔ تین دن کے بھوکے بیہوش ہو کر گرنے والے میر مبارک فرماتے ہیں۔ سخنے گویم بشرطیکہ شما گران خاطر نہ شوید، گفتم حضرت بفرمائید"۔

دینی نکتہ نوازی سُنیے اپنے اسی شاگرد سے جس کی خاطر شکنی بھی منظور نہیں فرماتے ہیں "باصطلاح فقرا، ایں را طعامِ اشراف گویند" یعنی نفس نے جس کی طرف لو لگائی تھی۔ یہ ایسا کھانا ہے۔ کیونکہ اظہار حال کے بعد اور میر طفیل محمد کے جانے کے بعد میر مبارک کے نفس نے ظاہر ہے کہ اس کھانے کی اُمید قائم کر لی تھی، اس کے بعد میر مبارک فرماتے ہیں

"ہرچند نزد فقہا اکل آں جائز است و در شرع بعد از سہ روز میتہ حلال، اما در طریقہ فقرا اکل طعامِ اشراف جائز نیست"
کھانا ۔ مردار ۱۲

یعنی مخلوق سے توقع قائم کرنے کے بعد جو چیز سامنے آئے ان لوگوں کے لیے اس کا لینا جائز نہیں ہے جنھوں نے لا مانع لما اعطیت ولا معطی نہیں روکنے والا ہے اس سے کوئی جسے تو دے اور نہ دینے والا ہے کوئی تُسے

لما منعت (دعا نبوی) جس کے لیے تو روک دے۔

پر کمر ہمت چست کی ہو اور جنہوں نے

ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا آدمی کے لیے اللہ جس رحمت کو کھول دیتا ہے پھر اُس کا

ممسک لھا و ما یمسک فلا مرسل روکنے والا کوئی نہیں اور جسے روک دیتا ہے اُس کا جاری

لہ من بعدہ۔ (القرآن العظیم) کرنے والا بھی اس کے بعد کوئی نہیں۔

ہی کے تجربہ کا نام "الحیٰوۃ الدنیا" قرار دے رکھا ہے میر طفیل محمد اُستاد کے مذاق شناس تھے، بغیر کسی اصرار اور رد و کد کے کھانا سامنے سے اُٹھا لیا اور چلے گئے، اور تھوڑی دیر جانے کے بعد پھر لوٹے اور اب کھانا پیش کر کے اُستاد سے پوچھتے ہیں "ہرگاہ بندہ طعام را برداشتہ بر حضرت را توقع بود کہ باز خواہم آورد" میر مبارک نے جواب دیا کہ "نے" نہیں، میر طفیل محمد نے عرض کیا "حالا ایں طعام بے توقع حضرت آوردہ ام طعام اشراف نماند" سعید شاگرد کے اس حسن تدبیر پر اُستاد خوش ہوئے اور بولے "شما عجب فراستے بکار بردید" اس منطق سے جو منطق نہیں واقعہ تھا، اُستاد کو شکست کا اعتراف کرنا پڑا۔ اور "طعام برغبت تمام تناول فرمود" مگر وہی جس نے

الیس اللہ بکاف عبدہ (القرآن) کیا اپنے بندے کے لیے اللہ کافی نہیں ہے

کے قرآنی سوال کے جواب میں

حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ہمارے لیے اللہ بس ہے، بڑا اچھا وکیل (پشت پناہ)

ونعم النصیر۔ کتنا اچھا آقا کیسا اچھا یار (مددگار) فرما۔

کی چٹان سے اپنی زندگی کے جہاز کو باندھ دیا تھا۔ ابھی تو آپ نے دیکھا کہ جب تک وہ

زلزلوا زلزالاً شدیداً (القرآن) جھنجھوڑ دیے گیے اچھی طرح جھنجھوڑ کے ساتھ

کے مقام پر تھا تو بھوک کی شدت سے اسے بیہوش ہو ہو کر گرنا پڑتا تھا، مگر چند ہی دنوں کے بعد ان ہی

میر مبارک محدث کو دیکھا جاتا ہے، اسی بلگرام میں یکھا جاتا ہے کہ نصر اللہ کا ظہور ان کے سامنے باین شکل ہو رہا تھا کہ "میر (مبارک محدث) از محلہ سید واڑہ وعشیرۂ (کنبہ) خود در میدانے اقامت گزید و رعایا آباد کرد و مسجد و منازل سکونت تعمیر نمود" صرف یہی نہیں کہ مسجد اور رہنے کے مکانات میر مبارک نے بنوائے اور مستقل ایک گاؤں رعایا کا اپنے مکان کے ارد گرد آباد کیا، بلکہ "گرد آبادی سورِ محکم از خشت و گچ کشید تا از آسیب دزدان و وحوش وسباع محفوظ باشد" گویا ایک مستقل گڑھی تیار ہو گئی لیکن ایک فقیر کو رعایا کی کیا ضرورت تھی کیسا عجیب مذاق تھا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ اپنی اس گڑھی میں میر مبارک محدث نے جن رعایا کو بسایا تھا وہ "بیشتر از قوم حائک آباد کرد کہ اینہا اکثر دیندار و نماز خواں می باشند" جس سے صرف میر صاحب کے نصب العین ہی کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس غلط خیال کی بھی تردید ہوتی ہے۔ جو سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے جس طبقہ نے ہندستان میں عمل ید اور دستکاری کے اس فن کو یعنی پارچہ بافی کو رزقِ حلال کا ذریعہ بنایا تھا، وہ اسلامی حکومت کے عہد میں دین وعلم کے زیور سے قطعاً خالی تھا اور اس نے اپنی دینداری، جوشِ اسلامی میں جو شہرت اس زمانہ میں حاصل کی ہے یہ سب برٹش راج کی برکت ہے۔ مولانا غلام علی آزاد نے یہ واقعہ گیارہویں صدی کا بیان کیا ہے جس سے ثابت ہوا کہ کم از کم آج سے دو ڈھائی سو سال پیشتر بھی پارچہ بافوں کا یہ گروہ اپنی دینداری اور نماز خوانی میں امتیازی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اور میرے نزدیک تو دین اور دین پر عمل ہی سارے علموں کی جان ہے۔

البتہ اس سلسلہ میں مولانا غلام علی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دلچسپ لطیفہ نقل کیا ہے کہ انہی پارچہ بافوں میں ایک شخص نماز میں حاضر نہیں ہوتا تھا۔ میر مبارک محدث نے بلا کر پوچھا کہ بھائی! تم جماعت میں کیوں نہیں آتے۔ اس نے جواب دیا کہ جماعت کی پابندی کی وجہ سے میری کمائی میں نقصان ہوتا ہے یعنی آنے جانے میں وقت لگ جاتا ہے۔ میر صاحب نے پوچھا کتنا نقصان ہوتا ہے، بولا ایک پیسہ کا نقصان روزانہ ہوتا ہے۔ میر صاحب نے فرمایا یہ ایک پیسہ مجھ سے لے لیا کر و حسبِ

وعدہ روزانہ ایک پیسہ اس کو ملنے لگا۔

ایک دن میر مبارک نے دیکھا کہ بلا وضو وہ نماز میں شریک ہو گیا۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ نماز را بے طہارت می خوانی؟ اُس نے جواب دیا کہ "بہ یک پیسہ دُو کار نمی تواں کرد" یعنی ایک ہی پیسہ میں آپ نماز اور وضو دونوں کام لینا چاہتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔" میر بے اختیار خندہ زد و پیسۂ دیگر برائے وضو، اضافہ کرد"

بہر حال آخر میں، تو مولانا آزاد لکھتے ہیں" رفتہ رفتہ حائک را رغبت دلی در نماز بہم رسید واز تقاضائے اُجرت درگذشت۔

فاقہ و فقر کی اس کیفیت کے بعد میر مبارک محدث پر فتح باب، ارسال رحمت اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کیسے ہوا؟ مولانا آزاد نے اس کو بھی لکھا ہے کہ نواب مکرم خاں بن نواب شیخ میر عالمگیری در خدمت میر اعتقاد عظیم داشت و خدمات شایستہ بہ تقدیم رساند" اور یوں

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ اللہ کو جس نے وکیل بنالیا تو وہ اس کے لیے بس ہے

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا اللہ سے ڈر کر (بُری باتوں سے جو ڑکا) یعنی تقویٰ اختیار کرتا ہے

و یرزقہ من حیث لا یحتسب تو اللہ تعالیٰ اس کے خلاص کی راہ نکال دیتے ہیں اور روزی پہنچاتے ہیں، ایسی جگہ سے جہاں سے اُسے اُمید نہ ہو۔

کی تفسیر ہندستان کے گوشہ گوشہ میں ہو رہی تھی حالانکہ خود میر مبارک محدث نے جس طرح تعلیم حاصل کی تھی جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد" از اول تا آخر ایام اقامت دہلی در خانہ شیخ نورالحق بن شیخ عبدالحق قدس اللہ اسرارہما سکونت ورزیدہ و علم حدیث از آنجناب اخذ کرد"۔

ظاہر ہے کہ خانۂ شیخ نورالحق میں میر صاحب کو کیا جگہ ملی ہوگی، کیا ان کے لیے باتھ روم اور ڈرائنگ روم کا نظم کیا گیا ہوگا، برقی قمقموں سے کمرہ جگمگاتا ہوگا۔ بجلی کے پنکھے سر پر گردش میں ہونگے۔

ان کے لیے سرونٹ، دھوبی، حجام، ریزر، صابن، کنگھا، آئینہ یا بناؤ سنگھار کے دیگر ساز و سامان مہیا کیے گئے ہونگے، توارث کے قانون کو پیشِ نظر رکھ کر پچھلوں کے حال پر اگر اگلوں کا قیاس درست ہو سکتا ہے۔ نیز آئندہ آپ کے سامنے جو مواد پیش ہونگے ان کی بنیاد پر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ خانۂ شیخ نور الحق میں میر مبارک کے لیے چٹائی کے فرش والے تنگ و تاریک حجرے کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ متاخرین علماءِ ہند میں مولانا محمد حسین الٰہ آبادی جو اپنی وفات کی خاص نوعیت کی وجہ سے یعنی بہ مقام اجمیر حالت سماع میں آپ کا انتقال ہوا اس واقعہ کی وجہ سے آپ کی شہرت علمی و دینی خواص سے گذر کر عوام کے دائروں تک پہنچی ہوئی ہے، ان کی سوانح عمری جسے ان کے خلف سعید و حفید رشید مولانا حافظ محمد الفاروقی (فاضلِ مصر) نے حال میں شائع کی ہے۔ اسی کتاب میں مولانا مرحوم کی طالب العلمی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا فاروقی رقمطراز ہیں۔ اس کی تصریح کرتے ہوئے کہ مولانا کے والد کی مالی حالت اچھی تھی اس لیے مصارف کافی ملتے تھے مگر والد کے بھیجے ہوئے روپیے کتب فروشوں کے نذر ہو جاتے اور خود طالب علمی کی پوری زندگی لکھنؤ میں اُنہوں نے جو گذاری اُس کی تفصیل یہ ہے۔

زنگی محل کے پل کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو مسجد ملا مبین کے نام سے مشہور ہے اس مسجد میں ایک حجرہ ہے جو اتنا تنگ ہے کہ اس میں تین چار آدمی مشکل سے لیٹ سکتے ہیں جس کے دروازہ سے صرف چند گز کے فاصلہ پر پاخانہ بنا ہوا ہے۔ اس کی کافی بدبو حجرہ میں آتی ہے مسجد کے دروازہ پر ایک سائبان ہے جہاں نصف شب تک کباب والوں کی دکان کے چولھے کا دھواں بھرا رہتا ہے۔ اس مسجد کی موجودہ حالت یہ ہے لیکن میں نے اپنے اساتذہ سے سُنا کہ مولانا مرحوم (مولانا محمد حسین) کی طالب العلمی کے زمانہ میں اس سے بھی کم راحت کے سامان کے ساتھ وہاں تھے اسی مسجد میں آپ نے طالب العلمی کا پورا زمانہ بسر فرمایا۔ (ص ۹ (انوار المحمدیہ))

لیکن کیا طالب العلمی کی اس زندگی کا اثر آئندہ زندگی پر بھی مرتب ہوتا تھا؟ عجب لوگ ہیں جن

چیزوں کو انسان کی فطرت خود چاہتی ہے بنگلوں اور محلوں میں کون نہیں رہنا چاہتا۔ موقعہ ملے تو باغ و چمن کی لذت گیریوں سے عموماً کون گریز کرتا ہے لیکن خدا جانے لوگوں کو اس زمانہ میں اس کا وسوسہ کیوں ہوتا ہے کہ اگر طلباء کو سادہ زندگی کا عادی بنا دیا جائیگا تو آئندہ رنگین زندگی کی ہوس ان کے اندر سے نکل جائیگی۔ فرض کیجیے کہ اس قسم کی خواہش اگر نکل بھی جائے تو اس میں انسانیت کا کیا نقصان ہے۔ تکلف کی زندگی سے تو سادہ زندگی بہرحال اگر باہر نہیں تو اندر کو مسرور رکھنے میں گونہ ممد ہوتی ہے۔

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں مشہور محدث علامہ محمد بن نصر مروزی کے ترجمہ میں ایک دلچسپ بات لکھی ہے اگرچہ اس قصہ کا تعلق ہندوستان سے نہیں ہے لیکن تعلیمی زندگی سے تو اس کا بہرحال ضرور تعلق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کا ذکر یہاں کر دیا جائے۔

الخطیب لکھتے ہیں کہ محدث مروزی نے جب درس حدیث کا حلقہ قائم کیا اور ملک میں ان کے درس کا چرچا ہوا، جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا ابھی میر مبارک محدث کے قصہ میں گذرا کہ خدا نے میر صاحب کی خدمت کے لیے نواب مکرم خان کو آمادہ کر دیا تھا۔ محدث مروزی کے ساتھ ایک نہیں متعدد امراء کا یہ سلوک تھا یعنی۔

کان لہ من اسمٰعیل بن احمد والی خراسان	خراسان کے گورنر اسمٰعیل بن احمد سالانہ چار ہزار
یصلہ فی کل سنۃ باربعۃ آلاف درھم	درہم اور اسمٰعیل کے بھائی اسحٰق بھی چار ہزار
ویصلہ اخوہ اسحٰق باربعۃ آلاف درھم	سمرقند کے باشندے بھی چار ہزار درہم سالانہ
ویصلہ اھل سمرقند باربعۃ آلاف درھم	کے ساتھ محمد بن نصر مروزی کی خدمت کرتے تھے۔

لیکن بارہ ہزار کی مستقل سالانہ آمدنی کے باوجود محدث موصوف اتنے شاہ خرچ فراخ چشم واقع ہوئے تھے کہ آخر سال تک ان کے پاس ایک کوڑی بھی باقی نہیں رہتی تھی کہنے والوں نے علامہ سے ایک

دن کہا کہ۔

لوجمعت منہا لنا ثبتہ کیا اچھا ہوتا کسی آڑے وقت کے لیے اس آمدنی سے آپ کچھ پس انداز کیا کریں۔

جواب میں اُنھوں نے جو بات کہی تھی اُسی کا نقل کرنا مقصود ہے۔ فرمایا

یا سبحان اللہ انا بقیت بمصر	واہ سبحان اللہ میں مصر میں اتنے اتنے سال تک رہا (یعنی طالب
کذا وکذا سنتہ فکان قوتی و	العلمی کہتے رہے) اس زمانہ میں میری خوراک میرے کپڑے میرے
ثیابی وکاغذی وحبری و	کاغذ میری روشنائی اور جو کچھ بھی میرے مصارف سال بھر میں
جمیع ما انفق علی نفسی فی	ہوتے تھے کل بیس درم سب کے لیے کافی ہوتے تھے۔ پھر کیا
السنتہ عشرین درھما افترے	تم خیال کرتے ہو کہ اگر یہ بارہ ہزار سالانہ کی آمدنی جاتی بھی رہے
ان ذھب ھذا لایبقی ذلک	تو بیس درہم کی سالانہ آمدنی بھی باقی نہ رہیگی۔ (الخطیب ص۱۳ ج۲)

ایک حکیمانہ بات ہے جو محدث نے فرمائی، آدمی جب کم خرچ کی زندگی کا کسی زمانہ میں عادی ہوتا ہے پھر اگر خدا اُسے کسی وقت زیادہ بھی دے تو اس سے نفع اُٹھانے یا دوسروں کو نفع پہنچانے میں وہ تنگی نہیں محسوس کرتا۔ بقول مروزی جس نے بیس درم سالانہ کے اندر مصر میں برسوں گزارا ہو اُس کی نگاہ میں بارہ ہزار سالانہ کی کیا وقعت ہوسکتی ہے۔ ہوا تو خرچ کیا ورنہ بیس درم والی زندگی کا تجربہ تو موجود ہی ہے۔ پھر اُسی حالت کی طرف واپس ہونے میں اُس کو خوف وخطر کیوں محسوس ہوگا جو اُن لوگوں کو ہوسکتا ہے جنھیں بیس درم والی زندگی سے کبھی سابقہ ہی نہ پڑا ہو۔ بہر حال ہندوستان کے باہر ہو یا اندر مسلمانوں نے اپنی تعلیم کی بنیاد اُسی پر قائم کی تھی۔ طالب العلمی کے زمانہ میں خواہ مخواہ ایٹی کیٹ آموزی، صفائی اور خدا جانے کن کن ناموں کا پردہ ڈال کر آج طلبا کو جن تنعمات لایعنی کا عادی بنایا جاتا ہے، ہمارے اسلاف اس کو بالکل غیر ضروری سمجھتے تھے۔

تعلیم کے ایام تعلیم کے لیے ہیں نہ کہ بننے اور سنورنے، نوعروسی اور دولہا بننے کی مشق کا وہ

کوئی عہد ہے۔ باقی وہ وسوسہ کہ جو آج خرچ کا عادی نہیں بنایا جائیگا کل اس کے سینے میں وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ آج جسے صفائی اور ستھرائی زیبائش و آرائش کی مشق نہ کرائی جائیگی تو کل بھی اپنے آپ کو وہ صاف ستھرا نہ رکھ سکیگا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ اس کا کیا جواب دے رہی ہے۔ بیس درم سالانہ سے زیادہ جس بیچارہ کو سالہا سال تک خرچ کرنے کا موقع نہ ملا ہو وہ کتنی سیر چشمی سے بارہ ہزار سالانہ کو صرف کر رہا ہے۔ یہی میر مبارک محدث ہیں، ان کے مصارف کا حال بھی آپ پڑھ چکے، اب ان کی صفائی و پاکیزگی نظافت و لطافت کا حال بھی مولانا غلام علی کی عینی شہادت کی بموجب سن لیجیے۔ کہاں تو ایک زمانہ دلی میں گذرا کہ صرف شیخ نور الحق کے مکان کا ایک تنگ و تاریک حجرہ میر صاحب کے لیے کافی تھا لیکن جب عملی زندگی میں انہوں نے قدم رکھا بلگرام میں ان پر خدا نے فتوحات کے دروازے کھولے تو مولانا آزاد کا بیان ہے "معاش بوضع صفا و نزاکت می کرد"۔ صفا ہی نہیں بلکہ اس میں نزاکت بھی شریک تھی کیسی نزاکت انہی سے تفصیل سنیے، فرماتے ہیں "نشست گاہ خاص پیش مسجد چناں مصفا و پاکیزہ می داشت کہ نمونۂ سینۂ صاف دلاں دیدۂ پاک جیاں باید گفت"

حضرت آزاد پر میر صاحب کی اس صاف ستھری دھلی دھلائی اور اجلی زندگی کا اتنا اثر تھا، کہ بے اختیار اس واقعہ کی تحریر کے وقت میر صاحب کی اس خصوصیت کا نقشہ نگاہوں میں پھر جاتا ہے اور اپنے ایک شعر کا محمل ان ہی کی اس پاک زندگی کو قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں کہ گویا راقم الحروف (آزاد) ایں بیت را از زبانِ میر گفتہ ؎

حباب خوش منشم می زیم بہ وضع و صفا — ز آب صرف بنا کردہ اند منزل من

آج خبر سے آنکھیں بند کر کے مبتداہی میں جو الجھے ہوئے ہیں یا دوسروں کو الجھا رہے ہیں، ناعاقبت اندیشوں کے اس طبقہ کو کون سمجھا سکتا ہے کہ عنفوانِ شباب میں مشقتوں صعوبتوں کو بہرحال آدمی جھیل لیتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ شباب کی ان ہی گرمیوں کے بعد آئندہ زندگی کی سردیوں اور سہولتوں کا صحیح

لطف حاصل ہوتا ہے۔ سرگرم و چشیدہ زندگی اپنے اندر جو پختگی رکھتی ہے بیرت و کردار کی پاستواری ان لوگوں میں تلاش کرنا فضول ہے جن کی پوری زندگی سرد ماحول میں گزری ہو۔

لیکن آج گنگا الٹی بہائی جا رہی ہے مشقت و صعوبت تحمل و برداشت کے جو دن ہیں ان کو عوام کے چندوں پر نوابوں اور راجواڑوں کی خیراتی امدادوں کے بل بوتے پر ان محلوں پر گزارا اور گزروایا جاتا ہے، جو نعمتوں اور سہولتوں کے پھولوں سے لدی ہوئی ہیں اور اس قسم کے مسرفانہ غیر ضروری مصارف کی عادی زندگی کی پیاس پیدا کرکے نوجوانوں کو جب ان کی نوجوانی ختم ہونے کو آتی ہے دارالاقاموں کی چند سالہ بہشت سے کشمکش حیات کی اس وادی پرخار، بلکہ وادی نار کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے جس میں سو پیاسوں میں سے بمشکل دس ہیں تشنہ کامان ملازمت و امیدواران خدمت کی سیرابی کی ایک حد تک گونہ صورت نکل سکتی ہے لیکن نوے فیصدی بیچارے اسی جہنم کے شعلوں میں جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں جن کا بجھانے والا اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں نہ حکومت ان بہشتی ڈگریوں کی خریدار اور نہ پبلک ان معاشی اجارہ داروں کی علاج کار۔

خسر الدنیا والآخرۃ ذلک ھو الخسران المبین۔ برباد ہوئی دنیا اور الآخرت کی زندگی اور یہی ہے کھلا ہوا خسارہ۔

پیاس بھوک غیر فطری پیاس پیدا کرنے والے بے سوچے سمجھے بھوک میں بھوک، پیاس میں پیاس کا اضافہ کرتے چلے جا رہے ہیں لیکن ان میں کوئی نہیں جو یہ سوچتا ہو کہ ان بھوکوں کو روٹی اور ان پیاسوں کو پانی یعنی وہی روٹی وہی پانی جس کی صورت ایک دفعہ ان شاہی اقامت خانوں میں دکھا دی جاتی ہے۔ اور ایک دفعہ دکھا کر پھر اسی کے دیکھنے کی تمنا، وہی اگر نہ ملی تو پھر اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔

تعلیم سے جن کے دماغوں کو بگاڑا جا رہا ہے، تنور و وسعت نظر کا وعدہ کرکے باپوں سے جو

پیچھے چھینے گئے تھے اب ان کے متعلق شکایت ہے کہ وہ سرکاری محکموں میں چھچھوری حرکتیں کرتے ہیں رشوتیں لیتے ہیں، چوریاں کرتے ہیں، فریب و مکر سے حکومت کے خزانوں پر ایک طرف اور پبلک کی جیبوں پر دوسری طرف علانیہ ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ علم کی ڈگریوں، فضیلت کے طیلسانوں کے مالک ہونے کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ان سے ایسے دنی اور سفیہانہ افعال صادر ہوتے ہیں۔

اور یہ حال توان کا ہے، جنہیں کسی نہ کسی طرح حکومت نے نوکری کی ٹینوں کے پیچھے چھپنے کا موقعہ دے دیا، لیکن جو سکین ان سرفرازیوں سے محروم ہیں وہ پھانسیوں میں لٹک رہے ہیں، اپنے آپ کو شوٹ کر رہے ہیں یا مفسدوں اور انارکسٹوں کی جماعت میں شریک ہو رہے ہیں ناواقف پبلک کے جذبات میں اشتعال پیدا کر کے ملک کے امن وامان کو غارت کر رہے ہیں، فردوسی ازلا فانوں سے نکالی ہوئی آدم کی تعلیم یافتہ اولاد پر ہر طرف نفرے کسے جا رہے ہیں۔ طنز اور طعنوں کے تیروں سے بیچاروں کے دل وجگر کو چھلنی بنا دیا گیا ہے لیکن یہ قصور کس کا ہے خود اُن پیاسوں کا؟ یا مصنوعی غیر ضروری پیاس پیدا کرانے والوں کا، ولوج سے پہلے خروج اور آمد سے پہلے رفت کی راہوں سے جو بے پروائی برتتے ہیں اُن کا انجام آج کیا ہمیشہ یہی ہوا ہے، یہی ہوگا، متقین کے سوا حسن اتفاق کے جیتنے میں آخر کون کامیاب ہوا ہے۔

ہمیں نہ سکھایا گیا تھا اور اس راہ میں قدم رکھتے وقت ہی پکارنے والے پکار رہے تھے۔

بقدر الکد تکتسب المعالی ومن طلب العلا سھر اللیالی

(بڑائیاں اور فضیلتیں مشقت کے حساب سے تقسیم ہوتی ہیں، جو بلندی و برتری کا طالب ہے اُسے راتوں کو جاگنا پڑیگا) (کتاب تعلیم المتعلم)

سمجھا دیا گیا تھا کہ ؎ درره منزلِ جاناں کہ خطرہاست بجاں ؛ شرط اول قدم این است کہ مجنوں باشی۔
جتا دیا گیا تھا ؎ جس کو ہو جان و دل عزیز، میری گلی میں آئے کیوں! اور ابھی کا نتیجہ تھا کہ منزل جاناں کے

راہروؤں کے سامنے آخر زندگی تک جو کچھ بھی پیش آتا تھا۔ زیادہ تر وہی ہوتا تھا جس کی پیش بینی پہلے ہی سے حاصل ہو چکی تھی۔ تکلیف تو ہمیشہ خلاف توقع حادثوں سے ہوتی ہے، لیکن جس کے سامنے وہی حوادث پیش ہوں جن کا اسے منتظر بنایا گیا ہو وہ کیوں گھبرائیگا، کیوں کڑھیگا؟[1]

کہا جاتا ہے۔ ان کی طرف سے کہا جاتا ہے جن کے اندر تو نہیں باہر بھی اپنا کچھ باقی نہیں ہے، چہرے سے، پیشانی سے، گریبانوں سے، ٹانگوں سے الغرض ہر اس جگہ سے جہاں سے

---

[1] یہاں ایک دلچسپ نفسیاتی لطیفہ کا ذکر غالباً بے محل نہ ہوگا۔ محقق طوسی کی رسائی جب ہولاکو خاں تاتاری بادشاہ کے دربار تک ہوئی تو ایک رصد خانہ کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا۔ ہولاکو خاں سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ کیا خرچ ہوگا اس نے پوچھا۔ طوسی نے کروڑوں کا حساب بتایا۔ ہولاکو خاں بیچارا جاہل سردار علم کی اس کی نگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی تھی، مصارف کا حال سن کر اس نے کہا کہ اتنے روپیے برباد کرنے کا کیا حاصل؟ طوسی بڑے جز بز ہوئے جاہل کے دل میں ہیئت و نجوم کے مسائل کی وقعت کیسے بٹھائی جائے۔ سوچ کر کہا کہ ستاروں کا حال اس رصد خانہ سے معلوم ہو سکتا ہے جس سے آئندہ واقعات کے متعلق صحیح پیشین گوئیوں میں مدد ملتی ہے۔ ہولاکو نے کہا کہ بالفرض کسی جنگ میں مجھے شکست ہونے والی ہو، اور نجوم کے ذریعہ سے اس کا علم قبل از وقت حاصل ہو جائے تو کیا یہ ممکن ہوگا کہ ہم اس شکست کو فتح سے بدلنے کی کوئی صورت نکالیں۔ طوسی نے کہا کہ یہ کس کے بس کی بات ہے، جو واقعہ ہونے والا ہے وہ تو بہر حال ہو کر رہتا ہے۔ ہلاکو خاں نے کہا۔ پھر اس پیشین گوئی کا کیا فائدہ؟ محقق طوسی کے لیے یہ سوال بڑا سخت تھا۔ لیکن دل میں ایک بات آئی۔ بولے، آپ ایک طشت لے کر کسی کو چھت پر حکم دے کر بھیجیے کہ جس وقت صحن میں اپنے درباریوں کے ساتھ آپ بیٹھے ہوں، وہ زور سے اس طشت کو چھت سے نیچے گرا دے۔ آپ یہ کر دیجیے، تب جواب عرض کروں گا۔ ہولاکو خاں نے یہی کیا۔ طشت کے گرنے کا حال چونکہ ہولاکو خاں اور طوسی کو معلوم تھا اس لیے یہ دونوں جہاں تھے وہیں بیٹھے رہے، لیکن دربار کے دوسرے آدمی جو اس سے قطعاً ناواقف تھے طشت کے اچانک اس طرح زمین پر گرنے سے ان میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ کوئی ادھر بھاگا، کوئی ادھر، کسی نے کچھ خیال کیا، کسی نے کچھ۔ الغرض طوفان بدتمیزی پیدا ہو گیا۔ طوسی نے ہولاکو کو خطاب کر کے اب پوچھا۔ فرمائیے ہم اور آپ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں۔ لیکن دوسرے بدحواس ہو ہو کر ادھر ادھر کیوں بھاگے؟ ہولاکو نے کہا کہ ہم دونوں طشت کے گرنے سے واقف تھے، ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ بس نجوم سے آئندہ واقعات کا علم جن لوگوں کو حاصل ہو جاتا ہے وہ واقعات کو ٹال تو نہیں سکتے لیکن اپنی جگہ اسی طرح مطمئن (بقیہ بر صفحہ ۲۰)

امکان تھا اپنی خودی کو پونچھ پونچھ کر دوسروں کو بھر گیا ہے چپکا یا گیا ہے۔ ان ہی کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ اقامت خانوں کی موجودہ عصری زندگی میں خودداری (سلف ریسپکٹ) کی تعلیم دیجاتی ہے اور طلبہ کی اقامت کے قدیم طریقوں میں خودی اور خودداری مجروح ہوتی تھی۔

جس کی غیروں ہی فانی زندگی اپنے دعوے کی خود تردید کر رہی ہو، میں اس پر روٹے تو کی دروغ بیانیوں کا کیا جواب دے سکتا ہوں، لیکن ان ہی میر مبارک محدث رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے، یعنی وہی جس کے طلب علم کی زندگی دادھر کے گھر اور دوسرے کے باورچی خانہ کی روٹیوں پر گذری تھی، ان ہی میر مبارک محدث کی مجلس میں لکھنو کا گورنر (حاکم) غیرت خاں آتا ہے: مولانا آزاد فرماتے ہیں "غیرت خاں حاکم لکھنؤ بہ ادراک شرف خدمت آمد" مگر جس لباس میں آتا ہے میر صاحب کے نزدیک مسلمان کی خودی پر اس سے چوٹ پڑتی تھی، وہ بلگرام میں ہے اور اسی بلگرام کے دارالخلافہ لکھنؤ کا وہ حاکم ہے مولانا فرماتے ہیں۔ "خان پاچہ زیر جامہ دراز شکن دار" نامشروع" پوشیدہ"

کوٹ اور پتلون کے اس عہد میں اب کون سمجھ سکتا ہے کہ یہ زیر جامہ کیا بلا تھی، اور اس کا پائچہ کیا تھا" دراز شکن" کی اصطلاح کا کیا مطلب ہے۔ تاہم آخری لفظ" نامشروع" سے وہی بات معلوم ہوتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم کی خودی کی تعمیر جن ظاہری اور باطنی عناصر سے فرمائی تھی ان میں سے کوئی عنصر غائب تھا اور بجائے اس کے کوئی اجنبی جز اس میں شریک ہو گیا تھا، میر مبارک محدث اپنے صوبہ کی سب سے بڑی اقتداری طاقت کو اس حال میں پاتے ہیں، خاموشی کو ایمانی ضعف کی دلیل خیال کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں کہ غیرت خاں کے اس" نامشروع" لباس

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۰) رہتے ہیں جیسے شکست کرنے کے وقت ہم اور آپ مطمئن رہے۔ طوسی نے رصد خانہ کی ضرورت اس تدبیر سے ہولاکو خاں کی ذہن نشین کی۔ ہولاکو کے دل کو بھی بات لگ گئی۔ رصد خانہ کی منظوری اس نے دیدی۔
(فوات الوفیات)

پر "میر اعتراض کرد"

آگے کے واقعہ کا تعلق میر سے نہیں بلکہ غیرت خاں کی غیور فطرت کی حیرت انگیز جسارت سے ہے، کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ "میر اعتراض کرد" کے جواب میں غیرت خاں نے تلوار کھینچ لی تھی اور میر کا سر مبارک جسد سے جدا ہو کر زمین پر پڑا ہوا تھا، یا یہ نہیں تو کم از کم میر پر "تنگ نظری، کوتاہ خیالی کا الزام لگا کر ان کے اعتراض کو قہقہوں میں غیرت خاں کی بے غیرتی نے اڑا دیا تھا۔ آج مسلمانوں کے ان سادہ رخوں، سادہ دلوں کو کون سمجھائے جنہیں باور کرایا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ مسکینوں، عقل کے ان مسکینوں نے باور بھی کر لیا ہے کہ ہر وہ بات جس میں ان کی "خودی" کی ضمانت مستور ہے نہ ہی چھوٹی بات اور نا قابل لحاظ ہے، بلکہ لحاظ کرنے والا ہی تنگ سینہ، تنگ چشم، تنگ دل، مذہبی مجنون، مبتلائے "فینٹی سیزم" ہے، رجعت کا شکار ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہے صرف اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمیں خود اپنے آپ سے چھین لیا گیا ہے، اب ہم خود نہیں ہیں بلکہ وہی ہیں جو کچھ ہمیں دوسرے رکھنا اور بنانا چاہیں، کہنے والے نے کہا تھا اور سچ کہا تھا۔

ان ہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی
ان ہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی

یہی افتاد ہے جس میں ہم گرفتار ہیں اور مولانا آزاد جس زمانہ کا قصہ سُنا رہے ہیں، گو وہ زیادہ دن کی بات نہیں ہے اور کسی دوسرے ملک کی نہیں اسی دیارِ مرحوم کی تھی، جس کے ہم بھی کبھی شہریار تھے، جب غیر تو ہمیں کیا چھینتے، ان ہی کو ان سے چھین کر اپنی خودی ان میں ہم ہی بھر رہے تھے، ہم دوسروں میں کیا جذب ہوتے دوسرے ہم میں منجذب ہونے کو اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھتے تھے۔ غیرت خاں کی غیرت بھی اسی عہد خودی کی پیداوار تھی جس میں مسلمان باطن میں ہو یا ظاہر میں

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی اور ان کی شریعت غرا کے سوا اپنے اندر کسی اور چیز کا پانا برداشت نہیں کرسکتا تھا، غلطی سے اگر کوئی اجنبی کانٹا کسی وجہ سے چبھ بھی جاتا تھا تو اولاً خود ہی اُس کی چبھن محسوس کرتا تھا۔ ورنہ کسی معمولی تنبیہ سے ہوش میں آجاتا تھا، اور جہاں سے ہٹا تھا، بعجلت ممکنہ کانٹے کو نکال کر اسلامی توازن کے کانٹے کو سیدھا کرلیتا تھا۔ غیرت خاں کو میر مبارک نے چونکا دیا، وہ چونک گیا اور کیسی چونک مولانا آزاد راوی ہیں "غیرت خاں احتساب میرا قبول کرو" اور صرف قبول کرو ہی نہیں بلکہ" ہماں وقت پائچہ را بہ دست خود قطع کرد"

چھوٹی بات تھی لیکن سامنے ہیں، پر اس چھوٹی بات کے پیچھے اسلامی غیرت کی جو بڑی آگ چھپی ہوئی تھی، کیا غیرت خاں کے بس میں تھا کہ اس کی تپش کے بھڑک اٹھنے کے بعد سینہ سے لئے لگائے رکھتا مولانا آزاد کا بیان ہے کہ اٹھنے سے پہلے اس اجنبی غیر اسلامی کانٹے کو بھسم کرکے اس نے رکھ دیا۔

اور یہ ہیں اس راہ کے نقوش پا کی دلچسپ کیسی یا دل سوز شوخیاں، جن پر ابھی ابھی اسی ملک میں اسی آسمان کے نیچے، اسی زمین پر کل ڈیڑھ دو صدی پہلے گزرنے والے گزر رہے تھے، تماشا اور عجب تماشا تھا پر

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

وہی راستہ ہے، ان ہی گزرنے والوں سے نکلنے والے اب بھی گزر رہے ہیں، مگر کس حال میں لیٹ رہے ہیں، لٹتے جارہے ہیں، کھو رہے ہیں اور کھوتے جارہے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ لٹنے والوں کو یقین دلایا جارہا ہے کہ تم ہی لوٹ رہے ہو، کھونے والوں کو سمجھایا جارہا ہے کہ تم ہی پا رہے ہو، اف! متاع کارواں کی تاراجی شاید اتنی جاں گسل نہ ہوتی اگر تاراجی کے احساس کو بھی غارتگرِ تاراج نہ کرتے، لیکن متاع بھی لٹ گئی، لٹ رہی ہے اور متاع عزیز کے لٹنے کا جو احساس تھا

وہ بھی لوٹ لیا گیا، پہلی صورت میں تو لوٹنے کی اُمید بھی، لیکن اس لوٹ کو لوٹ سے کون بدل سکتا ہے۔ آخر "ہرکس کہ نداند و بداند کہ بداند، درجہلِ مرکب ابدالدہر بماند"۔ انسانی فطرت کا پارینہ دستور ہے الا ان باقی اللہ بامرہ۔

غیرت خاں کے اس واقعہ سے جہاں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقامت خانوں کے قدیم جاگیری و مسجدی نظاموں کی بے خودی میں جس ناقابلِ تسخیر خودی کی پرورش ہوتی تھی وہ کتنی عجیب طاقت تھی کہ ہر اس قوت سے وہ ٹکرانے کے لیے تیار رہتی تھی جس سے اسلامی خودی پر زد پڑتی تھی۔ وہیں اس کا پتہ چلتا ہے کہ میر مبارک محدث کے متعلق مولانا آزاد نے جو یہ سُنایا تھا کہ نواب مکرم خاں عالمگیری امیر شیخ میر کے صاحبزادے میر صاحب کے ساتھ "اعتقادِ عظیم داشت و خدمات شائستہ بہ تقدیم رسانید"

ان خدمات شائستہ کی نوعیت کیا ہوتی تھی، خدمت کرنے والے خدمت کرتے تھے یا ان سے خدمت لے کر خدمت کرنے والوں کو ممنون کیا جاتا تھا۔ اپنے صوبہ کے مطلق العنان مغل گورنر کے سامنے جس کی زبان نہیں رُکتی تھی، وہ نہیں دیتا تھا ظاہر ہے کہ اس کے مناسب حال دوسری ہی صورت ہو سکتی ہے اور مولانا آزاد کے الفاظ "اعتقادِ عظیم داشت" سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے آہ کہ آج کون باور کر سکتا ہے اور کون باور کرا سکتا ہے، کہ علم و دین کے جن نمائندوں کو "املاق" یا معاشی مشکلات کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں، چند دن پیشتر وہی ہر اُس شخص کو دھمکی دیتے تھے جسے معاشی فراغبالیوں پر ناز تھا، اُف، دُنیا میں ہمیشہ دینے والے مُحسن سمجھے جاتے ہیں لیکن اس دُنیا نے مدتوں یہ تماشا دیکھا ہے کہ محسنیت کا مقام ان ہی کو حاصل تھا، جو کسی سے خدمت لے کر اس کو اپنا احسانمند بناتے تھے اور

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا   آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

خیر درد کی یہ داستان طویل ہے، ذکر تو ہندوستان کے قدیم تعلیمی نظام کا تھا اور آپ نے دیکھا کہ کالج بلڈنگ بورڈنگ لاجنگ کے تمام مشکلات کو کتنی آسانیوں کے ساتھ حل کیا گیا تھا۔ (مجلہ دارالعلوم کی نیت سے جو مضمون لکھا گیا تھا وہ بس یہاں ختم ہو گیا آگے اب وہ اضافہ ہے جس نے اس مضمون کو کتاب بنا دیا)

فراہمی کتب

اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ سوال کتابوں کی فراہمی کا بھی ہے، مطابع اور پریس کے اس زمانہ میں کچھ ایسا خیال پھیلا ہوا ہے کہ ایک تو یوں ہی اُس زمانہ میں کتابوں کا مسئلہ پیچیدہ تھا خصوصاً ہندوستان کی تہی دامانی اور افلاس کے جو افسانے اس زمانے میں بیان کیے جاتے ہیں ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں اس کی حالت سب سے زیادہ زبوں اور قابل رحم تھی، کسی صاحب کو کسی جگہ یہ واقعہ مل گیا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ جب اپنی تفسیر فارسی فتح العزیز لکھنے بیٹھے تو امام رازی کی مشہور تفسیر کبیر بھی اُنہیں ہم دست نہ ہو سکی، بہ مشکل قلعہ معلّٰی کے شاہی کتب خانہ سے چند دن کے لیے عاریۃً ان کو یہ کتاب ملی تھی۔

---

[1] اس موقعہ پر ایک واقعہ یاد آگیا، جسے فقیر نے براہ راست اپنے محسن کریم و مربی عظیم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست سُنا تھا۔ فرماتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں مدت تک وہی جاگیری اور مسجدی نظام اقامت طلبہ کا جاری تھا، لیکن زمانہ اور ضرورت دونوں کے مطالبوں سے تنگ آکر ارباب مدرسہ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سرپرست مدرسہ کی خدمت میں مطبخ کے جدید نظام کو استمزاجاً پیش کیا، حضرت نے فرمایا کہ دل کی پوچھتے ہو تو میرے نزدیک ایام طلب کے ان چند دنوں میں طلبہ علم کا دوسروں کے در پر جاکر کھانا دوسروں کے گھر پل میں رہنا اپنے اندر ایک بڑے اصلاحی راز کو پوشیدہ رکھتا ہے فرمایا کہ علم بہرحال [illegible] بلندی [illegible] اپنی حیثیت [illegible] سے عطا ہی کیا جاتا ہے عوام پر اتنا زیر بار ہی بہی وقت ہوتا ہے جب ہنگام طلب کی خواریاں بیداری اور تنبیہ کا کام دیتی ہیں، عوام [illegible] [illegible] ہاتھ چومنے کے لیے ٹوٹتا ہے [illegible] مولوی کا یہ خیال کہ [illegible] دن پہلے گلیوں کی ٹھوکریں [illegible] کی جھڑکیاں کھاتا پھرتا تھا [illegible] کو ہے [illegible] سے باز رکھتی ہیں، مرض کے علاج کا کام دیتی ہیں مولانا گنگوہی نے اس کے بعد فرمایا کہ یہ میرا ذاتی مذاق ہے [illegible] مطبخ کا [illegible] دارالعلوم کا موقوف

ممکن ہے کہ خاص کر تفسیر کبیر کے متعلق کوئی ایسی خاص صورت شاہ صاحب کو پیش آگئی ہو، لیکن اس جزئی واقعہ کو کلیہ بنالینا، اور اسی بنیاد پر ہندوستان کے کتابی افلاس کا فیصلہ کردینا بالکل عجیب ہے۔ آخر کسی تاریخ میں اگر یہ جزئی واقعہ کسی کو ملا ہے تو کیا تاریخ ہی کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا نہ تھا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان تھا۔

علمے دیدام و یادہم بقدر خود دارم یک صد و پنجاہ علم است (ملفوظات عزیزیہ ص ۳۶) یعنی جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور ان کو یاد بھی رکھتا ہوں اُنکی تعداد ڈیڑھ سو ہے

اگر حضرت شاہ صاحب کی طرف اس واقعہ کا انتساب صحیح ہے تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ اتنے علوم کیا کتابی سرمایہ کے بغیر حاصل ہوسکتے ہیں[1]۔ خود حضرت شاہ عبدالعزیز کی کتابیں، تحفہ، بستان ان کے فتاوی، مولانا اسمٰعیل شہید کی عبقات، اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات بالخصوص علی الخصوص ازالہ، حجۃ، انصاف کیا ان کتابوں کے مطالعہ کے بعد ایک لمحہ کے لیے اس جزئیہ سے جو کلیہ بنایا گیا ہے کوئی اُس کی تصدیق کرسکتا ہے۔ شاہ صاحب اپنی کتابوں میں ابن حزم، ابن تیمیہ اور اُن سے پیشتر کے بزرگوں کے اقوال براہ راست ان کی کتابوں سے جو نقل فرماتے ہیں قدیم فقہا، امام ابو یوسف، امام شافعی وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کی کتابوں کے حوالے دیتے چلے جاتے ہیں، حدیث کے جن نایاب متون سے آثار و احادیث نقل فرماتے ہیں اُن کو دیکھ کر تو شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ طباعت کے عام رواج کے باوجود آج بھی ہندوستان میں ان کتابوں میں سے بعضوں کا ملنا دشوار ہے جن پر شاہ صاحب اور ان جیسے علما کو دسترس حاصل تھی، مجھے خیال آتا ہے کہ ریاست ٹونک کے ایک امیر مرحوم عبدالرحیم خاں کے کتب خانہ میں مصنف عبدالرزاق

---

[1] افسوس کہ باوجود تلاش کے مجھے ایک چیز نہیں ملی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ شاہ عبدالعزیز کے کتب خانہ میں پندرہ بیس ہزار کتابیں تھیں شاہ صاحب نے ان سب کا مطالعہ کیا تھا لیکن اس وقت حوالہ یاد نہ رہا۔ علوم کے بالا تر اعداد پر متحیر نہ ہونا چاہیے کیونکہ مسلمانوں نے علوم کی فروعی تقسیموں کو بہت پھیلا دیا تھا، صرف حدیث متعلقات حدیث ہی کی تعداد اسّی سے متجاوز ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

(متن حدیث کی نادر معتبر کتاب) کے ایک نسخہ کی نقل عرب سے خرید کرائی تھی، اُس وقت کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ عرب میں مصنّف کا جو نسخہ ملا تھا وہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کتب خانہ ہی سے منتقل ہو کر عرب پہنچا تھا، غالباً شاہ صاحب کی مہر یا دوسرے علامات اس پر موجود تھے[1] حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی جنہیں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ بیہقی الہند کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے ان کی تفسیر مظہری جس نے دیکھی ہے، خصوصاً حدیث کے متون کا تذکرہ جس طریقہ سے اس میں کیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری کتابیں ان کے پاس تھیں۔

عالمگیری عہد کے مشہور عالم ملا محب[2] اللہ بہاری صاحب سلم و مسلّم کی کتاب مسلّم الثبوت

---

[1] تذکرۂ رحمانیہ جو محدث پانی پتی حضرت قاری عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ہے اس میں لکھا ہے کہ انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد جب حضرت شاہ اسحٰق صاحب اور ان کے بھائی شاہ یعقوب دونوں ہجرت کی نیت سے عرب روانہ ہونے لگے، تو کتب خانہ حضرت شاہ صاحب (شاہ اسحٰق رح) نے بوقت ہجرت اپنے ساتھ لیا اس کا وزن نو من تھا، اس کے علاوہ جیسا ذخیرہ باقی رہا اس کے متعلق مجھے (قاری عبدالرحمٰن پانی پتی رح) اور نواب قطب الدین خاں صاحب کو حکم دیا کہ یہ سب نیلام کر دیا جائے، چنانچہ ہم دونوں نے یہ خدمت انجام دی" ص ۱۵ - یہ روایت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے حوالے سے منقول ہے جس سے معلوم ہوا کہ شاہ ولی اللہ کے کتب خانہ کا ایک حصّہ عرب منتقل ہوا مصنف عبدالرزاق غالباً اسی ذریعہ سے مدینہ منورہ پہنچا۔

[2] جن اسماء واعلام کا ذکر مری اس کتاب میں آیا ہے اگر سب پر تشریحی نوٹ دینے کا التزام کیا جاتا تو کتاب خدا جانے کتنی ضخیم ہو جاتی۔ مگر بعض خاص معلومات کا جن سے تعلق ہے دل ان کے چھوڑنے پر بھی آمادہ نہیں۔ یہ مُلا محب اللہ جو اپنی نسبت بہاری سے ظاہر ہے کہ بہار سے تعلق رکھتے ہیں مولانا آزاد نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ کڑا نامی گاؤں جو محب علی پور پرگنہ سے صوبۂ بہار میں تعلق رکھتا ہے پیدا ہوئے اور بہار کی ایک شریف قوم ملک جس کی اس زمانہ میں بھی اس صوبہ میں معقول تعداد ہے، اور دینی و دنیوی ہر حیثیت سے مسلمانوں میں امتیاز رکھتی ہے، نہ صرف قدیم بلکہ جدید تعلیم یافتوں کا ایک بڑا طبقہ بہار میں ملک ہی قوم سے تعلق رکھتا ہے اپنی کتاب سلم و مسلم جو بقول مولانا شبلی درس نظامیہ کے نصف نصاب کو اپنے نیچے تقریباً دو سو سال اس نے دبائے رکھا، قاضی حمداللہ، مُلا حسن، مُلا مبین، شرح سلم بحر العلوم یہ نظامیہ درس کی مشہور کتابیں مسلّم ہی سے تعلق رکھتی ہیں (دیکھیے مقالات شبلی مضمون درس نظامیہ) لیکن بظاہر اسی چیز نے مُلا محب اللہ مرحوم کو محسود اقران بنا دیا۔ یوں تو اپنے زمانہ میں دنیاوی حیثیت سے ترقی کی اس آخری نقطہ پر پہنچ کر رہے جو ملاگیری کے پیشہ کرنے والوں کی معراج کمال تھا یعنی شاہ عالم ابن اورنگ زیب (بقیہ برصفحہ ۴۵)

کا جو نسخہ مصر سے شائع ہوا ہے اس کے آخر میں ملا محب اللہ کی ایک خود نوشتہ عجیب یادداشت چھاپ دی گئی ہے، میں بجنسہ ناشر کتاب کے الفاظ کے ساتھ اسے نقل کرتا ہوں، ناشر نے یہ لکھ کر کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴) نے بر سرِ حکومت آنے کے بعد اُن کو بقول مولانا آزاد "صدارت مجموعہ ممالک ہندوستان" کے منصب جمیل پر سرفراز کیا جو ہندوستان میں شیخ الاسلامی کے عہدہ کے مرادف تھا۔ یوں بھی وہ کبھی اودھ (لکھنؤ) اور دکن میں حیدرآباد کے قاضی رہے آخر میں اورنگ زیب نے اپنے پوتے رفیع القدر کی تعلیم کے لیے شاہ عالم گورنر کابل کے ساتھ کابل بھی بھیج دیا تھا اس سے اس زمانہ کے مسلمانوں کی اولوالعزمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ بہار میں پیدا ہوئے شمس آباد (قنوج) میں قطب الدین شمس آبادی سے تعلیم حاصل کی، ابھی لکھنؤ میں ہیں، کل دکن میں پرسوں کابل میں، بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے اسی چیز نے ملا کو محسود اقران بنا دیا اور اُن کو بدنام کرنے کی یہ عجیب کوشش کی گئی کہ کسی صاحب نے منطق میں ایک رسالہ لکھا جس کے تمام مسائل کی عبارتیں ہی نہیں بلکہ سُلّم کا مشہور معرکۃ الآراء دیباچہ سبحانہ ما اعظم شانہ سے لا جلا خطبہ بھی مولانا محمود حسن ٹونکی کی قلمی کتاب معجم المصنفین میں کچھ الفاظ اس کے نقل بھی کیے ہیں۔ الحمد لمن ھو عن الکلیۃ والجزئیۃ تعالیٰ۔ وعن الجنس والفصل تبری فلا یحد فلا یحدیہ نعم بتصل بوجہ یمتاز بہ اور لطیفہ یہ گھڑا کہ مشہور معقولی و کلامی مصنف مرزا جان کی طرف اُس کو منسوب کر دیا مقصد یہ تھا کہ محب اللہ کی کتاب سرقہ ثابت ہو۔ تماشے کی بات یہ ہے کہ ایک ایرانی عالم کی کتاب روضات الجنات جس میں علما کے حالات ہیں خود مرزا جان اور اُنکے معاصر ابوالحسن اسکافی کے متعلق لکھا ہے کان منتحلان من کثیر الکتب الغیر المتداولۃ ص۵۶۶ یعنی یہ دونوں غیر مشہور کتابوں سے چرایا کرتے تھے (لکھا ہے کہ زیادہ تر غیاث منصور کی کتابوں سے یہ دونوں حضرات سرقہ کیا کرتے تھے غالباً مرزا جان کی طرف منسوب کرنے کی وجہ بھی یہی ہوئی کہ وہ خود اس مسئلہ میں بدنام تھے واقعہ یہ ہے کہ سلم جیسی کتاب اگر مرزا جان صاحب کے قلم سے پہلے ہی نکل چکی ہوتی تو جہاں ان کی معمولی بیسیوں کتابیں علما میں پھیلی ہوئی ہیں ایسا متن متین گوشۂ گمنامی میں کیوں پڑا جاتا نیز ملا محب اللہ کی عبارت میں جو آمد ہے، اور اس جعلی کتاب میں جو آورد ہے خود دلیل ہے اس کے جعلی ہونے کی۔ محب اللہ ایک خاص طرز تعبیر کے موجد ہیں، سلم میں بھی ان کا یہی رنگ ہے لیکن مرزا جان کی کسی کتاب کی عبارت مسلم کے طرز کی نہیں ہے۔

[1] یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان بلکہ اسلام کے مشرقی علاقوں کی تصنیفات کا رواج اسلام کے مغربی علاقوں مثلاً افریقہ یا اندلس میں کم ہوا خصوصاً پچھلی صدیوں میں جو کام مشرقی ممالک میں ہوا اس سے مغربی علاقوں کے علماء زیادہ واقف نہ تھے، ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں آٹھویں صدی کے مشرقی علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فلم نر لھم من بعد الامام ابن الخطیب ونصیر الدین الطوسی کلاما یعول علی نھایتہ فی الاصابۃ (۴۰۹) (بقیہ برص۳۶)

وجد بآخر نسخة الاصلی مما ھو من	مسلم الثبوت کے اصل نسخہ میں خود مولف کتاب کا بیان
کلام المولف لبیان ما اطلع علیہ	درج ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب اور اس کے حواشی
من کتب الاصول عند تالیفہ و	کی تالیف کے وقت ان کے سامنے اصول فقہ کی کون
تعلیق حواشیہ مانصہ	کون سی کتابیں تھیں ۔

پھر اصل عبارت درج کی گئی ہے۔ حمد و نعت کے بعد ملا محب اللہ نے لکھا ہے، کہ اصل کتاب کی تالیف سے فارغ ہونے کے بعد میرے بعض دوستوں نے فرمائش کی کہ خود ہی اپنی اس کتاب کے مشکلات کی تشریح میں ایک حاشیہ لکھوں۔ بہرحال اصل متن اور اس کے حواشی لکھنے کے وقت جو کتابیں اُن کے سامنے تھیں ان کی فہرست خود ان ہی کے قلم سے یہ ہے:۔

واعلم انہ قد جمع اللہ بفضلہ لدی حین	معلوم ہونا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے میرے
تصنیفی لھذا الکتاب، من کتب الحنفیہ	پاس اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں حسب ذیل
کتاب البزدوی واصول السرخسی	کتابوں کا ذخیرہ جمع کرا دیا تھا:۔ حنفیوں کے اصول فقہ کی
وکشف البزدوی وکشف للمنار و	کتابوں میں سے تو البزدوی اور اصول سرخسی، کشف
البدیع وشرحۃ الشراح والتوضیح و	بزدوی، کشف المنار اور البدیع نیز البدیع کے شارحوں
التلویح والتحریر لابن الھمام و	نے جو اس کی شرحیں لکھی ہیں، توضیح و تلویح ابن ہمام
التقریر والتیسیر مع شروحہما و من	کی تحریر (اس کی شرح) التقریر اور التیسیر اپنے مختلف شروح

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵) مطلب یہ ہے کہ ابن الخطیب یعنی امام رازی اور طوسی کے بعد ابن خلدون کو مشرقی ممالک کے علماء کی کوئی قابلِ ذکر معتبر کتاب نہ مل سکی، پھر خود ہی لکھا ہے کہ مشکل قد دلنا علی ذلک کلام بعض علما ئھم فی تالیف وصلت الینا الی ھذہ البلاد وھو سعد الدین التفتازانی (م) جس کا مطلب یہی ہوا کہ علامہ تفتازانی کی بعض کتابیں ابن خلدون تک پہنچی تھیں۔ حالاں کہ اسی زمانہ میں قطب الدین شیرازی، قطب الدین رازی، سید شریف جرجانی، سعد الدین دوانی جیسے ارباب تحقیق کا قلم ان ممالک میں جواہر پاشیوں اور زرافشانیوں میں مصروف تھا۔

كتب الشافعية المحصول للامام و الاحكام للآمدي وشرح المختصر للقاضي وتعليقاته مع حاشية السيد الشريف والابهري وشرح الشرح للتفتازاني وحاشية الفاضل ميرزاجان، والردود والنقود و المنهاج للبيضاوي وشرحه للاسنوي ومن كتب المالكية المختصر والمنتهى لابن الحاجب.

کے ساتھ یوں ہی شافعیوں کی کتابوں میں سے المحصول امام رازی کی الاحکام الآمدی کی شرح مختصر قاضی کی، نیز اس کے تعلیقات سید شریف کے حواشی کے ساتھ، الابہری کی شرح نیز تفتازانی کی شرح الشرح اور فاضل میرزا جان کا حاشیہ الردود اور النقود نامی کتابیں بھی قاضی بیضاوی کی منہاج اور انہوں نے اس کی جو شرح لکھی ہے اور مالکیوں کی کتابوں میں ابن حاجب کی مختصر اور منتہی الاصول۔

اہل علم جانتے ہیں کہ ملا محب اللہ نے اصول فقہ کی کتابوں کی جو فہرست پیش کی ہے کتنی جامع اور حاوی فہرست ہے۔ اس فن کی اہم کتابوں میں خود ہی غور کیجیے کہ آخر کونسی کتاب رہ گئی ہے، صرف احناف کے اصول کی کتابیں نہیں ہیں بلکہ شافعی مالکی اصول فقہ کی امہات کتب بھی جب اس ملک میں پائی جاتی تھیں اور اہل علم کے زیر مطالعہ تھیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتابی سرمایہ کی کمی کا جو عام پروپاگنڈہ ہندوستان کے اسلامی عہد کے متعلق کیا گیا ہے، اس میں اصلیت کا کتنا حصہ ہے کتنی عجیب بات ہے یہ سارے واقعات جن سے لوگ ناواقف نہیں ہیں، قطع نظر کر لیا گیا، اور ایک امام رازی کی تفسیر کے نہ ملنے کے قصہ کو اتنا اچھالا گیا کہ گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند مکتبی اور درسی کتابوں کے سوا اس ملک میں اسلامی علوم کا شدید قحط تھا، عالمگیر کے عہد کی اصول فقہ کی فہرست آپ دیکھ چکے، میں کہتا ہوں کہ فتاوی عالمگیری پر کس عالم کی نظر نہیں پڑتی، انصاف شرط ہے علم فقہ کی جن مشہور و غیر مشہور طویل و مختصر معتبر نامعتبر کتابوں کے بکثرت حوالے اس فتاوی میں

دیے گئے ہیں، کیا ان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ شرح وقایہ، ہدایہ، کنز و قدوری اور اس کی معمولی شرحوں کے سوا ہندوستان میں فقہ کا ذخیرہ نہیں پایا جاتا تھا۔[۱]

ہندوستان کی کتابی بے مایگی کا جب ذکر کیا جاتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر لوگوں کا اشارہ کن کتابوں اور کس قسم کی کتابوں کی طرف ہے، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادے شاہ نورالحق جن کا ذکر بہر مبارک محدث کے ذکر میں گزر چکا ان کی شرح بخاری کی فارسی[۲] میں موجود ہے، اس کے دیباچہ ہی پر یاروں کی نظر ہوتی تو شاید آج جن کتابوں پر ناز کیا جاتا ہے، وہ نا زباقی نہیں رہتا، ان کتابوں کا نام لیتے ہوئے، جن سے شیخ نے اپنی شرح میں استفادہ کیا ہے، فرماتے ہیں

---

[۱] اورنگ زیب عالمگیری کیا یہ تو اس زمانہ کی کتاب ہے جب ہندوستان اسلام کے قدیم اوطان میں ایک پرانا وطن بن چکا تھا، تتارخانیہ جو فیروز تغلق کے عہد میں مرتب ہوا، اسی کے دیباچہ کو کوئی پڑھ لیتا تو سمجھ سکتا تھا کہ ہندوستان کتابی حیثیت سے مغلوں ہی کے عہد میں نہیں بلکہ ان سے بھی پہلے اور بہت پہلے کتنا مالدار تھا، فقہ حنفی کے حاویات، مبسوطات، مجامع، مجموعوں اور فتاوی کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جس کا تتارخانیہ کے دیباچہ میں یہ کہتے ہوئے ذکر نہیں کیا گیا ہے کہ تدوین کتاب میں فلاں فلاں کتابیں زیر نظر تھیں۔ تتارخانیہ تو ایک ضخیم فتاوی ہے۔ فتاوی حمادیہ جو چھپ بھی چکا ہے نسبتاً ایک جلد میں چھوٹا سا فتاوی ہے، میں شاید مبالغہ نہیں کروں گا اگر یہ کہوں کہ کم از کم ڈیڑھ تقطیع کے صفحات پر بھی ان کتابوں کی فہرست مشکل ہی سے سما سکتی ہے جن کے نام بحیثیت ماخذ اس کتاب کے دیباچہ میں درج ہیں، نہ صرف حنفی بلکہ فقہ شافعی کی کتابوں کا بھی ایک بڑا ذخیرہ مؤلف کے پیش نظر تھا، مگر ان چیزوں کو کون دیکھتا ہے، جو کچھ غیروں نے کہہ دیا جب اسی پر ایمان لانے کا ارادہ کر لیا گیا ہو، تو اب جستجو کی حاجت کیا ہے۔ ہماری غفلتوں کا تو یہ حال ہے کہ اچھے لکھے پڑھے مولویوں میں بھی ننانوے فیصدی شاید ہی اس سے واقف ہوں گے کہ فتاوی حمادیہ ہندوستان میں مدون ہوا ہے، حالاں کہ دیباچہ میں بھی مصنف بیچارے نے اپنا نام ابوالفتح رکن بن حسام المفتی الناگوری بتا بھی دیا ہے جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ مصنف ہی خود عالم تھے بلکہ ان کے والد حسام بھی المفتی تھے، اصلی وطن تو ان کا ناگور تھا، لیکن اسی میں لکھا ہے کہ نہروالہ (گجرات) کے دارالسلطنت میں یہ کتاب اس زمانہ کے مفتی اعظم علامہ قاضی حماد بن قاضی اکرم کے اشارہ سے لکھی گئی، یہ بھی اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے قاضی حماد کو نعمان الثانی کا خطاب بھی تھا، ابوالفتح رکن خود بھی عالم تھے، والد حسام بھی عالم اور لکھا ہے کہ ان کا بیٹا بھی اس کتاب کی تدوین میں شریک تھا جس کا نام تو نہیں بتایا گیا ہے لیکن اتنا تو معلوم ہوا کہ طبقۂ اہل علم سے ان کا بھی تعلق تھا۔ ہندوستان (جونپور) میں فتاوی ابراہیم شاہی بھی مرتب ہوا تھا۔

[۲] (بر صفحہ ۴۹)

زبدہ وخلاصہ ایں چند شرح کرمانی، فتح الباری، عینی، سیوطی، شرح تراجم قسطلانی کہ متداول علماء روزگار است۔ (تیسیر القاری ج ۱ ص ۳)

خط کشیدہ الفاظ قابلِ غور ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کی یہ شرح علماء ہند میں عام طور پر عہد جہانگیری و شاہ جہاں میں متداول تھیں۔ جامعہ عثمانیہ میں چند سال ہوئے ایک اسیر کا قلمی کتب خانہ آیا تھا، اس میں بھی فتح الباری قلمی، عینی قلمی موجود تھی، انتہا یہ ہے کہ کتاب الاسرار ابوزید دبوسی بھی اس کتب خانہ میں تھی، واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف دلی کی مرکزی حکومت بلکہ صوبوں کی طوائفی حکومتوں کی تاریخ پڑھئے، شادی آباد مانڈو (سی۔ پی) احمد آباد (گجرات) لکھنوتی یا گور (بنگال) کے سوا دکن کی چاروں حکومتوں میں علم و فن کے عشاق سلاطین جو گذرے ہیں، اور ان کے شاہی کتب خانوں میں دنیا بھر سے ہر فن کی جو کتابیں منگائی جاتی تھیں خود ہر ملک سے علماء اپنے ساتھ کتابیں لاتے تھے، اور تحفوں میں بادشاہوں کے پاس پیش کرتے تھے۔

دوسرے ممالک کے سلاطین ہندی بادشاہوں کے پاس مسلسل سفارتیں بھیجتے رہتے تھے، خود پایگاہ خلافت سے بھی خلعت اور سند حکومت اس ملک کے سلاطین کے نام وقتاً

(حاشیہ صفحہ ۴۸) یہ واقعہ یہ ہے کہ کشفاً خیال کیجیے یا ضرورۃً جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ اور اُن کے صاحبزادوں نے قرآن مجید کو فارسی اور اُردو کا لباس پہنا کر اس ملک ہندوستان پر احسان عظیم فرمایا ہے، اُسی طرح شیخ محدث دہلوی نے مشکوٰۃ کا ترجمہ ضروری مطالب کے ساتھ اور اُن کے صاحبزادے شیخ نور الحق نے بخاری کا ترجمہ ضروری شرح کے ساتھ کر کے اس ملک پر اسی قسم کا احسان کیا تھا۔ شاہ صاحب کو تو اس ملک کی حالت دیکھ کر تقریباً دو سو سال بعد ترجمہ کے ذریعہ سے دین کی عمومیت کا خیال آیا لیکن بجنسہٖ یہی خیال شیخ محدث کو بھی ہوا، فارسی میں مشکوٰۃ کا ترجمہ اُنھوں نے خود کیا اور بخاری کا ترجمہ و شرح ان کے صاحبزادے نے ان ہی کے اشارے سے کیا، جیسا کہ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ تذکرۂ علماء ہند کے مصنف کے بیان سے معلوم ہوا ہے۔ مولانا نور الحق نے صحیح مسلم کی شرح بھی لکھی تھی غالباً وہ بھی فارسی میں ہوگی شاہ عبدالحق ہی کے خاندان کے ایک بزرگ مولانا اسلام اللہ کی ایک ضخیم شرح عربی زبان میں موطا امام مالک کی فقیر کی نظر سے ریاست ٹونک میں صاحبزادہ عبدالرحیم خاں

توقتاً جاتی رہتی تھی۔ اگران تعلقات سے لوگوں کو واقفیت ہو تو ہندوستان کی کتابوں کے افلاس کا افسانہ ان کے لیے افسانہ بن کررہ جائیگا، براہ خشکی اور براہ دریا[1] اسلامی ممالک سے آنے والوں کا جو تانتا اس ملک میں بندھا ہوا تھا، صرف ایک علی عادل شاہ فرماں روائے بیجاپور کے پاس محض شیراز سے جو لوگ آئے اور انعام و اکرام و ظائف لے کر واپس ہوئے ان کی تعداد خود ایک شیرازی رفیع الدین جو علی عادل شاہ کا خانساماں شاہی تھا دس ہزار بتاتا ہے، میں کسی دوسری جگہ ایک اور ضرورت سے اس کی عبارت بھی نقل کرونگا۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے محمد تغلق کے حالات میں لکھا ہے:۔

دراں سال چنداں مردم از ولایت خراسان و عراق و سمرقند بامید بخشش سلطان "
ہند آمدند کہ دریں دیار بغیر از ایشاں طائفہ دیگر کم بنظر می آمد ص۲۳۲ (بداؤنی ج ۱)

کچھ ایک اسی بادشاہ کے زمانہ کا یہ حال نہیں ہے، سکندر لودی جس کا ذکر عنقریب آرہا ہے شیخ محدث نے اس علم پرور معارف نواز بادشاہ کے متعلق لکھا ہے کہ

"از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بہ سابقہ استدعا و طلب و بعضے بے آں در عہد دولت
او تشریف آوردہ و توطن ایں دیار را اختیار کردند" ص۲۲۵ (اخبار الاخبار)

---

[1] ایک عام خیال لوگوں کا یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں دریا کا سفر لوگ کم کرتے تھے۔ خطرات کے خیال سے بھی اور مہینوں بلکہ برسوں آمد و رفت میں خرچ ہو جاتے تھے لیکن دونوں باتیں عدم علم پر مبنی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے عربوں کی جہاز رانی پر جو مضمون لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاز سے اس زمانہ میں سفر کم نہیں کیا جاتا تھا۔ دکن کی ساحلی حکومتوں کی تاریخ میں تو اس کا سواد وافر ہے۔ رہا مدت سفر کی طوالت ظاہر ہے کہ اس زمانہ کی ایسی سرعت رفتاری جہازوں میں کہاں تھی، لیکن شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب متقی کے حالات میں لکھا ہے کہ عرب سے وہ ہندوستان آئے اور واپس ہوئے۔ آمد و رفت کی کل مدت اتنی تھی "مدت آمدن کشتی از آنجانب پانزدہ شانزدہ روز بود و ازیں جانب چہل روز" ص۲۷۷ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ سولہ دن میں اس زمانہ میں بھی بحر ہند اور عرب کو عبور کرکے آدمی حجاز پہنچتا تھا ۱۲

صرف دلّی (پایۂ تخت) ہی کی یہ کیفیت نہ تھی، صوبوں میں جو مستقل حکومتیں مختلف زمانوں میں قائم ہوتی رہیں اُن کی قدردانیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، شادی آباد مانڈو (مالوہ) کے بادشاہ محمود خلجی کے ذکر میں مورخین لکھتے ہیں۔

زر باطراف عالم فرستادہ مستعداں راطلب داشت و باجملہ بلاد مالوہ درزمان او یونان ثانی گشت۔ (مآثر رحیمی ج ۱ ص ۱۲۵)

اور مغلیہ حکومت ہمایوں کے زمانہ میں جب زیر بار منتِ ایران ہوئی، تو اس وقت کا حال ظاہر ہی ہے بقول بداؤنی کتنے ایسے تھے کہ

پار بودم قطبک و امسال قطب الدین شدم   گر بیایم سال دیگر قطب دین حیدر شوم

جب "قطبکوں" کی یہ کیفیت تھی، تو اسی سے اندازہ کیجیے کہ جو لوگ واقعی قطب الملۃ والدین تھے ہندوستان نے ان کے کھینچنے میں کیا کمی کی ہوگی، پھر کیا جوق در جوق علماء کا جو گروہ ہندوستان کھنچا چلا آرہا تھا، وہ خالی ہاتھ آتا تھا[1]، مشہور تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو بلایا جاتا تھا، خود نہ آتے تو اپنی مصنفہ کتابیں ہندوستان بھیج دیتے تھے، بداؤنی میں بلبن کے بڑے لڑکے سلطان محمد شہید صوبہ دار ملتان (پنجاب) کے ذکر میں ہے کہ

"دو نوبت زر بسیار از ملتان بشیراز فرستادہ التماس قدوم شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نمود و شیخ بعذر پیری نیامد اما بہ تربیت میر خسرو سلطان را وصیت فرمود، و سفارش او فوق الحد نوشتہ وگلستاں و بوستاں و سفینۂ اشعار بخط خود ارسال داشت۔ (ج ۱ ص ۱۳۰)

اور اس قسم کے واقعات نادر نہیں ہیں، بنگال سے حافظ شیراز کی طلبی، یا دکن میں مولانا جامیؒ

[1] کسی موقعہ پر شمس الدین نامی محدث کا ذکر آئیگا، علاء الدین خلجی کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے تھے، لکھا ہو کہ چار سو صرف حدیث کی کتابیں ان کے ساتھ تھیں۔

اور دوسرے علمار کی دعوت کے قصے زبان زدِ عام ہیں ہندوستان کتابوں کے مسئلہ میں کتنا چوکنا اور بیدار رہتا تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے یعنی قاضی عضد نے مواقف کا متن جب لکھا تو محمد تغلق نے اس کتاب کو اپنے نام معنون کرنے اور قاضی صاحب کو ہندوستان بلانے کے لیے ایک خاص عالم کو شیراز روانہ کیا، مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

آوردہ اند کہ سلطان محمد مولانا معین الدین را بہ ولایت فارس نزد قاضی عضد ایجی فرستاد والتماس نمود کہ بہ ہندوستان تشریف آرد و متن مواقف را بہ نام او سازد۔ (مآثر۔ص ۱۸۵)

آج تو اس مُردہ قوم کے متعلق آپ جو چاہیں رائے قائم کریں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو کتاب سے جو ذوق تھا اُس کا اس وقت صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، چونکہ بحث صرف ہندی نظامِ تعلیم تک محدود ہے، ورنہ سفر میں اسلامی علمار کتابوں کی جو مقدار اپنے ساتھ رکھتے تھے سُن کر لوگوں کو حیرت ہوتی، چالیس چالیس، پچاس پچاس اونٹوں پر بعض علمار اپنے ساتھ کتابیں بھی ساتھ لیے پھرتے تھے، خود صاحب قاموس کا بھی یہی حال تھا، اسی ہیئت کے ساتھ وہ ہندوستان بھی پہنچے تھے، آخر آخر زمانہ تک اسی ہندوستان کے مولویوں کا کتابوں کے ساتھ یہ ربط تھا کہ ملا عبدالنبی احمد نگری جو بارہویں صدی کے عالم ہیں اپنی کتاب دستور العلمار میں احمد نگر کا تذکرہ کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ ان کے بچپن کے زمانہ میں مرہٹوں نے ایک دفعہ احمد نگر کا محاصرہ کیا۔ فوجدار شہر جس کا نام ابراہیم خان تھا، مقابلہ نہ کر سکا، اور بھاگ کھڑا ہوا، مرہٹوں نے شہر میں آگ لگا دی، ملا صاحب لکھتے ہیں

لہ یہی متن مواقف اور اس کے مصنف قاضی عضد کے اسی قصہ میں یعنی محمد تغلق نے مولانا عمرانی کو جب شیراز بھیجا یہ حال جب شاہ ابو اسحاق جو اس زمانہ میں شیراز کا بادشاہ تھا معلوم ہوا، اور اُس نے سُنا کہ شاہ ہند مواقف کو اپنے نام معنون کرانا چاہتا ہے تو قاضی عضد کے پاس حاضر ہوا کہ بیوی کے سوا اب وہ سب کچھ جو میرے پاس ہے حتیٰ کہ حکومت بھی لے لیجیے لیکن آپ کو نہ ہندوستان جانے دیا جائیگا اور نہ یہ کتاب کسی دوسرے کے نام معنون ہو سکتی ہے شیخ محدث اور مولانا آزاد کی کتابوں میں آپ کو اس واقعہ کی تفصیل ملیگی۔

راقم الحروف دراں وقت بہ سن بلوغ نرسیدہ بود با والد ماجد مرحوم بعد نماز ظہر بقلعہ رفت

س کے بعد لکھتے ہیں کہ ان کے والد جو احمد نگر کے قاضی بزرگ تھے، انھوں نے اپنے نوکروں چاکروں
کو حکم دیا کہ

"مستورات را بہ عنوان بقلعہ رسانند و اہتمام فرستادن کتب خانہ از ہمہ اسباب خانہ بیش تر دانند چنانچہ
شیخ مذکور (خادم قاضی) را در جائے نماز ہائے مسجد جامع بستہ بر سر مزدوراں فرستاد" (ج ۳ ص ۴۱)

حالانکہ سارا شہر جل رہا تھا، مرہٹے گھروں میں گھس کر لوٹ مار مچائے ہوئے تھے، لیکن اس کتابی
ذوق کو ملاحظہ فرمائیے کہ ایسی حالت میں بھی قاضی صاحب کے سامنے سب سے زیادہ جو
چیز اہم تھی، وہ کتابوں کا معاملہ تھا، ملا عبد النبی خود لکھتے ہیں کہ مستورات اور کتابوں کے سوا

"اثاث البیت و دوات کہ در خانہ ماندہ بود ہمہ بغارت رفت"

یہ اثاث البیت جن کو چھوڑ کر قاضی صاحب نے صرف کتابوں کے بچا لینے کو سب سے اہم
خیال کیا تھا، اس کی نوعیت کیا تھی، ملا عبد النبی نے ایک دیکھنے والے سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں

از خانہ شریعت پناہ (قاضی صدر) دوازدہ شتر از ظروف و فروش وغیرہ متاع خانہ بار
کردہ بردند"

گویا اونٹوں کا ساز و سامان چھوڑ دیا گیا اور صرف کتابیں بچ گئیں، اسی کو قاضی صاحب نے غنیمت
خیال کیا، یہ آخر زمانہ کی بات ہے جب مرہٹوں کا تسلط اس ملک پر ہو چکا تھا، اسی سے قیاس
کیا جا سکتا ہے کہ جب زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمان آثار حیات سے لبریز تھے ان کا کیا حال ہوگا

ملا عبد القادر نے لکھا ہے کہ اکبر کے شاہی کتب خانہ سے ایک کتاب خرد افزا نامی گم ہو گئی
تھی شاہزادی سلیمہ سلطان بیگم کو اس کتاب کی ضرورت ہوئی، کتب خانہ میں نہ ملی، شاہی کتب خانہ
جس زمانہ میں ملا عبد القادر کی نگرانی میں تھا لیکن ملازمت ترک کر کے وہ بداؤں چلے آئے تھے۔

صرف اس کتاب کی تلاش میں شاہزادی نے کتنی دلچسپی لی، اس کا اندازہ ملا صاحب کے اس بیان سے کیجیے فرماتے ہیں کہ

بہ تقریب نامۂ خرد افزا کہ از کتاب خانہ گم شدہ بود محصنا سلیمہ سلطان بیگم مرا چند مرتبہ یاد فرمودند، ہر چند قاصداں از یاراں بداؤں رفتند بہ تقریب موانع آمدن نشد آخر حکم کردند کہ مدد معاش ادرا موقوف دارند و خواہی نخواہی طلبند (ج ۳ ص ۳۷۷)

خیال تو کیجیے کہ ایک کتاب کی کیا حقیقت ہے لیکن شاہزادی کے علمی مذاق کا یہ حال ہے کہ بہرحال اس کا پتہ چلانا چاہیے، ملا کو جاگیر کی ضبطی کی دھمکی دی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دارالاسلام ہونے کے ساتھ ہی بیرونی اسلامی ممالک سے آمد و رفت کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا حج کا قافلہ بھی خصوصاً مغلوں کے عہد میں لاکھوں لاکھ روپے کے ساتھ بھیجا جاتا تھا اس کا کام ایک کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی تھا، اکبر نے سب کچھ بند کر دینے کے باوجود حج کے قافلہ کی روانگی کو بدستور جاری رکھا۔ نوادر[1] علوم کی کتابوں کا اکبر کتنا

[1] مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں سے ترجمہ کرانے کا کام اکبر کے زمانہ میں جو انجام دیا گیا ہے ایک مبسوط و مفصل مضمون کا مواد ہے۔ دربار اکبری میں تھوڑی بہت تفصیل اس کی مولوی محمد حسین آزاد نے کی ہے۔ اسی سلسلہ میں آزاد نے اکبری زمانہ کی ایک تصنیف "ثمرۃ الفلاسفہ" کا بھی تذکرہ کیا ہے، لکھا ہے کہ کسی مغربی زبان غالباً لاطینی سے فارسی میں اکبر کے حکم سے عبدالستار ابن قاسم نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ ان ہی کا یہ بیان بھی ہے کہ "خلیفہ محمد حسین صاحب وزیر پٹیالہ کے کتب خانہ میں یہ کتاب میری نظر سے گذری ہے" کتاب کے دیباچہ سے یہ مضمون نقل کیا ہے کہ مصنف عبدالستار نے چھ مہینے کے عرصہ میں زبان مذکور جس میں اصل کتاب تھی پادری جزو غوشو پر سے سیکھ لی، یہ پادری جزو غوشو پراں پرتگالی پوادر میں تھا جو گوا بندر سے اکبر کی دعوت پر دربار میں پہنچے تھے۔ عبدالستار نے لکھا ہے کہ چھ مہینے میں اتنی قابلیت بہم پہنچالی تھی کہ بولنے کی قدرت تو نہ پیدا ہوئی تھی، لیکن کتاب کا مطلب خاصہ نکال لیتا تھا۔ ابوالفضل نے بھی جہاں گوا بندر کے پادریوں کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ "یونانی کتابوں کے ترجمے کا سامان بہم پہنچا" غالباً اسی قسم کے کاروبار کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال مغربی زبانوں سے ہندوستان کا تعلق گویا اسی زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا، اور اگر یہ سوال ہو کہ یوروپین زبانوں کی کتابوں کا ہندوستان میں کب سے ترجمہ شروع ہوا تو غالباً اس فہرست میں پہلا نام اس ثمرۃ الفلاسفہ کا رکھا جائیگا۔ کاش! پنجاب کے کوئی بزرگ خلیفہ محمد حسین کے کتب خانہ سے اس پہلی مغربی زبان سے ترجمہ شدہ کتاب کا سراغ لگاتے اور اس کے مضامین سے عام لوگوں کو آگاہ کرتے

شائق تھا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کے پاس تحفے اور ہدیے میں عرب سے لوگ کتابیں بھیجا کرتے تھے، اسی ذوق وشوق کا نتیجہ تھا کہ نادر کتابیں اس کے پاس جمع ہوگئی تھیں۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ حموی کی معجم البلدان جیسی ضخیم کتاب صرف یہی نہیں کہ اکبر کے کتبخانہ میں موجود تھی بلکہ ملا عبدالقادر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا فارسی ترجمہ بھی اکبر نے کرایا تھا۔ اس کتاب کے ترجمہ میں جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا وہ اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اُس زمانہ میں انسائیکلو پیڈیا وغیرہ جیسی کتابوں کی تالیف میں بجائے واحد شخص کے مصنفوں اور مؤلفوں کی ایک جماعت سے جو کام لیا جاتا ہے اکبر اپنے زمانہ میں اس پر عمل پیرا ہو چکا تھا، ملا عبدالقادر نے لکھا ہے:۔

"دوازدہ کس فاضل راجمع نمودہ چہ عراقی وچہ ہندی وآں را مجزّی (جزو جزو پر تقسیم کرکے) ساختہ تقسیم فرمودند مقدار دہ جز حصۂ نقیر رسید در عرض یک ماہ ترجمہ کردہ پیش تر از ہمہ گزرانیدہ وسیلہ التماس بجانب بداؤں ساختم وبدرجہ قبول پیوست۔ (ج ۲ ص ۳۷۵)

اجتماعی تالیف کا یہ طریقہ اکبر نے کچھ اسی ایک کتاب کے ترجمہ میں اختیار نہیں کیا تھا بلکہ مہابھارت اور تاریخ کشمیر کے ترجمہ میں بھی یہی صورت اختیار کی گئی تھی، نیز اکبر نے تاریخ الفی جو اپنے زمانہ میں مرتب کرائی تھی سب کا یہی حال تھا۔

خود ہندوستان کا وہ سرمایۂ ناز فقہی کارنامہ یعنی فتاوی ہندیہ جو عام طور سے فتاوی عالمگیری کے نام سے مشہور ہے جس کے متعلق میں نے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقالہ میں ان ہی کی زبانی یہ شہادت نقل کی ہے کہ بادشاہ بہ نفس نفیس جو اس کتاب کی تدوین میں عملاً شریک تھے، روزانہ جتنا کام ہو چکتا تھا بالالتزام لفظاً لفظاً اُسے غور سے سُنتے تھے، موقعہ موقعہ سے مُناسب اصلاح و ترمیم بھی بادشاہ کی طرف سے عمل میں آتی تھی، شاید یہ خصوصیت ہندوستان ہی کی اس فقہی کتاب کو حاصل ہے کہ عالمگیرؒ جیسا بادشاہ اس کے ارکین تدوین میں خود شریک تھا۔ خیر یہ

تو جملہ معترضہ تھا، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ جس طرح اکبر ایک ایک کتاب کو بجائے شخص واحد کے چند آدمیوں سے مرتب کراتا تھا، عالمگیر نے بھی اپنے اس "فتاویٰ" کی تدوین کا کام علمار کی ایک کمیٹی کے سپرد کیا تھا، افسر اعلیٰ تو اس سررشتہ کے ملا نظام جو غالباً برہان پور کے رہنے والے ہیں، تھے لیکن ان کے سوا چار اور ارکین کے نام بھی تاریخوں میں لیے جاتے ہیں۔ تاریخ مراۃ عالم کے حوالے سے برہان پور کی تاریخ میں یہ فقرہ منقول ہے کہ علاوہ ملا نظام افسر تدوین کے

یک ربع* مفوض بہ قاضی محمد حسین جون پوری محتسب عسکر، ویک ربع بہ سید علی اکبر سعد اللہ خانی ویک ربع سپرد"
بہ ملا حامد جون پوری تلمیذ میرزا زاہد ویک ربع محمد اکرام لاہوری معلم شاہزادہ کام بخش بود" (ص ۴۳)

کم از کم مجھے نہیں معلوم کہ تصنیفی کاروبار نے کسی دوسرے اسلامی ملک میں اتنی وسعت حاصل کی تھی کہ حکومت نے ایک ایک کتاب کی تالیف کے لیے علمار کی باضابطہ کمیٹیاں مقرر کی ہوں، اس سے اس ملک کے بادشاہوں کے علمی وکتابی مذاق کا اندازہ ہوتا ہے، میرے سامنے چونکہ سلاطین ہند کا علمی پہلو نہیں ہے کہ وہ تو خود ایک مستقل کتاب کا موضوع ہے، کاش کسی کو اس کے جمع کرنے کی توفیق ہو۔

میں صرف ان کی کتابی دلچسپیوں کا تذکرہ کر رہا ہوں، ظاہر ہے کہ جس ملک کے بادشاہوں کو کتابوں کے جمع کرنے کا والہانہ شوق ہو، کیا اسی ملک کے متعلق کتابی قحط کا شکوہ صحیح ہو سکتا ہے، افسوس ہے کہ شاہی کتاب خانوں کی کتابیں بھی اور ان کتابوں کے ساتھ ان کی فہرستیں بھی انھی ممالک میں منتقل ہو گئیں جہاں ان کا خزانہ منتقل ہوا، جواہرات منتقل† ہوئے۔ ورنہ

---

* تعجب ہے کہ مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم نے اپنی کتاب ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں میں یہ کس ماخذ کی بنیاد پر لکھا ہے کہ ارکینِ تدوین میں بھی بہار کے بھی دو عالم شریک تھے جن میں ایک پھلواری شریف کے رہنے والے تھے۔ کسی صاحب کو ماخذ معلوم ہو تو اس سے مطلع فرمائیں۔

† میرے مرحوم دوست مولوی مظہر علیم سفیر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جن کا روزنامچہ کیسے یا سفرنامہ "سفرنامۂ مظہری" کے نام سے ان کے بھائی مولوی حلیم انصاری صاحب نے ان کی وفات کے بعد جمع کر کے شائع کر دیا ہے۔ (بقیہ برصفحہ ۴۷)

ہو سکتا ہے کہ دلّی کے سلاطین ہوں یا صوبجات کے ملوک اپنے اپنے زمانہ میں علم کی کتنی بڑی دولت ان لوگوں نے جمع کی تھی، کبھی کبھی پُرانے کتب خانوں میں جواب بھی ہندوستان کے بعض مقامات میں بطور بقیۃ السیف کے رہ گئی ہیں، وہ کتابیں نظر آجاتی ہیں جن پر سلاطین کی مہریں یا اُن کے قلم سے کتاب کے متعلق کوئی یادداشت ثبت ہے، علی الخصوص عظیم آباد پٹنہ المعروف بہ بانکی پور کے مشرقی کتب خانہ میں خدابخش مرحوم نے ایسی کتابوں کا ایک

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۶) اور بنگال، بہار، دکن، کاٹھیا وار، گجرات، صوبجات متوسطہ وغیرہ کے دیہاتوں اور قریوں میں مسلمانوں کی جو حالت اس زمانہ میں ہے اُس کے متعلق بڑے دلچسپ ہی نہیں بلکہ دل دوز معلومات درج ہیں، بڑے بڑے امراء، نواب، علماء، فقراء کی اولاد اس ملک کے گوشہ گوشہ میں کس طرح پھیلی ہوئی ہے اس کا حال آپ کو اس کتاب میں ملیگا، پُرانے خاندانوں میں شاہی وثائق یا پُرانی کتابیں جہاں کہیں نظر پڑی ہیں، اُن کا ذکر بھی کہیں کہیں کرتے چلے گئے ہیں، اسی سلسلہ میں کمیلا (مشرقی بنگال) کے ایک رئیس نواب حسام حیدر کا بھی تذکرہ درج کرتے ہوئے ایک موقعہ پر لکھتے ہیں کہ "نواب حسام حیدر صاحب نے ایک قرآن شریف قلمی مُذہّب وُمطلّا دکھایا، دبیز چکنے کاغذ پر خط ولایت لکھا ہوا تھا، بڑی تقطیع ہے، اُس کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوگئیں" یہاں تک تو خیر معمولی بات ہے۔ جس چیز کی وجہ سے میں نے اس قصہ کا ذکر کیا ہے وہ ان کے بیان کے یہ آخری دو فقرے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ یہ قرآن" خاص داراشکوہ کی تلاوت کا مصحف ہے مہر اُس کی موجود ہے" صاحب قِران ثانی (شاہ جہاں بادشاہ) کے چہیتے لخت جگر کا قرآن ہے، اور کمیلا کے نواب صاحب کے پاس یہ پہنچا کس ذریعہ سے ان ہی سے سُنیئے لکھتے ہیں :-

"ایک یوروپین لیڈی سے نواب صاحب نے لیا تھا" (سفرنامہ مظہری۔ ص ۵۸)

شاہی کتاب خانہ کس طرح لوٹا گیا اور کن کن ہاتھوں تک یہ جواہر پارے پہنچے اس کا اندازہ آپ کو اسی ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے، مرحوم نے اور اور مقامات کے نادر نسخوں کا ذکر کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ حکیم حبیب الرحمٰن صاحب (ڈھاکہ) کے پاس الذہبی کی "الکاشف" کا نسخہ خط کوفی میں دیکھا ۷۴۰ھ کی کتابت تھی۔ ایک نسخہ "منطق الشفا" ابن سینا ۹۰۱ھ کا مکتوبہ کتب خانہ عالمگیری کا نسخہ تھا (ص ۵۲) ازیں قبیل مختلف مقامات میں اس قسم کی نادر چیزیں ان کو نظر آئی ہیں۔

اچھا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔

اس زمانہ میں عالی جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے زرکثیر صرف فرماکر جہاں جہاں سے ممکن ہوا ہے ان جواہر پاروں کا ایک قیمتی مجموعہ اپنے کتاب خانۂ حبیبیہ" میں جمع بھی کیا ہے اور یہ مشغلہ ابھی جاری ہے۔

اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ایک صوبجاتی حکومت بیدر کے مشہور علم دوست وزیر خواجہ جہاں گیلانی مشہور بہ محمود گاواں کے کتب خانہ کے متعلق مولوی ابوالحسنات مرحوم نے ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں والی کتاب میں حدیقۃ الاقالیم کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

"پینتیس ہزار کتابیں مختلف علوم وفنون کی نکلیں" (ص ۶۰)

یہ بادشاہی کتاب خانہ نہیں بلکہ ایک وزیر کے کتب خانہ کی کتابوں کی تعداد ہے، شاہ نواز خاں نے مآثر الامراء میں نقل کیا ہے کہ جب مُلّا فیضی کا انتقال ہوا اور اکبر نے اُن کے ذاتی کتب خانہ کے ضبط کا فرمان نافذ کیا تو معلوم ہوا کہ

"نزد شیخ (فیضی) چہار ہزار و سہ صد کتب صحیح ونفیس داخل سرکار بادشاہ شد" (ج ا ص ۵۸۵)

خیال تو کیجیے ایک شخص جو نہ بادشاہ ہے اور نہ وزیر بلکہ عہد اکبری کا ایک عالم امیر ہے۔ اس کے کتب خانہ سے چار چار ہزار صحیح ونفیس کتابیں جس زمانہ میں برآمد ہوتی تھیں، کہا جاتا ہے اسی ملک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کتابوں کے لحاظ سے ہندوستان میں خاک اُڑتی تھی، اور یہ لوگ تو خیر گونہ حکومت سے تعلق بھی رکھتے تھے، مفتی آزردہ یعنی مولانا صدرالدین خاں صاحب (جو اُجڑی دلّی کے مفتی تھے) لیکن باوجود اس کے ان کے براہِ راست شاگرد مولوی فقیر محمد صاحب نے اپنی کتاب "حدائق الحنفیہ" میں لکھا ہے کہ غدر کے مقدمہ میں مفتی صاحب کو جب رہائی حاصل ہوئی تو لاہور تشریف لائے اور واسطے اپنے کتب خانہ مالیتی تین لاکھ روپے کے جو دہلی کی کورٹ

میں نیلام ہوا تھا حضور لارڈ جان لارنس کے پاس جو اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دلّی میں بڑے مہربان رہ چکے تھے مطالبہ کیا لیکن جائداد منقولہ کا واپس ہونا متعذر تھا اس لیے مطلب میں کامیاب نہ ہو سکے (حدائق صفحہ ۴۸۲) تین لاکھ کی کتابوں کی تعداد کیا ہوگی خود سوچنا چاہیے۔

مولوی ابوالحسنات مرحوم نے ایک گمنام مولوی میر محمد علی کا ذکر کیا ہے جو مہابت جنگ کے زمانہ میں عظیم آباد سے مرشد آباد چلے گئے تھے۔ لکھا ہے کہ اکیلے اس مولوی کے پاس دو ہزار کتابوں کا کتب خانہ تھا۔ تلاش کیا جائے تو عہد اسلامی میں ایسے ذاتی کتب خانوں کا اور بھی پتہ چل سکتا ہے۔ سکندر لودی کے عہد کے ایک غیر مشہور عالم سید ابراہیم دہلوی کا تذکرہ فرماتے ہوئے شیخ محدث دہلوی نے اخبار میں لکھا ہے۔

چنداں کتب واکثر بخط او از کتاب خانہ او برآمدہ کہ از حد حصر خارج ۔ (ص ۔ ۲۰۵)

"اکثر بخط او" کے الفاظ قابلِ غور ہیں، سچی بات تو یہی ہے کہ جب خطاطی کا ہنر کسی صاحبِ ذوق کے اندر موجود ہو، وہ چاہے جتنی کتابیں بھی فراہم کر سکتا ہے۔ یہ چند سرسری واقعات ہیں جو میں نے اِدھر اُدھر سے بغیر کسی مزید کدوکاوش کے پیش کر دیے ہیں۔ ان واقعات کو ایک طرف رکھیے اور اس کے بعد اس لطیفے کی حقیقت پر غور کیجیے کہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تفسیر کبیر بھی موجود نہ تھی، ہو سکتا ہے کہ نہ موجود ہو لیکن کسی عالم کے پاس اگر کوئی کتاب اتفاق سے نہ پائی جائے تو کیا اس کا یہ مطلب صحیح ہو سکتا ہے کہ ایسا ملک دنیا جہان کی ساری علمی کتابوں سے قطعاً خالی تھا۔ آج جس ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق امام رازی کی تفسیر کا ایک حال یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کیا تماشا ہے کہ اسی ہندوستان کے متعلق مولانا غلام علی آزاد یہ واقعہ خود تفسیر کبیر رازی ہی کے متعلق نقل فرماتے ہیں کہ ان کے استاد یعنی استاد المحققین میر طفیل محمد صاحب

آغازِ شباب میں آگرہ تشریف لے گئے وہاں نواب فضائل خاں کے دربار تک ان کی رسائی ہوئی۔ نواب نے چند مولویوں کو سامنے پاکر مشہور قرآنی آیت "عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ"[1] کا ذکر چھیڑ دیا۔ عام توجیہ کہ بابِ افعال کی ایک خاصیت سلب مادہ بھی ہے، اس لیے مطلب یہ ہے کہ جن میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو، اس کا ذکر ہوا، اس پر میر طفیل محمد صاحب نے فرمایا کہ "ہمزۂ سلب در باب افعال سماعی ست نہ قیاسی" یعنی باب افعال کے ہر لفظ میں اس خاصیت کو مان لینا صحیح نہ ہوگا، جب تک خود لفظ اطاقت کے متعلق ائمۂ لغت سے اس کی تصریح نہ دکھادی جائے

---

[1] اہل علم تو اس آیت کے متعلقہ مباحث سے واقف ہی ہیں جو نہیں جانتے ہیں اُن کے لیے لکھا جاتا ہے کہ روزہ جب فرض کیا گیا تو اُس میں جہاں مسافروں اور مریضوں کو مہلت دی گئی کہ وہ بعد کو رکھ سکتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک حکم یہ بھی ہے کہ جو روزے کی اطاقت رکھتے ہوں وہ ایک مسکین کو کھانا بطور فدیہ کے کھلادیا کریں۔ اطاقت کے کیا معنی ہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے حنفی مذہب میں آدمیوں کو تین حصّوں میں بانٹا گیا ہے ایک وہ جنھیں کوئی عذر روزہ رکھنے میں مانع نہ ہو ظاہر ہے کہ ان پر تو مقررہ وقت یعنی رمضان میں روزہ رکھنا فرض ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو عذر رکھتے ہیں۔ عذر والوں کی بھی دو قسمیں ہیں، اسی لیے تیسری قسم پیدا ہوگئی، یعنی عذر اُن کا ایسا ہے جس کے متعلق توقع کی جاسکتی ہے کہ مرنے سے پہلے ازالہ ہوجائیگا، مثلاً سفر سے مسافر گھر واپس آجائے یا بیماری سے اچھا ہوجائے۔ لیکن بعض لوگوں کا عذر ایسا بھی ہوسکتا ہے جس سے نجات عام حالات میں موت تک نہیں ہوسکتی مثلاً شیخ فانی کی جوانی واپس ہو، ناممکن ہے۔ بس ان معذوروں کے لیے جن کا عذر زوال پذیر ہے یہ حکم ہے کہ زوال عذر کے بعد روزوں کی قضا کریں۔ پر جن کا عذر زوال پذیر نہیں ہے، ان ہی کے لیے فدیہ کا حکم ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک یہ تینوں قسموں کا حکم نہ بیان کیا جاتا روزہ کا قانون مکمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ہدایہ میں شیخ فانی وغیرہ کے حکم کو اسی آیت یطیقونہ سے نکالا گیا ہے جو دلیل ہے کہ فقہاء احناف نے اس لفظ کا ترجمہ یہی قرار دیا ہے کہ روزہ بہ مشقت رکھ سکتے ہوں یعنی رکھنے کی صلاحیت تو نہ ہو لیکن خواہ مخواہ رکھنا چاہتے ہوں۔ ان کے لیے فدیہ کا حکم ہے۔ لغت سے بھی اطاقت کے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اور یطیقونہ کی قرأت بھی اسی کی مؤید ہے۔

اس آیت کی اور توجیہیں بھی ہیں، جن میں حضرت شاہ ولی اللہ والی تاویل یعنی صدقۂ فطر پر اس کو محمول کیا جائے۔ اس حنفی توجیہ کے بعد زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ انسانوں میں ایک تیسری قسم پیدا ہوتی ہے یعنی وہی لوگ جن کا عذر زوال پذیر نہ ہو، قرآن کا حکم کہاں سے نکالا جائے، اگر اس آیت کا وہ مطلب نہ بیان کیا جائیگا جو صاحب ہدایہ نے بیان کیا ہے۔

کہ سلب مادہ کی حیثیت سے عربی زبان میں اطافت کا لفظ بھی مستعمل ہے میر طفیل محمد کا بیان ہے کہ اتنی سی معمولی سی بات کے لیے

تفسیر کبیر امام رازی و کشاف و بیضاوی و تفاسیر دیگر، و از لغت کتب صحاح جوہری و قاموس وغیرہ ملاحظہ کردند (مآثر الکرام ص ۱۵۱)

مجھے اس وقت اصل مسئلہ سے بحث نہیں، بلکہ کہنا یہ ہے کہ معمولی معمولی مسئلوں کے لیے جس ملک میں تفسیر کبیر نکلا کرتی تھی، اُسی ملک کے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں کہ محض ایک شاہ عبدالعزیز کے واقعہ کی وجہ سے اس پر فقدان کتب، یا کتابی افلاس کا الزام لگانا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟

بلکہ اگر آپ سچ پوچھتے ہیں تو میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ پریس اور مطابع کے اس عہد سے پہلے کم از کم کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بعض وجوہ سے نسبتاً زیادہ آسان تھا، شہروں اور قصبوں میں آبادی کا ایک خاص طبقہ تقریباً ہر جگہ پایا جاتا تھا جس کی گذر اوقات ہی "وراقیت" پر تھی، مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم لفظ "وراق" کی تشریح کرتے ہوئے "فوائد بہیہ" میں لکھتے ہیں

الوراق .... اسم لمن یکتب المصاحف وکتب الحدیث وغیرھا وقد یقال لمن یبیع الورق وھو الکاغذ ذکرہ السمعانی (ص ۱۶)

وراق نام ہے اُن لوگوں کا جو قرآن مجید اور حدیث اور ان کے سوا دوسری کتابوں کے نقل کرنے کا کام کرتے ہیں، کبھی کاغذ فروش کو بھی وراق کہتے ہیں، سمعانی نے یونہی لکھا ہے۔

چونکہ ان لوگوں کی گذر اوقات کی یہی واحد شکل تھی اس لیے وہ اس کا پتہ چلائے رکھتے تھے کہ کون کون سی کتابیں شہر میں کس کس کے پاس پائی جاتی ہیں صرف فرمائش کی دیر ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح وہ اس کتاب کی نقل حاصل کر کے طالب کو پہنچا دیتے تھے، ہندوستان میں انہی وراقوں کو نساخ بھی کہتے تھے، یہ لوگ گاہکوں کی تلاش میں کس طرح سرگرداں رہتے تھے اس کا

اندازہ آپ کو دلّی ہی کے ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء سے فوائد الفواد میں منقول ہے کہ حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل رحمۃ اللہ علیہ کو جامع الحکایات عوفی کی ضرورت تھی لیکن غریب آدمی تھے اتنے پیسے ہاتھ پر نہیں چڑھتے تھے کہ اُس کی نقل کا انتظام کریں۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ

روزے نساخ حمید لقب علیہ الرحمۃ بخدمت او (شیخ نجیب الدین) آمد، شیخ نجیب الدین گفت دیر بازست کہ امی خواہم کہ جامع الحکایات را بنویسانیم ہیچگونہ میسر نمی آید"

حمید نساخ نے اس کے بعد جو جواب دیا ہے، اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتابوں کے مہیا کرنے میں ان نساخوں کا کیا حال تھا، سلطان جی نے اس کے بعد فرمایا کہ "حمید گفت حالے چہ موجود داری، شیخ (نجیب) گفت یک درم" حمید غریب کو یہ ایک درم بھی غنیمت معلوم ہوا "آں درم گرفتہ ازاں کاغذ خریدہ آورد و درکتابت شد"

آگے قصہ کا تتمہ یہ ہے کہ سلطان جی نے فرمایا "یک درم را چند کاغذ موجود شدہ باشد" چند کاغذ سے غالباً چند اجزاء مراد ہیں، جس سے گونہ اس زمانہ میں کاغذ کی کچھ قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے

ملا عبد القادر بدا ؤنی نے مشہور شاعر عرفی شیرازی کے تذکرہ میں اس کے معاصر ثنائی شاعر کے دواوین کی عام مقبولیت کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے اُن سے بھی اس زمانہ کی کتب فروشی کی کیفیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں "ہیچ کوچہ و بازارے نیست کہ کتاب فروشاں دیوان این دوکس (عرفی و ثنائی) را در سر راہ گرفتہ نائستند و عراقیاں و ہندوستانیاں نیز بہ تبرک می خرند"[1]

ہندوستان کے شہروں میں اگر واقعی کتب فروشی کا یہی حال تھا کہ ہر کوچہ و بازار میں کتب فروش کتابیں لیے کھڑے رہتے تھے تو پریس کے اس عہد کو اس لحاظ سے کیا

[1] ج ۲ ص ۲۸۵۔

ترجیح حاصل ہوسکتی ہے۔

اس زمانہ کے وراقوں اور نساخوں کے ذریعہ سے کتابوں کے نسخے ملک میں کتنے وسیع پیمانہ پر پھیل جاتے تھے اس کا اندازہ بھی آپ کو ان ہی ملا عبدالقادر کی اسی تاریخ سے ہوسکتا ہے جس سے میں نے مندرجہ بالا عبارت نقل کی ہے، ملا صاحب نے جیسا کہ سب کو معلوم ہے اکبر اور اکبری دربار کا سارا کچا چٹھا کھول کر اس میں رکھ دیا تھا، اس لیے ملا صاحب نے زندگی بھر تو اس کتاب کو صیغۂ راز میں رکھا، اندیشہ تھا کہ ذراسی بھی بھنک حکومت کو لگی تو اُن کی ہی نہیں بلکہ اُن کے آل اولاد خانماں کی خیر نہ تھی، لیکن جب وفات ہوئی تو نساخوں نے کسی طرح اس کی نقل حاصل کی، اور ملک میں اتنی سرعت کے ساتھ اس کے نسخے پھیلا دیے کہ جہانگیر جیسا مطلق العنان بادشاہ بھی ملا کی اس تاریخ کے نسخوں کو معدوم نہ کر اسکا اسی کتاب کی آخری جلد میں جو مقدمہ درج ہے، اُس میں لکھا ہے کہ اس کتاب کو ملا عبدالقادر "تا حیات خود مخفی داشتہ در زمان جہانگیر بادشاہ کہ خبر بمسامع ایشاں رسید" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگ بگولا ہوگیا، ملا بیچارے، سے انتقام لینے کی صورت کیا تھی! نزلہ ان کے خاندان پر ٹوٹا، لکھا ہے "اولاد او را دعبدالقادر را) طلب داشتہ مورد اعتراض ساختند" واللہ اعلم کیا کچھ ان غریبوں کو سنایا گیا، بہرحال ان کی طرف سے یہ عذر پیش ہوا۔ "آں ہا گفتند ما خورد سال بودیم خبرے نداریم"

حالانکہ ظاہر کہ ملا کے "مخفی نسخہ" کو آخر نساخوں تک کس نے پہنچایا ہوگا۔ ملا صاحب کی اولاد یا اُن کی بیوی۔ ان کے سوا مُلا بیچارے کے اس راز خونخوار سے اور کون واقف ہوسکتا تھا، مگر خدا نے فضل کیا، جہانگیر کی سمجھ میں کچھ بات آگئی، تاہم اس کے بعد بھی شاہی فرمان ہوا کہ

ملہ حال ہی میں اخبار ہندو (مدراس) میں ایک خبر یہ شائع ہوئی ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۵۵۸ء میں چھپ چکی تھی لیکن ملک کے مختلف حصوں میں چھاپے خانے بہت کم کھل سکے۔ ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی ترقی میں سست رفتاری کی ایک وجہ یہ بھی کہ مشہور کتابوں کی نقل کے لیے خطاطوں کا انتظام مغلوں نے کر رکھا تھا۔ (اخبار ہندو مدراس ۱۹۴۳ء)

ملّا کی اولاد سے مچلکہ لیا جائے کہ اس کتاب کی اشاعت نہ ہونے پائے، اِن بیچاروں نے مچلکہ دیا جیسا کہ لکھا ہے: "مچلکہ نوشتہ دادند کہ نزد ما ہم رسد سیاست کردنی باشیم" مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا، ان لوگوں کے مچلکہ لینے سے کیا ہوتا۔ کتاب تو ملک میں پھیل چکی تھی، خیال کیا جاسکتا ہے کہ جہانگیر نے کوئی دقیقہ اس کتاب کے غائب اور مفقود کرانے میں اُٹھا چھوڑا ہوگا، لیکن اس زمانہ کی "ورّاقیت" اور "نساخیت" کا نظام اتنا وسیع پیمانہ پر پھیلا ہوا تھا کہ حکومت بھی اس تاریخ کے نسخوں کو معدوم نہ کرا سکی، اور ملّا کی وفات سے لے کر تا ایں دم ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مل سکتی ہے اور اب تو خیر چھپ ہی گئی ہے۔

حالانکہ اس زمانہ میں حکومتیں جب چاہتی ہیں تو مطبوعہ کتابوں کو ضبط کر کے چند ہی دنوں میں ان کو دنیا سے ناپید کر دیتی ہیں، لیکن جہانگیر کی حکومت قاہرہ ایک کتاب کو معدوم کرنے پر قادر نہ ہوسکی، وجہ ظاہر ہے کہ پریس کی وجہ سے نقل کتب کا رواج باقی نہ رہا جن کتابوں کے چھاپنے کی ممانعت کر دی جائیگی ان کا ناپید ہو جانا ناگزیر ہے لیکن اس زمانہ میں گلی گلی کوچہ کوچہ میں آپ کو نساخ مل سکتے تھے حکومت ان کی نگرانی کہاں تک کر سکتی تھی۔ آج ان چابک دستیوں کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے جو نساخیت اور ورّاقیت میں لوگوں کو اس زمانہ میں حاصل تھی بلکہ نقلِ کتب کے جن کمالات کا تذکرہ جستہ جستہ طور پر کتابوں میں پایا جاتا ہے، اگر آج اُن کو بیان کیا جائے تو مشکل ہی سے باور کیا جاسکتا ہے، وہی لوگ نہیں جو اس پیشہ کو معاشی حیثیت سے اختیار کیے ہوئے تھے، بلکہ عام خوش باش لوگوں کی مہارت بھی عجیب تھی، بلگرام کے ایک عالم شاہ طیب قدس سرہٗ کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے ارقام فرمایا ہے "شرح ملّا جامی را دریک ہفتہ من اولہ الی آخرہ نوشت" (مآثر ص ۵۴) شرح جامی کی ضخامت سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ہفتہ میں بڑی تقطیع پر چار پانسو صفحوں کی اس کتاب کا اوّل سے آخر تک نقل کر دینا اس زمانہ میں کیا قابل تصور بھی

ہوسکتا ہے، اور یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی، ان ہی میر طیب کے متعلق مولانا ہی لکھتے ہیں۔

"بہجۃ المحافل کہ کتابے ست ضخیم در سیر نبوی تصنیف یحیی بن ابی بکر العامری الیمنی در بست وسہ روز کتابت کرد"

اب یہ کتاب چھپ چکی ہے، ملتی ہے دیکھ لیجیے، اس کی ضخامت کو ملاحظہ فرمایئے اور تئیس۲۳ دن کی مدت خیال کیجیے ظاہر ہے کہ اسی میں زندگی کے دوسرے ضروری اور دینی مشاغل بھی شریک ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ قلم کیا تھا، ہوائی جہاز تھا۔ میر طیب کی اسی سرعت کتابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا آزاد ان کے متعلق لکھتے ہیں "کتب خانہ عظیمے از خط خوش نمط خود یادگار گذاشت"

اور یہی وہ بات تھی جس کا ذکر میں نے کیا تھا کہ نساخی اور کتابت کا ہنر جس کے ہاتھ میں ہو اس کے لیے کتابوں کی فراہمی اس زمانہ میں کچھ دشوار نہ تھی، جو ایک ہفتہ میں پوری شرح جامی نقل کر کے رکھ دیتا ہو، سوچیے تو بڑی سے بڑی کتابوں کا نقل کر لینا اس کے لیے کیا دشوار ہوسکتا ہے۔

واللہ اعلم میر طیب کے کتاب خانہ میں کون کون سی کتابیں تھیں، لیکن بہجۃ المحافل جیسی کتاب جب ان کے کتب خانہ میں موجود تھی جس سے عوام تو عوام اس زمانہ کے عام علماء جنہیں فن سیرت سے زیادہ لگاؤ نہیں ہے مشکل ہی سے واقف ہونگے، حالانکہ اس فن کی معتبر کتابوں میں اس کا شمار ہے، اسی سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کو نوادر فن کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا، اور کچھ میر طیبؒ کا یہ کوئی خصوصی مذاق نہ تھا، صرف مآثر الکرام میں آپ کو متعدد علماء ایسے نظر آئیں گے جن کے تراجم میں مولانا آزاد عموماً اس قسم کے الفاظ ارقام فرماتے ہیں مثلاً "خط شاں لسنحے بہ پختگی و شیرینی می نوشت و کتب درسی بیروں از حصر در قید کتابت آورد (ص ۲۲۵) "کتب درسی" سے کیا کریا، ماضیاں مراد ہے۔ مولانا آزاد ہی ان کتب درسی کی تفصیل فرماتے ہیں "مطول و تلویح بہ خط شیریں نمط موجود ست" اور صرف نقل ہی پر کفایت نہیں کی جاتی، بلکہ "ہر یک کتاب را من اولہ الی آخرہ تحشیہ نمود" عموماً ان حاشیوں کی

حیثیت کیا ہوتی تھی، شیخ کمال ایک عالم کے ذکر میں مولانا آزاد نے لکھا ہے۔

"کتب درسی از صرف و نحو منطق و حکمت و معانی و بیان فقہ و اصول و تفسیر وغیرہ مجموع بدست مبارک کتابت کرد و ہر یک کتاب را من اولہ الی آخرہ محشی ساخت بہ حیثیتے کہ متن محتاج شرح و شرح محتاج حاشیہ نماند" (مآثر الکرام ص ۲۲۹)

بظاہر اس عبارت کا مطلب وہی معلوم ہوتا ہے کہ بین السطور کے حواشی اور ضمیروں پر ہندسے لگا کر متعلقات کو ص کے حرف سے نمایاں کر کے کلام کی تعقید اور پیچیدگیوں کے ازالہ کا جو عام دستور عہد قدیم میں تھا، اسی پر عمل کیا گیا تھا۔ اور صرف یہی نہیں کہ کتابیں نقل کی جاتی تھیں، ان کی خدمت کی جاتی تھی ان کو اس طرح حل کر کے رکھ دیا جاتا تھا کہ شروح و حواشی کی امداد کے بغیر مطلب سمجھ لیا جائے۔ بلکہ اسی کے ساتھ مولانا آزاد جیسے محتاط بزرگ کے یہ الفاظ ہیں "کہ در تمام کتاب یک نقطہ غلط نتواں یافت" اسی عجیب و غریب مشق اور چابک دستی کا نتیجہ تھا کہ ایک ایک آدمی صرف اپنے قلم سے مستقل کتب خانے مہیا کر لیتا تھا، مشہور ابوالفضل و فیضی اکبر کے درباریوں کے والد شیخ مبارک ناگوری کے حالات میں مولانا آزاد لکھتے ہیں "۔ پانصد مجلد ضخیم بدست خود تحریر نمود" (ص ۱۹۸)

اپنے ہاتھ سے پانسو صرف کتابیں نہیں بلکہ ضخیم کتابوں کا نقل کرنا اس زمانہ میں بلاشبہ ایک افسانہ سے زیادہ شاید نہ سمجھا جائے لیکن خدا نے انسان میں جو کمالات پوشیدہ کیے ہیں جب ان کمالات کو بروئے کار لانے پر کوئی قوم آمادہ ہو جاتی ہے تو وہ ہوا پر بھی اُڑ سکتی ہے، سمندر کو گھر بنا سکتی ہے، اور جو کچھ کر سکتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے، لیکن جن کے مردہ اخلاف کو دیکھ کر ان کے زندہ اسلاف کی طرف اس قسم کے عجائب کا انتساب محل غور و تامل بنا ہوا ہے، شاید قوموں کی موت و حیات کا قانون ان کے سامنے سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ آپ کو آج اسی پر تعجب ہو رہا ہے کہ ایک شخص (ملا مبارک) جن کا ظاہر ہے کہ کتابت ہی پیشہ نہ تھا بلکہ پچاس سال

تک آگرہ میں اپنے درس و تدریس کا غلغلہ بھی اُنہوں نے بلند کر رکھا تھا۔ اس شخص نے پانسو ضخیم مجلدات کو کس طریقہ سے نقل کیا تھا، لیکن شیخ محدث دہلوی نے تو اپنی کتاب اخبار الاخیار میں اسی "زود نویسی" اور مشق کتابت کے واقعات اس سے بھی عجیب تر نقل کیے ہیں حصار (مشرقی پنجاب) میں حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ جنید حصاری رحمۃ اللہ علیہ تھے، شیخ محدث نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ "سرعتِ کتابت او بحدے بود کہ آں را حمل جز بر خارق عادت نتواں نمود" پھر اس معجزانہ زود نویسی کی خود تفصیل فرماتے ہیں کہ "در سہ روز تمام قرآن مجید با اعراب می نوشت"[1] تین دن میں قرآن کے تیسوں پاروں کا لکھنا اور صرف لکھنا ہی نہیں بلکہ اعراب یعنی زیر زبر پیش وغیرہ حرکات بھی ہر ہر حرف پر لگانا، واقعہ تو یہی ہے کہ شیخ جنید کی اسے کرامت ہی خیال کرنا چاہیے، مگر کیا کیجیے کہ واقعہ ایک نہیں ہے، یہ تو شیخ محدث کا شنیدہ ہے۔ برہان پور کے مشہور محدث حضرت عبدالوہاب المتقی جو صاحب کنز العمال شیخ علی المتقی کے ارشد تلامذہ و خلفاء میں ہیں اور ہندوستان سے مکہ معظمہ ہجرت کر گئے تھے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حجاز پہنچ کر ان ہی سے زیادہ تر استفادہ فرمایا تھا، ان کے براہ راست شاگرد ہیں، اپنے انہی اُستاد شیخ عبدالوہاب

[1] آج یہ باتیں محل حیرت ضرور ہیں لیکن جیسا کہ آگے آپ پڑھیں گے ہزار ہزار سطروں کا یومیہ لکھ لینا لوگوں کے لیے جب مشکل نہ تھا، تو تین دن میں پورا قرآن اگر لکھ لیا جاتا تھا تو کیا تعجب ہے "تذکرہ خوشنویسان" نامی کتاب میں جو ایک معتبر کتاب ہے آئندہ بھی ممکن ہے اس کے حوالے آئیں۔ اسی کتاب میں "مولانا سیمی" کے زیر عنوان لکھا ہے "در پیشۂ خط مہارت داشت در ہر فن مرد مستعد و صاحب کمال اول در نیشاپور بود بعد ازاں بہ مشہد مقدس رضوی ساکن شد و در عہد علاء الدولہ شاہزادہ بن بالسنغر مولانا سیمی در یک شبانہ روز سہ ہزار بیت نظم کرد و بطور کتابت خوشنویسانہ نوشتہ" ص ۵۰ منشورہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ

غور کرنے کی بات ہے کہ تین ہزار اشعار اتنی قلیل مدت یعنی کل چوبیس گھنٹوں میں صرف منظوم ہی نہیں ہوئے بلکہ شاعر نے انہیں لکھ بھی لیا، صرف لکھا نہیں بلکہ خوشنویسانہ شان کے ساتھ لکھا۔ مسلمانوں نے جب مہارت کو اس نقطۂ کمال تک پہنچا دیا تھا، تو میں نہیں سمجھتا کہ محض اس لیے کہ اس زمانہ میں ایسے ماہرین چابکدست چونکہ نہیں پائے جاتے اس لیے باور کرنا چاہیے کہ کسی زمانہ میں بھی نہیں پائے جاتے تھے۔ یہ کونسی منطق ہو سکتی ہے۔

کے متعلق اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں کہ "ایشاں خط نستعلیق را بسیار خوب نوشتند" یہ اُس وقت کا حال ہو جب شروع شروع مکہ معظمہ گئے تھے اور شیخ علی المتقی کے حلقہ میں شریک ہوئے تھے۔ شیخ علی نے ان کو خط نسخ (عربی) کی مشق کا حکم دیا، چند ہی دنوں میں وہ صاف ہو گیا، حتیٰ کہ "در اندک مدت خط نسخ نیز حُسن صورت پذیرشد" محدث دہلوی نے پھر ان کی زود نویسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہو کہ "کتابے بود مواز نۂ دوازدہ ہزار بیت" شیخ علی المتقی جو شیخ عبدالوہاب سے عموماً لکھوانے کا کام لیتے تھے، ان کو اسی بارہ ہزار بیت کی کتاب لکھوانے کی جلدی تھی، شیخ محدث فرماتے ہیں "در نوشتن واستنساخ آں استعجال می کردند" شیخ عبدالوہاب نے اپنے پیر کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اتنی طویل کتاب کو کتنے دن میں لکھا؛ محدث دہلوی کی اپنے استاد کے متعلق یہ شہادت ہو کہ "در دوازدہ شب تمام کردند" شب کا یہ مطلب نہیں ہو کہ اس میں دن بھی شریک تھا خود شیخ محدث کی تصریح ہو "ہر شب ہزار بیت سطر[1] می نوشتند با کتابہائے دیگر کہ در روز می کردند (ص ۲۶۹۔ اخبار)

پھر جب ایک رات میں ہزار بیت ایک شخص لکھ سکتا تھا، دن کے دوسرے لکھنے پڑھنے کے مشاغل کے ساتھ لکھ سکتا تھا، اور یہ شیخ ہی کے اُستاد کا قصہ ہو تو شیخ جُنید اگر تین دن میں قرآن کامل باعراب لکھ لیتے تھے، اس میں کیوں تعجب کیجیے۔ قومیں جب زندہ ہوتی ہیں ان کا یہی حال ہوتا ہے ابن جوزی، ابن عساکر، ابن حجر، السیوطی، والامام الرازی، الخطیب البغدادی، الذہبی وغیرہ علمائے اسلام نے علم کے جن ذخیروں کو مہذب اور مرتب کیا ہو، ان کی تنقیح و تحقیق کی ہو، دنیا میں آج اُن کے کارناموں کا سرمایہ بحمداللہ موجود ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہو کہ ہم جس چیز کو سوچ نہیں سکتے، وہی ان بزرگوں نے کر کے دکھایا ہو، ان میں کتنے ہیں جن کی پوری عمر کے حساب سے روزانہ تین چار جز تصنیف کا اوسط پڑتا ہو۔

الخطیب نے ابن شاہین محدث کے ذکر میں ان کی اُس روشنائی کا حساب جو حدیثوں کے لکھنے میں خرچ ہوئی ہو اگر اُس کو جمع کیا جائے تو شاید منوں سے متجاوز ہوگی۔ اور سچ تو یہ ہو کہ لوگ اس غریب ہندوستان کو گھر سمجھ کر شاید اس کی قدر نہیں پہچانتے ورنہ اسی ہندستان کے تو آخر شیخ

[1] (صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ ہو)

علی المتقی بھی تھے، جن کی ایک ہی کتاب کنز العمال کی ضخامت کیا کم تھی، ہزار ہا صفحات پر پھیلی ہوئی ہے لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کتاب کے سوا لکھا ہے کہ "تو الیف وے از صغیر و کبیر دعربی و فارسی از صد متجاوز ست"

خود فیضی جس نے نسبتاً کم عمر پائی ہے ماثر الامراء میں لکھا ہے کہ "یک صد و یک کتاب تالیف شیخ است (مآثر الامراء ج ۱ ص ۵۸۵)

ہم ناخلف ہیں کہ اپنے بزرگوں کے متروکوں کی حفاظت نہ کرسکے ورنہ اسی ہندوستان میں خواجہ حسین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں ان کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے۔ شیخ محدث نے لکھا ہے کہ ان کی ایک تفسیر "نور النبیؐ" نامی ہے جس کی تیس جلدیں ہیں، شیخ فرماتے ہیں

او تفسیرے دارد مسمّٰی نور النبی بر ہر جزوے از قرآن (یعنی ہر پارہ) مجلدے نوشتہ است وحل تراکیب و بیان معانی قرآن از انچہ در تفسیر لامی باشد بتفصیل وتسہیل ہرچہ تمام تر بیان فرمود (ص ۱۸۲)

اور تیس جلدوں میں یہ تفسیر ان کی ایک ہی کتاب نہیں ہے۔ مفتاح العلوم سکاکی کی قسم ثالث پر بھی ان کی شرح ہے۔ شیخ احمد غزالی جو امام غزالی کے بھائی ہیں ان کی مشہور رسوانح پر بھی ان کا حاشیہ ہے۔ اس

---

[1] تاریخ بغداد میں ابن شاہین کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے "صنعت ثلاثمائۃ مصنف وثلاثین مصنف (ابن شاہین نے تین سو تیس کتابیں تصنیف کی ہیں، اور کیسی کتابیں؟) احدہا التفسیر الکبیر الف جزو المسند الف جزو خمسمائۃ جزو والتاریخ مائۃ وخمسین جزء والزہد مائۃ جزء (یعنی ایک ہزار جزء میں ان کی تفسیر کبیر تھی اور ایک ہزار پانسو جزء میں مسند، تاریخ ایک سو پچاس جزء، زہد کی کتاب سو جزء) الخطیب نے ان کے حوالہ سے یہ قول نقل کیا ہے۔ کتبت باربعمائۃ رطل حبرا (میں نے چار سو رطل حبر (روشنائی) سے لکھا ہے) اسی کے بعد محمد بن عمر بن اسماعیل داؤدی کے واسطے یہ قول بھی منقول ہے داؤدی کہتے تھے۔ سمعت ابا حفص بن شاہین یقول حسبت یوما ما اشتریت بہ الحبرالی ہذا الوقت فکان سبعمائۃ درہم (یعنی میں نے لکھنے میں جتنا حبر (روشنائی) استعمال کی ہے اس کا ایک دن حساب کیا تو پانسو درہم ہوئے) آگے الداؤدی کا یہ اضافہ بھی ہے کہ "وکنا نشتری الحبر اربعۃ ارطال بدرہم (یعنی چار رطل روشنائی ہم ایک درہم میں خرید اکرتے تھے) رطل کو اگر آدھ سیر کے مساوی بھی مان لیا جائے تو اس حساب سے خود ہی غور کیجیے کہ ابن شاہین نے روشنائی کی کتنی مقدار خرچ کی تھی، الخطیب نے دوسرے مقامات میں لکھا ہے کہ حبر اور مداد میں فرق تھا، مداد تو سیاہ روشنائی کو کہتے تھے اور حبر سرخ روشنائی کو۔ ایسی صورت میں گویا ابن شاہین کے متعلق اس حساب کا تعلق صرف سرخی سے رہ جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ دیکھو تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۷

[2] یہ تو ان کی تصنیفات کی تعداد ہے، نقل کتب میں بھی شیخ کو کمال تھا۔ علامہ عبدالوہاب شعرانی نے (بقیہ بر صفحہ)

سوا بھی چیزیں ہیں، یوں ہی دولت آبادی کی تفسیر بحر مواج از یں قبیل متقدمین میں بھی متاخرین میں بھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ مولانا عبدالحیی فرنگی محلی کی تصنیفوں کی مقدار کیا کچھ کم ہے، خصوصاً مؤخر الذکر جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چالیس سے کچھ ہی بعد وفات پا گئے، ان کی عمر کو دیکھیے، اور تصنیف کے سوا تدریس و افتا کے کاروبار کو ملاحظہ فرمائیے۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ہم بے برکتوں کے وقت کا جو پیمانہ ہے اس پر ان بزرگوں کے اوقات کا قیاس کرنا کیا صحیح ہو سکتا ہے؟ خود در زمانہ تست کے مصنفوں میں حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ العالی کی تالیفات کی تعداد کماً اور کیفیۃً کیا ان ہی نوادر کی زندہ توثیق اپنے اندر نہیں رکھتیں؟[1]

اللہ اللہ یہی ہندستان تھا جس میں ایسے مصنف بھی گذرے ہیں جو قوتِ بینائی سے محروم ہو چکے تھے لیکن تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری تھا اور کیسی تصنیف! گیارہویں صدی کے مشہور مصنف صاحب الحواشی المفیدہ سہارنپور کے رہنے والے مولانا عصمت اللہ کے متعلق

(بقیہ حاشیہ ص۵۹) طبقات الصوفیہ الکبریٰ میں ان کا تذکرہ درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اطلعنی علی مصحف بخط کل سطر منہ حزب فی ورقۃ واحدۃ" (یعنی کل ایک ورق میں پورا قرآن انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا ایک سطر میں پاؤ پارہ ختم کر دیا گیا تھا)

[1] بحمد اللہ ابھی اسلام کا یہ زندہ معجزہ ہم مسکینوں کے سر پر سایہ فگن ہے ومتعنا اللہ بطول حیاتہ ۱۹۳۰ء یعنی آج سے بارہ سال پہلے مجلس مبارک میں کتابوں کا ذکر آیا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی اپنے پیر کی دعا کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا تھا کہ اس وقت تک پانسو انتیس کتابیں حضرت تصنیف فرما چکے ہیں اور اس طرح شمار نہیں کیا کہ مثلاً بارہ جلدیں تفسیر کی ہیں وہ بارہ شمار کی گئی ہوں بلکہ اُن کو ایک ہی کتاب قرار دے کر پانسو انتیس ہوتی ہیں اور خدا ہی جانتا ہے کہ ان بارہ سالوں میں اور کتنا اضافہ ہو چکا ہے۔ افسوس ہے کہ ان سطروں کی کتابت کے بعد خدا کی یہ بخت خزانہ رحمت کی طرف منتقل خود شیخ محدث عبدالحق دہلوی کے متعلق تذکرہ علمار ہند میں لکھا ہے۔ میگویند کہ تصنیفاتش خورد و کلاں از صد متجاوز است۔ اسی کتاب میں یہ عجیب بات شیخ کے متعلق لکھی ہے کہ اشعار ریشمار ابیات تقریباً پنج لک می رسد ص۱۰۹ تذکرہ علمار ہند لیکن میرے نزدیک غالباً مصنف تذکرہ کو کچھ مغالطہ ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شیخ محدث کبھی کبھی شعر بھی موزوں فرما لیتے تھے۔ اخبار میں آپ کے اشعار کے نمونے موجود ہیں، ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں شیخ کا تذکرہ درج کرتے ہوئے آپ کے اشعار کا ذکر کیا ہے لیکن پانچ لاکھ اشعار کا انتساب شیخ کی طرف صحیح نہیں ہے۔ غالباً بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہوا ہے کہ شیخ محدث کے قلم نے پانچ لاکھ ابیات لکھے، یہی بیت کا لفظ وجہ مغالطہ ہے۔ عموماً مراد اس سے شعر ہی لیا جاتا ہے، لیکن اُس زمانہ میں ایک سطر کو بھی ایک بیت کہتے تھے۔ غالباً شیخ محدث نے جو کچھ لکھا ہے سطروں کے لحاظ سے اُس کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچی ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ اشعار کے لحاظ سے سب سے

مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں۔

"از مشاہیر علماء ہند است اگرچہ مکفوف (نابینا) اند، اما بینایاں را راہ دانش وبینش می نمودند"

شرح جامی اور تصریح (ریاضی کی مشہور درسی کتاب) کے حواشی ملا عصمت اللہ مرحوم کی جس نے دیکھی ہے وہ اندازہ کرسکتا ہے کہ سہارن پور کے بہ ظاہر ان نابینا عالم کو خدا نے کیسی اندرونی بینائی عطا فرمائی تھی خصوصاً تصریح کی شرح جو چھپ بھی چکی ہے کم از کم اپنی طالب العلمی کے دنوں میں اس سے زیادہ سلجھی ہوئی کتاب مسائل تصریح کے حل کے سلسلہ میں مجھے نہیں ملی تھی۔

ملا مبارک ناگوری پدر ابوالفضل وفیضی کے حالات میں مولانا غلام علی نے لکھا ہے کہ

"در پایانِ عمر باآنکہ باصرہ از کار رفتہ بود بہ قوت حافظہ تفسیرے بہ قید قلم اور در چہار مجلد مسمّی "منبع عیون المعانی"

مولانا نے ارقام فرمایا ہے کہ اس تفسیر کی تصنیف میں ملا مبارک نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ

"عبارت را مسلسل تقریر می کرد و دبیران (کاتباں) کسوت تحریر می پوشانیدند صہ ۱۱"۔

گویا ملا نے بہ طریق املا یہ تفسیر لکھوائی تھی۔

بہر حال ملا مبارک اپنے اعمال واطوار اخلاق وعادات، افکار وخیالات کے لحاظ سے کچھ بھی ہوں، لیکن معقولات ومنقولات میں ان کا جو پایہ بیان کیا گیا ہے خصوصاً احمد آباد پہنچ کر خطیب ابوالفضل الگازرونی سے استفادہ کا نادر موقعہ ان کو جو مل گیا تھا اور جیسا کہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ملا کے متعلق لکھا ہے کہ الگازرونی سے

"اسالیب تصوف واشراق برخواندند وفراواں کتب نظر وتالہ (الہیات) دیدہ شد خاصہ شیخ ابن عربی ابن فارض وصدر الدین قونوی"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عقلی علوم میں ملا مبارک کی حذاقت ومہارت غیر معمولی تھی۔ الگازرونی کوئی معمولی عالم نہ تھے، وہ علامہ جلال الدین دوانی کے براہ راست شاگرد تھے۔ دوانی کا جو مقام عقلیات میں ہے اس سے اہل علم کے طبقہ میں کون ناواقف ہے، اور جلال

تو ملا کا عقلی علوم میں تھا، حدیث ملا مبارک نے میر رفیع الدین الایجی الشیرازی سے آگرہ میں پڑھی تھی، اور میر رفیع الدین صاحب کے متعلق ابوالفضل ہی نے لکھا ہے۔

ج ۳ ص ۲۰۳

"در جزیرۂ عرب انواع علوم نقلی از شیخ سخاوی مصری قاہری تلمیذ شیخ ابن حجر عسقلانی برگرفت (آئین اکبری)"

یعنی بدو واسطہ ملا مبارک ناگوری حافظ الدنیا علامہ ابن حجر العسقلانی کے شاگرد تھے، اس تعلق سے حدیث و سیر و رجال کا جو مذاق ملا میں پیدا ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔

اسی بنیاد پر باہمہ مالہ وما علیہ یہ توقع شاید غلط نہ ہو کہ ملا مبارک کی یہ املا کرائی ہوئی تفسیر اپنے اندر کچھ نہ کچھ خصوصیت ضرور رکھتی ہوگی، ضخامت بھی کم نہیں ہے۔ مولانا غلام علی نے ماثر الکرام میں تو "چار مجلد" میں اس تفسیر کو تبلایا ہے، اب خدا جانے کاتب کی غلطی ہے یا کیا ہے، فیضی کی بے نقط تفسیر (جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے آئیگا) اس کے خاتمہ نگار واللہ اعلم کون صاحب ہیں یہ لکھا ہے کہ

"از تصانیف وے تفسیرے ست مثل تفسیر کبیر امام در چہار دہ مجلد کبار کہ فیضی در سواطع ذکر وے کرد"

مگر سواطع میں مجھے اس چہار دہ مجلد کبار کا پتہ تو نہ چلا البتہ اتنا اشارہ اس کے دیباچہ میں ضرور ہے کہ میرے والد نے ایک تفسیر "الامام" کے طرز پر لکھی ہے جس سے ظاہر ہے امام رازی ہی مراد ہو سکتے ہیں اس خاتمہ نگار نے ملا مبارک کی اس تفسیر کا نام بھی ذرا بدل دیا ہے یعنی "منبع نفائس العیون" لیکن مولانا غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان : کم از کم نام کی حد تک زیادہ قابل اعتماد ہونا چاہیے۔ البتہ جلدوں کی تعداد میں ممکن ہے کہ مولانا کی کتاب میں "دہ" کا لفظ چھوٹ گیا ہو۔

طباطبائی بہار کے مشہور مورخ نے سیر المتاخرین میں بھی اس تفسیر کا ذکر کیا ہے، مگر ایک عجیب

ف البدایونی باوجودیکہ ملا کے بھی شاگرد ہیں لیکن اپنی تاریخ میں اکبری فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "ایں ہمہ آتش از آگرہ (ملا مبارک کا تعلیمی مرکز) برخاستہ کہ خانماں اکابر و اصاغر ازاں سوخت ... بداؤنی نے سچ لکھا ہے ؎

تو اے مرد سخن پیشہ کہ ہر چند ستے دوں ۔۔۔ ز دین حق باندستی بہ نیروی سخن دانی

چہ سستی دیدی از سنت کہ رفتی سوے بے دینا ۔۔۔ چہ تقصیر آمد از قرآں کہ گردی گرد الآنی

یہی خاندان تھا جو کل "کوچہ ذکر" "الآن" کی لذتوں میں ڈوب گیا تھا۔ وشرالناس شرار العلماء سخن پیشوں نے ہمیشہ دنیا پر مصیبت نازل کی اور آج بھی "نیروی سخن دانی" ہی کے بل بوتے پر حدیث کا بھی انکار ہو رہا ہے۔ قرآن کا بھی مطلب بدلا جا رہا ہے

مقالات احسانی

واقعہ کے ساتھ لکھا ہے کہ

"شیخ مبارک در زمانِ حیات خود تفسیرے برائے قرآن مجید درست تصنیف کردہ بود و شیخ (ابوالفضل) بعد رحلتِ پدر بے آنکہ موافق رسمِ دنیا عنوان کتاب بنام پادشاہ موشح گرداند نسخہ ہائے بسیار نویسانیدہ باکثر ولایاتِ اسلام فرستاد"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفضل کو اپنے باپ کے اس کارنامہ پر اتنا ناز تھا کہ اظہار فضل کے لیے اسلامی ممالک میں اس کے نسخے بھیجے گئے، مگر صلہ نہ شد بلا شد" طباطبائی کا بیان ہے کہ

"چوں این معنی (عدم ادخال نام پادشاہ) بعرض اکبر رسید از غرور یکہ داشت سخت برآشفت و شیخ ابوالفضل را مورد عتاب گردانید"

لکھا ہے کہ دربار میں آمد و رفت بند کر دی گئی، بڑی مشکل سے اُڑی ہوئی چڑیا پھر ہاتھ آئی، میرا خیال ہے اور طباطبائی کی اسی عبارت سے ذہن منتقل ہوا کہ غالباً یہ تفسیر ممکن ہے اکبر ہی کے اشارہ سے لکھی گئی ہو اسی لیے ناراضی بھی زیادہ ہوئی وجہ اُس کی یہ ہے کہ آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے ایک مستقل باب اس کا باندھا ہے کہ اس میں اکبر کے اقوال جمع کیے جائیں "می فرمودند" "می فرمودند" اس کا عنوان ہے ان ہی "می فرمودندوں" میں ایک "می فرمودند" اکبر کا یہ بھی ہے۔

نقرہ ۱۲۲ "می فرمودند عجب است کہ در زمانِ پیغمبر[۲] تغییر قرار نہ گرفت تا دگرگونگی راہ نیافتے"

---

[۱] حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق میں نے اپنے مضمون میں ملا عبدالقادر کے حوالے سے اکبر کی جن فتنہ سامانیوں کا ذکر کیا ہے بعضوں کو اس پر اعتراض ہے کہ ملا کا بیان حجت نہیں ہے، حالانکہ میں نے ملا عبدالقادر کا حلف نامہ بھی نقل کیا ہے لیکن پھر بھی لوگوں کو اعتبار نہ ہوا۔ ایسے حضرات کے لیے مناسب ہوگا کہ اس می فرمودند کا مطالعہ فرمائیں کہ اس میں وہ سب کچھ ہے جو عبدالقادر نے لکھا ہے۔ دشمن کی شہادت اگر قابل اعتبار نہیں تو کیا دوست کی گواہیوں میں بھی شک کیا جائیگا۔

[۲] آئینِ اکبری میں بھی پہلی اور غالباً آخری جگہ ہے جس میں "پیغمبرما" کا لفظ اکبر کے مُنہ سے نکلا ہے، ورنہ وہ خود بھی اور ابوالفضل بھی اسلام کا ذکر ہمیشہ "کیش احمدی" سے کرتے ہیں گویا وہی "محمد نژم" اُس زمانہ میں "احمد نژم" بن چکا تھا: تاہم اس فقرہ میں اس لفظ پر میری نظر جب پڑی تو خیال گذرا کہ "بہانہ جوئی" جس رحمت کا قانون ہے وہاں یہ انتساب کون کہہ سکتا ہے کہ بے کار جائیگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اکبر بیچارہ تو دنیا سے چلا گیا اور اُس کا (باقی بر صفحہ ٦٤)

"دگرگونگی" سے غالبًا اکبر کی مُراد مفسرین کے مختلف اقوال کی طرف ہے اور یہی اختلاف کا ہتھکنڈا تھا جس سے علمارِ سوء اس کے دربار میں اپنے دوسرے معاصرین پرسبقت لیجانے کی کشمکش میں مصروف ہوئے جس کا قصہ "الف ثانی کی تجدید" کے ذیل میں بیان کرچکا ہوں۔ اور اُس سے معلوم ہوتا ہو کہ قرآن کی کسی اچھی تفسیر کا اکبر بھی آرزومند تھا، ممکن ہو کہ ملا مبارک نے اسی آرزوئے شاہانہ کو پورا کیا ہو۔ عتاب کی وجہ ہوسکتی ہو کہ یہ بھی ہو کہ کتاب میں نے لکھوائی اور اُس شخص نے مجھے الگ کرکے صرف اپنے باپ کی فضیلت کا علم بلند کردیا۔

فیضی نے بھی جب اپنی تفسیر پوری کی، تو ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ "چند جزو برائے انتشار در عراق فرستاد" (منتخب ص ۳۹۳)

جیساکہ میں نے عرض کیا کہ فیضی کی اس تفسیر کا ایک خاص موقع پر ذرا تفصیل سے ذکر کرونگا، اور وہیں معلوم ہوگا کہ بیرون ہند کے اسلامی ممالک پر اس کا کیا اثر پڑا۔ اس وقت ابوالفضل نے اپنے والد کی تفسیر کے "نقول بسیار" جو اکثر اسلامی ممالک میں بھیجے اور فیضی نے اپنی تفسیروں کے بعض اجزا، عراق روانہ کیے، اس سے بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ بعض وجوہ سے اس زمانہ میں کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ عہد پریس و مطابع سے بھی زیادہ آسان تھا، آج تو کسی کتاب کی اشاعت طباعت سے پہلے ناممکن ہو، لیکن اُس زمانہ میں کتابت کے معمولی مصارف سے نقول کا حصول چونکہ آسان تھا، یا مصنف خود بھی اپنی تصنیف کی چند نقلیں تیار کرسکتا تھا۔ اس لیے بآسانی ہر جگہ کتاب پہنچ جاتی تھی اور اس کے بعد نقل در نقل کا سلسلہ وراقوں کے ذریعہ سے شروع ہوجاتا تھا اور یوں تھوڑے دنوں میں کتاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳) معاملہ خدا کے ساتھ ہے بعضوں نے تو لکھا ہو کہ مرنے سے پہلے توبہ کی بھی توفیق ہوئی تھی۔ بہر حال میں نے مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے مقالہ میں اکبر کے متعلق جو کچھ لکھا ہو اُس سے میرا اشارہ اس فتنہ کی طرف ہو جو اس شخص کی ناسمجھی خامی عقل سے پیدا ہوا اور یہ واقعہ ہو کہ اکبری فتنہ کی تاریکی کا جسے علم نہ ہوگا، مجدد کی تجدید کی روشنی کا وہ کیا اندازہ کرسکتا ہے کہ "وبضدہا تتعرف الاشیاء"

پورے اسلامی ممالک میں پھیل جاتی تھی۔

بہرحال گفتگو اس میں ہو رہی تھی کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں تعلیم کا جو نظام تھا اس میں کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ کیسے حل کیا گیا تھا؟ میں نے اسی کے متعلق بعض چیزیں آپ کے سامنے پیش کیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس عہد کے کتابی مذاق کا اندازہ اس زمانہ میں صحیح طور پر کیا بھی نہیں جا سکتا کتابوں کی اشاعت اور اس لیے کہ لکھنے لکھانے میں سہولت پیدا ہو گئی بعض علماء نے اپنی عبادت و ریاضت کا ایک جزء یہ بھی قرار دے رکھا تھا کہ طلباء میں کتابیں تقسیم کرتے تھے، قلم بانٹتے تھے اور حد یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے سیاہی بنا بنا کر اہل علم میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ نظر اللہ حضرت شیخ علی متقی صاحب کنز العمال کے حال میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ علاوہ اس مشغلہ کے یعنی "در دادنِ کتب و اسباب کتب و اعانت دریں باب بجد بود" یعنی جہاں تک ممکن تھا لوگوں میں کتاب اور اسباب کتب تقسیم فرماتے تھے۔[۱] انتہا یہ ہے کہ "بدست خود سیاہی درست می کردند و بطالب العلمان می دادند"

مولانا غلام علی آزاد نے بھی ملا احمد بن طاہر فتنی (پٹنی) جو گجرات کے مشہور محدث عالم تھے اور غریب الحدیث میں مجمع البحار رجال میں مغنی ان کی متداول کتابیں ہیں ان کے حال میں مولانا نے لکھا ہے کہ سیاہی بنا کر اہل علم میں تقسیم کرنے کا ذوق ان پر اتنا غالب تھا کہ

"مداد برائے نسخہ نویساں علوم حل می کرد، بہ حدے کہ در وقت درس گفتن ہم بہ حل کردن مرکب مشغول می بود" روشنائی

(ماثر الکرام ص ۱۹۵)

[۱] اور یہ مسلمانوں کا کسی زمانہ کا ایک عام دستور معلوم ہوتا ہے۔ خاکسار جب ٹونک میں پڑھتا تھا تو چند علمی گھرانے شہر میں ایسے تھے جن سے طلبہ اپنے پڑھنے کے لیے کتابیں مانگ کر لایا کرتے عموماً بے عذر دے دی جاتی تھیں۔ صاحب تذکرہ علماء ہند نے خود اپنا واقعہ لکھا ہے کہ جن دنوں مچھلی شہر میں وہ پڑھتے تھے وہاں مفتی علی کبیر صاحب کے پاس بڑا کتب خانہ تھا۔ کتابے کرمی طلبیدم بہموں ہیئت کہ داشت از الماری برآوردہ می داد" البتہ دیتے ہوئے مفتی صاحب ایک دلچسپ شعر ضرور پڑھتے تھے "کتابم می ہم لاکن بایں شرط؛ کہ طبل و بوق و صندوقش نہ سازی۔ مطلب یہ تھا کہ طلبہ کتابوں کے استعمال میں بے احتیاطی کرتے ہیں کوئی صاحب تو طبلہ بنا کر بجاتے ہیں۔ کوئی ورقوں کا باجہ بناتے ہیں، کوئی ہر قسم کے کاغذ جلدوں کے بیچ میں رکھ دیتے ہیں جس سے جلد ٹوٹ جاتی ہے بعض کتابوں سے تکیہ کا بھی کام لیتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ یہ حرکتیں نہ کرنی چاہئیں۔

دست بکار، وزبان بگفتار آن واحد میں شیخ نے ان دونوں سعادتوں سے متمتع ہونے کا عجب طریقہ نکالا تھا، اور اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں "فراہمی کتب" کے مسئلہ کو کتنی اہمیت حاصل تھی، زبان سے سبق بھی پڑھا رہے ہیں اور ہاتھ سے سیاہی بھی گھوٹی جا رہی ہے۔ بازار سے سوان اور واٹرمین کی دواتوں کی خریدنے والی نسلیں تو آج اس سے بھی ناواقف ہیں کہ سیاہی بھی گھر میں بنانے کی چیز ہے۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے تک پرانے مکتبوں میں تھوڑا بہت رواج اس کا باقی تھا، لیکن اب تو وہ بھی نابود ہو گیا۔ ملا عبدالنبی احمد نگری نے اپنی کتاب دستور العلماء میں سیاہی بنانے کے چند نسخے بھی درج کیے ہیں، لیکن اب ان کی نقل کرنے سے کیا فائدہ۔

ان محدثین کبار جن پر ہندوستان کو بجا طور پر ناز ہے، آج تو آپ شیخ علی متقی، اور ملا طاہر کا صرف نام سن رہے ہیں لیکن جس عہد میں یہ اکابر موجود تھے اس وقت ان کی عظمت وجلالت کا پھریرا جس بلندی پر اڑ رہا تھا، اس جلالت اور عظمت کے باوجود سیاہی گھونٹنے کا کام کرنا اور وہ بھی اپنی ذاتی ضرورتوں ہی کے لیے نہیں بلکہ نسخہ نویسوں اور طلبۂ علم میں تقسیم کرنے کے لیے ایسے معمولی ہلکے شغل میں مشغول ہونا بلا شبہ حیرت انگیز اور اس بلند معیار کو ظاہر کر رہا ہے جو علم اور دین کو اس زمانہ میں حاصل تھا۔

ملا احمد بن طاہر وہی بزرگ ہیں، جن کے متعلق مولانا آزاد اور دوسرے مورخین نے لکھا ہے کہ گجرات کے مہدوی فتنہ کے مقابلہ کا عزم کرتے ہوئے شیخ نے اپنی دستار سر سے اتار دی تھی اور فیصلہ کیا تھا کہ جب تک اس فتنہ کا استیصال کلی نہ ہوگا سر فضیلت کے اس عمامہ کو نہیں باندھوںگا شیخ اسی حال میں تھے کہ گجرات پر اکبر حملہ کرتا ہے، اور مغلیہ محروسہ کا گجرات جزو بن جاتا ہے۔ اکبر کو شیخ اور شیخ کے اس مقدس عزم کی خبر ملتی ہے، اس وقت اکبر ملا عبدالقادر کا مقتدی اکبر تھا، فیضی اور ابوالفضل کا بظاہر پیر اور بہ باطن مرید نہیں ہوا تھا، سنتے ہیں اکبر نے کیا کیا۔ وہ شیخ احمد کے آستانہ پر حاضر ہوتا ہے اور "پادشاہ دستار بدست خود بر سر شیخ (احمد بن طاہر) پیچید" اکبر اپنے ہاتھ سے ملا احمد کی اتری ہوئی یا اتاری ہوئی پگڑی کو باندھتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے" باعثِ ترک دستار بہ سمع رسید، نصرت دین متین بر دفق

ارادۂ شما بر ذمہ معدلت من لازم است" ص ۱۹۵۔ یعنی پگڑی اتارنے کا جو سبب ہے میرے کان تک بھی اس کی خبر پہنچی ہے، دین متین کی امداد و نصرت آپ کے ارادہ کے مطابق میرے جذبۂ عدل پر واجب ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ابوالفضل و فیضی کے ذکر میں میرا قلم قابو سے باہر ہو جاتا ہے مگر "دینِ متین کی نصرت کی اس عزیز قوت" کو جن قوتوں نے برباد کیا، برباد ہی نہیں کیا، بلکہ بجائے نصرت کے اسی قوت کو اسی دین کی تحقیر و اہانت بغض و عداوت میں لگا دیا، انصاف شرط ہے، کیا ان کے ذکر پر اسلامی و ایمانی جذبات اپنے تلاطم کو روک سکتے ہیں، اور یہ تھا ملا احمد کا مقام رفیع دنیا میں لیکن باوجود اس کے وہی جس کے سر پر اکبر بادشاہ پگڑی باندھتا تھا اس کا ہاتھ "مداد برائے نسخہ نویسانِ علوم حل می کرد" کے مشغلہ میں بھی مصروف تھا، رضی اللہ عنہ، یہی کیفیت شیخ علی المتقی کی تھی جو ملا احمد بن طاہر کے استاد تھے، محدث دہلوی شیخ عبدالحق نے اخبار میں لکھا ہے کہ گجراتی سلطان بہادر خاں مدت العمر اس آرزو میں رہا کہ شیخ متقی اس کے شاہی محل سرا کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سعادت اندوزی کا موقعہ دیں، لیکن آرزو پوری نہیں ہوتی تھی، وقت کے قاضی عبداللہ السندی کو بادشاہ نے تیار کیا کہ کسی طرح سمجھا بجھا کر ایک ہی دفعہ سہی شیخ کو شاہی کوشک میں لے آئیں، السندی بڑی جد وجہد کے بعد کامیاب ہوئے، مگر شیخ نے شرط کر دی تھی کہ بادشاہ کے ظاہر یا باطن میں اگر کوئی اجنبی غیر اسلامی عنصر نظر آئیگا، تو میں خاموش نہیں رہ سکتا، بر سر دربار ٹوک دونگا۔ شرط منظور کر لی گئی۔ شیخ سے بادشاہ نے کہلا بھیجا "ملازماں ہر چہ دانند بگویند و بکنند" شیخ تشریف لائے اور جو جی میں آیا، گجرات کے اس بادشاہ کے منہ پر فرماتے چلے گئے، محدث دہلوی نے لکھا ہے "نصیحتے کہ بائست کرد" اور اٹھ کر چلے آئے، اس کے بعد کیا ہوا، اس زمانہ کے مولوی کے سینے میں حوصلہ ہے جو یہ سُن سکتا ہے فرماتے ہیں لاکھ دو لاکھ نہیں "یک کرور تنکہ گجراتی فتوح فرستاد"

واللہ اعلم گجراتی تنکہ کی قیمت کیا تھی، تاہم وہ تنکہ ہی تھا، روپیہ سے کیا کم ہوگا۔ اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ نہیں بلکہ میرے نزدیک تو ہم جیسوں کے لیے یہ دل ہلا دینے والا شرم

سے گردنوں کو جھکا دینے والا واقعہ ہے کہ "آں مبلغ یک کروتنکہ گجراتی را بہ تمام بقاضی عبداللہ السندی مذکور دادند" دنیا کے بادشاہ نے جو کچھ بھی بھیجا تھا، دین کے بادشاہ نے اس کو پھر اسی کے ملازم کے حوالہ کردیا، فرمایا کہ "ایں فتوح بہ توسل او آمدہ است ایں مستحق او ہموں است" شیخ علی المتقی کی اس رفعت شان کو ملاحظہ فرمایئے اور اس کے ساتھ شیخ محدث کے الفاظ "بدست خود سیاہی راست می کردند" کے عمل پر غور کیجیے، سوچیے کہ علم کے خدمتگاروں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفاداروں نے چلنے والوں کے لیے کیسے عجیب وغریب نمونے چھوڑے ہیں۔ رزقنا اللہ اتباعھم

شیخ علی المتقی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں تو اشاعت و نشر کتب کے متعلق اس سے بھی زیادہ نادرہ کاریاں نظر آتی ہیں۔ اخبار الاخیار ہی میں ہے اور اس لیے یہ شہادت زیادہ قابل توجہ ہے کہ شیخ محدث نے اس واقعہ کو علی المتقی کے براہ راست تلمیذ و خلیفہ شیخ عبدالوہاب سے گوش خود مکہ معظمہ میں سنا ہے۔ شیخ علی متقی کا عموماً دستور تھا کہ وہ ہند سے حجاز، حجاز سے ہند آتے جاتے رہتے تھے۔ گو آخر میں ان کا مستقل قیام مکہ معظمہ ہی میں رہ گیا تھا، عرب میں بیٹھ کر منجملہ دیگر تعلیمی و تدریسی تصنیفی وتالیفی، ارشادی و تذکیری خدمات کے علم کی خدمت کی ایک صورت یہ بھی نکالی تھی کہ "کتابہا از دیار عرب مفید وکمیاب بہم می رسید نسخ متعددہ از واستکتاب فرمودہ بہرکس می دادند" یعنی نادر اور کمیاب مفید مخطوطات کو صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ یوں بھی ان کے متعدد نسخے نقل کرواتے اور جو بھی ضرورتمند ہوتا، اسے یہ چیز تحفۃً عطا فرماتے اور اس سے بھی عجیب تر ان کا یہ طرز عمل ہے کہ "وبہ بلاد دیگر کہ آں کتاب در انجا وجود نہ داشت می فرستادند"

خیال کیا جاسکتا ہے کہ ہندستان کا ایک عالم ام القریٰ قبۃ الاسلام میں مستقل قیام کرکے اس کام کو انجام دیتا ہے کہ جن جن ملکوں میں جن مصنفین کی کتابیں نہیں پہنچی ہیں انہیں نقل کرواتا ہے، اور بغیر کسی معاوضہ کے وہاں ان کتابوں کو بھیجتا ہے کیا ایسی صورت میں شیخ اپنے وطن ہی کو بھول جاتے ہونگے، میرے نزدیک تو ہندستان میں نوادر کی فراہمی کا بڑا ذریعہ حضرت شیخ کا

یہ طرزِ عمل بھی ہوگا، خدا نے عمر بھی کافی دی تھی۔ لکھتے ہیں کہ "نوّد سال زیست،" ہر سال اسلامی ممالک سے حجاج کے قافلے عرب پہنچتے تھے اُن کی عظمت کا آفتاب اس وقت سمت الراس پر چمک رہا تھا، کنز العمال (احادیث نبویہ کا جو دائرۃ المعارف ہے) اس کی تالیف نے سارے دنیائے اسلام میں ان کا غلغلہ بلند کر دیا تھا، ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک سے "للسیوطی منۃ علی العالمین وللمتقی منۃ علیہ" (یعنی سیوطی کا احسان تو دنیا پر ہے اور سیوطی پر شیخ متقی کا احسان ہے) کی تاریخی سند ان کو مل چکی تھی، اس لیے فتوحات بھی کافی ہوتے تھے لیکن ان فتوحات کا ایک بڑا مصرف کتابوں کی نشر و اشاعت کا یہی ذوق تھا۔

نوادر کتب کی اشاعت اور ان کے افادہ کے دائرہ کو عام کرنے کا یہ نادر متقیانہ طریقہ اب بھی اگر سچ پوچھیے تو اس قابل ہے کہ ارباب توفیق اس پر عمل کر کے علم اور دین کی بڑی اہم اور قیمتی خدمت انجام دے سکتے ہیں، جنہیں خدا نے ثروت دی ہے وہ دوسروں سے نادر مخطوطات نقل کرا کے ان مقامات تک پہنچا سکتے ہیں جہاں وہ کتابیں نہ پہنچی ہوں، اور غیر مستطیع اہل علم جہاں بیسیوں مجاہدات و ریاضات میں اپنا وقت صرف فرماتے ہیں، اگر اپنے عزیز اوقات کا ایک حصہ اس کام کے لیے بھی مختص کر دیں تو وہ اپنے پیچھے ایک بہترین فاتحہ خواں کو دنیا میں چھوڑ کر رہگرائے عالمِ آخرت ہو سکتے ہیں۔ علی الخصوص ہر سال سرزمین حجاز میں حاجیوں کا جو قافلہ جاتا ہے، اگر ان ہی حجاج میں اس کا بھی ذوق پیدا کیا جائے کہ جہاں لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے وہ عرب سے خاکِ شفا، یورپ کی بنی ہوئی جانمازیں، تسبیحیں، کپڑے وغیرہ لاتے ہیں اگر اپنے ساتھ کسی نادر مخطوطہ

لہ یہ فقرہ علامہ ابوالحسن البکری کا ہے، جو عام طور سے اہل علم میں مشہور ہے یعنی تمام حدیثوں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کا خیال جلال الدین السیوطی کو پیدا ہوا اور جمع الجوامع کے نام سے اُنہوں نے ایک کتاب تالیف بھی کی لیکن ترتیب کے اعتبار سے استفادہ اس کتاب سے آسان نہ تھا۔ شیخ متقی نے نئے سرے سے اس کام کو ایسی عمدہ ترتیب سے انجام دیا کہ سیوطی کی کتاب کی جگہ ان ہی کی کتاب نے لے لی۔ حیدر آباد کی ریاست کو فخر ہے کہ اسی کے مطبع دائرۃ المعارف نے سب سے پہلے اس کتاب کو شائع کیا۔ بعد کو مسند احمد کے حاشیہ پر اس کا خلاصہ مصر سے بھی شائع ہوا۔ علی متقی نے اس ضخیم کتاب کے سوا جو کتابیں لکھی ہیں ان کی تعداد سو کے قریب پہنچتی ہے۔

کی نقل بھی حجاز سے اپنے علاقہ کے علماء یا مدارس کے لیے لایا کریں، تو اس سے ایک طرف علم اور دین کے مہمات کی اشاعت میں یومًا فیومًا ترقی ہوگی، وہ تو بجائے خود ہے، دوسری طرف میرے نزدیک ساکنانِ حرم والذین عند رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ان کی معاشی دشواریوں کے حل کی تدبیروں میں ایک مفید کارگر تدبیر کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں مرکزی مقامات ہیں باوجود ان تمام بربادیوں کے اب بھی ان مقامات کے سرکاری و غیر سرکاری کتب خانوں یا خانگی مکانوں میں ایسی عجیب چیزیں محفوظ ہیں جن کی اشاعت کی سخت ضرورت ہے۔

ایک بڑا گروہ قاطنین حرمین و مہاجرین کا اب بھی ایسا ہے جو نقلِ کتب کے شریفانہ پیشہ کو گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر انجام دینے کو دستِ سوال کے دراز کرنے سے شائد بہتر خیال کریگا۔ بلکہ مخطوطات نادرہ کی نقل کا کام تو ایسا کام ہے کہ ہندوستان کے اہل علم بھی اس سے نفع اٹھا سکتے ہیں، الحمد للہ اب بھی ہندوستان میں ایسے چند ادارے ہیں جہاں ان کتابوں کی اچھی قیمت مل جاتی ہے، صرف حکومت آصفیہ حرسہا اللہ تعالیٰ کا شاہی کتب خانہ آصفیہ سالانہ بیس ہزار روپیہ کی رقم ان مخطوطات کی خریداری پر صرف کرتا ہے، اور دوسرے امراء مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مدظلہ العالی بھی کافی رقم دے کر نادر کتابیں خریدا کرتے ہیں، ہندوستان میں فرض کیجیے کہ آپ کی کتاب نہ بھی فروخت ہو، تو امریکہ یورپ میں اسلامی مخطوطات کے خریدنے والے لوگ موجود ہیں اور اچھی قیمتیں دے کر کتابیں خریدتے ہیں۔

ایک ذیلی بحث عربی مدارس کے طلبہ کی معاشی دشواریوں کو دیکھ دیکھ کر عمومًا لوگوں کا خیال ادھر مائل ہو رہا ہے کہ کوئی ایسی چیز ان مدارس کے نصاب میں شریک کی جائے جس سے اس دشواری کے حل میں طلبہ کو آئندہ زندگی میں کچھ مدد مل سکے، بلکہ اب تو یہ سوال عربی مدارس سے زیادہ انگریزی کلیات و جوامع میں اہم بنا ہوا ہے، اس سلسلہ میں خاکسار ایک خاص خیال رکھتا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ایسے صناعات اور دستکاریاں جن میں یورپ سے مقابلہ ہے مثلاً پارچہ بافی صابن سازی وغیرہ، اولاً ان چیزوں کے لیے ہزارہا ہزار روپوں کی مشنری کی ضرورت

ہی، سیکھنے والے سیکھنے کے بعد بھی عموماً کسی کارخانے کی وہی ملازمت جس سے بھاگنا چاہتے تھے اسی کی تلاش میں طلبہ سرگرداں نظر آئیں گے، بلکہ نظر آرہے ہیں اور مشنریوں کے بجائے اگر ان ہی چیزوں کو جنہیں غیر ممالک میں مشنری سے بنایا جاتا ہے ہم ہاتھ سے بنائیں مثلاً سوت چرخے سے کاتیں کاٹیج انڈسٹری کے اصول پر طلبہ کو پارچہ بافی سکھائیں تو یہ واقعہ ہے کہ مشنری کے ذریعے سے بنی ہوئی چیزوں کا مقابلہ ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں نہ لاگت میں کر سکتی ہیں، نہ وقت میں نہ قیمت میں۔ اور بازار میں یہ خیال کہ وطن اور قوم یا مذہب کے نام کے وعظ سے سودا بیچ لیا جائیگا میرے نزدیک تجربہ کے لحاظ سے تو غیر بازاری اور فکر کے لحاظ سے بازاری خیال ہے۔ بازار میں چیزوں کی عمدگی، نفاست، قیمت کی کمی وغیرہ یہی چیزیں وعظ کا کام کرتی ہیں۔

اِسی لیے میرا خیال ہے کہ انگریزی مدارس وکلیات والے خواہ کچھ ہی کریں، وہاں تو سوچنے والے دماغ اور ہوتے ہیں اور کام کرنے والے اور غیر مکلفوں کے اس طبقہ کو سمجھانا سخت مشکل ہے لیکن عربی مدارس کے ارباب حل وعقد چاہیں تو غیر مقابلاتی صناعات جن میں یورپ جاپان وغیرہ والے مشنری ممالک مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ عموماً یہ صنعتیں مقامی ہی ہوتی ہیں، عربی مدارس میں انہیں اگر مروج کیا جائے تو امید ہوتی ہے کہ علاوہ معاشی منافع کے خود دین کا سر جو آج "چہ خورد بامداد فرزندم" کے بوجھ کے نیچے دب کر مجبور ہے کہ ہر جاہل کندۂ ناتراش کے آگے جھکا رہے، شیروں کی ان روبہ مزاجیوں میں اس سے بہت کچھ تخفیف کی امید ہو سکتی ہے، اور ایسی دستکاریاں یا پیشے ایک نہیں متعدد ہیں۔ یہی استکتاب (نقل کتب) کا فن ہے اگر طلبہ میں خطاطی کا شوق پیدا کیا جائے صرف نقل کتب ہی نہیں، کاپی نویسی، مختصر نویسی، کمپوز کرنے کے کام، نامہ نگاری، وقائع نگاری اخبار نویسی یہ سب ایسے کام ہیں جو علم سے مناسبت رکھتے ہیں، بلکہ یہ توقع کی جاتی ہے کہ جاہلوں کے ہاتھ سے نکل کر اگر اس قسم کے پیشے اہل علم کے ہاتھ میں آجائینگے تو کام زیادہ بہتر صورت میں انجام پا سکتا ہے۔ ان پڑھ جاہل کاتبوں سے جن مصنفین کو پالا پڑا ہے، یہ واقعہ ہے کہ ان کو وہی مرزا صائب کا شعر

ہرگز از چنگیز خاں بر عالم صورت نرفت　　آنچہ از دستِ کاتباں بر عالم معنی گذشت

پڑھ پڑھ کر بسا اوقات سر پیٹ لینا پڑتا ہے۔ اور علم سے اگر کسی پیشہ کو مناسبت نہ بھی ہو مثلاً زرگری، نجاری، آہنگری، خیاطی، معماری، طباخی، مرغبانی، مویشیوں کی پرورش، باغبانی، کاشتکاری زمینداروں کے دیہاتوں کا نظم، حساب وکتاب وغیرہ وغیرہ بیسوں ایسے کام ہیں جنہیں علم سے براہِ راست ظاہر ہے کہ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ سارے کاروبار چونکہ مقامی ہیں یورپ سے نہ زرگر آئینگے، نہ معمار نہ طباخ نہ حلوائی، اس لیے مشرقی ممالک سے مقابلہ کا ان پیشوں میں خوف بھی نہیں ہے۔ بلکہ علم دین کے پڑھنے والے طلبہ سے اُمید کی جاتی ہے کہ عموماً انہیں خدا کا خوف ذمہ داریوں کا احساس زیادہ ہوگا، آج جاہل بے دین پیشہ وروں سے دنیا چیخ اٹھی ہے۔ ایک تولہ خالص دودھ بھی آپ شہروں میں تلاش کیجیے، تو مشکل ہی سے مل سکتا ہے، یہی حال تمام پیشوں کا ہے نسلِ آدم ایمان دار دستکاروں اور ملازموں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ بڑے بڑے زمیندار ہیں جنہیں اپنے ہر ہر گاؤں کے لیے منیجروں، تحصیلداروں کی خدمات کی ضرورت ہے لیکن دیانت دار مولوی ان فنوں سے ناواقف اور جوان چیزوں کو جانتے ہیں وہ دین و دیانت سے عاری، بحمد اللہ پیشوں کے متعلق ذلت کے احساس کا مسئلہ مسلمانوں کی تاریخ ختم کر چکی ہے جس سے ہر کہ دمہ واقف ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ

ہر چہ گیرد علتے علت شود　　کفر گیرد کاملے ملت شود

لہ کچھ زیادہ دن کی بات نہیں حضرت مولانا انوار اللہ خاں رحمۃ اللہ علیہ جو بعد کو اُستاذ السلاطین اور صدر المہام امور مذہبی کے عہدہ تک حکومت آصفیہ میں پہنچے ان کی سوانح عمری مطلع الانوار میں لکھا ہے کہ ابتداء میں مولانا محکمہ مالگذاری میں مختصر نویسی کی ملازمت پر بحال ہوئے لیکن اس ملازمت کو صرف اس بات پر چھوڑ دیا کہ ایک سودی لین دین کی مسل کا خلاصہ لکھنا پڑتا تھا"۔ ملا۔ پھر برسوں سخت معاشی پریشانیوں میں گرفتار رہے لیکن اس ملازمت کی طرف رجوع نہ ہوئے۔ سر سالار جنگ اور نواب خورشید جاہ نے چُپ چاپ مولانا سے استفسار کیے بغیر اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کی تعلیم کے لیے آپ کا تقرر کر دیا۔ آپ کو جب خبر ہوئی تو مولانا جو اس زمانہ میں حسبۃً للہ مدرسۂ نظامیہ کا کام کرتے تھے، یہ فرمایا کہ قومی خدمت کو چھوڑ کر میں اس ملازمت کو قبول نہیں کر سکتا۔ آخر بڑے رد و کد اور استخارہ کے بعد ان کو بہرحال وہ خدمت انجام دینی پڑی جس کے نتائج بحمد اللہ آج تک لوگوں کے سامنے ہیں

پیشے دراصل ذلیل نہیں ہیں، بلکہ ذلیلوں اور جاہلوں کے ہاتھ میں بیچارہ پیشہ جاکر ذلیل ہوگیا ہے،
میں یقین کرتا ہوں کہ ایک پڑھا لکھا آدمی جس پیشے کو ہاتھ میں لیگا، اسی وقت اس میں عزت پیدا
ہو جائیگی۔ آپ باہر کیوں جائیں اسی ہندوستان میں ایک عالم مولانا عثمان خیر آبادی تھے فوائد
الفواد میں سلطان المشائخ کے حوالہ سے مولانا عثمان کے متعلق یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کا پیشہ
طباخی کا تھا، اور طباخی بھی کس چیز کی، سلطان المشائخ فرماتے ہیں

"سبزی (ترکاری) پختے از شلغم وچقندر ومانند آں و دیگ پختے داں رامی فروختے" ص ۳۲

یہ خیال کیجیے کہ یہ نام کے مولانا تھے، سلطان المشائخ ہی کا بیان ہے کہ "بس بزرگ کسے بود و در تفسیرے
ہست" قرآن کا مفسر ہے اور شلغم چقندر پالک سب کو ملا کر ترکاری پکاتا ہے اور بیچتا ہے ظاہر ہے کہ پکنے کے
بعد ان کی دیگ کو خالی ہونے میں کیا دیر لگتی ہوگی، اور یہ تو خیر اس وقت کی بات ہے جب ہندوستان
میں اسلام نے پہلی دفعہ قدم رکھا تھا، کیونکہ شیخ عثمان خیر آبادی کا زمانہ سلطان المشائخ سے بھی پہلے
ہے، میرا تو چشم دید واقعہ کانپور کا ہے مشہور صاحب درس عالم محشی مثنوی مولانا روم مولانا احمد حسن
کانپوری مرحوم کے منجھلے صاحبزادے جو خود عالم بھی تھے کانپور میں صرف غالباً امرتیاں یا اور بھی دو
ایک قسم کی مٹھائی خاص طریقہ سے بناتے تھے (بناتے کیا تھے اپنی نگرانی میں بنواتے تھے)، لیکن چونکہ ہر
چیز مٹھائی میں دیانت داری سے دی جاتی تھی گھی بھی خالص ہوتا تھا، دوسرے اجزاء بھی خالص، دھوکہ
فریب جو عام جاہل حلوائیوں کا شیوہ ہے نہ تھا، آج کانپور میں سیکڑوں آدمی اس کی شہادت دے
سکتے ہیں کہ بننے کے گھنٹے دو گھنٹے کے بعد مٹھائی کا ملنا ناممکن تھا خریدار گدھ کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے،
لبا اوقات پیشگی دے کر اپنا حصہ آدمی کو محفوظ کرانا ہوتا تھا، حالانکہ اسی کانپور میں سیکڑوں حلوائی صبح سے
شام تک بیٹھے دکانوں پر مکھیاں مارا کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ نہ طباخی کے پیشہ سے حضرت مولانا عثمان خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی عزت پر حرف
آیا ہی کیا کم ہے کہ سلطان المشائخ جیسی ہستی ایسے شاندار الفاظ میں ان کی توصیف کرتی ہو، آج
چھ سو سال کے بعد ان کے ذکر پر اپنی کتاب میں میں مجبور ہوا ہوں، اور نہ مولانا احمد حسن مرحوم کے

صاحبزادے کو کان پور نے کبھی تحقیر کی نگاہ سے دیکھا، مولانا کی مٹھائی سارے کانپور میں زبان زد عام تھی۔

آج عوام کے چندوں پر مولویوں کی گزر بسر کا جو دار مدار رہ گیا ہے اور اس کی وجہ سے ملک کے تاجروں، رئیسوں، خوش باشوں کے سینوں کے وہ بوجھ بنے ہوئے ہیں، اس دباؤ کے تحت بسا اوقات حق پوشی کے جرم کا مجرم بھی بننا پڑتا ہے، کیا ان دنیوی و دینی بے آبروئیوں سے بھی زیادہ کسی پیشہ کے اختیار کرنے میں بے آبروئی کا احتمال ہے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر مدرسہ میں اس قسم کی ہر دستکاری کو داخل کیا جائے بلکہ موقعہ مناسب خیال کر کے ایک ایک دو دو پیشوں کو داخل کر دینا کافی ہو سکتا ہے خصوصاً جس علاقہ میں مسلمان پیشہ وروں کی کمی محسوس ہوتی ہو، کہیں مسلمان خیاط نہیں ملتے، کہیں مسلمان مزین نہیں ملتے کہیں زرگری کا پورا کام غیر اقوام کے ہاتھ میں ہے، ان علاقوں کے عربی مدارس کو دیکھ بھال کر اپنے یہاں اسی قسم کی دستکاری یا ہنر کی تعلیم کا نظم طلبہ کے لیے کر سکتے ہیں۔

ایک ذیلی بات تھی، لیکن مدت سے دماغ میں موجزن تھی گوشہ نشینی موقعہ نہیں دیتی کہ لوگوں سے دل کی کہوں، مناسب مقام دیکھ کر خیالات کا اظہار کر دیا گیا "فذکر فان الذکریٰ تنفع المومنین" شائد کسی کو میری کوئی بات پسند آجائے

میں گفتگو تو شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عجیب و غریب طرز عمل پر کر رہا تھا کہ جہاں کتابیں نہیں ہوتی تھیں وہاں نقل کرا کے بھیجا کرتے تھے مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، باوجودیکہ طباعت نے بہتر سے بہتر کتابوں کو اہل علم تک پہنچا دیا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جو کچھ چھپ چکا ہے اس سرمایہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو ابھی زیور طبع سے عاری ہے، علوم نادرہ ہی نہیں اسلام کے علوم عامہ تفسیر و حدیث، فقہ، اصول فقہ، تصوف، رجال، تاریخ وغیرہ وغیرہ تک علوم کی بیسیوں ضروری کتابیں غیر مطبوع ہیں، جن کی کام کرنے والوں کو اب بھی ضرورت ہے۔ ضرورت کے اس تریاق کو مطابع کے عراق سے وابستہ کیے رہنا، مارگزیدوں کی تو نہیں لیکن علم گزیدوں

کی موت ہی، کاش استکتاب کے اس طریقہ کو جاری کر دیا جاتا تو بڑا کام نکلتا، پچھلے دنوں ہندستان کے ایک جواں ہمت عالم مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے اس سلسلہ میں بڑی دلیری اور جوانمردی کا کام کیا، صحاح کے سوا آٹھ نئی کتابوں کی حدیثوں کا ایک مجموعہ جمع الفوائد کا نشان ان کو حجاز سے واپسی کے وقت دمشق میں ملا، معلوم ہوا کہ شام کے گاؤں کفرسوسہ کے ایک عالم محمود بن رشید العطار کے پاس اس کا ایک نسخہ ہی۔ مولانا اُس گاؤں تک گئے، علامہ محمود نے ان کے اس شوق کو دیکھ کر کتاب حوالہ کردی۔ مولانا غالباً دمشق یا بیروت ہی سے اپنے ساتھ ٹائپ بھی خرید کر لائے اور صرف اس کتاب کی طباعت کے لیے ٹائپ کا یہ مطبع قائم کیا۔ ان کو دوسرا نسخہ سندھ میں پیر جھنڈا کے کتب خانہ میں بھی مل گیا، دونوں کا مقابلہ کر کے آخر کتاب کو چھاپ کر علماء تک پہنچا ہی دی۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

مسلمانوں کو کتابوں کے لکھوانے تقسیم کرنے کا ذوق دراصل ایک مستقل داستان ہے، مشہور واعظ ملا معین ہروی جو اپنی کتاب معارج النبوۃ کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہیں، بلکہ ان ہی کے دیوان کو مطبع نول کشور نے حضرت خواجہ اجمیری قدس سرہ کے نام سے شائع کر دیا ہی، ان کے پوتے جن کا نام بھی شیخ معین تھا، اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور لاہور کے قاضی مقرر ہوئے

ل ان کے قضا کے قصے بھی بڑے دلچسپ ہیں، بداؤنی کا بیان ہی کہ جب تک قاضی رہے لوگوں کا بیان ہی کہ ہمیشہ مدعی و مدعیٰ علیہ میں مصالحت ہی کرانے کی کوشش کی، اور کبھی خود کوئی فیصلہ صادر نہیں کیا، لکھا ہی کہ " گر مدعی الحاح بر فیصل قضا می نمود او بالحاح و عجز و زاری می گفت کہ از برائے خدا شما بایک دگر صلح نمائید تا من را ہیں میاں ماخوذ و شرمندہ نہ باشم و لیزی گفت کہ شاہر دو دانا ئید و من تنہا نادان را بادو دانایان کار افتادہ پس مرا شرمندہ درگاہ خدائے تعالیٰ مسازید" یہ بھی لکھا ہے کہ اگر " زنے از غیبت شوہر طلب تفریق می کرد" یعنی مفقود الخبر کی بیوی مالکی مذہب کے رو سے چار سال بعد اپنا نکاح دوسرے مرد سے کرسکتی ہے، اسی قانون کا نفاذ چاہتی تھی، چونکہ مسئلہ اختلافی تھا اس لیے قاضی معین بیچارے کفاف او را از خود می داد و گفت ایں قدر وجہ معیشت بہ گرو و انتظار شوہر ببر و از و جدا مشو۔ اس سلسلہ میں عہد عثمانی کے ایک حاکم تقی یار جنگ کا خیال آتا ہی۔ سنتے ہیں کہ جب کسی کی سزا کا فیصلہ کرتے تو قلم سے فیصلہ لکھتے جاتے اور روتے جاتے۔ کہتے کہ دیکھیے فیصلہ کرنے والا ہمارے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہی۔ ان کی عادت بھی یہی تھی کہ حتی الوسع فریقین کو مصالحت پر آمادہ کرتے۔

ملا عبد القادر بدائونی نے ان کے متعلق منجملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا ہے کہ "مدد معاش خود را کہ کلی بود صرف کتابت می کرد تا کتب نفیس قیمتی می نویسانید و آں را مقابلہ می فرمود و مجلد ساختہ بہ طالب العلماں می بخشید و مدت العمر کار و بار پیشہ او ایں بود ہزاراں مجلد ازیں قبیل بمردم بخشیدہ باشد ص۹۱ ج ۳ بدائونی۔

بہرحال اس زمانہ کے مسلمانوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن ہمارے بزرگوں نے علم اور وہ بھی علم دین کی کتابت[1] کو دین ہی کا ایک جز قرار دیا تھا۔ عموماً چاہا جاتا تھا کہ دین کے اس کام میں اپنا حصّہ بھی حسب استطاعت حاصل کیا جائے، علماء کی دوات کی روشنائی شہیدوں کے خون کے برابر ہوگی، یہ حدیث صحیح نہ بھی ہو، لیکن الم کے تین حرف کے تلفظ میں حدیث صحیح کے رو سے جب بحساب فی حرف دس نیکی، تیس نیکیاں ملتی ہیں تو ان ہی حروف کی مکتوبہ شکلوں کی تشکیل جو نطقی حالت سے یقیناً زیادہ پائدار ہے اور اس کے افادہ کا دائرہ زیادہ وسیع ہے، کہ اشخاص سے منتقل ہو کر نسلوں تک اس کے دور رس نتائج اپنے منافع کو پہنچاتے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ اس پر بھی "مجازاۃ حسنی" کا یہ قانون کیوں منطبق نہ ہوگا، میں تو سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا اس کے متعلق ہمیشہ یہی خیال[2] رہا، یہی وجہ ہے

[1] اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات کا خیال آیا، خاکسار جب دار العلوم دیوبند کے ادنیٰ خدام میں تھا تو کسی جلسہ کے سلسلہ میں حصار جانا ہوا۔ حصار میں مدت ہوئی تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے چند پارے عجیب و غریب کاغذ پر چھپے تھے یعنی ظاہری شکل کاغذ کی بہت ہی ادنیٰ درجہ کی تھی تاہم علم پر چھاپنے والے نے احسان عظیم کیا تھا، کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ حصار جب پہنچا تو خیال گزرا کہ ناشر کتاب سے ملوں معلوم ہوا کہ انتقال ہو گیا۔ میں نے لوگوں سے کاغذ کی اس ربودگی کی وجہ پوچھی تو عجب بات معلوم ہوئی کہ ناشر صاحب کوئی صاحب دل آدمی تھے جب اس کتاب کی اشاعت کا عزم ہوا تو عام مطابع میں ظاہر ہے کہ پاک کاغذ پاک سیاہی، پاک پانی، پاک پتھر، باوضو کاتب و پریسمینوں کا نظم کون کر سکتا ہے، چونکہ کلام اللہ کی تفسیر کا معاملہ تھا، ان صاحب دل بزرگ نے باضابطہ حصار میں جس طرح بن پڑا کاغذ بنوایا اور طہارت کے تمام ضوابط کے ساتھ بنوایا، ان ہی ضوابط کے تحت اس تفسیر کو طبع کرا رہے تھے، پھر کیا عذر پیش آیا یا اجل مسمی آگیا چند پاروں پر کتاب ختم ہو گئی۔ حکومت آصفیہ نے مولوی محبی الاسلام پانی پتی کو چند سال ہوئے بیش قرار رقم اس کتاب کے چھاپنے کے لیے دی ہے۔ مگر افسوس چند پاروں سے معاملہ آگے نہیں بڑھا۔

[2] دین کے سوا خود علم کی اشاعت کا جو ذوق مسلمانوں میں تھا اور اس اشاعت کے لیے جو تدبیریں ان کی سمجھ میں آئی تھیں ان میں ایک مشہور تاریخی واقعہ وہ ہے جس کا تعلق گو ہندوستان سے نہیں ہے لیکن مسلمانوں کی اشاعتی تدبیروں میں ایک خاص تدبیر کا اس سے پتہ چلتا ہے اس لیے اس کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ میرا اشارہ خواجہ رشید الدین فضل اللہ (باقی برصفحہ)

کہ عوام تو عوام خود سرزمین ہند میں محی الملۃ والدین سلطان اورنگ زیب انار اللہ برہانہ ہی نہیں جن کے دست مبارک کے مصاحف آج بھی مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ دولت اسلامیہ ہندیہ کے ابتدائی عہد میں بھی ایسے سلاطین گذرے ہیں جنہوں نے کتابت قرآن ہی کو اپنی معاشی زندگی کے ساتھ معادی فلاح کا ذریعہ بنایا تھا کیا ان کے سامنے والحسنۃ بعشرۃ امثالہا کا قرآنی انعام کتابت مصاحف میں نہ تھا، تاریخوں میں حضرت سلطان ناصرالدین بن شمس الدین التمش کے حالات میں جہاں یہ لکھتے ہیں جس سے اسلامی حکومتوں کے بجٹ کے مدات کا بھی سرسری اندازہ ہوتا ہے۔

> خراج وباج ممالک درمواجب سپاہ وننذور درویشاں خدا آگاہ ووظائف وادرار فضلاء وارباب استحقاق ودوجوہ مسکیناں وزیردستاں وعمارت ومساجد وخانقاہ ومہمان سرائے واجرائے انہار وغیرذلک انچہ از آثار خیر واسباب ذکر جمیل تواند بود خرچ کردے" (سیرالمتاخرین ج ۱ ص ۱۰۹)

اسی کے ساتھ تقریباً مورخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ "درسالے دو مصحف بخط خود نوشتہ آنرا قوت ساختے" آخر اس بادشاہ دیں پناہ کے سامنے آخرت کا ثواب نہ تھا تو اس واقعہ کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے کہ:۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶) المتوفی ۷۱۸ھ کی مشہور تاریخ "جامع التواریخ" کی طرف ہے جو جامع رشیدی کے نام سے بھی مشہور ہے، مؤلف تاتاری حکومت کے وزراء میں تھے اسی تعلق سے انہوں نے چار ضخیم جلدوں میں ترکوں اور تاتاریوں کی تاریخ لکھی ہے، کتاب عام طور سے مشہور ہے، مجھے کہنا یہ ہے کہ اس کتاب کو خواجہ رشیدالدین نے فارسی میں لکھا تھا اور پھر اس کا ایک ترجمہ عربی میں بھی کیا، اس لیے کہ ان کی تاریخ کے دونوں نسخے دنیا میں پھیلتے رہیں یہ خاص ترکیب کی کہ تبریز شہر کے باہر ایک چک جو "ربع رشیدی" کے نام سے موسوم تھا وقف کر دیا تھا، مقصد اس وقف کا یہ تھا کہ "ان تکتب فی کل سنۃ نسخۃ من المجموعۃ وترسل الی احدی بلاد الاسلام نسخۃ بالعربیۃ ونسخۃ بالفارسیۃ" (تاریخ عراق ص ۲۰) (یعنی ہر سال اس مجموعے کے دو دو نسخے اس وقف کی آمدنی سے لکھوائے جائیں اور اسلامی ممالک میں سے کسی ملک میں بھیج دیے جائیں، ایک نسخہ عربی میں تیار کیا جائے اور ایک فارسی میں) جب تک یہ وقف موجود رہا یہ کام ہوتا رہا۔ میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ جہاں دیگر دینی علمی اغراض کے لیے اس زمانہ میں مسلمانوں کے ارباب ثروت اوقاف کرتے رہتے ہیں، کیا اچھا ہو کہ ہر صوبہ میں کچھ اوقاف کتابوں کی اشاعت کے لیے بھی کیے جائیں، اس ذریعہ سے علم کا ایک بڑا ذخیرہ جو اشاعت وطباعت سے محروم ہے شائع ہوجائیگا، اور واقفوں کو آخرت کے ثواب کے ساتھ دنیا میں بھی ایک نفع عاجل یہ ملیگا کہ بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں کے

سلہ (صفحہ ۷۸ پر)

"نوبتے یکے از نوکران سرکار مصحف کہ بخط سلطان بود از روئے خوشامد بقیمت گراں خرید چوں ایں خبر گوش سلطان رسید منع کرد کہ آئندہ مصحف را بخط من اظہار نکنند بلکہ بطور اخفا کہ احدے بر تحریر من وقوف نیابد میفروختہ باشند"

(سیر المتاخرین ج ۱ ص ۱۰۹)

باون سال تک حضرت اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت میں اور اُنتیس سال تک سلطان نصیر الدین نے یعنی اکہتر سال تک اسی ہندوستان نے یہ تماشا دیکھا ہے کہ اورنگ حکومت اور چتر شاہی کے نیچے بھی قرآن لکھا جا رہا ہے۔ دنیا میں اور بھی ادیان و مذاہب ہیں ان میں سلاطین و فرمانروا گزرے ہیں، لیکن اس کی نظیر اور کہاں مل سکتی ہے۔ اسلامی سلاطین کے اسی عجیب و غریب ذوق کا نتیجہ تھا کہ شاہی خانوادہ کی خواتین مخدرات میں بھی ایسی خاتونیں ملتی ہیں جنہوں نے چند سورتیں نہیں بلکہ پورا قرآن اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا۔ شاہجہاں نامہ میں سال ہشتم کے سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی درج کیا گیا ہے کہ امیر تیمور گورگان کی حقیقی پوتی ملک شاد خانم کے دست خاص کا لکھا ہوا مصحف بادشاہ کے سامنے پیش ہوا، اصل عبارت یہ ہے:۔

"مصحفے بود بخط ملک شاد خانم بنت محمد سلطان میرزا بن جہانگیر میرزا بن صاحب قران امیر تیمور گورگان کہ بخط ریحاں درکمال متانت نوشتہ در خاتمہ اسم و نسب خود بر قاع نگاشتہ" (منقول از سیر المتاخرین[۱])

اس واقعہ سے صرف مصحف نگاری کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ بھی کہ شاہی خاندان کی عصمتیاں سراپردۂ عفت میں خطاطی کا فن کس کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ آج تو ہم عام مسلمانوں کے لیے بھی خط ریحان اور خط رقاع کی اصطلاحات نامانوس ہو گئی ہیں، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ تاریخ کے کشورکشا د

(حاشیہ صفحہ ۷۷) ؎ اس بادشاہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ گھر کی کاروبار کے لیے اپنی بیوی کے سوا کوئی ملازمہ وغیرہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ملکہ نے پریشان ہو کر کہا کہ آخر میں کب تک اس طرح کام کرتی رہوں کوئی تو ملازمہ دو، سلطان نے فرمایا "صبر کن تا خدائے تعالیٰ در آخرت نتیجۂ شائستہ دہد۔" (ملخصاً سیر)

(حاشیہ صفحہ ہذا) مسلمانوں نے خطاطی کے آرٹ کو جن جن شکلوں میں ترقی دی ہے اپنی مختلف نوعیتوں کی وجہ سے ان کے بیسیوں نام ہو گئے۔ ریحان اور رقاع خط ہی کی ایک قسم تھی۔ ان کے سوا خلفاء بنی امیہ و عباسیہ کے عہد میں قلم الجلیل، قلم السجلات، قلم الدیباج، قلم الطومار، قلم الثلثین، قلم الزنبور، قلم المفتح، قلم الحرم، قلم المصود، قلم القصص، قلم الخرفاج، قلم المدمع، قلم

میں جس فاتح اور کشورکشا کا نام آج بھی اپنی مثال بہ مشکل پیدا کرسکتا ہے، اسی امیر تیمور گورگان کی پوتی بھی قرآن صرف لکھتی نہیں بلکہ ایک خط ریحان کے التزام کے ساتھ بکمال متانت پورے قرآن کو ختم کرتی ہے۔ اور جس عہد کے سلاطین وشاہی خانداں، بلکہ شاہی خاندان کی خواتین کا یہ حال ہو اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس زمانہ میں عوام کی کیا کیفیت ہوسکتی ہے۔ ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "خط بابری را بابر بادشاہ اختراع نمودہ ومصحف بان نوشتہ بمکہ فرستادہ" (ج ۳ ص ۲۷۳) اسی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر عبدالحیی مشہدی وغیرہ نے اس خط کی مشق بہم پہنچائی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی باتوں کا ملک میں عام طور سے عام مذاق پھیلا ہوا تھا، بعض بزرگوں کا ذکر تو پہلے بھی آیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک مرید شیخ فخرالدین مروزی بھی ہیں، یہ بھی اس وقت تک جب تک انگلیاں کام دیتی رہیں، آنکھوں میں قوت بینائی موجود تھی بقول محدث دہلوی "پیوستہ کتابت کلام مجید کردے" چونکہ حافظ بھی تھے، اس لیے لکھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ یہ کام کب تک کرتے رہے، شیخ نے لکھا ہے "چوں پیر معمر شد از کتابت باز ماند" حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے حوالے سے کتابت قرآن کے متعلق ان کی جو خصوصیت شیخ محدث نے نقل کی ہے۔ اس سے اُس زمانہ میں کتابت کی عام اُجرت کا بھی چونکہ پتہ چلتا ہے اس لیے چراغ دہلوی کے اس بیان کو یہاں درج کرتا ہوں۔ فرماتے تھے کہ "آنچہ فخرالدین مروزی روزے کتابت کرد از خلق پرسیدے این کتابت ارزد" یعنی لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس کتابت کی بازار میں کیا قیمت لگائی جاسکتی ہے لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ "شش گانی جزدے" یعنی فی جزو "شش گانی" بہ ظاہر مروجہ سکوں میں جو سب سے آخری سکہ بمنزلہ پیسے کے ہوتا تھا

لہ جہانگیر کے مشہور شاہزادہ پرویز کے متعلق بھی لکھا ہے " در علم عربی وفارسی ونوشتن خطوط بغایت آراستہ وپیراستہ بود اکثر اوقات را بہ کتابت کلام اللہ صرف می نمود۔ تذکرہ خوشنویساں غلام محمد ہفت رقمی ص ۹۱۔ اور یہی ایک شاہزادہ نہیں اسی کتاب میں آپ کو شاہجہاں، جہانگیر، داراشکوہ اور جیب النساء خانوادۂ شاہی کا نام خطاطوں کی اس فہرست میں ملیگا۔ اور یہ کہ ان میں ہر ایک فارسی کے ساتھ عربی کا بھی خطاط اور عالم ہوتا تھا، لیکن آج ان ہی کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے کہ عربی سے ان کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ۔ ۱۲

جسے جیتل کہتے تھے وہی مراد ہے، کیونکہ آگے کا فقرہ اس کے بعد یہ ہے کہ مولانا فخرالدین لوگوں سے اس کے جواب میں کہتے کہ "او گفتے من چہار جیتل بستانم زیادہ نستانم" یعنی بجائے چھ جیتل کے حضرت نے اپنی کتاب کا دام فی جزء چار جیتل ہی مقرر کر لیا تھا، اور اس سے زیادہ نہیں لیتے۔ حتیٰ کہ اگر کسے بطائے تبرک زیادہ از چہار جیتل کردے، نستدے"

لکھا ہے کہ بڑھاپے تک چار جیتل فی جزء کے حساب سے قرآن کی کتابت کا مشغلہ کرتے رہے، لیکن جب بالکل معذور ہو گئے تب قاضی حمیدالدین ملک التجار نے سلطان علاء الدین خلجی سے سفارش کی کہ ان کی امداد شاہی خزانہ سے جاری فرمائی جائے۔ بادشاہ نے ایک تنکہ (غالباً نقروی روپیہ مروجہ) یومیہ مقرر فرمایا، لیکن ان کو اسی پر اصرار تھا کہ دن بھر کتابت کی مزدوری کی جو اُجرت میری ہوتی تھی وہی دی جائے۔ "ہاں شش گانی بدہید بعدہ بجیل بسیار دو شش گانی قبول کرد"

اس سلسلہ میں غالباً اس کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ فی جزء ایک "شش گانی" تو عام بھاؤ تھا، لیکن اپنی کتابت کی خوبی نیز مطلّا و مُذہّب اور دوسرے لازم جو اس زمانہ میں خصوصاً قرآنی نسخوں میں اختیار کیے جاتے تھے، جیسا کہ ظاہر ہے قیمتیں مختلف ہوتی تھیں، شیخ محدث نے مولانا جلال الدین مانکپوری کے حالات میں لکھا ہے کہ

"خوردن او از وجہ کتابت بود مصحف می نوشت و بدہلی می فرستاد و پانصد تنکہ ہدیہ شدے" ص ۱۱۰۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک قرآن کا ہدیہ پان پان سو تنکہ بھی ہوتا تھا لیکن حضرت سلطان جی نظام الاولیاء کے حوالہ سے فوائد الفواد میں ایک واقعہ قاضی برہان الدین (دہلی) کا درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک تنکہ میں بھی قرآن عموماً مل جاتا تھا، قاضی برہان الدین کے اس قصہ میں ہے کہ "یک تنکہ را مصحف خرید" ص ۱۱۔ آج طباعت کے زمانے میں بھی قرآن مجید کا ہدیہ اس سے کم نہیں ہے۔

بہرحال ان واقعات سے مجھے تو اس زمانہ کے مسلمانوں کے ذوق کتابت کا اظہار مقصود تھا، مسلمانوں میں قرآن کی کتابت کو کتنی اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ ان واقعات سے بھی ہو سکتا ہے

کہ جن سے کتابت کا کام بن نہیں پڑتا تھا، تو وہ قرآنی نسخوں کی تصحیح میں وقت گذارنے کو زادِ آخرت بناتے تھے۔ مولانا آزاد نے مآثر الکرام میں میر محمد جان بلگرامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ آخر میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے، اور مدینہ کی زندگی میں انہوں نے اپنا دینی مشغلہ یہ مقرر کیا تھا کہ

"از صبح تا شام در مسجد نبوی می نشست و مصاحف وقف روضۂ مقدسہ را بہ تصحیح می ساند داوقات گرامی را دریں شغل شگرف صرف می ساخت۔" (مآثر ص ۲۸۰)

اس سلسلہ میں دلچسپ قصہ تو خود ملا عبدالقادر کا ہے، اکبر نے انہیں جب مہابھارت کے ترجمہ کا حکم دیا تو گو وہ خود بھی بھاشا سے واقف تھے لیکن مہابھارت کی سنسکرت عبارت کا براہِ راست سمجھنا اُن کے بس کی بات نہ تھی، اس لیے "دانایان ہند (پنڈتوں) را جمع کردہ حکم فرمودند کہ کتاب مہابھارت را تعبیر می کردہ باشند" جس کا بظاہر یہی مطلب معلوم ہوتا ہے کہ دانایان ہند سنسکرت کی عبارت کے مفہوم کو سمجھاتے ہونگے، اور یوں فارسی میں اس کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ سے کتاب کا ترجمہ ہوسکتا ہے یا نہیں ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ طریقہ کار کو اکبر نے خود سمجھایا "چند شب بہ نفس نفیس معانی آں را بہ نقیب خاں (رفیق ترجمہ ملّا) خاطر نشان ساختند تا ماحصل را بفارسی املا می کرد" الغرض نقیب خاں کی معیت میں ملا عبدالقادر نے ترجمہ کے اسی خاص طریقے سے مہابھارت کو فارسی لباس پہنانا شروع کیا۔ ملّا کا بیان ہے کہ "در مدت چہار ماہ از ہژدہ فن از مزخرفات لاطائل کہ ہژدہ عالم دراں متحیر است دو فن نوشتہ شد" اب واللہ اعلم ملّا صاحب سے بات نہ بن پڑی، یا قصداً ان کی جانب سے کوتاہی ہوئی، کچھ بھی ہوا ہو، ملّا صاحب موردِ عتاب شاہی ہوئے۔ خود ہی لکھتے ہیں کہ "چہ اعتراض کہ نشنید و حرام خور م و شلغم خورم[1] ایں معنی درشت گویا نصیبۂ فقیر ازیں کتابہا ہمیں بود النصیب یصیب" (ص ۳۲۰)

[1] واللہ اعلم یہ گالی اکبر کی اپنی ایجاد تھی شاید شلغم سے نفرت ہوگی اس لیے حرام خور کے ساتھ شلغم خور کا بھی اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ یا شلغم کی ترکاری عام طور پر پسند نہ تھی، سعدی نے بھی "شلغم پختہ بہ از نقرہ خام" میں شلغم کی مذمت کی ہے ۱۲۔

"ملا بیچارے پر اکبر کا یہ غصہ اخیر وقت تک باقی رہا ایک اور موقعہ پر مہابھارت ہی کے ترجمہ کی کسریوں نکالی گئی جس کے ملا ہی ناقل ہیں کہ میں "جھروکہ کے درشن" کے سامنے دوسروں کے ساتھ کھڑا تھا،

"نقیر راپیش طلبیدند وخطاب بہ شیخ ابوالفضل فرمودند کہ ما فلانے را عبارت از فقیر باشد جوانے فانی صوفی مشربے خیال می کردیم اما اوخود چناں فقیہ متعصب ظاہر شد کہ ہیچ شمشیرے رگ گردن تعصب اورا نتواند برید"

ابوالفضل نے عرض کیا کہ ان سے کیا حرکت سرزد ہوئی، جواب میں وہی مہابھارت کا قصہ نکالا۔ "فرمودند درہمیں رزم نامہ کہ عبارت از مہابھارت باشد و دوش بریں معنی نقیب خاں را گواہ گرفتہ ام اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا خیال یہی تھا کہ ملا نے قصداً مذہبی تعصب کی وجہ سے مہابھارت کے ترجمہ میں کوتاہیاں کی ہیں۔ بہرحال بیچارے ملا کو اس ترجمہ کا معاوضہ ان شکلوں میں جب ملا تو کفارہ کی جو شکل ان کی سمجھ میں آئی وہ یہی تھی کہ قرآن مجید کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے تیار کیا جائے خود لکھتے ہیں۔

دریں سال حق سبحانہٗ وتعالیٰ کاتب را توفیق کتابت کلام مجید رفیق گردانید تا بخط نسخ و روشن وخوانا نوشتہ باتمام رسانیدہ وبلوح وجدول مکمل وقف روضۂ منورہ "حضرت غوث الانامی مرشدی ملاذی میاں شیخ داؤد جھنی وال قدس سرہ ساختہ (ص ۳۹۴۔ البداؤنی ج ۲)

ملا صاحب کی اس فارسی عبارت میں لوح وجدول کے جو الفاظ آئے ہیں عہد مطابع کے پیدا شدوں کو شاید اس کی اہمیت کا علم نہ ہو واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے موسیقی کی چونکہ ہمت افزائی نہیں کی بلکہ اس کا عام رجحان اس کے خلاف ہی رہا جس کی بحث کچھ آئندہ صوفیۂ ہند کے سماع کے سلسلہ سے ان شاء اللہ آئندہ آئیگی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ساری موسیقیت فنِ تجوید و قرأت میں گم ہوگئی نعم، وہی چیز جس کے ذریعہ سے خدا جانے شیطان کتنے گھرانوں کو اجاڑ چکا تھا، کتنے نوجوان اسی موسیقی کے بت پر جذبات سے بے قابو ہو کر بھینٹ چڑھ گئے اور کون جانتا ہے کہ

عصر حاضر کے سیناؤں اور تھیٹروں، میوزک ہالوں کے ہاتھوں کتنے جوانوں کی زندگیاں برباد ہو رہی ہیں، دلرباؤں سے لو لگانے میں شیطان کو جتنی مدد موسیقی سے ملی ہے اتنا کارگر حربہ مردم کش آلات کے بعد بنی آدم کی تباہی کا اسے شاید ہی ملا ہو،[1] کتنی مائیں، کتنے باپ اپنے عشق نواز بچوں سے جو عموماً اسی میوزک کے میٹھے زہر کے مارے ہیں ہاتھ دھونا پڑا لیکن یہ اسلام کا کمال ہے کہ اماله کے قانون پر عمل کرکے اتنے بڑے شر سے بھی خیر کا کام نکال لیا گیا، ایک قاری جب اپنے خاص لحن سے قرآن پڑھتا ہے روحیں ان سے اپنے اندر جو بالیدگی اور رفعت محسوس کرتی ہیں، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں، جن میں فطرۃً حسنِ صوت سے متاثر ہونے کا مادہ ودیعت کیا گیا ہو[2]

[1] یہ عجیب بات ہے کہ ہابیل کو قتل کرکے جب آدم علیہ السلام کا قاتل بیٹا قابیل عدن کے مشرق کی طرف نود کے علاقہ میں جا بسا۔ پھر اس کو عورت کہاں ملی جب کہ اس وقت نسل آدم پھیلی نہ تھی، الگ مسئلہ ہے۔ معارف میں ایک مضمون کے نوٹ میں خاکسار نے اپنا ایک خواب وخیال درج کیا ہے جس سے ڈارون کے نظریۂ "فردہ" پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ بہرحال اس وقت یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تورات میں اس کے بعد ہے کہ قابیل سے اس کی بیوی حاملہ ہوئی اور ایک نسل قابیل کی اسی ذریعہ سے دنیا میں پھیلی، اسی نسل کے متعلق تورات ہی میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ "بین اور بانسری بجانے والے کا باپ" بھی ان ہی میں سے تھا، اور اسی نسل میں توبلقائن نامی شخص بھی تھا جو پیتل اور لوہے کے سب تیز ہتھیاروں کا بنانے والا تھا (پیدائش۔ باب ۴۔ ۲۱-۲۲) غور کرنے کی بات ہے کہ آلات موسیقی اور آلات آدم کشی میں اس وقت تک دنیا کی کن قوموں کو خصوصیت حاصل ہے، بلکہ اگر تحلیل و تجزیہ سے کام لیا جائے تو ان قوموں کے سارے ایجادات کی تہ میں بالآخر یہی دونوں مقاصد کارفرما نظر آئینگے۔ گزشتہ عبارت میں توبلقائن کا لفظ بھی قابلِ غور ہے۔ مشرقی یورپ کا جو حصہ آج کل بلقان کے نام سے مشہور ہے، قائن آدم کے قاتل بیٹے کا نام ہے، اور اسی کی تیسری پشت میں توبلقائن ہے۔ کیا یورپ میں جس راستہ سے بنی آدم کا داخلہ ہوا اُس کو بلقان اسی وجہ سے کہتے ہیں، ایک قرینہ یہ بھی ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یورپ کے باشندے آدم کے کس بیٹے کی نسل سے ہیں اور عرب میں ہبل نامی جو مشہور بت تھا کیا وہ ہابیل کے نام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آدم کی ظالم ومظلوم نسلوں کا کچھ سراغ ان اسماء کی مناسبتوں سے کیا مل سکتا ہے ۱۲۔

[2] جیسا کہ میں نے عرض کیا ہندوستانی صوفیہ خصوصاً طریقۂ چشتیہ کو سماع کے مسئلہ میں آج جتنا بدنام کیا جا رہا ہے، اس کی اصل تاریخی حقیقت تو آئندہ معلوم ہوگی لیکن اس موقعہ پر سلطان المشائخ کے ملفوظات مبارکہ فوائد الفواد کے جامع امیر حسن علا سنجری کے ایک لطیفہ کا خیال آگیا حضرت سلطان جی کی مجلس میں سماع کے جواز و عدم جواز کی بحث چھڑی ہوئی تھی، اس زمانہ میں بعض علماء غیر مزامیری سماع کے مسئلہ میں بھی انتہائی شدت سے کام لے رہے تھے۔ (باقی بر صفحہ ۸۴)

بہر حال کچھ امالہ کی سی کیفیت ہمیں تصویر کشی کے مسئلہ میں نظر آتی ہے یعنی حیوانی مصوری کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۳) بات حکومت تک پہنچی جس کا قصہ آگے آرہا ہے حسن علاء نے حضرت سلطان جی سے عرض کیا۔

"بندہ ایں طائفہ را کہ منکر سماع اند نیکو می داند و بر مزاج ایشاں وقوفے تمام دارد غرض آنکہ ایشاں سماع نمی شنوند ہم چنیں گویند کہ ما ازاں نمی شنویم کہ حرام است بندہ سوگند نمی خورد اما راست عرضداشت می دارد کہ اگر سماع حلال بودے ہم ایشاں نہ شنیدندے"

سلطان جی یہ فقرہ سن کر مسکرانے لگے گفت ارے چوں ایشاں را ذوقے نیست چہ گونہ شنیدندے و برچہ شنیدندے۔ اس سلسلہ میں مجھے بھی ایک بات یاد آئی، بعض خشک مزاجوں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ ساری چیزیں جن کا وعدہ اہل ایمان سے جنت میں کیا گیا ہے، یہ نہیں کہ شرعی ممانعت کی وجہ سے دنیا میں ان سے احتراز کرتے ہیں بلکہ خشکی کی مشق بڑھاتے ہیں اور اس حد تک اس مشق میں آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ان چیزوں سے اپنے دل میں کراہت، نفرت، چڑ پیدا کر لیتے ہیں اور اسی کو دینی احساس کی بیداری کا کمال سمجھتے ہیں۔ لیکن میں تو خیال کرتا ہوں کہ جذبات کو مردہ کر کے شریعت پر عمل شائد اتنا باعث اجر نہ ہو، جتنا کہ جذبات کی بیداری کے ساتھ ان کو عقل کے قابو میں اور عقل کو ایمان کے قابو میں رکھا جائے۔ میں تو اکثر ایسے حضرات کے متعلق یہ کہا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے اندر جنت کی نفرت اور دوزخ کی چیزوں کی رغبت گویا پیدا کر لی ہے۔

لہ تعجب ہے کہ تصویروں کے مفاسد کا اعلان آج خود ان ہی تصویروں کی زبانوں سے ہو رہا ہے۔ پہلے تو صرف اصنامیات ہی تک ان کی گمراہیاں محدود تھیں، اگرچہ انسانیت کو جو نقصان اصنامی نظام حیات سے پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے اخروی خسران کے ساتھ ساتھ آدمی کی کمائی ہوئی آمدنیاں پانی کی طرح اصنامی اوہام پر ہزارہا ہزار سال تک بہتی رہی ہیں، جن کا اس زندگی میں بھی قطعاً کسی قسم کا کوئی نفع انسان کو نہیں پہنچا۔ ایسا شرمناک فعل کہ خود کرنے والے بھی اب اس کے ارتکاب پر شرماتے ہیں اور جھوٹی فضل تسلیوں سے اپنی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ بالآخر دیانند سرسوتی جی اور برہمو سماجی طبقوں کے ضبط سے بات باہر ہو گئی، اور ملمع سازیوں کو چھوڑ کر ان بیچاروں کو اصنامی نظام کے خلاف شدت سے آواز بلند کرنی پڑی، لیکن یہ تو پرانے زمانہ کی بات ہے، آج عریاں پکچروں، سینمائی فواحش کی راہ سے شیطان کا جو بے پناہ حملہ نسل انسانی پر ہوا ہے کہ آدمی کے بچے جنسی جذبات کے سلسلہ میں خرنفیوں کے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جن سے شاید اب تو گدھوں کو بھی شرم آتی ہو۔ اعصاب بشری پر صرف عورت سوار ہو گئی ہے۔ بھولے دل کے تازہ وارد نوجوانوں کی زندگی صرف سوزش اور جلن بن کر رہ گئی ہے۔ بلوغ سے پہلے حسنام بالغوں کو بالغ بنا دیا جاتا ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں کا یہی حال ہو گیا ہے، بتدریج ان بے راہ رویوں کے جو نتائج ان آئندہ نسلوں پر مرتب ہونے والے ہیں جن کی قوتوں اور توانائیوں کی موجودہ نسلیں امین ہیں، کون کہہ سکتا ہے ان غریب ترسنے والوں پر ان ہی تصویروں کے ذریعہ سے کیا ظلم توڑا جا رہا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ روحانی اطبار کی بات اگر جہیں سنی جا رہی ہے تو جسمانی اطبار آخر کب تک آدم کے بچوں کے اس ذبح عام (باقی بر صفحہ ۸۵)

اسلام نے جو حرام قرار دیا، تو غالباً اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسن کاری کے سارے رجحانات اور میلانات منجملہ دیگر مباح فنون لطیفہ کے قرآنی لوح اور جدول سازی کے متعلق نادرہ نمایوں کی طرف راجع ہو گئے۔ لوح یعنی کتاب کے ابتدائی ورق اور جس ورق سے کتاب شروع ہوتی تھی اس کی ناصیہ (پیشانی) پر جو گل کاریاں کی جاتی تھیں، نیز ہر ورق کے حوض کو لکیریں کھینچ کر جو دیدہ زیبی اور کتاب میں رعنائی پیدا کی جاتی تھی جس کی ابتدا جہاں تک میرا خیال ہے قرآن ہی سے ہوئی۔ اور قرآن سے پھر متجاوز ہو کر دوسری کتابوں میں اس عمل کا رواج ہوا، یہ بھی گویا جذبۂ مصوری کے امالہ کی ایک شکل ہے مسلمانوں نے اس سلسلہ میں سونے چاندی، موتی، مختلف رنگین جواہرات کو محلول اور سیال کر کے ان کے مختلف رنگوں سے جو کام لیا ہے اور اسی سلسلہ میں جلدوں کی صنعت میں جو ترقیاں کی ہیں حقیقت یہ ہے کہ بجائے خود ان کا ایک مستقل کارنامہ ہے، اس سے ان کے ذہنی اور علمی استغراق کا پتہ چلتا ہے، امارت بھی کی تو کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا تعلق قرآن اور علم ہی سے باقی رکھا، قدیم قلمی کتابوں کے کتب خانوں میں جن کا بڑا حصہ تو غیروں کے قبضہ میں چلا گیا ہے لیکن تھوڑا بہت بچا کھچا جو ذخیرہ ابھی ملک کے بعض گوشوں میں باقی رہ گیا ہے خصوصاً حیدرآباد کے شاہی کتاب خانہ یا نواب صاحب رام پور کی لائبریری، خدابخش خاں مرحوم بانکی پور پٹنہ کے مشرقی کتب خانے، سیدی مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی نواب صدریار جنگ بہادر مدظلہ العالی کے کتب خانہ حبیبیہ وغیرہا میں اب بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۴) کا صبر کے ساتھ معائنہ کرتے رہیںگے۔

زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھیگا، نبی عالم کی ایک ایک بات کی تصدیق پر لسے مجبور ہونا پڑیگا، اور یہ تو تصویر سازی کا مضر پہلو ہے، اب اس پر اگر ہم غور کرتے ہیں کہ آخر اس کا کوئی مفید پہلو بھی پیدا ہو سکتا ہے، تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بڑے لوگوں کا نام سن کر آدمی کا جی چاہتا ہے کہ ان کی صورت کیسی تھی اس کا بھی علم ہوتا۔ لیکن ایک وہمی خواہش سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے ہم میں سے بڑے سے بڑا آدمی بھی ظاہر ہے کہ وہی دو آنکھیں دو ہاتھ دو کان رکھتا ہے جن سے چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی محروم نہیں بلکہ شاید حیوانات بھی ان میں انسان کے ساتھی ہیں۔ بڑائی کا مدار باطنی سیرت و کمالات پر ہے جو تصویروں میں منتقل نہیں ہو سکتے اور جو چیز تصویر میں آتی ہے اس کو بڑائی سے دور کا بھی تعلق نہیں، رہا حسن کاری کے جذبہ کا استعمال تو اس کے لیے بیسیوں راہیں کھلی ہوئی ہیں۔

مسلمانوں کی ان حُسن کارانہ صناعیوں کا معائنہ کیا جا سکتا ہے اور اس مرحوم اُمت کے اس شغف مفرط کا سُراغ ملتا ہے جو کتابوں سے کسی زمانہ میں اسے پیدا ہو گیا تھا، بلا مبالغہ اس سلسلہ میں ایک ایک کتاب پر ہزار ہا ہزار روپیہ صرف کیے جاتے تھے۔ تاریخ حدیقۃ العالم میں لکھا ہے کہ ایران کے بادشاہ عباس صفوی کو شوق ہوا کہ فردوسی کے شاہنامہ کا ایک شاہی نسخہ تیار کرایا جائے۔ عماد کاتب اس کام کے لیے بلایا گیا۔ عماد نے شرط پیش کی کہ ایک خاموش باغ کے مکان میں جگہ دی جائے اور ساز و سامان کی جو ضرورت ہو وہ پوری کی جائے۔ بادشاہ نے وزیر کو بلا کر حکم دے دیا کہ عماد کی فرمائش پوری کی جائے باغ اور بنگلہ نوکر چاکر سب حاضر کر دیے گئے۔ طلاکاری و جواہر نگاری کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی، اس کی ابتدائی قسط کی فہرست وزیر کے پاس پیش ہوئی، اس کی بھی منظوری دے دی گئی چند دنوں کے بعد عباس نے وزیر سے شاہ نامہ کی کتابت کا حال پوچھا۔ وزیر نے رپورٹ کی کہ اب تک پچھتر شعر مثنوی کے لکھے گئے ہیں اور چالیس ہزار صرف ہو چکے ہیں، باوجود بادشاہ بلکہ کج کلاہ ایران ہونے کے اس کے ہوش اڑ گئے مصارف کا یہی معیار آخر تک باقی رہا تو پوری کتاب کی لاگت گویا کروڑوں ہی تک پہنچے گی، ہمت چھوٹ گئی اور عماد کو حکم دے دیا گیا کہ کام کو روک دیں۔ اس حکم نے عماد میں غصہ کی لہر دوڑا دی اسی وقت اپنے ایک شعر کو اس نے کاٹ کر وصلی کی شکل میں بدل دیا۔ سوار ہو، نقیب جو آگے آگے جا رہا تھا اُس کو حکم دیا کہ بازار میں آواز لگاتے جاؤ "عماد کاتب کے قطعات فی قطعہ ہزار روپیے کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں، کہتے ہیں کہ اصفہان کے بازار کے اس سرے سے دوسرے سرے تک عماد کی سواری پہنچنے نہیں پائی تھی کہ پچھتروں شعر بک گئے۔ حکومت کے خزانے کے چالیس ہزار جو صرف ہوئے تھے عماد نے وزیر کے پاس اس کو بھیج دیا اور پینتیس ۳۵ ہزار کی رقم مزید بچ گئی[1]۔ میرے خیال میں اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ اس زمانہ

[1] اسی قصہ کو مولوی غلام محمد ہفت قلمی نے اپنی کتاب تذکرہ خوشنویسان میں بھی دُہرایا ہے لیکن بعض اجزاء میں کچھ اختلاف ہے۔ مثلاً غلام محمد نے لکھا ہے "میر ابیات مذکور را متعرض نمودہ بہ ہفتاد کس از شاگردان خود تقسیم کردہ ہر یک تک تومان (ایرانی سکہ) حاضر کرد" (صفحہ ۹۲ کتاب مذکور) اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ عباس صفوی نے اس قصہ میں میر عماد پر سنیت کا الزام لگا کر شہید کرا دیا۔ اسی کتاب میں یہ بھی ہے "در اوائل شاہجہاں ہر کہ خط میر عماد می گزرانید یک صدی منصب داتی برش

بھی جب پُرانے قدردانوں کو میں نے دیکھا ہے کہ عمادیا رشید کے قطعات کی قیمت تین تین سو چار چار سو دیتے ہیں تو خیال کیا جاسکتا ہی کہ جب مسلمانوں میں آج کا ایک روپیہ ہزار روپیے کی مساوی قیمت رکھتا تھا، اس زمانہ میں ایک ایک قطعہ کو ہزار ہزار روپیے میں لینے والے اگر مل گئے ہوں تو کیا تعجب[۱]

ہے یہی ہندوستان جس میں لوگ شیرازہ بندی سے بھی واقف نہ تھے بلکہ ہر ورق دوسرے ورق سے الگ ہوتا تھا، جیسا کہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس ملک کی کتابیں

بیش تر بر برگ تار[۲] و توز[۳] بغدادی قلم بر نوشتہ دامروز بر کاغذ در نوشتن از چپ آغاز ند و ورق باہم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۶) می یافت" یعنی میر عماد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی سی چیز مثلاً کوئی قطعہ ہی کیوں نہ ہو ایک صدی منصب کا حقدار صرف اس لیے بنا دیتا تھا کہ دربار شاہی میں اس نے پیش کیا ہو۔ دوسرے مشہور خطاط آقا رشید دیلمی کے تذکرہ کا یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہو کہ ایک شاعر نے مدحیہ قصیدہ رشید کی شان میں کہہ کر ان کے سامنے پیش کیا۔ رشید نے اس قصیدہ کو اپنے ہاتھ سے نقل کرکے شاعر کو واپس کر دیا "شاعر محزوں برآمد" کہ صلہ کا اُمیدوار تھا، چاہتا تھا کہ رشید سے کوئی رقمی انعام ملیگا۔ لیکن چوں طالبان خطش (خط رشید) شنیدہ ند زیادہ از آنکہ توقع صلہ و انعام درخیال داشت یاد دادہ ان قصیدہ نوشتہ آقا را از دگر فتند و خیلے ممنون گشتند ص ۱۰۰۔ ایک اور خطاط میر خلیل اللہ جو عادل شاہی حکومت بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل کے اُستاد تھے ان کے متعلق یہ لکھا ہو کہ ایک شخص جو میر خلیل کے خط کے قدردانوں میں تھا کسی کے پاس معلوم ہوا کہ ان کا کوئی مخطوطہ ہے" بہ ہفت صد روپیہ پیش آمد سود نہ کرد" بالآخر ایک قطعہ کی قیمت کیا دینی پڑی" یک اسپ عربی مبادلہ نمود" علم و ہنر کی قدر شناسیوں کا کوئی ٹھکانہ ہے؟

[۱] ملا عبدالقادر بدا ؤنی نے اپنی تاریخ میں اس مشہور داستان کا ذکر کرتے ہوئے جس کا اب تو اُردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے یعنی داستان امیر حمزہ۔ مطبع نول کشور نے تو خدا جانے اس داستان کو کہاں تک بڑھا دیا ہی، میرا تو خیال ہی کہ طلسم ہوش رُبا، ہفت پیکر، نور افشاں وغیرہ جن کے مطالعہ کا شرف اس فقیر کو بھی عہد طفولیت میں ملا تھا اب تو ان کی ابواب مجلدات سو سے متجاوز ہوں تو تعجب نہیں لیکن ملا کے بیان سے معلوم ہوتا ہی کہ ابتداءً فارسی زبان میں اس داستان کی سترہ جلدیں تھیں۔ واللہ اعلم یہ داستان کہاں لکھی گئی، مجھے یہ عرض کرنا ہی کہ ملا عبدالقادر نے ان سترہ جلدوں اور شاہ نامہ کے متعلق لکھا ہی کہ اکبر نے" شاہ نامہ و قصہ امیر حمزہ را بہ ہفتدہ جلد در مدت پانزدہ سال نویسانیدند و زر بسیار در تصویر آں خرچ شد ص ۳۲۰ ج ۲۔ اسی کتاب کی تیسری جلد میں میر سید علی مصور تخلص جُدائی کا تذکرہ کرتے ہوئے ملا صاحب نے لکھا ہی۔ قصہ امیر حمزہ در شانزدہ جلد مصور باہتمام وے اتمام یافتہ ہر جلدے صد دفتے دہر ورقے یک ذرع در یک ذرع و در ہر صفحہ صورتے ص ۲۱۱ ج ۳ جس کا یہی مطلب ہوا کہ سترہ اٹھارہ جلدوں کی یہ کتاب اس طرح لکھی گئی تھی کہ ایک ہاتھ چوڑا ایک ہاتھ لمبا جلد کا ہر ورق تھا اور ہر ورق میں ایک تصویر بنائی گئی تھی ۱۲۔

[۲] حال میں ایک قدیم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں خریدا گیا ہی جس میں تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کا ایک کافی ذخیرہ ہی۔ کرتے یہ تھے کہ لوہے کے قلم سے ان پتوں پر جو تقریباً ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت لمبے ہونگے اور ان کے کناروں کو (باقی بر صفحہ ۸۸)

پیوستہ نباشد وشیرازہ رسم نبود" (آئین اکبری ج ۳ ص ۲۸)

ابوالفضل نے امروز کا لفظ جو بڑھایا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ کا رواج اس ملک میں مسلمانوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۷) تراش کر گول کرلیا جاتا تھا اس کے بعد لوہے کے قلم کی نوک سے صرف نشانات بنا دیے جاتے تھے پھر سنبھالو یا اسی قسم کے عرق دار پتوں کو ہاتھوں سے مل کر ان نشانات پر پھیر دیا جاتا تھا جس سے نشانات نمایاں ہوجاتے تھے پرانے زمانہ میں عینکوں کے لیے جیسے خول ہوتے تھے ان ہی میں تیس تیس چالیس چالیس پتوں کا ایک مجموعہ ایک ڈوری سے نتھا ہوا ان خولوں میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ان پتوں کی کتابوں میں کس قسم کے مضامین ہیں اب تک ان کا پتہ نہیں چلا ہے، زیادہ تر تلنگی، کنڑی، مرہٹی زبانوں میں ہیں اور بعض سنسکرت میں بھی ہیں۔ جامعہ کے بعض ہندو پروفیسروں نے مجھ سے کہا کہ ان میں زیادہ تر پرانے زمانہ کے قصے کہانیاں یا جھاڑ پھونک وغیرہ جیسی چیزیں ہیں۔ ملا عبدالقادر نے بھی فیروز شاہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ جب کانگڑہ فتح ہوا تو اس کے مندروں سے بھی بہت سی کتابیں برآمد ہوئیں بادشاہ نے ان کتابوں کے ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ ملا نے لکھا ہے کہ ان ترجمہ شدہ کتابوں میں سے بعض کتابیں میری نظر سے بھی گزری ہیں۔

"بعضے ازاں در علم پنگل یعنی فنون موسیقی و اقسام اکھاڑہ کہ آں را پاتری بازی گویند و بعضے در غیر آں و اکثراں را

بے ما حصل یافت" ص ۲۴۹

اکھاڑہ سے مراد وہ اکھاڑہ نہیں ہے جس میں کشتی گیری کا فن سکھایا جاتا ہے، بلکہ ملا نے پاتری بازی سے جس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہی مقصود ہے، ابوالفضل نے اپنی خاص زبان فارسی شدہ میں اسی اکھاڑہ کے مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے "اکھاڑہ نشاط بزمے ست، درشبستان بزرگاں ایں مرز (سرزمین) پیراستہ گردد" پھر اُس نے اپنی اسی زبان میں بتایا ہے کہ گھر کی چھوکریوں کو ساز و نغمہ سکھایا جاتا ہے، اور چار عورتیں جو "نکو رو" ہوتی ہیں "برقاصی درآیند" "چہار بسرائیدگی الفرض یوں آٹھ چھوکریاں گاتی اور ناچتی ہیں اور "چہار بداں نمط تال نوازند" یعنی تالیاں بجاتی ہیں، اسی طرح سے مختلف قسم کے ڈھول جن کے مختلف نام ہوتے ہیں وہ بجاتے جاتے ہیں۔ ہندوستان جب اپنا سب کچھ کھو چکا تھا، وام مارگی فرقوں نے عبادت کی ان شکلوں کو مندروں میں مروج کیا تھا، اور باضابطہ اس کو فن بنا دیا گیا تھا دراصل پچھلے زمانہ میں ہندوستان میں کتابیں جو لکھی گئیں ان کا تعلق اسی قسم کی باتوں سے تھا۔ ٹھیک آج جو حال یورپ کا ہے کہ فائن آرٹس (فنونِ لطیفہ) کے نام سے ہر ناکردنی کو کردنی بنا دیا گیا ہے۔ وحسبون انھم یحسنون صنعاً۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان نے فن کاغذ سازی سے ناواقف ہونے کی وجہ سے تاڑ کے پتوں سے جو کام نکالا اُس میں ذہانت سے ضرور کام لیا گیا ہے لیکن اسی ملک میں مسلمانوں نے جب مسلم قرآن کو اتنی چھوٹی تقطیع میں لکھ کر دکھا دیا تھا جو انگوٹھیوں کے نگینے کی جگہ سما جاتا تھا، یا بازوبند بنا کر سلاطین و امرا بطور تعویذ کے استعمال کرتے تھے حتی کہ چنے کی ایک دال پر پوری قل ہو اللہ کی سورت تک لکھی جاتی تھی، ملا عبدالقادر بدایونی نے شریف نامی شخص کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ پدرش (خواجہ عبدالصمد) در یک طرف دانہ خشخاش سورۂ اخلاص تمام درست و خوانا نوشتہ و طرف دیگر نیز ازیں مقولہ" خشخاش کے دانہ کی ایک طرف پر سورۂ قل ہو اللہ کو اس طور پر لکھنا کہ ہر شخص پڑھ سکتا ہو بظاہر عقل میں یہ بات نہیں آتی۔ اور یہ تو باپ کا کمال تھا میاں شریف صاحبزادے بھی کم نہ تھے۔ ملا صاحب ہی نے لکھا ہے "پسرش در یک دانہ خشخاش می گویند کہ ہشت سوراخ باریک کردہ و تارہا دراں گزرانیدہ و در دانہ برنجے صورت سوارے مسلح و جلودارے در پیش مع دیگر خصوصیات از تیغ و سپر و چوگان وغیرہ آں نقش نمود (باقی برصفحہ ۸۹)

کے عہد میں ہوا۔ میں نے حاشیہ میں روضۃ الصفا سے جو عبارت نقل کی ہے اُس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیجانگر میں اس وقت تک جس زمانہ میں اس رپورٹ کا لکھنے والا آیا ہے اور وہ ان دنوں میں آیا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۸) ص۔ ۱۰۱ ج ۳۔ (برنجے) چاول کے ایک دانہ پر مسلح سوار کو ان چیزوں کے ساتھ مصور کرنا بلاشبہ عجب کمال تھا۔ اور اب بھی ان لکھنے والوں کی یادگاریں بعض پرانے خاندانوں میں موجود ہیں۔ ان کے مقابلہ میں تاڑ کے پتوں پر لکھنا ظاہر ہے کہ کیا کمال کی بات ہو سکتی ہے۔ البتہ ایک چیز غالباً ہندوستان میں لکھنے ہی کے متعلق ایسی تھی جس سے غالباً مسلمان واقف نہ تھے، روضۃ الصفا کے آخر میں دکن کی مشہور راجدھانی بیجانگر کے کچھ حالات بھی درج ہیں، غالباً قران السعدین سے ماخوذ ہیں، وہ لکھتا ہے کہ

کتابت ایشاں بر دو نوع ست یکے بقلم آہن کہ بر برگ جوز ہندی کہ دو گز طول بنگارند و ایں نوع کتابت کم بقا باشد دیگر بر جنس سیاہ سنگ نرم کہ آں را بسان قلم تراشند و چیزہا نولیسند و ازاں سنگ رنگ سفیدی بریں جنس سیاہ پدید آید و ایں کتابت دیر بماند"

جوز ہندی تو وہی تاڑ کے پتوں سے مُراد ہے، لیکن آخری چیز جو اس نے لکھی ہے بظاہر اس کا اشارہ سلیٹ اور پنسل جو پتھر ہی کی ہوتی ہے اس کی طرف ہے سلیٹ ہی پر جب لکھتے ہیں تو سیاہ پتھر سے سفید حروف نکل آتے ہیں، لیکن اجنبی مسافر ہونے کی وجہ سے اس کو غلطی لگی اور یہ لکھ دیا کہ ایں کتابت دیر بماند" حالانکہ الٹی بات ہے غالباً خود تجربہ نہیں کیا۔ پتھر پر کسی چیز کو لکھتے ہوئے رائے قائم کرلی کہ یہ نقش جب حجر میں ہو رہا ہے تو النقش فی الحجر ہی ہوگا، اور یہی دلیل ہے کہ ہندوستان میں جو مسلمان باہر سے آئے وہ سلیٹ والی ترکیب کتابت سے ناواقف تھے اور یہ کوئی خاص چیز اسی ملک کی ایجاد ہے تاہم ظاہر ہے کہ جب اس ملک میں مسلمان متوطن ہو گئے تو ہندوؤں سے اس چیز کو انہوں نے اخذ کیا ہوگا، اسی لیے میں نے اس کا ذکر بھی کیا کہ ہندی نظام تعلیم کے ایک طریقہ کتابت کا اس سے پتہ چلتا ہے ضمناً جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ پنسل سلیٹ والی ترکیب یہ اسکولوں کی پھیلائی ہوئی ہے صحیح نہیں ہے بعض عربی مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تاڑ کے پتوں کے سوا ہندوستان میں ریشمیں کپڑوں پر بھی لکھنے کا دستور تھا، واللہ اعلم بالصواب

؎ توز کیا چیز ہے؟ ہندوستان ہی کی چیز ہے لیکن مختلف کتابوں میں اس کی جو شرح کی گئی تھی دل کو نہیں لگتی تھی لیکن البیرونی کی کتاب الہند میں اس کی تفصیل ملی انجمن ترقی اردو کے اُردو ترجمہ سے اس کی عبارت نقل کرتا ہوں وہ لکھتا ہے وسط اور شمالی ہند میں درخت توز کی چھال (لکھنے کے لیے) استعمال کرتے ہیں، جس کی ایک قسم سے کتابوں کے غلاف بنائے جاتے ہیں اس کو بھوج پتر بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک ہاتھ لانبی اور پھیلی ہوئی انگلیوں کے برابر یا اس سے کم چوڑی ہوتی ہے۔ اس کو کسی طریقہ سے مثلاً تیل لگا کر اور صیقل کر کے سخت اور چکنا کر لیتے ہیں اور اُس پر لکھتے ہیں" (ص ۲۲۵ ترجمہ اُردو) لیکن اس سے بھی زیادہ تفصیل طبی کتاب محیط اعظم میں دی گئی ہے۔ لکھا ہے "واں پوست درخت ہندی کشمیری ذی طبقاتِ کثیرہ مثل طبقات ابرک بود ہر طبقہ مثل کاغذ و خطوطِ مستقیم سُرخ و سفید مثل الف برآں کشیدہ و مردم کشمیر برآں کتاب می نویسند و درخت او بلند می شود و برگہائے او نقطہ دار (ج ا ص ۳۸۲) (باقی بر صفحہ ۹۰)

جب دکن کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا، صرف یہ علاقہ باقی تھا، معلوم ہوتا ہے کہ قدامت پرستی کی وجہ سے بیجانگر کی حکومت نے اس وقت تک کاغذ کا استعمال شروع نہیں کیا تھا اور ہندوستان کی تاریخ وغیرہ کے متعلق جو عام مواد کمیاب ہے، اس کی زیادہ وجہ غالباً یہی ہے کہ ان کے پاس کاغذ نہیں تھا، تاڑ کے پتوں پر چند مذہبی ضروری کتابیں لکھ لیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم میرا یہ خیال ہے، ممکن ہے ارباب تحقیق کی رائے کچھ اور ہو۔ بہرحال اگر کاغذ اس ملک میں مستعمل ہوگا بھی تو بہت کم۔ زیادہ تر کام وہی تاڑ کے پتوں یا سلیٹ کی تختیوں سے لیا جاتا تھا، یا زمین پر ملتانی مٹی سے بچوں کو حساب وغیرہ کی مشق لکھوا کر کرائی جاتی ہوگی جس کی یادگار اب تک پرانے پاٹھ شالوں میں ملتی ہے لیکن جب مسلمان اس ملک میں آئے تو اپنے ساتھ کاغذ لائے مختلف شہروں میں کاغذ بنانے کے کارخانے قائم تھے خصوصاً کالپی کا کاغذ بہت مشہور تھا لیکن ماثر الکرام میں ایک واقعہ کے ذکر میں کالپی کے کاغذ کی یہ خاصیت بتائی گئی ہے کہ "کاغذ کالپی درآب زود متلاشی می گردد" (ص ۵۸) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کالپی کا ساختہ کاغذ پانی میں بآسانی گل جاتا تھا۔ اسی کے مقابلہ میں جو کاغذ کشمیر میں بنتا تھا ملا عبدالقادر نے اس کے متعلق اپنی کتاب میں ایک عبارت یہ نقل کی ہے "نقوش ان از کاغذ شستن چناں می رود کہ ہیچ اثرے از سیاہی نماند" (ص ۱۴۴ ج ۳)۔ جس سے معلوم ہوا کہ پانی سے دھونے کے بعد کاغذ پھر جیسا کا جیسا ہو جاتا تھا۔ اب بھی کشمیری کاغذ پر قرآن چھپا ہوا نظر آتا ہے تو بہت چکنا اور مضبوط معلوم ہوتا ہے، اتنا چکنا کاغذ کہ پانی سے حروف کو دھو دیجیے پھر جیسا تھا ویسا ہی ہو جائے شاید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۹) اسی میں یہ بھی ہے کہ مردم ہند بچہ فلیاں (حقہ) بکار می برند" البیرونی نے لکھا ہے کہ ان اوراق کی ترتیب مسلسل ہندسوں سے معلوم ہوتی ہے۔ پوری کتاب کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپٹی ہوئی دو تختیوں کے درمیان جو کتاب کے برابر ہوتی ہیں بندھی رہتی ہے اور ان کتابوں کا نام پوتھی ہے۔ محیط اعظم میں دوسرے موقعہ پر "توز" کے تحت میں لکھا ہے "شجر عظیم ست چوں چوب آں را بر آتش نہند از آں روغن مثل روغن بلساں سائل شود و صمغ دگوند) آں کہربا ست" واللہ اعلم ہندوستان میں رواج ہے کہ دال یا پلاؤ وغیرہ میں ایک قسم کے پتے بنام تیزپات ڈالتے ہیں۔ کیا تیز کا لفظ "توز" کی بگڑی ہوئی شکل ہے بھوج پتر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بھوج کے معنی ہندی میں کھانے کے ہیں یعنی وہ پتہ جو کھانوں میں ڈالا جاتا ہے ممکن ہے کہ مصالحہ کے یہ پتے اسی درخت توز کے ہوں۔ بہرحال صاحب محیط اعظم کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تہ بہ تہ بالکل رول دیے ہوئے کاغذ کی مانند قدرتی طور پر یہ چھال درخت توز میں پیدا ہوتی ہے۔ کمان پر چڑھاتے تھے اس سے معلوم

اب بھی مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔

بہرحال معلوم نہیں کہ اور کہاں کہاں کاغذ کی صنعت مسلمانوں کے آنے کے بعد اس ملک میں جاری ہوئی، ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اکبری قلمرو کے ہر صوبہ کی دستکاریوں اور پیداوار کا ذکر کیا ہے لیکن کاغذ سازی کے سلسلہ میں اُس نے صرف بہار ہی کا نام لیا ہے، بہار میں بھی سرکار بہار جو اب ایک معمولی قصبہ اور سب ڈویژن ہے اس کے ذکر میں لکھتا ہے کہ

"در سرکار بہار نزدیک موضع راجگر کان سنگ مرمرست از وزیورہا بر سازند، و کاغذ خوب می شود"

سیر المتاخرین کے مصنف نے بھی حالانکہ تمام صوبوں کے کچھ نہ کچھ مصنوعات کا ذکر ہر صوبہ کے ذیل میں کیا ہے، زیادہ تر ابوالفضل ہی سے اس کا بیان ماخوذ ہے لیکن تقریباً دو سو سال بعد انہوں نے بھی صرف یہی لکھا کہ "و کاغذ در موضع اروَل و بہار خوب بہم رسد" (ص ۱۹) گویا ابوالفضل کے بیان پر صرف اتنا اضافہ کیا کہ قصبہ بہار کے سوا اروَل جو ضلع گیا میں قدیم شرفا کی ایک بستی سے زیادہ اب کوئی وقعت نہیں رکھتا، اس میں بھی "کاغذ خوب" کی بہم رسانی کی خبر دی ہے۔ آخر میں اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ان دونوں مقامات بہار و اروَل میں

"اکنوں ہم می سازند اگر کارفرمائے بہم رسد و زرے خرچ کند شاید بہتر از آنکہ می ساختند ساختہ آید"
ص ۱۱۹

مولوی مقبول احمد صمدنی نے میر عبدالجلیل بلگرامی کی سوانح عمری میں سرکاری گزیٹر سے یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے کہ سنہ ۱۸۰۱ء تک انگریزی کتابیں پٹنہ کے کاغذ پر چھاپی جاتی تھیں (حیات جلیل ص ۱۷۹) لیکن بتدریج آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ کارفرماؤں کا خاتمہ ہو گیا، اور "زر" بجائے حوصلہ افزائی کے حوصلہ شکنی میں صرف ہوا، تقریباً چالیس پچاس سال سے تو میں جانتا ہوں کہ ان مقامات کو اب کاغذ سازی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے، شاید بہار میں ایک محلہ جو اب اسٹیشن بھی ہے، کاغذی محلہ کے نام سے جو مشہور ہے کسی زمانہ میں اسی میں کاغذ بنتا ہو، ممالک[۱] محروسہ سرکار عالی حضور نظام

---

[۱] شالمرل کی کتاب کے حوالہ سے اسلامی درسگاہوں کے مصنف نے یہ عبارت نقل کی ہے کہ "جنوبی ہند میں لڑکے نرکل سے چینی کاغذ پر لکھتے ہیں" یہ گولکنڈہ کے بادشاہ قطب شاہ کے زمانہ کی بات ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دکن میں کاغذ چین سے آتا تھا، گویا دکن میں کاغذ کی صنعت سلاطین آصفیہ کے زمانہ سے مروج ہوئی۔

میں بھی اورنگ آباد میں قدیم طرز کے کاغذیوں کی ایک نسل پائی جاتی تھی جو دم توڑ رہی تھی[1]، نیز بعض دوسرے اضلاع مثلاً کریم نگر وغیرہ کے بعض قصبوں میں اس کے بنانے والے موجود ہیں، لیکن ادھر چند سالوں سے حکومت آصفیہ کے کارفرماؤں کی توجہ اس صنعت کے احیاء کی طرف مبذول ہوئی ہے، اور زر بھی خرچ کیا جا رہا ہے، بحمداللہ ہر قسم کے کاغذ فراہم ہونے لگے ہیں، سرکاری دفاتر میں ان کا تھوڑا بہت رواج بھی ہو چلا ہے اور شاہی فرامین جس کا نام "جریدہ غیر معمولی" ہے وہ عموماً اسی کاغذ پر طبع ہوتا ہے بعض کتابیں بھی اس پر چھپی ہیں۔

خیر یہ تو ایک ذیلی بحث تھی، نظر سے گذری ہوئی بات تھی موقع سے ذکر آگیا، جی نہ چاہا کہ چپ چاپ گزر جاؤں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خواہ کاغذ کہیں بنتے ہوں لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد اس ملک میں کاغذ کی فراوانی تھی، صرف یہی نہیں کہ عام کاغذ لکھنے پڑھنے اور کتب نویسی کے ملتے تھے، بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں جو ظاہر ہے کہ ہندی اسلام کے قرون اول ہی میں شمار ہو سکتا ہے، اس زمانہ میں سادہ کاغذوں کی مجلّد کاپیاں بھی مسودہ نگاری کے لیے ملتی تھیں اور وہ بھی سفید کاغذ کی، فوائد الفواد میں ایک موقع پر خود حضرت نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ

[1] جون پور کے پاس ہی پرانے زمانہ میں ایک بڑا مشہور شہر ظفر آباد تھا، جو قریب قریب اب کھنڈر ہو گیا ہے، پھر بھی تھوڑی بہت آبادی ابھی باقی ہے۔ ایک صاحب نے چراغ نور کے نام سے اس کی تاریخ لکھی ہے اس میں بیان کرتے ہیں کہ اس قصبہ میں پانچ سو دکانیں کاغذ بنانے کی تھیں، بظاہر دکان سے مراد کارخانے ہیں لکھا ہے کہ سال میں تین چار لاکھ روپیہ کی تجارت تھی، واللہ اعلم یہ سب بیان ان کا کہاں تک صحیح ہے لیکن ایک مفید بات اس کتاب میں خوب ہی مل گئی، مصنف کتاب نے کاغذیوں کے خاندان والوں سے ان کاغذوں کی قسمیں اور نام پوچھ کر درج کر دیے ہیں، ان کے بیان کے مطابق ظفر آباد میں جو کاغذ بنتے تھے ان کی قسم اور نام یہ تھے۔ (۱) اردلی غالباً یہ تو وہی اردل بہار کے کاغذ کی نقل ہوگا (۲) نصیری (۳) ہیراننڈی (۴) راسی (۵) موٹھا (۶) پتنگی۔ غالباً پتنگ کا باریک کاغذ ہوگا (۷) چرکوٹا (۸) سلم۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ٹاٹ اور نار سٹرا کر اسی کو کوٹ کر بجی کا کھار دے کر پانی میں صاف کر کے یہ کاغذ بناتے تھے اب ظفر آباد کی آبادی کل ہزار بارہ سو گھروں پر مشتمل ہے، کاغذی شیوخ کہلاتے ہیں۔ مولانا شبلی مرحوم نے اپنے مقالات میں سے خانخاناں عبدالرحیم خاں پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں ذکر کیا ہے کہ ابری کاغذ خاص ہندستان میں خانخاناں کی ایجاد ہے، اور ایک کاغذ عکاسی کی ایجاد کا انتساب بھی خانخاناں کی طرف کیا ہے لیکن مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ "کاغذ عکاسی" کا کیا مطلب ہے وہ میری سمجھ میں نہ آیا۔

علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

"مردے مراکاغذ ہاسپید داد بجی جلد کردہ ہس آں رابستدم فوائد شیخ ہم درآنجا ثبت کردم" ص ۳۰۱

جس ملک میں لوگ کتابوں کی جلد بندی سے بھی ناواقف تھے اور دو ورق بھی باہم پیوستہ نہ ہوتے تھے وہاں سادہ کاغذوں کی مجلد بیاضوں کا رواج ہو چکا تھا، اور یہی مجھے عرض کرنا تھا کہ مسلمانوں کے زمانہ میں ہندوستان علمی و کتابی کاروبار اور اس کی مختلف نوعیتوں کے اسباب و ادوات، آرائش و زیب و زینت کے لحاظ سے دوسرے اسلامی ممالک سے اگر بڑھا ہوا نہیں تو کم بھی نہ تھا، ملا عبدالقادر کی لوح و جدول نگاری، جلد بندی کے ذیل میں بے ساختہ قلم سے یہ چند زائد چیزیں نکل گئیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان میں ہر چیز کا تعلق "تعلیم و تعلم" اور اس کے ساز و سامان ہی سے ہے۔

میں دراصل یہ بیان کر رہا تھا کہ مسلمان دینی کتابوں کی کتابت ان کی تصحیح و مقابلہ وغیرہ کے کام کو بھی دین ہی کا ایک جزء سمجھتے تھے اور اسی سلسلہ میں ملا عبدالقادر کی قرآن نویسی کا بھی ذکر اس لیے کیا گیا تھا کہ ملا صاحب نے جس نقطۂ نظر سے لکھا تھا، وہ دلچسپ تھا اور اسی کا ذکر یہاں مقصود تھا، اپنی مصحف نگاری کے مندرجہ بالا تذکرہ کے بعد فرماتے ہیں کہ

اُمید کفارۂ کتابہائے گذشتہ کہ چوں اعمال بندہ سیاہ ست گردیدہ مونس ایام حیات و شفیع بعد ممات گردد

وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ (منتخب ص ۳۹۴)

جس کا یہی مطلب ہوا کہ اکبر کے حکم سے جن مزخرفات کے لکھنے اور ترجمہ کرنے کا کام محض ملازمت اور بادشاہ کے خوف سے ان کو کرنا پڑا تھا، اسی کے کفارہ کی ایک صورت ملا صاحب نے یہ نکالی تھی اور یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ مسلمان اس کام کو ایک اہم دینی خدمت سمجھتے تھے، ملا صاحب بیچارے نے اپنے اس کام سے کفارہ کے سوا اس کی بھی توقع کی ہے کہ زندگی میں اس سے انس حاصل کرونگا، اور اُمیدوار ہوئے ہیں کہ مرنے کے بعد ان ہی حروف قرآنی کی شفاعت اور سفارش سے ان کی نجات ہوگی اور سچ تو یہ ہے کہ صحیح حدیث کے رو سے قرآن کی تلاوت کا اثر یہ بتایا گیا ہے

کہ وہ میدانِ قیامت میں بادلوں کی شکل میں یا پرندوں کے پرے کی شکل میں پڑھنے والے کے سر پر سایہ فگن ہونگے، تو قرآن لکھنے والے اسی قسم کی توقع اپنے مکتوبہ حروف سے اگر قائم کریں تو کیا تعجب ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ اسلامی علوم کے مصنفین اپنی کتابوں میں قرآن کی آیتیں جو جا بجا استعمال کرتے ہیں، ان کے لیے بھی اس میں بشارت ہے وانما الاعمال بالنیات آپ دیکھ چکے کہ ہمارے اسلاف تو قرآن کی کتابت ہی نہیں صرف تصحیح کو بھی ایک مستقل عبادت کی حیثیت سے اختیار کرتے تھے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں قرآن کی بھی کوئی خصوصیت نہ تھی شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے استاذ شیخ عبدالوہاب المتقی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ

کتابے کہ نادرالوقوع کثیر النفع می بود کہ بسبب عدم تداول از حلیۂ صحت عاطل گشتہ اصول نسخ آں را احیا الممکن بہم رسانیدہ سوزن تصحیح می دادند۔ (ص ۲۷۲ - اخبار)

یعنی قرآن کی خصوصیت نہ تھی بلکہ ہر کتاب جو شیخ کے نقطۂ نظر سے نفع بخشی میں اہمیت رکھتی تھی، لیکن بے توجہی یا عدم استعمال کی وجہ سے صحت سے محروم ہو گئی تھی، ان کے "اصولِ نسخ" یعنی تلاش کر کے اصل نسخے شیخ بہم پہنچاتے تھے اور جہاں تک ممکن تھا ان کی تصحیح میں کوشش کرتے تھے، گویا آج یورپ میں پرانی کتابوں کے ایڈٹ کرنے کا جو عام طریقہ جاری ہے، مختلف قدیم نسخے مہیا کیے جاتے ہیں، اور سب سے مقابلہ کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا جاتا ہے جس کے معاوضہ میں مصححین کافی معاوضہ وصول کرتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ تو صرف اسی تصحیح و مقابلہ کے صلہ میں جو کسی پرانے نسخہ کے متعلق کوئی انجام دیتا ہے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لوگوں کو مل رہی ہیں۔ لیکن سن رہے ہو مسلمان بغیر کسی معاوضہ کے محض حسبۃً للہ "نادر الوقوع کثیر المنافع" کتابوں کے ایڈٹ کرنے کے کام کو بھی دین ہی کا کام سمجھ کر کرتے تھے۔

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ شیخ عبدالوہاب متقی کا یہ کوئی ذاتی مذاق تھا۔ اسی ہندوستان کے ایک دوسرے بزرگ سید ابراہیم دہلوی جن کے کتب خانہ کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ بقول شیخ محدث "بیروں از حد حصر بیشمار بود" ان کا بھی مشغلہ جیسا کہ شیخ ہی نے لکھا ہے یہ تھا کہ

کتب بسیار از ہر علم مطالعہ کردہ و تصحیح فرمودہ و مشکلات را چناں حل کردہ کہ ہر کرا ادنیٰ مناسبتے باشد نظر در کتاب او کافی ست و احتیاج استاد نیست" ص ۲۵۰۔

پہلے زمانہ میں اسی کام کا نام "کتاب بنانا" تھا، میں نے پہلے بھی کسی صاحب کا ذکر کیا ہے کہ ان کے کتب خانہ کی کتابیں سب بنائی ہوئی تھیں لیکن بظاہر ان کا کام صرف درسی کتابوں تک محدود تھا، لیکن سید ابراہیم صاحب کے یہاں درسی و غیر درسی کی خصوصیت نہ تھی۔

کچھ یہ نہ خیال کیا جائے کہ عام اہل علم ہی تک یہ مذاق محدود تھا، قرآن ہی نہیں حدیث کی ضخیم ضخیم کتابوں کی خدمت اس زمانہ کے نامی گرامی امراء وقت بھی سرمایہ سعادت خیال کرتے تھے، مولانا آزاد نے ایک محمد شاہی امیر روح الامین خاں کے متعلق جو بلگرام کے رہنے والے تھے اور نادر شاہ کے معرکہ میں بالآخر وہ شہید بھی ہوئے، ان ہی کے ترجمہ میں یہ بتاتے ہوئے کہ "ہمیشہ صاحب طبل و علم و خیل و حشم زیست و چندے بہ حکومت بست و دو محال عمدہ پنجاب کہ سیالکوٹ و جالندھر جملہ است پرداخت" لیکن اس طبل و علم و خیل و حشم کے ساتھ، اور پنجاب کے ایک بڑے علاقہ کی گورنری کے مشغلوں کے باوجود انہوں نے نیکیوں اور سعادتوں کے سمیٹنے کا ایک ذریعہ یہ بھی بنا رکھا تھا، جیسا کہ مولانا آزاد ہی راوی ہیں۔

"در پایانِ عمر کہ سن شریفش از ہفتاد متجاوز نمود صحیح بخاری و مسلم را بدست خود کتابت کردہ محشی ساخت[۲۸۹]

روح الامین خاں بلگرام ہی کے رہنے والے ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کا یہ بیان ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے، ستر سال کی عمر ہے، اور بخاری و مسلم جیسی ضخیم کتابوں کی کتابت کرتے ہیں، صرف کتابت نہیں، بلکہ "محشی ساخت" دونوں پر حواشی بھی لکھتے ہیں۔ اور یہ تھی پیرانہ سروں کی جوان ہمتی، بڑھاپے کی علمی اولوالعزمیاں اور اس پر کمال یہ ہے کہ اس عمر کے بعد درجہ شہادت سے بھی فائز ہوتے ہیں، اُف قوموں کو جب زندگی بخشی جاتی ہے، تو پھر ان سے کیسے کیسے آثار نمایاں ہوتے ہیں، اور جب موت طاری ہوتی ہے تو اس کی افسردگیاں بھی کتنی دردناک ہوتی ہیں)۔

اور روح الامین خاں کا واقعہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ قرآن و حدیث کے لکھنے لکھانے کا ایسا معلوم ہوتا ہے امراء کے عام طبقہ میں ایک عام ذوق پایا جاتا ہے۔ خود مولانا غلام علی آزاد کے حقیقی نانا میر عبدالجلیل بلگرامی جن کا شمار عالمگیری امراء میں تھا، مدت تک سندھ میں بھکر اور سیوستان کی وقائع نگاری[1] جیسی اہم خدمت ان کے سپرد رہی۔ فرخ سیر کے آغاز حکومت تک۔ مگر باوجود اس شوکت و اُبہت امارت و دولت کے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ میر عبدالجلیل صاحب نے صحیح بخاری کا ایک نسخہ اپنے لیے لکھوایا تھا لیکن ابھی اس نسخہ کی تصحیح و مقابلہ کا موقع نہ ملا تھا کہ اپنی خدمت سے وہ معزول ہو کر سندھ سے روانہ ہو کر دلی چلے۔ معزولی کی وجہ یہ تھی کہ سندھ میں نباتِ سفید کا مزہ رکھنے والے اولوں کے برسنے کی خبر انہوں نے بادشاہ کو دی تھی۔ وزیر کو بدگمانی ہوئی کہ بادشاہ کو صرف خوش کرنے کے لیے میر صاحب نے یہ واقعہ گھڑا ہے اسی لیے معزولی کا حکم بھیج دیا۔ بہرحال مجھے تو اس ذوق اور والہانہ تعلق کا ثبوت پیش کرنا ہے، جو مسلمانوں کو علم و دین کی کتابوں سے تھا، مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ سندھ سے چلے تھے اپنی چھوٹی ہوئی ملازمت اور وہ بھی کیسی ملازمت قریب قریب اس کی وہی حیثیت تھی جو آج کل ریاستوں میں رزیڈنٹوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی ملازمت پر دوبارہ بحالی کی کوشش کرنے کے لیے لیکن بخاری کی تصحیح و مقابلہ کا کام رہ گیا ہے۔ اس کا خیال آیا، اور سندھ سے نکل کر نوشہرہ پہنچے تھے کہ وہیں محض بخاری کے اس کام کے لیے خیمہ زن ہو گئے۔ مولانا کے الفاظ

---

[1] شاہی عہد کا یہ ایک بڑا اہم عہدہ تھا، ہر علاقہ میں ایک خاص سررشتہ وقائع نگاری کا قائم تھا، مقصد اس کا یہ تھا کہ بادشاہ اپنے ملک کے ہر علاقہ کے حوادث و واقعات سے براہ راست واقفیت حاصل کر کے اپنے آپ کو پورے ملک کے ساتھ وابستہ رکھے، گویا وقائع نگار پادشاہ وقت کی آنکھیں ہوتے تھے جو ملک کے ہر واقعہ پر اسی ذریعہ سے ٹکٹکی باندھے رکھتی تھیں۔ چونکہ وقائع نگار روز روز کے واقعات کی رپورٹ بصیغہ راز استانۂ شاہی تک کیا کرتا تھا، اس لیے علاقہ کے تمام حکام و ولاۃ و قضاۃ سب پر ان کی نگرانی قائم رہتی تھی، وہ کسی کا محکوم نہیں ہوتا تھا، لیکن دوسرے اپنے آپ کو ان کے دباؤ میں پاتے تھے، اسی لیے اس عہدہ کے لیے کسی ایسے آدمی کا انتخاب ہوتا تھا جو دل و دماغ، عقل و دین دونوں میں کمال رکھتا ہو، علاقہ کے نوابوں جاگیرداروں حکام سے کوئی کمزوری سرزد ہوتی تھی، تو ان کا پہلا کام یہی تھا کہ وقائع نگار کو ہموار کیا جائے، ہزاروں اور لاکھوں کی رشوتیں پیش ہوتی تھیں۔ مولانا آزاد بھی اپنے نانا کے ساتھ کبھی کبھی سندھ میں رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ احمد یار خاں زمیندار نے ایک شخص کو بلا وجہ قتل کر دیا تھا، نانا صاحب کے پاس خطیر رقم لے کر حاضر ہوا کہ رپورٹ شاہی دربار میں اس واقعہ کی نہ کی جائے لیکن اس عہدہ کے لیے (باقی بر صفحہ ۹۷)

ہوئیں :-

"آں جناب بعزم شاہجہاں آباد خیمہ را بہ نوشہرہ کہ موضعے ست در سواد بھکر برآوردند ومحض برائے مقابلہ صحیح بخاری شش ماہ مکث کردند"
قیام ۱۲

اس ذوق کی کوئی انتہا ہے، دوسرا آدمی کہتا تو شاید اُسے مبالغہ خیال کیا جاتا، لیکن مولانا آزاد تو ان کے حقیقی نواسے ہیں، خود اس سفر میں ان کے ساتھ تھے۔ اتنی بڑی اہم نوکری کا معاملہ ہے، چاہیے تو یہی تھا کہ ہانپتے کانپتے کسی طرح دارالسلطنت پہنچ کر اپنے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرتے، لیکن ان بے نیازیوں کو دیکھتے ہو، جو دین اور علم نے ان بزرگوں میں پیدا کیا تھا۔ جانتے ہیں کہ وزیر اعظم مخالف ہے، اسی کے مشورہ سے بادشاہ نے معزول کیا ہے۔ ساری عزت و آبرو کا دارمدار اسی عہدہ پر ہے، جس سے اچانک محروم ہونا پڑا ہے۔ تاخیر میں ہر طرح کے احتمالات قدرتی طور پر دماغ میں آتے ہونگے، لیکن دل کی ٹھنڈک سے ساری دماغی شورشوں کی تلافی ہو رہی تھی، نوشہرہ کے سواد میں اُتر جاتے ہیں، اس قصد سے اُتر جاتے ہیں کہ بخاری کی تصحیح و مقابلہ کا رُکا ہوا کام پورا ہولے، تب دیکھا جائیگا جو ہوگا، صرف یہی نہیں، بلکہ ظاہر ہے کہ وہ امیر کبیر تھے، کوئی غریب آدمی تو تھے نہیں کہ کسی مسجد میں اُتر گئے تھے، خیمہ خرگاہ اور اُس کے لوازم سب ساتھ تھے، مولانا آزاد رقمطراز ہیں :-

"چوں توابع ولواحق بسیار در رکاب بود مبالغ الوف بہ صرف در آمد"
نوکر چاکر ۱۲ ہزار ہا ہزار ۱۲

خدم وحشم، پیادوں، دونوں کے ساتھ ایک اجنبی مقام میں چھ چھ ماہ تک رئیسانہ نوابی زندگی پر جو خرچ ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں اس والہانہ اور عاشقانہ کیفیت میں علم کے سوا دینی جذبہ کا بھی کافی اثر ہمیں ماننا چاہیے تھا، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میر صاحب کے سامنے بہ یک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۶) ان کا انتخاب ہی کیوں ہوتا۔ اگر ان نقرئی وطلائی زنجیروں سے ان کا ہاتھ باندھا جا سکتا تھا۔ فرخ سیر کے عہد میں وقتی طور پر میر صاحب کو وزیر اعظم نے اس لیے معزول کر دیا تھا کہ سندھ میں اولے برسے تھے چکھنے والوں نے چکھا تو بالکل نبات سفید کا مزہ تھا، واقعہ تھا لکھا گیا۔ وزیر کو اس خبر پر اعتبار نہیں ہوا اور اُس نے محض اس ایک خبر کی وجہ سے معزولی کا فرمان بھجوا دیا۔ اس سے اُس عہدہ کی نزاکت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۱۲۔

کرشمہ دو کار کا بھی نکتہ ہو، اس لیے کہ مسلمانوں میں سلفاً عن خلفٍ ایک تجربہ کی بات یہ رہی ہو کہ حل مشکلات میں بخاری شریف کے ختم کو بالخاصیت دخل ہو۔

دوسرے مورخین نیز حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بستان المحدثین میں لکھا ہو کہ تاتار کا وہ فتنۂ ہائلہ جس نے اسلامی ممالک کو ساتویں صدی میں، اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روند ڈالا تھا، فتنہ کا یہ سیلاب ترکستان، خوارزم، بخارا، ایران وعراق حتیٰ کہ پایۂ تخت خلافت دارالسلام بغداد کو برباد کرچکا تھا، عباسی خلیفہ مستعصم ہولاکو کے ہاتھوں شہید ہوچکا تھا جب اسی سیلاب نے شام کی طرف رُخ کیا تو اُس وقت جیسا کہ شاہ صاحب ارقام فرماتے ہیں۔

"چوں ہنگامۂ تتار روداد و افواج ستم امواج آں اشقیا بدیار شام توجہ نمود حکم سلطانی نفاذ یافت کہ علماء جمع شدہ ختم صحیح بخاری بخوانند" (بستان المحدثین ص ۱۲۷)

شاہ صاحب نے لکھا ہو کہ ابھی ختم میں ایک دن باقی تھا کہ مشہور محدث امام حضرت علامہ تقی الدین بن دقیق العید جامع مسجد تشریف لائے، اور ختم کرنے والے علماء سے پوچھا کہ بخاری کیا ختم ہوگئی، عرض کیا گیا کہ "یک میعاد باقیست" لیکن ختم بخاری کے نسخہ کا مسلمانوں کو جو ہمیشہ سے تجربہ تھا آج بھی وہی سامنے تھا، شاہ صاحب نے لکھا ہو کہ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ نے کشفاً اعلان کیا:۔ "تمتد منفصل شد دی روز وقت عصر فوج تتار شکست فاحش خوردہ برگشت و مسلمانان در فلاں صحرا متصل فلاں بکمال خوشی وخرمی مقام کردند"

دراصل معرکہ کا میدان دمشق سے سیکڑوں میل دور تھا، شامی فوج آگے بڑھ کر دشمنوں کو روکنے کے لیے بھیجی گئی تھی، شیخ کا یہ ایک کشفی بیان تھا، لوگوں نے عرض کیا "ایں خبر را شائع بکنیم" شیخ[1]

[1] یہ شیخ ابن دقیق العید ان چند اشتثنائی ہستیوں میں ہیں جن میں عقل کے ساتھ علم، اور علم کے ساتھ دین اور دین کے ساتھ اخلاص یہ سارے صفات جمع ہوگئے تھے۔ علامہ ذہبی جو ان کے دیکھنے والوں میں ہیں تذکرۃ الحفاظ میں ان کا بسیط تذکرہ درج کیا ہو خود اپنی رائے بھی قلم بند کی ہو۔ کان من اذکیاء زمانہ واسع العلم کثیر الکتب مدیما للسہر مکبا علی الاشتغال ساکنا وقوراً ورعاً قل ان ترٰی العیون مثلہ (اپنے وقت کے بڑے ذکی آدمیوں میں تھے علم ان کا وسیع تھا، کتابوں کا کافی ذخیرہ اپنے پاس رکھتے تھے، شب بیداری کے پابند تھے، ہمیشہ مشغول ہی رہتے تھے۔ بھاری بھرکم مطمئن دل والے تھے، بڑے پرہیزگار، آنکھوں نے ان جیسی ہستیوں کو کم ہی دیکھا ہو) (باقی برصفحہ ۹۹)

سنے اجازت دے دی، شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "بعد چند روز مطابق در برید سلطانی رسید" ص ۱۲،
حقیقت یہ ہے کہ بخاری کے ختم کا یہ ایسا تجربہ ہے، جس کا مشاہدہ خود مجھے بھی اپنے ایک دوست کے سلسلہ میں ہوا عقلی طور پر ایک ایسا کام جو بظاہر ناممکن تھا میرے سامنے اس کا ظہور ہوا، میں نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ ان کے والد جو ایک صاحب دل عالم تھے انہوں نے بخاری شریف کا ختم کیا تھا، پس کیا تعجب ہے کہ میر عبد الجلیل صاحب کے سامنے یہ بات بھی رہی ہو اور ہوا بھی یہی کہ دلی پہنچنے کے ساتھ ہی بغیر مزید کد و کاوش کے غلط فہمی رفع ہوگئی، اپنے منصب پر بحالی کا فرمان ان کو مل گیا۔

خیر اس واقعہ میں تو آپ کو علم سے زیادہ دین کا دباؤ نظر آتا ہے، گو میرے نزدیک حقیقی علم ہی کا نام دین ہے اور سچے دین ہی کی تعبیر علم صادق سے کی جاتی ہے، مگر اسی زمانہ میں اسی ہندوستان میں ہم نوشہرہ کے سواد میں مغل دربار کے اگر ایک امیر کبیر کو تصحیح و مقابلہ بخاری میں مشغول پاتے ہیں، تو ٹھیک انہی دنوں میں مرشد آباد بنگال میں دریائے بھاگیرتی کے کنارے ایک شاہی محل میں ایک امیر عالم کو پاتے ہیں کہ وہ فلسفہ و حکمت کی سب سے نادر کتاب جو میرے نزدیک تو شفا و اشارات شرح حکمۃ الاشراق جیسی اساسی کتابوں سے بھی زیادہ اہمیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۸) اور قطب الدین الحلبی کے حوالہ سے بھی ان کی نسبت یہ نقل کی ہے "لم یُرَ فی عصرہ مثلہ" (اپنے وقت میں ان کے جوڑ کا آدمی نہ دیکھا گیا) ۶۲۵ھ ہجری میں بمقام ینبع (حجاز) میں پیدا ہوئے، اپنے عہد کے اساتذہ سے علوم دینیہ خصوصاً حدیث و فقہ و اصول حاصل کیا، مصری حکومت اصرار کر کے مصر کے قضاء القضاء (چیف جسٹس) کے عہدہ پر مقرر کرتی رہی، لیکن ہر چند سال کے بعد استعفا داخل کرتے تھے عموماً یہ اس صورت میں ہوتا تھا جب حکومت دین کے معاملہ میں کچھ مداہنت سے کام لینا چاہتی تھی۔ ارض فرعون (مصر) کے سلاطین پر اتنا اثر تھا کہ شیخ جب کسی ضرورت سے بادشاہ کے پاس جاتے تعظیم کے لیے بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور اپنی جگہ چھوڑ دیتا تھا، شیخ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ لکھی ہے کہ "کان کثیر الشفقۃ علی المشتغلین کثیر البرلہم" (یعنی اپنے شاگردوں پر بڑے مہربان تھے، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے تھے ۷۰۲ھ میں ستر کی عمر پا کر وفات پائی۔ شیخ نے اگرچہ کم کتابیں لکھی ہیں۔ اور جو کچھ لکھا ہے ان میں بعض کی تکمیل نہ ہو سکی تاہم ان کی کتاب "الامام فی الاحکام" جو غیر مکمل ہے اس سے ان کی جلالت شان اور اجتہادی نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے عجیب بات ہے کہ لوگ ان کو "المالکی الشافعی" دونوں نسبتوں کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۲۶۴)

رکھتی ہو یعنی مجلس اخوان الصفا کے فلسفیانہ رسائل کے ساتھ بجنسہ اسی خدمت میں مصروف ہے جو بخاری شریف کی میر عبد الجلیل صاحب فرما رہے تھے۔ طبا طبائی نے سیر المتاخرین میں ایک شیعی عالم میر سید محمد علی کا ذکر کیا ہے، یہ اورنگ آباد دکن کے مولود تھے مگر نسلاً ایرانی تھے۔ ہندوستان سے ایران جا کر اجتہاد کی سند لائے تھے، دکن کی آب و ہوا، اور یہاں کا آصفی ماحول ظاہر ہے کہ ان کے مناسب حال نہ تھا، اس لیے مختلف مقامات سے گذرتے ہوئے، بالآخر وہ اس زمانہ کے مشہور ناظم بنگالہ علی وردی خاں مہابت جنگ کے شیعی دربار میں پہنچ گئے۔ جیسا کہ چاہیے تھا، وہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی علی وردیؒ خاں جو ناظم کیا بنگال و بہار و اڑیسہ کا مطلق العنان فرمانروا تھا اس نے ان کے لیے بیش قرار وظیفہ جاری کردیا، اور دریائے بھاگیرتی مرشد آباد جس کے ساحل پر ہے لب دریا ان کو عالی شان شاہی محل رہنے کے لیے عطا ہوا، مہابت جنگ روز انہ کافی "(شیعہ حدیث) کی کتاب کا درس بھی ان سے لیتا تھا۔

---

[1] طبا طبائی نے لکھا ہو کہ سید محمد علی جب ایران سے اورنگ آباد پہنچے تو "ناصر جنگ ناظم دکن (یعنی آصف جاہ ثانی شہید رحمۃ اللہ علیہ) تکلیف ماندن کرد لیکن بر بنا فساد و ضلع او قبول نکرد و از آنجا بحیدر آباد و در آنجا چندے قیام کردہ از راہ سیکا کول بہ بنگالہ" (ج ۳ ص ۶۱)، افسوس ہو کہ سلاطین آصفیہ کے ساتھ سیر المتاخرین کا مصنف محض مذہبی تعصب کی بنیاد پر موقعہ بے موقعہ چوٹ کرنے سے نہیں چوکتا، کبھی حضرت آصف جاہ انار اللہ برہانہٗ کو دنیادار زمانہ شناس اور خدا جانے کن کن الفاظ سے یاد کرتا ہو، یہاں بھی ناصر جنگ شہید جن کے حالات مولانا آزاد نے اپنی چشم دید گواہیوں سے جو لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ ایک معارف نواز، دین پرور بادشاہ تھے۔ غالباً اُن کے تسنن کی تعبیر طبا طبائی نے "فساد و ضلع" سے کی ہو۔ حالانکہ خود اقرار کرتا ہو کہ میر محمد علی جو ایک شیعہ عالم تھے مگر باوجود شیعہ ہونے کے صرف علمی قدر دانی تھی ناصر جنگ کی، کہ قیام اورنگ آباد پر مصر تھے مگر پھر بھی یہ متعصب مورخ ان کی طرف فساد و ضلع کا انتساب کرتا ہو۔

[2] مغل حکومت کا چراغ سحری جس وقت بجھنے کے لیے جھلملا رہا تھا، اس وقت اس چراغِ حکومت کی چند خاص جانگ کرنوں میں یہ مہابت جنگ ناظم بنگالہ بھی تھے۔ صاحب سیر المتاخرین مہابت جنگ کے درباریوں میں بھی تھے، اس لیے اپنی کتاب میں ان کے تفصیلی حالات لکھے ہیں، بہادری اور استقامت کا ایک دلچسپ واقعہ مہابت جنگ کے متعلق یہ بھی نقل کیا ہو کہ شکار کے لیے اڑیسہ کی طرف غالباً گئے ہوئے تھے، فوج جو ساتھ تھی پانچ چھ سو سے زیادہ نہ تھی، اچانک معلوم ہوا کہ مرہٹوں کی برگی نے حملہ کر دیا ہو، مہابت جنگ خیمہ میں تھے، حکم دیا کہ ہاتھی کس کر لایا جائے، لوگوں پر بدحواسی طاری تھی لیکن مہابت جنگ اطمینان سے مقابلہ کے لیے تیار ہوئے، ہاتھی آگیا۔ سیڑھی لگائی گئی، (باقی بر صفحہ ۱۰۱)

مگر فلسفہ و منطق ہی سہی، بخاری نہ سہی، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بایں ہمہ عیش و عشرت، دولت و امارت میر محمد علی کے جو مشاغل مرشد آباد میں تھے اس کا اندازہ آپ کو طباطبائی ہی کے اس بیان سے ہو سکتا ہے۔

کتاب اخوان الصفا و خلان الوفا کہ در حکمت است چندیں نسخہ فراہم آوردہ باکمال تنقیح و تحقیق مقابلہ نمودہ جابجا اکثر عبارات نامناسب و نامفہوم را بعبارت مناسب و قریب الفہم تغییر دادہ من حیث اللفظ و المعنی تسہیل و تصحیح فرمود و چند رسالہ کثیر النفع برآں افزودہ می تواں گفت کہ تصنیفے ست جدید"[1] (ج ۲ ص)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۰) لیکن عجلت میں نواب کی جوتیاں نہیں مل رہی تھیں، لوگ تقاضا کر رہے تھے کہ حضور سوار ہو جائیں۔ مرہٹے بالکل سر پر پہنچ گئے، مگر نواب ٹہلتے رہے جب تک جوتیاں نہ ملیں سوار نہ ہوئے۔ بہرحال مقابلہ ہوا اور حسب دستور مرہٹے بھاگے، بعد کو جب پوچھا گیا کہ اس پریشانی کی حالت میں جوتیوں کے پہننے پر کیوں اصرار فرمایا جا رہا تھا تو بولے کہ "بعد آنکہ شما خواہید گفت کہ مہابت جنگ از فرط اضطراب کفش پا گزاشتہ بدر رفت" (ج ۲ ص ۵۰۳) یہ چیز بھی مہابت جنگ کے متعلق غالباً قابلِ ذکر ہی ہو کہ اپنے عہد میں اسے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں میں ایک لیڈر خیال کیجیے یا کسی علاقہ کا حاکم، بہرحال مہابت جنگ کے متعلق اس کے دربار کے مورخ کی یہ چشم دید گواہیاں ہیں کہ "اغلب دو ساعت تحولی می بود کہ برمیخواست و از تجلی طہارت فراغت نمودہ شروع بہ نوافل و اوراد می فرمود اول صبح نماز واجب ادا کردہ ...." پھر کار و بار حکومت میں مشغول ہوتا۔ دار آنجا برآمدہ وضو می نمود و نماز ظہر خواندہ یک جز تلاوتِ کلامِ الٰہی کردہ نماز عصر می خواند۔ ص ۶۰۹) خلاصہ یہ ہے کہ فرائض پنجگانہ کے ساتھ تہجد اور تلاوت تک کا پابند تھا۔ کیا مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں اور مسلمان حکام کے لیے اس میں عبرت نہیں ہے۔

[1] میر محمد علی صاحب کا یہ کام علمی حیثیت سے یقیناً قابل قدر ہے خصوصاً چند اور رسائل کا اضافہ ان کے کمال کی دلیل ہے واللہ اعلم دنیا میں اب یہ نسخہ پایا بھی جاتا ہے یا نہیں۔ ورنہ معلوم ہوتا کہ کس فن کی تکمیل انہوں نے کی ہے اس لیے کہ حکمت و فلسفہ کی تو شاید ہی کوئی ایسی شاخ باقی ہو جس پر کوئی رسالہ اس مجموعہ میں موجود نہ ہو، مدرسوں میں اس کے چند اوراق علم الحیوان کے ادبی حیثیت سے رکھے گئے ہیں، طلبہ عام طور سے اسی کو اخوان الصفا سمجھتے ہیں لیکن اصل واقعہ یہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ طبیعیات، الٰہیات، ہیئت، ہندسہ حتی کہ موسیقی تک ہر ایک فن پر مستقل رسالہ اس مجموعہ میں شریک ہے۔ بمبئی میں مدت ہوئی اس کا ایک مجموعہ چھپا تھا لیکن شاید اب وہ بھی نایاب ہے میں نے ایک قلمی نسخہ سے اس کا مقابلہ کیا تو اس مطبوعہ مجموعہ میں نظر آیا کہ بہت سے رسائل نہیں ہیں۔ مذہبی حیثیت سے ان رسائل کے متعلق لوگوں کا جو خیال بھی ہو، اور اس میں شک نہیں کہ بڑی چالاکی سے اس میں دین کو فلسفہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابوں میں اس کی حقیقت کھولی گئی ہے۔ مگر مجھے میر محمد علی کے اس طرز عمل پر تعجب ہے کہ کسی دوسرے کی کتاب میں کسی نامناسب عبارت کو پا کر بجائے اس کی تردید یا نوٹ وغیرہ لکھنے کے (باقی بر صفحہ ۱۰۲)

عربی زبان میں عقلی علوم کا جو ذخیرہ ہے اس ذخیرہ میں اخوان الصفا کے ان رسائل کے بعد بھی کیا کوئی ایسی کتاب رہ جاتی ہے جسے ان رسالوں پر مزیت حاصل ہو۔ غریب علماء کا نہیں بلکہ اہل علم کے امیر طبقوں میں جب ایک طرف بخاری اور دوسری طرف فلسفہ وحکمت کی چوٹی کی اس کتاب کے ساتھ دلچسپیوں کا یہ حال ہو، سوچنا چاہیے کہ آخر ہندوستان کے اسلامی عہد میں کس قسم کے علوم کی گرم بازاری کی توقع کی جاتی ہے اور ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے، آگے آگے دیکھیے سنتے ہیں کیا، یہی میر عبدالجلیل صاحب بلگرامی ہیں۔ کچھ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ ان کا ذوق علمی صرف بخاری کی حد تک محدود تھا، مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ

کتاب خانہ عظیمے درزمرۂ باقیات صالحات گذاشتہ اند" (ماثر الکرام ص ۲۶۵)

علم بھی ہو، شوق بھی ہو، پھر کتابوں کی فراہمی میں کیا دشواری پیش آسکتی تھی، خصوصاً اسی کے ساتھ جب ہمارے سامنے مولانا آزاد اس شہادت کو بھی پیش کرتے ہیں کہ "اکثر ایں کتب را بدست مبارک خود اصلاح ومقابلہ نمودہ اند" اور صرف یہی نہیں بلکہ "و نسخ بسیار بہ خط خاص خود نوشتہ اند" ذرا "نسخ بسیار" کے الفاظ پر غور کیجیے، وقائع نگاری کی خدمت جلیلہ کے ساتھ نقل کتب کا مشغلہ اس زمانہ میں کیا قابل تصور بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر عبدالجلیل صاحب غیر معمولی علم وفضل کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے بہترین خطاط بھی تھے، خاکسار نے ان کے خط کے بعض نمونے حیدرآباد میں ایک صاحب کے پاس دیکھے ہیں، کیا پاکیزہ خط تھا۔ خط نستعلیق میں تو ایک خاص طرز کے گویا موجد تھے، خطاطی کے متعلق اپنے ایک شعر میں انہوں نے ایک شاعرانہ دعویٰ بھی کیا ہے فرماتے ہیں :-

دانی کہ خوشنویسی ما از برائے چیست   ائیم واسطی بقلم نیر واسطی

نومشق کے اس قرن میں اس غریب واسطی قلم کو کون پہچان سکتا ہے، لیکن بجنسہ اپنی اسی خوبی کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۱) اصل کتاب کی عبارت ہی کو بدل دینا بالکل عجیب ہے، مسلمانوں کے بعض فرقوں پر یہ الزام ہے کہ وہ دوسروں کی کتابوں میں ردوبدل کر دیتے ہیں۔ اس واقعہ سے تو اس الزام کی کچھ تصدیق ہوتی ہے خصوصاً جب ان کے شدید معتقد کی یہ شہادت ہو، واللہ اعلم ۱۲۔

وجہ سے جس کی وجہ سے فونٹن قلموں کی قیمت بڑھتے ہوئے چالیس پچاس بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے، یعنی نوک کا نہ گھسنا، اسی لیے نوک کے بنانے میں قیمتی چیزیں خرچ کی جاتی ہیں اور قلم کا دام بڑھتا چلا جاتا ہے، مگر مسلمانوں نے خدا جانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈھ کے کلک کی ایک خاص قسم ایجاد کی تھی جسے واسطی قلم کہتے تھے۔ نرانگشت کے برابر تو وہ موٹا ہوتا تھا، اور رنگ گویا ٹھیک چوکلیٹ کا بیچ بیچ میں اس کے پھول جیسی چیزیں قدرتی طور پر نمایاں ہو جاتی تھیں۔ اس قلم کی خوبی یہی تھی، ایک دفعہ بنا لیا گیا پھر اسی قط پر برسوں لکھتے چلے جائیے، کیا مجال ہے کہ حروف میں کچھ تفاوت پیدا ہو۔ بعض خاندانوں میں یہ قلم اب تک تبرک[1] کے طور پر پایا جاتا ہے۔

عجب زمانہ تھا مسلمانوں نے اس فن کتابت کے ذوق کو کتنا اعزاز بخشا تھا کہ سلاطین وقت بھی خطاطی میں کمال پیدا کرنا اپنی عزت خیال کرتے تھے، پرانی کتابوں پر بعض مشہور بادشاہوں کے قلم کی لکھی ہوئی سطریں نظر پڑتی ہیں تو آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں، بیجاپور کی عادل شاہی حکومت

---

[1] خاکسار کے جد امجد مرحوم مولانا محمد احسن گیلانی بھی بڑے خطاط تھے، نسخ، نستعلیق، شفیعہ، شکست ان چاروں خطوں میں ان کو کمال تھا، ان کی لکھی ہوئی بعض وصلیاں میرے پاس موجود ہیں، ان ہی کے ترکہ میں واسطی قلم بھی ہے، عجیب عجیب قسم کے مسطر، قط زن کی ٹڈیاں، دیگر لوازم کتابت واقعہ یہ ہے کہ عہد اسلامی کے کاغذ، روشنائی، دوات، جدول، لوح، جلد بندی ہر ایک ایک مستقل عنوان کا مضمون ہے، دواتوں کے سلسلہ میں پڑھیے تاریخوں ہی میں ملیگا کہ بادشاہوں کی طرف سے لوگوں کو سنگ یشب کی دواتیں انعام میں ملتی تھیں۔ غلام محمد ہفت قلمی نے اپنے تذکرہ خوش نویساں میں سید محمد امیر رضوی کا ذکر کرتے ہوئے کتابت کے متعلق ان کی مختلف دستکاریوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ "نقاشی و لوح و جدول و صحافی و علاقہ بندی و سنگتراشی وغیرہ دستگاہے کمال داشت" (ص ۱۷)، بجز سنگتراشی کے جتنے الفاظ ہیں سب کا تعلق کچھ نوشت و خواند کے متعلقات سے ہے۔ اور سنگ تراشی کا ایک شعبہ مہرکنی و حکاکی و عقیق سازی بھی اسی زمرہ کے ہنر تھے جن کے ارباب کمال اسلامی عہد میں ہر شہر اور قصبہ میں پائے جاتے تھے، امیر محمد رضوی کے ذکر میں ایک اور چیز عجیب ہاتھ آئی خلاصہ یہ ہے کہ میرا بنی خطاطی میں آقا رشید دیلمی کے متبع تھے، آقا رشید سے آخر میں ان کی عقیدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ سالانہ ان کا عرس بھی دلی میں انہوں نے قائم کیا تھا، لیکن عرس کیا تھا سنیے "از چند سال عرس آقا عبدالرشید در ماہ محرم مقررہ نمودہ۔ اکثر اساتذہ خطاطان وغیرہ شاہ جہاں آباد در مجلس مذکور حاضری شوند و ملاقات یک دیگر مسرور و شاد کام می گردند و در تذکار خط و خطاطان می گزرانند" ص ۲۰ کتاب مذکور۔ گویا یہ عرس مشرقی نہیں بلکہ Death anniversary (برسی کی تقریب) منائی جاتی تھی۔ عرس کو آج جو کچھ سمجھا جا رہا ہے کیا اس تاریخی اشارہ سے ہم اسے کچھ اور بھی سمجھ سکتے ہیں؟

کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ جو اپنے خاندانی روایات کے خلاف سُنّی ہوگیا تھا جس کی قبر کا قبہ اپنی عظمت و جلالت اور حسن کاری کی خصوصیتوں کی وجہ سے بے نظیر سمجھا جاتا ہے۔ اُسی ابراہیم عادل شاہ کے حالات میں لکھا ہے کہ

"اگرچہ در آں زماں خوش نویساں جمع آمدہ بودند لکن بادشاہ بادشاہِ قلمہا بود ثلث و نسخ و نستعلیق وغیرہ را باں درجہ حسن و متانت رسانیدہ بود کہ بخط خوش قلماں عصر قلم نسخ کشیدہ (بستان السلاطین ص ۲۷۵)

غالباً سرسری طور پر ادھر اُدھر سے جتنے تاریخی معلومات آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں، کیا ان کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد انصافاً اب بھی ہندوستان کے عہد اسلامی کو کتابوں کے لحاظ سے مفلس ٹھہرایا جاسکتا ہے؟

تعلیمی مضامین

اب میں چاہتا ہوں کہ اس عہد کے ان مضامین کے متعلق بھی تھوڑا بہت تذکرہ کروں جن کی اس زمانہ میں تعلیم دی جاتی تھی، اگرچہ یہ ایک بڑی طویل بحث ہے لیکن جب اس وادیِ پُرخار میں پاؤں رکھ ہی دیا گیا ہے تو جو شکستہ شکستہ معلومات ہیں انہیں پیش کرتا ہوں۔

ابتدائی تعلیم سے سر دست بحث نہیں ہے بلکہ پیشِ نظر اعلیٰ تعلیم کے مضامین ہیں۔ جہاں

لہ تذکرہ خوش نویسان ہند جسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کیا ہے اس میں میر خلیل اللہ خطاط جو ابراہیم عادل شاہ کے خطاطی میں اُستاد تھے یہ لکھا ہے کہ "کتاب نورس تصنیف زمان ابراہیم عادل شاہ میر مذکور بخوشخطی نوشتہ گذرانید۔ بادشاہ خیلے محظوظ شدہ مخاطب بہ "بادشاہ قلم" ساخت، لیکن کیا صرف خشک خطاب ہی پر قصہ ختم ہوگیا؟ آگے سُنیے فن کے قدرشناسوں کا حال سُنیے۔ مصنف کتاب لکھتے ہیں" در تخت خود نشانیدہ وزراء و سائر اعیان دولت بر کابش دادہ بخانہ اش رسانیدند۔ (ص ۸۰) گویا خطاب جب بادشاہی کا دیا گیا تھا تو تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی، طریقہ تمیز کو واقعی بادشاہ بھی بادشاہ نے بنا دیا۔ تخت پر بٹھایا، وزراء، امراء کو ساتھ کیا کہ اسی شان کے ساتھ میر صاحب کو گھر تک پہنچا آئیں۔ اللہ اللہ کیا دن تھے۔ ابو اسحاق شاہ شیرازی بیوی کے سوا حکومت اور حکومت کے ساتھ جو کچھ تھا سب قاضی عضد کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ محمد تغلق نے ہندوستان سے اُن کو بلایا تھا اور مواقف کے متن کو چاہا تھا کہ میرے نام معنون کریں۔ علم کا اقبال فن کا عروج کیا اس سے بھی زیادہ بلندی کسی زمانہ میں حاصل کرسکا ہے۔

تک میرا خیال ہے کہ ہندوستان ہو یا ہندوستان سے باہر اور آج ہو یا کل، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر قابل ذکر اسلامی ملک میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم میں قرآن (تفسیر) حدیث، فقہ، عقائد کی علمی تعلیم صحبت و بیعت کے ذریعہ سے ہوائے دل کے تازہ واردوں میں سیرت کی پختگی، کردار کی بلندی اور سب سے بڑی چیز یعنی للہیت یا اخلاص باللہ میں رسوخ کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش ہر زمانہ میں کی گئی ہے، ان پانچ چیزوں سے کسی زمانہ میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام کبھی خالی نہیں رہا[1]، گویا ان مضامین کی حیثیت موجودہ نصابی اصطلاح کے رو سے لازمی مضامین کی تھی، یہ اور بات ہے کہ مندرجہ بالا امور میں سے کسی امر کو کسی ملک میں کسی خاص زمانہ میں خاص اسباب و وجوہ کے تحت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہو، مثلاً ہندوستان میں مسلمان جب شروع شروع میں آئے ہیں تو فقہ اور اصول فقہ کے ساتھ تصوف (یعنی وہی صحبت و بیعت کے ذریعہ سے سیرت و کردار کی استواری، عقائد میں استحکام و اخلاص) کا ملکہ پیدا کیا جاتا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس ملک میں ان دو مضامین کے سوا اور دوسرے مضامین مثلاً قرآن و حدیث وغیرہ سے ہندوستان ناآشنا تھا ناواقفوں سے تو بحث نہیں، لیکن اچھے پڑھے لکھوں کی زبان و قلم سے کبھی کبھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں جن سے عام مغالطہ پھیلا ہوا ہے، خصوصاً بعض مورخین نے خدا ان پر رحم کرے حضرت نظام الدین سلطان جی کے متعلق کہیں یہ قصہ نقل کر دیا ہے کہ سماع کے مسئلہ میں مولویوں سے بحث ہوئی، اور امام غزالی کے مشہور قول "یجوز لاھلہ ولا یجوز لغیر اھلہ" کو حدیث قرار دے کر مجلس مناظرہ میں پیش کیا گیا، گویا یہی واقعہ اس کی دلیل ہے کہ ہمارا یہ ملک فن حدیث سے بالکل ناواقف تھا۔

[1] البتہ بعض نادر مثالیں اس زمانہ میں کبھی کبھی ایسی بھی ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اس زمانہ میں بھی یک فنی ہوتے تھے، یعنی اس خاص فن کے سوا دوسرا کوئی فن انہیں آتا ہی نہ تھا، سلطان المشائخ کی زبانی فوائد الفواد میں منقول ہے کہ دلی میں "دانشمندے (ملا) بود ضیاء الدین لقب در زیر پایہ منارہ درس کردے" ان ہی ضیاء الدین صاحب سے سلطان جی راوی ہیں، کہتے ہیں کہ "فن از فقہ و نحو و علوم دیگر ہیچ خبر نداشتم ہمیں علم خلافی (اصول فقہ) آموختہ بود" م۔ (ص ۸۸) ۱۲۔

اس قصہ میں کس حد تک اصلیت ہے اس کا پتہ تو آپ کو خود آئندہ میرے پیش کردہ واقعات سے چل جائیگا، مگر میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ الزام ہند و علماءِ ہند کی طرف جو منسوب کیا جاتا ہے، اُس کا تعلق کس زمانہ سے ہے، یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ہمارا یہ ملک دوسرے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں گونہ نومسلم ہونے کی حیثیت رکھتا ہے وطن بنا کر اسلام اس ملک میں چھ سو سال بعد غوری انار اللہ برہانہ کے حملوں اور کامیابیوں کے بعد داخل ہوا۔ گویا اس حساب سے ساتویں صدی ہجری جو غوری کے غلام قطب الدین ایبک کی بادشاہی کی صدی ہے، یہی اس ملک میں اسلام کی پہلی صدی ہے، ایبک کی تخت نشینی ۶۰۳ھ میں ہوئی۔ اب کھلی ہوئی بات ہے کہ پچھلی صدیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بعد تو فن حدیث میں ہندوستان نے وہ مقام حاصل کر لیا جس کا تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مقالہ میں کر چکا ہوں، کہ علامہ رشید رضا مصری کو یہ تسلیم کرنا پڑا۔

لولا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم	اگر علوم حدیث کے ساتھ ہمارے ہندستانی بھائیوں کے
الحديث في هذا العصر لقضي عليها	علماء کی توجہ اس زمانہ میں مبذول نہ ہوتی تو اسلام
بالزوال من امصار الشرق، فقد	کے مشرقی علاقوں میں اس علم کا خاتمہ ہو جاتا، کیونکہ
ضعفت في مصر والشام والعراق	مصر، شام، عراق، حجاز سب ہی میں دسویں صدی
والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة	ہجری سے چودھویں تک تو ضعف کمال کو پہنچ گیا تھا
حتى بلغت منتهى الضعف في اوائل	
القرن الرابع عشر[1] (مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ)	

رہا شاہ صاحب سے پہلے، تو آپ ہی انصاف کیجیے کہ جس ملک نے اسلام کی آمد کی پہلی صدی

[1] عام اسلامی ممالک کی بے تعلقی فن حدیث سے کس حد تک پہنچ گئی تھی اس کا ایک افسوسناک ثبوت یہ ہے کہ اور تو اور صحاح ستہ کی کتابوں میں سے بھی بعض کتابیں مثلاً ابن ماجہ اور شاید سنن ابی داؤد بھی ہندستان کے سوا جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی اور اسلامی ملک میں نہیں چھپ سکی ہے اور اس پر بھی ہندوستان ہی حدیث سے بیگانہ ٹھہرایا جاتا ہے ۱۲

کے آغاز ہی میں ایک نہیں متعدد معتبر کتابیں فن حدیث میں پیش کی ہوں، جن میں ایک بخاری کی شرح بھی ہے، اور ایک بخاری کی شرح ہی نہیں، مصباح الدجیٰ، مشارق الانوار[1]، معرفۃ الصحابہ میں درۃ السحابہ یہ چار کتابیں دنیائے اسلام کے سامنے پیش کی ہوں کیا اسی ملک پر الزام لگایا جاسکتا ہے کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے زمانہ تک تعلق نہیں رکھا، آخر میں نے جن کتابوں کا نام اوپر درج کیا ہے کیا اہلِ علم نہیں جانتے کہ ان کے مصنف علامہ رضی الدین ابو الفضائل المشہور بہ حسن الصغانی الہندی ہیں، گھر کی مرغی کو آپ جو بھی سمجھیں لیکن السیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں لکھا ہے کہ

کان الیہ المنتہی فی اللغۃ — اپنے زمانہ میں لغت کے فن کی انتہا ان ہی پر ہوئی تھی

آج ساری دنیائے اسلام بلکہ یورپ کے مستشرقین کے ہاتھوں میں عربی لغت کی کتاب قاموس جو متداول ہے، کیا واقعی یہ مجد الدین الفیروز آبادی[2] کا کام ہے۔ اس فن کی کتابوں سے جو واقف ہیں

---

[1] آہ! غریب مشارق الانوار کو اس کے وطن نے بھلا دیا، قدامت آدمی کو تھکا دیتی ہے، نئی چیز میں لذت ہوتی ہے ورنہ سچ یہ ہے کہ متن حدیث پڑھانے کے لیے اس سے اچھا مجموعہ مقطوع الاسناد حدیثوں کا شاید اب بھی پیش کرنا دشوار ہی ہے، اس میں صحیحین سے (۲۲۴۶) دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثوں کا انتخاب بڑی خوبی سے کیا گیا ہے حسن صغانی ہندوستان سے سفارت پر بغداد گئے تھے مستنصر باللہ عباسی خلیفہ کا عہد تھا اسی خلیفہ کے حکم سے حدیثوں کا یہ مجموعہ انہوں نے مرتب کیا جس کا ذکر بھی دیباچہ میں کیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ خلیفہ نے یہ کتاب شیخ سے پڑھی تھی۔ خدا نے اس کتاب کو غیر معمولی حسنِ قبول عطا فرمایا قاسم بن قطلوبغا فیروز آبادی صاحب قاموس، اکمل الدین، بابرتی، ابن الملک کرمانی جیسے علما اس کے شارح ہیں بعض شرحیں چار چار ضخیم جلدوں میں ہیں کشف الظنون میں تفصیل دیکھیے ۱۲۔

[2] الفیروز آبادی کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا ہے پہلے یہ اپنے نسب کو مشہور امام الاساتذہ ابو اسحاق شیرازی کے نسب سے ملاتے تھے، لیکن لوگوں نے اس انتساب کا اس لیے انکار کیا کہ الاستاذ کی نسل منقطع ہو چکی تھی، لیکن لکھا ہے "وکان لایبالی من ذلک (یعنی لوگوں کے اس طعن کی پروا نہیں کرتے تھے) اور اپنا نسب نامہ ابو اسحاق شیرازی سے ہی ملاتے رہے مگر جب یمن میں ان کو قضا کا عہدہ مل گیا تو" ثم ارتقیٰ فادعی بعد ذلک انہ من ذریۃ ابی بکر الصدیق (یعنی حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد سے اپنے کو شمار کرنے لگے۔ وکتب بخطہ الصدیقی (اور اپنے دستخط میں الصدیقی لکھنے لگے۔ ہوسکتا ہے الشیرازی صدیقی ہوں، لیکن معلوم نہیں ابن حجر نے اخیر میں یہ کیوں لکھا " ان النفس تابی قبول ذلک (یعنی دل نہیں مانتا) واللہ اعلم۔ یہ فیروز آبادی بڑے سیاح عالم ہیں، اونٹوں پر کتابیں لاد کر ایک اسلامی ملک سے دوسرے ملک میں آتے جاتے رہتے تھے اور وہاں کے سلاطین سے انعام وجوائز حاصل کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی آئے تھے۔ بڑی آؤ بھگت یہاں بھی ہوئی، تیمور لنگ نے پانچ ہزار اشرفی نذر پیش کی، بایزید یلدرم کے دربار میں بھی پہنچے تھے وہاں (بقیہ برصفحہ ۰۰)

وہ جانتے ہیں کہ اسی ہندوستانی عالم رضی الدین العلامہ نے "العباب" کے نام سے جو کتاب لغت میں لکھنی شروع کی تھی اُسی کا اور المحکم کا خلاصہ فیروزآبادی نے کر دیا ہے بیچارے ہندی عالم کا کام ناکمل رہ گیا، یعنی "میم" تک پہنچتے پہنچتے ممات ہوگئی، صرف چند حروف رہ گئے تھے، بس اسی کو ابن سیدہ کی المحکم سے لے کر صاحب قاموس نے خلاصہ کر دیا، صغانی کی کتاب رہ گئی، اور فیروزآبادی کا کام چل نکلا، اور اسی لیے السیوطی کے اس دعوے کا تعلق کسی خاص ملک اور زمانہ سے نہیں بلکہ ساری دنیائے اسلام سے ہے عربی زبان کے اس ہندی لغوی کے بعد جس نے جہاں کہیں بھی عربی لغت پر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ایک لحاظ سے صغانی ہی کا زلہ رُبا ہے، ان ہی کی محنت و تلاش، تبحر و اجتہاد کا رہین منت ہے۔

حدیث میں بھی علامہ رضی الدین حسن صغانی کا جو مذاق تھا اُس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے جو مولانا عبدالحیی فرنگی محلی مرحوم نے اپنے طبقات حنفیہ میں حدیث ہی کے متعلق ان کی دو تالیفات کو ان الفاظ میں روشناس کراتے ہوئے یعنی

ومن تصانیفہ رسالتان فیہما الاحادیث الموضوعۃ	ان کی تصنیفات میں دو رسالے اور ہیں جن میں موضوع حدیثوں کو اُنہوں نے جمع کیا ہے۔

لکھا ہے۔

ادرج فیہما کثیرًا من الاحادیث الموضوعۃ فعد ذٰلک من المتشددین	اس میں اُنہوں نے بہت سی حدیثوں کو موضوع احادیث کے ذیل میں درج کر دیا ہے اسی لیے ان کا شمار سخت گیروں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۷) سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ آخر میں یمن کے قاضی ہو کر وہیں انتقال فرمایا۔ یمن کے بادشاہ الملک الاشرف اسماعیل کے پاس ایک کتاب اپنی ایک طبق میں بھر کر پیش کی، اس نے اس کو چاندی سے بھر کر واپس کیا۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ خود لکھتے ہیں کہ دو سو سطریں یاد کیے بغیر میں سوتا نہیں۔ ابن سیدہ کی محکم اور صغانی کی عباب دونوں کو ملا کر ساٹھ جلدوں میں لغت لکھی تھی، اسی کا خلاصہ قاموس ہے۔ پھر ایک ہندی عالم علامہ مرتضیٰ نے ۱۰ جلدوں میں قاموس کی شرح تاج لکھی۔ گویا قاموس کا یہ کام ہندوستان ہی میں شروع ہوا اور اسی خاک پاک کے ایک فرزند کے ہاتھ سے عربی لغت کی یہ مشہور و معروف کتاب ختم ہوئی اور پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کو عربی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا ۱۲۔

کا ابن الجوزی میں ہو جو ابن جوزی کا حال ہو (کہ بخاری تک میں دو حدیثوں پر ان کو وضع کا شبہ ہو)
علامہ سخاوی نے فتح المغیث میں بھی ان کی دونوں کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ حدیثوں
کی تنقید میں ان کا معیار بہت سخت تھا۔ آخر تشدد میں جسے ابن جوزی کا مماثل خیال کیا جاتا ہو جنہوں
نے بیچارے امام بخاری کو نہیں بخشا ہو اس کی تنقید کی معیاری بلندی کیا کم ہو سکتی ہے۔ بہر حال رضی
الدین صغانی تو اسلامی ممالک میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں، ان کی کتاب مشارق عام
اسلامی ممالک میں مدت تک زیر درس رہی، لیکن دلّی میں یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اس وقت وہی ایک
ممتاز عالم تھے۔ حضرت نظام الدین اولیا جن کا زمانہ صغانی کے قریب ہی ہو بلکہ لقا ثابت
نہ ہو تو معاصرت یقینی ہو، دلّی کے علمی ماحول کی صغانی کے زمانہ میں کیا حالت تھی فرماتے ہیں کہ

دراں ایام در حضرت دہلی علما، کبار بودند با ہمہ	ان دنوں میں بڑے بڑے علماء دلی میں تھے جو
(صغانی) در علوم متساوی بودا ما در علم حدیث	علوم میں صغانی کے مساوی تھے لیکن صغانی کو
از ہمہ ممتاز و ہیچ کس مقابل او نبود	علم حدیث میں سب پر امتیاز حاصل تھا، اس علم میں
(فوائد الفواد ص۱۰۱)	ان کا مد مقابل کوئی دوسرا نہ تھا۔

جس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ لغت و ادب میں صغانی کے جوڑ کے لوگ دلّی میں موجود تھے،
بلکہ یہ بھی کہ حدیث سے جیسا کہ سمجھا جاتا ہو کہ اس زمانہ کے لوگ بیگانہ تھے، یہ صحیح نہیں ہو، البتہ صغانی
کا ہم پلہ محدث کوئی نہ تھا۔

اور یہ رپورٹ تو ہندستان میں اسلام کی پہلی صدی کے نصف کی ہو یعنی ۶۵۰ھ جو صغانی
کی وفات کا زمانہ ہو۔ اسی کے بعد حضرت نظام الاولیاءؒ کی عجیب وغریب خانقاہ قائم ہوتی ہو جس

لہ چونکہ صغانی کی وفات ۶۵۰ھ میں بہ مقام بغداد ہوئی جب وہ دلّی دربار کی طرف سے سفیر بن کر بغداد گئے، اس لیے
یہ یقینی ہو کہ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا زمانہ پایا ہوگا۔ کیونکہ آپ کی عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی،
غالباً لقا ثابت نہیں۔ بہر حال فوائد الفواد میں آپ نے شاید اپنے اساتذہ ہی سے یہ بات سُنی ہوگی جو نقل فرمایا کہ
"حدیثے برا و مشکل شدے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام را در خواب دیدے وصحیح کردے" (ص ۱۰۳) ممکن ہو کہ الصغانی
کی شکایت جن لوگوں نے تشدد کی کی ہو اس میں پھر اس واقعہ کو بھی دخل ہو۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سلطان المشائخ نے

م صغانی کی کتاب مشارق مولانا کمال الدین زاہد سے پڑھی تھی، اور مولانا کمال الدین الزاہد نے مولانا برہان الدین بلخی

ہیں مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا اجتماع ہو جاتا ہے، مجلسِ سماع کا ایک مجہول واقعہ تو وہ ہے جو عوام میں کیا انسوس ہے کہ خواص میں بھی کلی نتائج کا ذمہ دار ہے لیکن ہم آپ کے سامنے ایک چشم دید شہادت اس عہد کی پیش کرتے ہیں۔ سیر الاولیا حضرت سلطان جی کے حالات میں ایک معتبر کتاب ہے۔ اس کے مصنف امیر خورد کرمانی ہیں جنہوں نے خانقاہ نظامیہ کے علماء کی نگرانی میں تربیت و تعلیم حاصل کی ہے، اس لیے حضرت کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے قریب قریب دیکھ کر لکھا ہے، اسی کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ میر خورد نے نقل کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت والا کی خانقاہ معارف پناہ میں جن علماء کا اس زمانہ میں اجتماع ہو گیا تھا، ان میں ایک مشہور عالم حضرت مولانا فخر الدین زرادی بھی ہیں، مدرسوں میں صرف کی ایک کتاب زرادی انہی کی طرف منسوب ہے، میر خورد کہتے ہیں کہ

"والد کاتب ایں حروف رحمۃ اللہ علیہ نزدیک خانہ سلطان المشائخ بکرایہ ستدہ بود و درس ساختہ و متعلمان خوب طبع را جمع گردانیدہ تا کاتب حروف چیزے بخواند" (سیر الاولیا ص ۲۰۸)

گویا میر خورد کے والد نے حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ سے متصل ایک چھوٹا سا مدرسہ ہی قائم کر دیا تھا، اس مدرسہ میں خانقاہ کے علماء مختلف اوقات میں ایسا معلوم ہوتا ہے آکر درس دیا کرتے تھے، میر خورد کہتے ہیں کہ چاشت کی نماز کے بعد مولانا فخر الدین ہدایہ کا درس دیا کرتے تھے ایک

لہ یوں تو خدا جانے دلی کی علم خیز معارف بیز خانقاہ میں کتنے علماء جمع ہو گئے تھے لیکن جن کے تراجم کتابوں میں ملتے ہیں ان میں شمس الدین یحییٰ، مولانا حسام الدین ملتانی، مولانا علاء الدین نیلی، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا وجیہ الدین یوسف کلاکھری، مولانا سراج الدین عثمان، مولانا وجیہ الدین پائلی، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا فصیح الدین، مولانا فخر الدین مروزی، مولانا جمال الدین، مولانا جلال الدین اودھی، خواجہ کریم الدین سمرقندی، قاضی شرف الدین فرد، مولانا بہاء الدین ادہمی، مولانا ضیاء الدین شیرازی وغیرہم حضرات اپنے وقت کے غیر معمولی علم و عمل کے نمونے تھے ان بزرگوں میں سے بعضوں نے ہندوستان کے بعض صوبوں میں اسلام کی مستقل تاریخ پیدا کی ہے۔ مگر ہندوستان جاہل تھا اس لیے کہ اسلام یہاں براہِ عرب نہیں بلکہ براہ خراسان آیا تھا۔ گویا بخاری، ترمذی، ابو داؤد سجستانی، امام مسلم نیشاپوری صحاح ستہ کے یہ سارے مصنفین عربی ممالک کے حضرات تھے؟ یورپ ایک نظریہ گڑھتا ہے، کسی نہ کسی راہ سے مسلمانوں میں اسے پھیلا دیتا ہے، پھر نسلیں گزرتی جاتی ہیں جو کچھ یورپ نے پھیلا دیا اس میں شک کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی۔

دن کا واقعہ جو خود ان کی آنکھوں کا دیکھا ہوا ہی درج کرتے ہیں کہ مولانا حسب دستور ہدایہ پڑھا رہے تھے کہ

"روزے ایں عالم ربانی مولانا کمال الدین سامانی کہ از مشاہیر علمائے شہر بود بدین سلطان المشائخ آمد چوں از خدمت سلطان المشائخ بازگشت سبب فرط اتحاد یکہ بخدمت مولانا فخر الدین داشت دریں مجلس حاضر شد" (سیر الاولیاء ص ۲۶۸)

یعنی کمال الدین سامانی کوئی غیر حنفی عالم تھے یا کیا قصہ تھا؟ اس لیے کہ اس زمانہ میں علماء احناف کے سوا اس ملک میں شوافع وغیرہ بھی موجود تھے۔ سلطان المشائخ کے زمانہ میں اودھ کے شیخ الاسلام مولانا فرید الدین نامی بھی شافعی المذہب مشہور عالم تھے، علاء الدین نیلی ان ہی کے شاگرد تھے، اخبار الاخیار میں نیلی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ

پیش مولانا فرید الدین شافعی کہ شیخ الاسلام اودھ بود کشاف خواند (ص ۹۳)

صاحب سیر الاولیاء نے بھی ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ "در حیات سلطان المشائخ دانشمندے (عالمے) بغدادی مالکی مذہب در غیاث پور (دلی) رسید" (سیر الاولیاء ص ۲۹۶) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفی علماء کے سوا دوسرے مذاہب کے علماء سے ہندوستان بالکلیہ خالی نہ تھا، بہرحال کوئی وجہ ہوئی ہو، مولانا کمال الدین کو دیکھ کر ہدایہ پڑھانے کا طریقہ مولانا فخر الدین نے عجیب طریقہ سے بدل دیا، امیر خورد لکھتے ہیں کہ

"چوں خدمت مولانا کمال الدین دید احادیث تمسکات ہدایہ را ترک دادہ" (سیر ص ۹۳)

یعنی حنفی مذہب کے مسائل کی تائید میں صاحب ہدایہ جن حدیثوں کو عموماً پیش کرتے ہیں مولانا فخر الدین نے ان حدیثوں سے استدلال کرنا ترک کر دیا، پھر کیا کرنے لگے جس ملک کو خود اسی ملک کے رہنے والے آج جہل و نادانی کے الزام سے رسوا کر رہے ہیں، اسی ملک میں آج سے چھ سو سال پہلے یہ تماشا دیکھا جا رہا تھا کہ "تمسکات ہدایہ ترک دادہ با حادیث صحیحین تمسک می داد" سمجھ رہے ہیں، مولانا فخر الدین نے بغیر کسی سابقہ تیاری کے اچانک ایک مقام سے جہاں سبق ہو رہا تھا یہ رنگ بدلا کہ صاحب ہدایہ کی پیش کردہ دلیلوں کو چھوڑ کر حنفی نقطۂ نظر کی تائید میں صحیحین کی حدیثیں پیش کرنی شروع کر دیں آج کہا جاتا ہے کہ ہدایہ کی جن حدیثوں کے نیچے ارباب حاشیہ "غریب جداً" "نادر جداً" کے الفاظ لکھ دیا کرتے ہیں،

یہ غرابت وندرت صرف لفظی حد تک ہے۔ ورنہ اگر الفاظ سے قطع نظر کر لیا جائے تو ان ہی حدیثوں کے مفہوم اور مفاد کو اکثر و بیشتر صحاح کی حدیثوں کے الفاظ سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اکثری حیثیت سے یہ دعویٰ صحیح ہے، لیکن میں نہیں جانتا کہ اس وقت بھی ہندستان کے مدعیانِ حدیث دانی میں کوئی ہستی ایسی ہوگی جس کے سامنے ہدایہ پیش کیا جائے اور بغیر کسی سابقہ تیاری کے وہ ہدایہ کے الفاظ کو چھوڑ کر اس کے مفاد کو صحاح کی حدیثوں سے ثابت کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ الّا ماشاء اللہ۔

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ ہندوستانی اسلام کی پہلی صدی کے نصف اول میں اگر حسن صغانی نے دلّی میں حدیث کے بازار کو رونق دے رکھی تھی، تو اسی صدی کے دوسرے نصف میں مولانا فخرالدین زرادی جیسے محدث جلیل یہاں موجود تھے، اسی سماع کی مجلس مناظرے کے قصہ کو میر خورد نے بھی بیان کیا ہے لیکن کیا بیان کیا ہے؟ کیا یہ کہ امام غزالی کے قول کو ہندستانی مولویوں کا معصوم گروہ حدیث قرار دے کر جوازِ سماع پر اس سے استدلال کر رہا تھا اور جو حرمت کے قائل تھے ان میں بھی کسی کے پاس اتنا علم بھی موجود نہ تھا کہ اس قول کے حدیث ہونے کی غلطی کا ازالہ کر سکے، بلکہ جواب میں کہا تو یہ کہا کہ ہم حدیث کو نہیں مانتے۔ اصل قصہ کی تفصیل تو آئندہ معلوم ہوگی مجھے صرف مولانا فخرالدین کے اس تبحر اور وسعت نظر کا ثبوت پیش کرنا ہے جو علم حدیث میں انہیں حاصل تھا، میر خورد نے لکھا ہے کہ بحث کی ابتدا کرتے ہوئے

"روئے مبارک بجانب علماء شہر کردہ ایں سخن گفت کہ شما از دو جنبہ یک جنبہ گیرید اگر جنبہ حرمت گیرید حل ثابت کنم، واگر جنبہ حل گیرید حرمت ثابت کنم" ص ۲۶۸

جس کا مطلب یہی ہوا کہ مولینا کے پاس دعوے کے دونوں پہلوؤں (حلت وحرمت) کے متعلق دلائل کا کافی ذخیرہ موجود تھا اور مسئلہ کے ان دونوں پہلوؤں نیز ان کے وسیع مباحث کا جن لوگوں کو صحیح علم ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مولانا فخرالدین جو کچھ فرما رہے تھے یقیناً ایک متبحر عالم ہی یہ کر سکتا ہے کیونکہ گفتگو مطلق سماع میں ہو رہی تھی نہ کہ مزامیر کے ساتھ جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا اس کے مخالف تو سلطان المشائخ

خود ہی تھے۔

اب نہ جاننے والوں سے کیا کہا جائے، خود سلطان المشائخ جن کے متعلق یہ جو زلاہلہٗ والا لطیفہ مشہور کیا گیا ہو گو ظاہر ہے کہ ان کا مشغلہ نہ درس و تدریس کا تھا اور نہ تصنیف و تالیف کا، لیکن میر خورد جو ان کے دیکھنے والے ہیں ان ہی کا بیان ہو کہ حدیث کا وہی مجموعہ جس میں دو ہزار دو سو چھیالیس بحذف اسناد علامہ صغانی نے صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیثیں جمع کی ہیں، یہ مجموعہ حضرت نظام الاولیاء نے صرف پڑھا نہیں تھا، بلکہ "مشارق الانوار را یاد گرفت" (سیر الاولیاء ص ۱۰۱) یعنی سلطان جی کو بخاری و مسلم کی دو ہزار دو سو چھیالیس حدیثیں زبانی یاد تھیں میں نہیں جانتا کہ اس زمانہ میں بھی ہندستان کا کوئی ممتاز محدث یا عالم پایا جاتا ہوگا جسے بخاری و مسلم کی اتنی حدیثیں زبانی یاد ہونگی صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اس مجموعہ کو یاد کیا تھا، بلکہ ان کی سند بھی میر خورد نے نقل کی ہو۔ ان کے اُستاد مولانا کمال الدین سند میں یہ ارقام فرمانے کے بعد

بان قرء ھذا الاصل المستخرج من صحیحین (بخاری و مسلم) سے حدیثوں کا یہ مجموعہ جو اکٹھا کیا گیا
الصحیحین علی ساطر ھذہ السطور ہے اس کو (سلطان جی) نے ان سطروں کے لکھنے والے ہی پڑھا

یہ الفاظ لکھتے ہیں کہ

قرأۃ بحث واتقان وتنقیح یہ پڑھائی ان کو اس طریقہ سے ہوئی کہ کامل بحث و تحقیق، استواری و
معانیہ وتنقیر مبانیہ اتقان کی پابندی کی گئی حدیثوں کے معانی کی تنقیح کی گئی اور ان
کی بنیادوں کو کھود کھود کر ظاہر کیا گیا

علم حدیث کے ساتھ ہندی اسلام کی پہلی صدی میں دلی کے علمی حلقوں کی دلچسپیوں کا جو حال تھا اُس کا اندازہ ان چند نمونوں سے بآسانی ہو سکتا ہو اور یہ میں نے چند اجمالی اشارے کیے ہیں ورنہ اس صدی کے متعلقہ معلومات جو ادھر اُدھر کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں اگر انہیں سمیٹا جائے تو اچھا خاصہ رسالہ بن جائے۔ میں نے قصداً حضرت سلطان المشائخ ہی کے متعلق بعض چیزوں کا تذکرہ اس لیے کیا کہ ان ہی کی مبارک ذات کو اکثر دیکھتا ہوں کہ "نام نیکو رفتگاں" کی بربادی

کے جو درپے ہیں عموماً اس سلسلہ میں ذکر کرتے ہیں، مغالطہ کی وجہ شاید حضرت کے ملفوظات کا وہ مجموعہ بھی ہے جو فوائد الفواد کے نام سے مشہور ہے، گویا لوگ اس کتاب کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ کسی نے قصد وارادہ کے ساتھ تصنیف کے لیے قلم اُٹھایا ہو، حالانکہ اپنی مجلسوں میں آئندو روند کے سامنے مختلف اوقات میں جو آپ گفتگو فرماتے تھے امیر حسن علا سنجری نے ان ہی کو قلمبند کر لیا ہے، ظاہر ہے کہ آدمی اس قسم کی گفتگو میں ہر طرح کی باتیں کرتا ہے، فضائل اعمال وغیرہ جن کے متعلق آج ہی نہیں ہمیشہ سے محدثین کو شکایت ہے کہ لوگوں میں ضعیف روایتیں مروج ہوگئی ہیں، اس قسم کی حدیثوں کا تذکرہ ان کی مجلس میں آجاتا تھا، لبسا اوقات آپ ٹوک بھی دیتے تھے، اور فرماتے کہ "ایں قول مشائخ ست" یعنی حدیث نہیں بزرگوں کا قول ہے۔ فوائد الفواد میں ہی اس قسم کے الفاظ متعدد مقامات میں ملیں گے۔ کبھی پوچھنے والوں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا۔ "ایں حدیث درکتب احادیث کہ مشہور است ومعتبر نیامدہ (فوائد ص۲۲۳) حدیث کے الفاظ میں اختلاف ہوتا تو آپ فرماتے "انچہ در صحیحین است آں صحیح باشد" ص۱۰۳

ایک اور مسئلہ اس سلسلہ میں یعنی اس قسم کے اکابر کے کلام میں جو حدیثیں پائی جاتی ہیں اُن کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ باضابطہ فن اصولِ حدیث کی اُنھوں نے تنقیح فرمائی تھی، ان کے مشاغل کے لحاظ سے غالباً صحیح بھی نہ ہوگا، لبسا اوقات یہ صورت پیش آئی ہے کہ معتبر عالم مثلاً اپنے کسی اُستاد سے اُنھوں نے طالب العلمی میں کوئی حدیث سُنی، اُستاد جب صاحب کمال ہو تو قدرتاً آدمی اس پر اعتماد کرتا ہے اور اسی اعتماد کی بنیاد پر ان کی کہی ہوئی باتوں کا گفتگو میں ذکر کر دیتا ہے، مثلاً سلطان المشائخ ہی کو دیکھیے، ایک دفعہ اپنی مجلس میں ایک حدیث کا آپ نے ذکر کیا، کسی پوچھنے والے نے حدیث کی صحت وضعف کے متعلق سوال کیا، اس وقت آپ نے جواب میں فرمایا۔

من ایں درکتبے ندیدہ ام از مولانا علاء الدین اصولی کہ اُستاد من بود در بداؤں شنیدم۔ فوائد ص۱۶۵

مولانا علاء الدین ایک صاحب تقویٰ صاحب علم ودیانت بزرگ تھے، ظاہر ہے کہ ایسے اُستادوں

کی بات اگر عام گفتگو میں کوئی نقل کردے، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے نقل کرنے والے کے متعلق اس قسم کی رائیں قائم کی جائیں، جن کا تماشا اس زمانہ میں ہم کررہے ہیں، بلکہ میں تو اس قسم کی حدیثوں کا الزام خود محدثین کے ایک طبقہ پر عائد کرتا ہوں، حالانکہ ان کا پیشہ ہی زندگی بھر علمِ حدیث کی خدمت ہی تھا، مگر باوجود اس کے تیسری اور چوتھی صدی میں محدثین کا ایک طبقہ پیدا ہوا، جس نے انتہائی بے احتیاطیوں سے کام لے کر اپنی کتابوں میں رطب و یابس ہر قسم کی حدیثیں بھر دیں۔ بیچارے امام غزالی اور اسی قسم کے بعض ائمہ کو ان ہی متاخرین محدثین کی وجہ سے بدنام ہونا پڑا۔ اور دوسروں نے یہ دیکھ کر کہ امام حجۃ الاسلام کی کتاب میں یہ حدیث موجود ہے، ان پر بھروسہ کرکے تذکرہ میں یا خطوط میں اُسے نقل کردیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اکابر صوفیہ کے کلام میں ایسی حدیثیں اگر کبھی نظر آئیں تو میرے نزدیک اس باب میں ان کو مطعون ٹھہرانے میں عجلت نہ کرنی چاہیے، ان کی معذوریوں کو بھی سامنے رکھ کر رائے قائم کرلینا چاہیے، بلکہ اسی کے ساتھ مجھے تو اس زمانہ کے لوگوں کی یہ عام عادت کہ ادھر کان میں حدیث پڑی اور ذراسی غرابت یا اجنبیت اس میں محسوس ہوئی، بے تحاشا قہقہے لگا کہ غلط ہے، بے اصل ہے، موضوع ہے، قصاصوں کی روایتیں ہیں، یہ طریقہ علمی سنجیدگی سے کبھی بعید ہے جاننے والے جانتے ہیں کہ حدیثوں پر قطعی وضع و اختلاق کا حکم لگانا قریب قریب اسی قدر دشوار ہے، جتنا کہ کسی حدیث کی صحت کی قطعیت کا فیصلہ۔

ایسی حدیثیں جو عام متداول کتابوں میں نہ ملتی ہوں، یا ان میں موجود ہوں لیکن آپ کے حافظہ میں موجود نہ ہوں یا لفظاً نہیں بلکہ مفاداً موجود ہوں اور آپ کی نظر اس مفاد یا نتیجہ پر نہ پہنچی ہو، جب آئے دن حدیثوں کے متعلق یہ تجربات ہوتے رہتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ ایسی صورت میں ایک سنجیدہ رائے ایسی حدیثوں کے سُننے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتی ہے جیسا کہ سلطان المشائخ نے ایک دن فرمایا۔

حدیثے کہ مردم بشنوند نتواں گفت کہ ایں حدیث رسول نیست، اما ایں تواں گفت کہ در کتبے

کہ ایں احادیث جمع کردہ اند و اعتبار یافتہ اند بنا مدہ (ص۳۳ فوائد)

بلکہ بسا اوقات اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ حدیث صحاح ہی میں موجود تھی، لیکن روایت کرنے والے نے جو مطلب اس سے پیدا کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اپنے الفاظ میں منسوب کیا تھا، اس کی طرف ہمارا ذہن نہیں گیا تھا۔

ابھی ہدایہ کی حدیثوں کا ذکر گذر چکا کہ ہدایہ کی جن حدیثوں پر لوگوں نے ندرت اور غرابت کا حکم لگایا ہے، لفظاً یہ حکم صحیح ہو تو ہو، لیکن معناً قاطبۃً یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو سلطان المشائخ کی یہ محتاط اور سنجیدہ رائے اب بھی ان لوگوں کے لیے قابلِ غور ہے، جنہوں نے اپنے لفظی شقشقوں اور بقبقوں سے کانوں کو گھائل کر رکھا ہے، ان ہی بے احتیاطیوں اور ذمہ داریوں کے احساس کی کمی کا آج یہ نتیجہ ہے کہ بالآخر بے ادبوں بے باکوں کا ایک گروہ ہم میں ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو ان بیچارے صوفیہ ہی کیا خود بخاری و مسلم کی حدیثوں کے مقابلہ میں العیاذ باللہ خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور کیا کہیے شقاوتیں اور بدبختیاں تو اب آگے ہی بڑھتی چلی جا رہی ہیں، پیغمبر کے کلام کو پیغمبر ہی کا کلام مان کر مدعیان اسلام کا ایک گروہ اس کی تعمیل اپنے لیے غیر ضروری ٹھہرا رہا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ جب واقعی علم و معرفت والوں کی طرف سے نیم بضیہ کی ستم رانی روا رکھی جائیگی تو مسکینوں کے جس گروہ کی ساری پونجی اُردو ترجموں کی وہ کتابیں ہیں جن کی سو باتوں میں سے بمشکل دس باتیں وہ سمجھ سکتا ہے، وہ اپنی اس عداوت میں اندھا ہو کر جو قدرتاً جہل کو علم کے ساتھ ہے " ہزار مرغ بہ سیخ " پر جری نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا، عالم کا علم بہرحال حقیقت سے دور ہونے میں عالم سے مزاحمت کرتا ہے، لیکن جن کی باگ صرف جہل کے ہاتھوں میں ہو، ان بیچاروں کو کون تھام سکتا ہے۔

بہرحال اس زمانہ میں لوگ دین کی مصلحت جس چیز میں بھی سمجھیں، لیکن علم اور دین جن سے منتقل ہو کر ہم تک وراثتہً پہنچا ہے، ان بزرگوں کو تو ہم پاتے ہیں کہ موضوع سے موضوع جعلی

حدیث جس کا جعلی ہونا اجلی البدیہیات میں ہوتا تھا، یونہی آدمی یقین کرسکتا ہے کہ وہ قطعاً بے بنیاد ہے ملاحظہ فرمائیے حضرت سلطان المشائخ اس کو بھی موضوع ہی قرار دیتے ہیں، مگر کس لب ولہجہ میں ایک شخص مجلس مبارک میں حاضر ہوتا ہے، پوچھتا ہے

"از بعضے علویاں (شیعہ) شنیدہ شدہ است کہ حضرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم خطے نوشتہ بود کہ فرزندان من بعد از من مسلمانان را اگر خواہند بفروشند ابوبکر یا عمر خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ پارہ کردند۔ ایں راست است؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اپنے فرزندوں (جن کی برہمنیت توڑنے کے لیے حضور نے آل ہاشم پر بھکشا اور دان یعنی صدقہ حرام فرما دیا ہے) ان ہی فرزندوں کو برہمنیت کبریٰ کا یہ مقام عطا کرنا کہ مسلمانوں کو بیچ کر جاہیں تو اپنی ضرورت پوری کرسکتے ہیں، جس قسم کی بات ہوسکتی ہے ظاہر ہے، غالباً خود علماء شیعہ بھی اس کو موضوع ہی سمجھتے ہونگے[1]۔ اتنی کھلی ہوئی واضح موضوع حدیث ہے مگر سلطان المشائخ سائل کو جواب دیتے ہیں۔

خیر ایں معنی در ہیچ کتاب نیامدہ است اما عزیز داشتن ایشاں وگرامی داشتن فرزندان رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم واجب است" (ص ۲)

بہرحال اس زمانہ میں حدیثوں پر حکم لگانے کا جو طریقہ تھا اُس کی مثال پیش کرنی تھی۔

خیال گزرتا ہے کہ شاید ان بزرگوں کی نظر ان چیزوں پر نہ تھی، جن کی بنیاد پر آج لمبے چوڑے دعوے کیے جاتے ہیں، میں سلطان المشائخ کی سوانح عمری اس وقت نہیں بیان کر رہا ہوں۔ ورنہ دکھاتا کہ حدیث اور فقہ کے جوہری اور اساسی حقائق پر ان کی کتنی گہری نظر تھی، خصوصاً حنفی فقہ

[1] کیونکہ قرطاس کا جو واقعہ شیعوں میں مشہور ہے اس کے متعلق تو کہتے ہیں کہ اس میں خلافت کا فیصلہ لکھا جانے والا تھا، میں کہتا ہوں کہ بالفرض یہی ہو لیکن کس کی خلافت کا فیصلہ اس کا جو دین اور نماز میں نائب بنایا گیا تھا، ظاہر ہے کہ ہوتا تو شاید اسی کے لیے ہوتا، ابن عباس نے اس کو رزیہ (مصیبت) جو قرار دیا تو اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ اگر خلافت صدیقی تحریر میں آجاتی تو جھگڑا نہ ہوتا، یعنی بجائے اقتضاء کے نص صریح ان کی خلافت کے لیے مہیا ہو جاتی۔

کا حضرت عبداللہ بن مسعود سے جو تعلق ہے، اور ابن مسعود کا جو خاص طریقہ روایت کرنے میں تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے وہ بہت کم حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، مرسل اور متصل کی صحت اور عدم صحت کے عالمانہ مباحث اس سلسلہ میں جو پائے جاتے ہیں، اسی عام مجلس میں باتوں ہی باتوں میں ان امور کی طرف وہ عمیق اور گہرے اشارے کرتے چلے گئے ہیں، حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ نہ ان کا پیشہ تھا اور نہ ان کا کاروبار، خدا نے ان کو جس کام کے لیے پیدا کیا تھا، وہی کام اتنا اہم تھا جس کی مشغولیت ان کو ان ذہنی اور علمی مباحث میں مشتغل ہونے کا وقت ہی کب دیتی تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ عالم ہونا محدث ہونا مفسر ہونا تو آسان ہے اور بکثرت تھوڑی بہت محنت سے لوگ ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہو ہی رہے ہیں، یورپ نے تو ان علوم کی مہارت کے لیے اسلام کی بھی شرط باقی نہیں رکھی ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ علم کا تعلق راست مطالعہ سے ہے۔ دین و بے دینی کو اس میں چنداں دخل نہیں لیکن عالم نہیں، عالم گر، فقیہ نہیں فقیہ ساز ہونا آسان نہیں ہے۔ ایسے نفوس طیبہ لاکھوں اور کروڑوں میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں جنہیں خدا ولی ہی نہیں ولی ساز بنا کر پیدا کرتا ہے، ان کی صحبت میں حیوان انسان بنتے تھے اور انسانیت سے بھی اعلیٰ مقام حاصل کرتے تھے، بشرطیکہ انسانیت سے کوئی اونچا مقام ہو بھی، ہم میں آج کتنے ہیں جنہیں خود اپنے آپ کو بھی واقعی مسلم اور مومن بنانے میں کامیابی ہوئی ہے، عمر گذرتی چلی جاتی ہے معلومات کا ذخیرہ دماغ میں بھرا چلا جاتا ہے، لیکن بجائے دماغ کے ہمارے دلوں کا آپریشن کیا جائے تب پتہ چل سکتا ہے کہ اس میں شکوک و شبہات و وساوس اوہام کی کتنی چنگاریاں چھپی ہیں کیسی چنگاریاں جنہیں موقع ملتا ہے تو العیاذ باللہ آن کی آن میں ایمانی زندگی کے سارے سرمایہ کو بھسم کر کے رکھ دیتی ہیں، خیال کرنے کی بات ہے، ان لوگوں کا مقابلہ ان بزرگوں سے کوئی معنی رکھتا ہے جن کے ایک ایک خادم نے زمین کے بڑے بڑے علاقوں کو ایمان و اسلام ایقان و سکینت کی دولت سے بھر دیا ہے، آج دریائے تاپتی کے کنارے مسلمانوں کا وہ عظیم مرکزی شہر برہان پور جس کے در و دیوار شکستہ اس کے کھنڈر آپ کو بتا سکتے ہیں کہ حضرت نظام الاولیاء کے صفِ

بنگال سے اُٹھنے والے ایک بزرگ حضرت برہان الدین غریب نے اسی اُجڑے ہوئے مقام کو سرزمین دکن میں ایمان کی روشنی پھیلانے کا مرکز بنایا تھا، خود اس شہر کا نام "برہان پور" ان ہی کے اسم گرامی کی یادگار ہے، شیخ محدث لکھتے ہیں۔

واین برہان پور کہ شہرے مشہور است بنام شیخ آبادان ست (اخبار الاخیار ص ۹۴)

آج بنگال کے تین کروڑ مسلمانوں پر مسلمانوں کو ناز ہے، ناز ہے کہ اتنی بڑی آبادی کسی خالص اسلامی واحد ملک کی بھی نہیں ہے لیکن غریب الدیار اسلام نے اس ملک میں جب قدم رکھا تھا، تو لوگوں کو کیا معلوم کہ اس کی پالکی کو کندھا دینے والے کون کون لوگ تھے، ایک لڑکا

ہنوز موئے ریش آغاز نہ شدہ بود در حلقہ ارادت شیخ در آمدہ بود، و در سلک خدمتگاراں پرورش یافتہ (اخبار ص ۸۶)

سلک خدمتگاروں میں اسی پرورش پانے والے لڑکے کا نام بعد کو اخی سراج الدین عثمان ہوا جس نے نظام الاولیا کی خانقاہ سے نکل کر سارے بنگال میں آگ لگادی، ایمان وعرفان کا چراغ روشن کردیا۔ پنڈوہ کے علاء الحق والدین جن کا آج سارا بنگال معتقد ہے ان ہی اخی سراج عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے تراشیدہ ہیں، اُف جس ذاتِ ہمایونی نے اپنی ایک ذات قدسی صفات سے ایسے ایسے "مردان راہ" پیدا کیے جن سے خدا ہی جانتا ہے کہ نسل انسانی کی کتنی تعداد جو اپنے مالک سے بچھڑی ہوئی تھی، پھر اسی کے استانہ پر پہنچ گئی۔ میرا دماغ ان لوگوں پر کھولنے لگتا ہے جو شاید خود اپنی ایک ذات کو بھی مسلمان بنانے میں جیسا کہ چاہیے کامیاب نہیں ہوئے ہیں جس کا احساس دوسروں سے زیادہ خود ان ہی کو ہوگا، آج اُنھی کی دراز زبانیں ان بزرگوں پر کھل رہی ہیں، ان کے قلم کی تیز نوک ان کی پاکیوں کو مجروح کر رہی ہے، جن کے طفیل میں خدا ہی جانتا ہے کتنوں کو پاکی میسر آئی، ایک سلطان المشائخ ہی کی ذات ہے۔ بنگال اور دکن کے سوا آئین اکبری کی گویا شاہی رپورٹ ان کے متعلق جو درج ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں میں سے ایک ایک آدمی نے کیا کیا کیا ہے اور اپنے محبوب رسول علیہ السلام کے پیغام اور دین کو دنیا کے کن کن گوشوں تک پہنچانے

ہیں وہ کامیاب ہوا ہے۔ سلطان المشائخ کے نمایندے سرزمینِ ہند کے کن کن علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ابوالفضل کے الفاظ یہ ہیں:۔

"شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، امیر خسرو، شیخ علاء الحق، شیخ اخی سراج الدین در بنگالہ، شیخ وجیہ الدین یوسف در چندیری، شیخ یعقوب و شیخ کمال در مالوہ، مولانا غیاث در دھار، مولانا مغیث در اجین شیخ حسام در گجرات، شیخ برہان الدین غریب، شیخ منتجب، خواجہ حسن در دکھن" آئینِ اکبری منشؔ"

دیکھ رہے ہیں، دین کے اس نیرِ تاباں کی کرنوں کو دیکھ رہے ہیں، دلّی کے اُفق سے طلوع ہو کر اس نے اپنی رُوح پرور اور جاں آفریں شعاعیں کہاں کہاں پہنچائیں، واقعہ یہ ہے کہ بزرگوں کا یہ گروہ جن جن علاقوں میں پہنچا ہے اپنے ساتھ وہ علم کی دولت کو بھی لے گیا ہے ان میں ہر بزرگ اس کا مستحق ہے کہ ان کے دینی خدمات اور علمی مجاہدات پر الگ الگ کتابیں لکھی جائیں، میری بحث دراصل علم حدیث کے متعلق ہو رہی تھی، حدیثوں کے متعلق ہندوستان کے بزرگوں کا جو طرزِ عمل تھا اس کی چند مثالیں پیش کر رہا تھا۔

بہرحال سمجھ میں نہیں آتا کہ جن لوگوں کی طرف سے ہندوستان پر علم حدیث کے متعلق آج الزام لگایا جا رہا ہے، وہ چاہتے کیا ہیں؟ کیا ہندوستان جہاں صحیح معنوں میں اسلام ساتویں صدی کے آغاز میں داخل ہوا، وہ چاہتے ہیں کہ زہری اور امام مالک، امام بخاری، ترمذی وغیرہ کی طرح حدیث کی تدوین میں حصہ لیتا؟ اسماء الرجال کا فن مرتب کرتا، خیال کرنے کی بات ہے کہ اس کام کی توعیت ہی یہی تھی کہ بجز ان ملکوں کے جہاں اسلام پہلی صدی ہجری میں پہنچ گیا، دوسرے ممالک جو صدیوں بعد اسلام کے وطن بنے ان کو حصہ لینے کا موقع ہی کیا تھا، یہ سعادت تو انہی بزرگوں کے لیے مخصوص تھی جو اسلام کے قدیم اوطان میں پیدا ہوئے۔ البتہ اس کے بعد حدیث میں کام کرنے کی جو راہ باقی رہ گئی تھی یا اب بھی کھلی ہوئی ہے وہ اس علم کی تعلیم و تدریس، تشریح و تنقیح، نشر و اشاعت ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھیے تو کس زمانہ میں ہندوستان کا قدم پیچھے رہا ہے۔ اسلام کی پہلی صدی جو ہندوستان میں تھی، اس میں گذر چکا کہ ہندوستان ہی کے

ایک عالم نے پایۂ تخت خلافت میں درس کے لیے صحیحین کی حدیثوں کا وہ مجموعہ پیش کیا جو صدیوں تقریباً اکثر اسلامی ممالک میں درسی نصاب میں شریک رہا، میری مراد حسن صغانی کی مشارق سے ہے جس کا تفصیلی ذکر گذر چکا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران، ترکی، مصر، شام ہر جگہ کے علماء کو ہم دیکھتے ہیں کہ مشارق کی شرح لکھ رہے ہیں۔ جب ہندستان کی ان ہی صدیوں میں اس مجموعہ کے زبانی یاد کرنے کا رواج تھا تو اس کے یہ معنی نہیں ہوئے کہ ہندستان میں صحیحین کی دو دو ہزار سے اوپر حدیثوں کے حافظ پائے جاتے تھے، گذر چکا کہ سلطان المشائخ کا بھی شمار ان ہی حفاظ میں ہے۔ یاد آیا میں مولانا عبدالحیی مرحوم سابق[1] ناظم ندوۃ العلماء نے نقل فرمایا ہے کہ اسی ہندستان میں مولانا عبدالملک عباسی تھے جن کے متعلق کہا جاتا ہے۔

کان حافظاً للقرآن وصحیح البخاری	وہ قرآن کے حافظ تھے اور صحیح بخاری ان کو زبانی یاد تھی
لفظاً ومعناً وکان یدرس عن ظھر	الفاظ بھی اور اس کے مطالب بھی اور صحیح بخاری کا
قلبہ۔	درس زبانی دیتے تھے۔

آپ سن چکے کہ ان ہی پرانے دنوں میں مولانا فخرالدین زرادی جیسے محدثین اس ملک میں موجود تھے جن کی فنی مہارت کا یہ حال تھا کہ سابقہ تیاری کے بغیر ہدایہ کی حدیثوں کی جگہ صحیحین کی حدیثوں سے حنفی مذہب کے مسائل کو ثابت کر سکتے تھے۔

ان ہی دنوں میں جب کہا جاتا ہے کہ ہندوستان فن حدیث سے بیگانہ تھا۔ صحاح ستہ کا وہ ضخیم مجموعہ مشکوٰۃ جس میں صحاح کے سوا حدیث کی دوسری کتابوں کی حدیثیں بھی جمع ہیں زبانی یاد کرنے والے لوگ موجود تھے تذکرہ علماء ہند میں بابا داؤد مشکوتی کے ذکر میں ہے۔

"در فقہ و حدیث و تفسیر و حکمت و معانی ید طولیٰ داشت و حافظ مشکوٰۃ المصابیح بود بدیں وجہ ادرا

---

[1] مولانا مرحوم ہندستان کے ان مخلص علماء میں تھے جنھوں نے نام پیدا کرنے سے زیادہ بہت زیادہ کام کیا ہے۔ عربی زبان میں ہندستان کی سیاسی علمی جغرافیائی ضخیم تاریخیں آپ نے لکھی ہیں لیکن بجز ایک مختصر قطعہ کے ان کی محنتوں کا یہ سارا ذخیرہ زیور طبع سے محروم ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت کس کے لیے مقدر ہے۔

مشکوٰتی می گفتند" ص ۶۰

صاحب الیانع الجنی نے حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے شیخ محمد فرخ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے

کان یحفظ سبعین الف حدیث	ان کو ستر ہزار حدیثیں متن اور سند کے ساتھ اس طور پر
متنا واسناداً جرحاً وتعدیلا	یاد تھیں کہ ہر ایک سند کے رواۃ کے متعلق جرح و تعدیل
(ص ۶۶)	کے اعتبار سے جو مباحث ہیں وہ بھی زبانی یاد تھے۔

تیرہویں صدی کے آخر میں مولانا رحمت اللہ الہ آبادی ایک محدث تھے جن کے متعلق لکھا ہے "کتب صحاح ستہ بر زبان داشت (تذکرہ علماء ص ۶۲) اور مولانا قادر بخش سہسرامی کے دیکھنے والے تو شاید اب بھی موجود ہونگے جو صحاح کے ورق کے ورق زبانی سناتے چلے جاتے تھے، بخاری کی حدیثیں سند کے ساتھ بیان کر کے فتح الباری عینی وغیرہ شروح کی عبارتیں تک مولانا زبانی سناتے تھے۔

الغرض اوّل سے لے کر آخر تک ایک طبقہ ہندوستان میں ہمیشہ پایا گیا جسے ہم حفاظ حدیث میں شمار کر سکتے ہیں۔

حدیث کی خدمت کی ایک شکل درس و تدریس کی ہو سکتی تھی، سو اس کا حال یہ ہے کہ دلّی کو جن دنوں اسلامی حکومت کے پایۂ تخت ہونے کی سعادت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی، یعنی پانچویں صدی کی ابتدا تھی آپ کو لاہور میں شیخ اسماعیل محدث نشر حدیث میں مشغول نظر آئینگے۔ تذکرہ میں یہ لکھنے کے بعد کہ "شیخ اسماعیل از عظمائے محدثین و مفسرین بود" لکھا ہے کہ "در اوّل کسے سب کہ علم حدیث و تفسیر بہ لاہور آوردہ" شیخ اسماعیل کا ایک بڑا کام یہ بھی تھا کہ "ہزارہا مردم در مجلس وعظ وے مشرف باسلام شدند" جانتے ہیں ان کی وفات کس سنہ میں ہوئی ہے" درسال چہار صد و چہل و ہشت ہجری در لاہور درگذشت (ص ۲۳)

حدیث کے ایسے مدرسین بھی اسی سرزمینِ ہند میں موجود تھے کہ "سی و شش مرتبہ مذاکرہ صحیح بخاری از اوّل تا آخر نمود" (تذکرہ علماء ہند) ان کا نام ملّا عنایت اللہ کشمیری تھا سنہ ۱۱۲۵ھ میں وفات پائی چھتیس چھتیس دفعہ بخاری کو مذاکرہ کے ساتھ ختم کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

ان ہی ملا عنایت سے پہلے اکبری عہد میں مولانا محمد مفتی نامی بزرگ تھے یہ لاہور میں افتاء کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ لکھا ہے کہ "ہر بارے کہ ختم صحیح بخاری و مشکوٰۃ المصابیح می کرد مجلسے عظیم ترتیب دادے و طبخ بعض حلویات می فرمود و بعلما و صلحا خوراندے۔ (ص ۲۱۳ تذکرہ و منتخب)

اکبر ہی کے زمانہ میں ایک اور محدث شیخ بہلول دہلوی تھے جن کے متعلق اسی کتاب تذکرہ علماء ہند میں ہے کہ "علم حدیث را خوب ورزیدہ" (ص ۳۲) اور صرف بالائی ہند پنجاب و کشمیر، دلی وغیرہ ہی کا یہ حال نہ تھا، نویں صدی کے عالم شیخ بھکاری کاکوروی تھے جن کی اصول حدیث میں ایک کتاب منبع کے نام سے ہے۔ مشہور مداح النبی حضرت محسن کاکوروی آپ ہی کی اولاد میں ہیں۔

انتہا یہ ہے کہ نو مسلم ہندوؤں میں سے بعضوں نے فن حدیث میں کمال پیدا کیا تھا، جوہر ناتھ کشمیری ان ہی نو مسلم محدثین میں ہیں لکھا ہے کہ حج کے لیے حجاز تشریف لے گئے اور "از ملا علی قاری ہروی و ابن حجر مکی اجازت حدیث بسند معنعن یافتہ" (تذکرہ ص ۴۴)

ان ہی ابن حجر مکی کے ایک اور شاگرد مشہور میر سید شریف جرجانی کے پوتے مولانا میر مرتضیٰ شریفی ہیں بداونی میں ہے۔

"در علوم ریاضی و اقسام حکمت و منطق و کلام فائق بر جمیع علمائے ایام بود از شیراز بمکہ رفتہ علم حدیث در ملازمت شیخ ابن حجر اخذ کردہ اجازت تدریس یافت"

مکہ معظمہ سے میر صاحب آگرہ آئے اور بقول بداونی "بہ اکثرے علماء و فضلاء سابق و لاحق تقدیم یافت و بدرس علوم و حکم اشتغال داشت" (ص ۳۲۱ ج ۳) اکبر کے عہد میں وفات پائی حافظ دراز پشاوری قاضی مبارک کے حاشیہ کی وجہ سے ارباب درس میں خاص شہرت رکھتے ہیں لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک طرف ان کے متعلق یہ لکھا جاتا ہے کہ "در فقہ و حدیث و اصول یگانۂ روزگار"۔ اور دوسری طرف یہ بھی ہم ان ہی کے ترجمہ میں پڑھتے ہیں کہ

"اکثر علوم از والدۂ ماجدہ خود کہ عالمہ فاضلہ بود تحصیل نمودہ و بر مسند افادت و افاضت

متمکن شد و تمام عمر گرامی بدرس طلبہ و تالیف صرف کرد"
جس کا یہی مطلب ہے کہ ان کی والدہ صاحبہ بھی محدثہ تھیں، ان پر حدیث کا فن اتنا غالب تھا کہ بخاری کی ایک شرح فارسی زبان میں لکھی تھی، تذکرہ میں ان کی تالیفات میں "منہج الباری شرح فارسی بخاری" (ص ۶۰) کا نام خاص طور پر لیا گیا ہے۔

مجھے استیعاب مقصود نہیں ہے بلکہ ابتداء عہد اسلامی سے آخر تک اس ملک میں علم حدیث کے درس و تدریس کا رواج جو رہا ہے اس کے چند نمونے پیش کر رہا ہوں۔ خدمت حدیث کی تیسری صورت تالیف و تصنیف ہو سکتی تھی، یہ دعویٰ کہ ہندوستان نے لے دے کر صرف مشارق کا مجموعہ دنیائے اسلام کو دیا صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ صرف یہی کارنامہ جیسا کہ گزر چکا ہندوستان کی طرف سے کافی ہو سکتا تھا لیکن قطع نظر ان چند مشہور تالیفات کے جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ مثلاً شیخ عبدالحق اور ان کے خانوادے کا کام یا شیخ علی متقی کا سارے جہان اسلامی پر کنز العمال کے ذریعہ سے احسان لیکن بات محض انہی کتابوں تک محدود نہیں ہے۔ ابھی حافظ دراز پشاوری کے تذکرے میں بخاری کی فارسی شرح کا ذکر گزر چکا ہے۔ شیخ بہلول کے رسالہ منہج فی اصول الحدیث کا ذکر بھی آپ سن چکے ہیں۔

اب سنیئے دسویں صدی ہجری میں زید پور جو جون پور کا ایک قصبہ ہے یعنی گجرات و سندھ کا کوئی شہر نہیں ہے، شمالی ہندوستان کے مشرقی علاقہ کا یہ قصبہ ہے، یہاں کے مولانا عبدالاول زید پوری ایک محدث جن کی وفات ۹۶۸ھ ہجری میں ہوئی ان کی تالیفات میں "فیض الباری شرح صحیح بخاری" (ص ۱۰۲) کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے ہندی عالم شیخ نورالدین احمد آبادی ہیں جن کی ایک سو ستر کتابوں میں ہم ایک کتاب "نورالقاری شرح بخاری" (تذکرہ ص ۲۴۸) بھی پاتے ہیں۔ خود مولانا آزاد غلام علی بلگرامی کی کتابوں میں بھی ہے "ضوء الدراری شرح صحیح بخاری تا کتاب الذکر (تذکرہ ص ۲۵۴) کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

یہی حال تراجم کا بھی ہے۔ شیخ محدث دہلوی کے ترجمہ مشکوٰۃ یا ان کی شرح لمعات اسی طرح

ان کے صاحبزادے شیخ نور الحق کی تیسیر القاری ترجمہ بخاری و ترجمہ صحیح مسلم کا ذکر گزر چکا ہے۔ شاہ صاحب کے خاندان کے ایک عالم مولانا سلام اللہ گزرے ہیں جن کی ایک شرح موطا المحلی ٹونک کے کتب خانہ میں حسن الخط کی کئی جلدوں میں موجود ہے۔ انہی مولانا سلام اللہ کے والد جن کا نام ہی شیخ الاسلام تھا، تذکرہ علماء ہند میں لکھا ہے کہ "مصنف شرح فارسی صحیح بخاری ست (ص ۲۷) اور ان کے دادا حافظ فخر الدین کی "شرح فارسی صحیح مسلم" (تذکرہ) موجود ہے، اسی طرح مشکوٰۃ المصابیح پر ہندوستان کے مختلف علماء نے حواشی و شروح لکھے۔ شیخ محدث کے سوا حضرت مجدد الف ثانی کے صاجزادے شیخ محمد سعید الملقب بخازن الرحمۃ کے تالیفات ہیں "حاشیہ بر مشکوٰۃ المصابیح نوشتہ" (تذکرہ ص ۱۹۰) اور جس طرح ہندوستان میں بخاری کی متعدد شروح مختلف علماء کے قلم سے پائے جاتے ہیں، مشکوٰۃ کے حواشی و شروح کی تعداد تو ان سے کہیں زیادہ ہے۔ آخر میں دنیائے اسلام کی وہ نادر مثال کتاب جس کا نام حجۃ اللہ البالغہ ہے بظاہر وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کوئی مستقل کتاب معلوم ہوتی ہے لیکن اپنے تجربہ و تتبع کی بنیاد پر میرا یہ خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے مشکوٰۃ ہی کو سامنے رکھ کر ہر باب کی حدیثوں کو مجموعی نقطۂ نظر سے کچھ اس طرح مرتب فرمادیا ہے کہ اسلام ایک فلسفہ کی شکل میں بدل گیا ہے۔ ایسا فلسفہ جس کی طرف نہ رہنمائی پہلوں کو میسر آئی اور نہ پچھلوں کو اسی لیے میں حجۃ اللہ البالغہ کو عموماً مشکوٰۃ ہی کی ایک خاص شرح قرار دیتا ہوں۔ حضرت شاہ صاحب نے علاوہ اس بے نظیر کتاب کے موطا کی فارسی و عربی شرحوں میں جن مجتہدانہ نکات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کے سوا آپ نے چھوٹے چھوٹے رسالے علم حدیث اور حدیث کا جو تعلق فقہ سے ہے، اس پر جو کتابیں لکھی ہیں یا معرفۃ الصحابہ میں آپ کی نفید المثال کتاب ازالۃ الخفار، قرۃ العینین وغیرہ ہندوستان کا وہ سرمایہ ہے جس پر ہمارا یہ نیم مسلم ملک ناز اور بجا ناز کرسکتا ہے۔ پچھلے دنوں میں ترمذی کی شرح مبارک پوری کی، اور ابوداؤد کی شرح عظیم آبادی کی، صحیح مسلم کی شرح علامہ عثمانی مولانا شبیر احمد کی، بخاری کی املائی شرح علامہ امام کشمیری کی، اسی طرح آثار السنن علامہ نیموی کی، اعلاء السنن علامہ تھانوی کی، نیز ترمذی کی املائی شرح علامہ کشمیری و

و مولانا رشید احمد گنگوہی کی، اور ابو داؤد کا حاشیہ مولانا خلیل احمد کا، موطا کا حاشیہ مولانا زکریا سہارنپوری کا، مفتی عبداللطیف رحمانی کی شرح غیر مطبوعہ ترمذی کی، موطا امام محمد کی شرح مولانا عبدالحیی فرنگی محلی کی، اور ازیں قبیل چھوٹی بڑی کتابوں کی ایک بڑی تعداد اس سلسلہ میں لکھی گئی فن حدیث کے خدمات میں جس ملک کے پاس اتنا بڑا عظیم سرمایہ ہو میں نہیں سمجھتا کہ کس بنیاد پر اس کو اسی فن کے متعلق لاپروائی کے ساتھ متہم کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تعلیقات حدیث میں غریب الحدیث رجال معرفۃ الصحابہ وغیرہ میں بھی ہندوستان نے ہر زمانہ میں کام کیا ہے۔ حسن صغانی اور احمد بن طاہر فتنی کی کتابوں کے سوا بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی، مقدمہ صحیح مسلم علامہ عثمانی کی، نخبۃ الفکر کی شرح ملا وجیہ گجراتی کی،

میں تفصیل کے درپے نہیں ہوں بلکہ کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کسی زمانہ میں علم حدیث سے بیگانہ نہیں رہا۔ پانچویں صدی کی ابتدا سے علامہ اسماعیل محدث نے حدیث کو ہندوستان میں جب سے پہنچایا، شمالی ہند ہو یا جنوبی، مغربی علاقے اس ملک کے ہوں یا مشرقی سب ہی جگہ اس ملک کے خدام نظر آتے ہیں، جنہوں نے درسًا و تالیفًا و حفظًا اس فن کی خدمت انجام دی اور اب تک دے رہے ہیں بلکہ دن بدن ہندوستان کا تعلق علم حدیث سے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ خیال کہ حدیث میں ہمارا جو مستقبل شاندار نظر آتا ہے اس کی تعمیر میں ماضی کی تاریخ کو کوئی دخل نہیں ہے، قطعًا غلط ہے۔ میرے نزدیک تو بزرگوں کا موروثی مذاق ہی تھا جو بتدریج حسب اقتضاء زمانہ بڑھتا رہا۔ پچھلے دنوں چونکہ عمل بالحدیث کا دعویٰ کر کے ایک فرقہ اس ملک میں اٹھا اور اسلام کے طویل الذیل ابواب بیوع، وصایا، معاقل، شفعہ، دیات، مساقاۃ، ہبات، دعوی، اقرار، شہادت سیر، جہاد، حج و صوم، زکوٰۃ، صلوٰۃ میں سے صرف صلوٰۃ کے باب سے اس نے کل تین یا چار مسئلوں (قراۃ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع الیدین، وضع الیدین علی السرہ) کا انتخاب کر کے چھیڑنا شروع کیا کہ اس ملک کے مسلمانوں کو حدیث سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ ان چار مسئلوں میں ان کا طریقہ عمل حدیث کے خلاف ہے۔ حالانکہ ان مسائل چہارگانہ میں سے تین مسئلوں کے متعلق جو مطالبہ

تھا وہ صرف اولیٰ اور بہتر ہونے کا تھا، یعنی بہتر یہ ہے کہ ہندی مسلمانوں میں جو طریقہ مروج ہے اس کو چھوڑ کر ان عاملین بالحدیث کے مشورہ کو قبول کیا جائے۔ اتنی شدت سے اس کا غلغلہ بلند کیا گیا کہ علماء ہند کو مجبوراً اپنی حدیث دانی کی مہارت کا اظہار کرنا پڑا، بلاشبہ ایک شر تھا جس سے خیر پیدا ہوا، یعنی علم حدیث کی طرف توجہ نسبتاً علماء ہند کی بڑھ گئی اور اب تو حال یہ ہے کہ مذکورہ بالا تصنیفی و تالیفی کاروبار کے سوا علم حدیث کی مستقل شاخ فن اسماء الرجال کی کتابوں کی اشاعت میں ہندوستان کو ایسی خصوصیت حاصل ہو گئی ہے کہ اب ساری دنیا ر اسلام اس فن کی کتابوں میں ہندوستان کی محتاج ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا عظیم کارنامہ حکومتِ اسلامیہ ہندیہ آصفیہ کے مطبع دائرۃ المعارف کا ہے، بارہ بارہ جلدوں تک کی کتابیں اس فن کی اسی مطبع نے شائع کیں، اور ایک نہیں تقریباً ایک درجن کتابیں اسماء الرجال کی دائرۃ المعارف کی نشریات مخصوصہ میں ہیں۔ ان کے سوا متن حدیث میں مسند طیالسی و مستدرک اور شرح حدیث میں سنن بیہقی کی دس ضخیم جلدیں شائع کر کے اسلامی جہان کو اس مطبع نے ششدر کر دیا ہے۔ اسی مطبع نے ہندوستان کے اس کام کو یعنی کنز العمال کو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے چھاپ کر شائع کیا نیز رجال کی بعض مختصر نادر کتابیں مطبع احمدیہ الہ آباد سے بھی شائع ہوئیں۔ اور ڈابھیل کی نومولود مجلس علمی نے اپنی عمر کے اسی قلیل عرصہ میں نصب الرایہ زیلعی اور فیض الباری امام کشمیری کی املائی شرح بخاری چھاپ کر ہمارے سامنے بڑے بڑے توقعات قائم کر دیے ہیں۔

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی اسلامی سلطنت آصفیہ نے آثار نبوت کی نشر و اشاعت میں جتنا بڑا کام کیا ہے، مشکل ہی سے کسی دوسرے اسلامی ملک کی اسلامی حکومت اس کی نظیر پیش کر سکتی ہو۔ یہ اکثر حضرات کو معلوم نہ ہوگا کہ مسند امام احمد حنبل مع منہج العمال جو مصر میں چھپا ہے اس کے مصارف بھی آصف سادس نواب سر محبوب علی خاں مرحوم والیِ حیدر آباد دکن نے ادا کیے ہیں مگر تاکید تھی کہ کسی کو پتہ نہ چلے واللہ مخرج ما کنتم تکتمون۔ اللہ آج میرے ذریعہ یہ ظاہر کرتا ہے۔ اور ہندوستان میں سلاطین اسلامی کا فنِ حدیث سے یہ تعلق کوئی نئی بات نہیں ہے

اسی جنوبی ہند میں جہاں آج دائرۃ المعارف اپنے طلائی کارناموں کو تاریخ کے اوراق پر ثبت کر رہا ہے آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے سلطان محمود شاہ بن حسن بہمنی المتوفی ۷۹۹ھ کے ترجمہ میں منجملہ اور باتوں کے ہم یہ بھی پاتے ہیں۔

جعل الارزاق السنیۃ للمحدثین	محدثین کی اس بادشاہ نے بڑی بڑی تنخواہیں جاری کر رکھی تھیں
لیشتغلوا بالحدیث بجمع الہمۃ	تاکہ باطمینان قلب کامل توجہ کے ساتھ علم حدیث کی اشاعت
والفراغ الخاطر وکان یعظمھم	میں مصروف رہیں یہ بادشاہ محدثین کی بڑی عظمت کرتا تھا
غایۃ التعظیم (نزہۃ الخواطر ص۱۵۰)	

اسی دکن کی دوسری اسلامی حکومت بیجاپور میں جب ابراہیم عادل شاہ تخت نشین ہوا جس نے اہل سنت کا مذہب اختیار کیا تھا، اور آثار شریف، نیز مسجد جامع میں اُس نے درس حدیث کے لیے خاص کر کے علما مقرر کیے تھے جس کا ذکر اپنے موقعہ پر آئیگا۔ گویا سب سے پہلے سرزمین ہند میں دارالحدیث قائم کرنے کا فخر ہند کے جنوبی حصہ ہی کو حاصل ہے۔

اب نہ سوچنے والوں کو کیسے سمجھایا جائے ورنہ اسی پر لوگوں کی نظر ہوتی کہ ہندوستان میں جس وقت امن وامان کا دور دورہ تھا، یہی وہ زمانہ ہے جب تاتاری فتنہ نے وسط ایشیا خراسان، ایران عراقِ عرب، عراق عجم یعنی ان تمام علاقوں کو جہنم کدہ بنا رکھا تھا، جہاں اسلامی علوم کے مراکز قائم تھے ایسی صورت میں سلاطین ہند کی عام علمی قدردانیوں کا حال سُن کر ہر قسم کے علمار کا ہندوستان کی طرف متوجہ ہونا ایک قدرتی بات تھی، نیز ہندوستان سے ہر سال حجاج کا قافلہ عرب آجا رہا تھا، حرمین میں حدیث کے حلقوں کا دستور نایادگار زمانہ سے جاری تھا، کیا یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے علما حجاز جائیں اور اتنی سہولت سے ان کو حدیث کی سند ان مقامات میں مل رہی ہو، اس سے وہ مستفید نہ ہوں ہندوستان کے صوفیوں کو بدنام کیا جاتا ہے کہ ملک کی فضا چونکہ انہی کے زیر اثر تھی اس لیے انہوں نے زیادہ تر تصوف اور تصوف کی کتابوں کو ہندوستان میں مروج کیا، حالانکہ اگر واقعات کا یہ مطالعہ کرتے تو ان کو نظر آتا کہ ہندوستان کے اکابر صوفیہ ہی پر حدیث کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا تھا مشہور بات ہے کہ

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا، حدیث ہی سے متاثر ہو کر باوجود سخت حنفی ہونے کے قرأۃ خلف الامام کرتے تھے، امیٹھی اودھ کے ایک مرکزی بزرگ صوفی شیخ فیاض جن کا شاید آئندہ بھی ذکر آئیگا بداؤنی نے ان کے متعلق بھی یہی لکھا ہے۔ بجنسہ یہی بات ہندی تصوف کے دوسرے رکن رکین حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے کہ وہ بھی حدیث ہی کے زیر اثر فاتحہ امام کے پیچھے پڑھتے تھے۔ؐ ان ہی مخدوم بہاری کے حالات میں لکھتے ہیں کہ دیوہ کے ایک بزرگ مولانا زین الدین دیوی جب بہار حضرت سے ملنے گئے تو ان کی خدمت میں جو تحفہ انہوں نے پیش کیا تھا وہ کوئی تصوف کی کتاب نہیں بلکہ

اھدی الیہ صحیح مسلم بن الحجاج النیسا پوری (نزہۃ الخواطر۔ص۴۳) — تحفہ میں ان کے سامنے انہوں نے صحیح مسلم بن الحجاج النیشاپوری پیش کی تھی۔

یہ تھا ہندوستان کا رنگ آٹھویں صدی میں اور یہ رنگ بتدریج پختہ ہی ہوتا چلا گیا۔ کیسے تعجب کی بات ہے۔ حافظ ابن حجر کے خلیفۂ اکبر علامہ سخاوی کے ایک نہیں متعدد شاگردوں نے ہندوستان کو وطن بنایا اور جیتے جی اس ملک میں حدیث کا درس دیتے رہے، جن میں مولانا رفیع الدین الایجی الشیرازی اور مولانا راجح بن داؤد احمد آبادی کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے، مولانا راجح کے متعلق تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ساحلی شہر احمد آباد کے محدث تھے، لیکن سخاوی کے دوسرے شاگرد مولانا رفیع الدین تو شمالی ہند کے مرکزی شہر آگرہ میں درس حدیث کا حلقہ قائم کیے ہوئے تھے، تذکرۂ علماء ہند میں لکھا ہے کہ

درمعقولات شاگرد مولانا جلال الدین دوانی و در حدیث شاگرد شیخ شمس الدین محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی الحافظ المصری ست۔ (ص ۶۵)

شیخ محدث نے اخبار میں لکھا ہے:

ؐ اس سے بحث نہیں کہ ان بزرگوں کا یہ خیال ترک قرأہ خلاف سنت ہے کہاں تک صحیح ہے۔ جب امام شافعی جیسے ائمہ اس کے قائل ہیں تو پھر ان بزرگوں پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے مجھے تو یہ دکھانا ہے کہ جن کو حدیث کے باب میں بدنام کیا گیا ہے ان کا

مشافہۃ حدیث را از وے (سخاوی) شنید و مدت مدید تلمذ نمود۔ ص ۲۵۲۔

سکندر لودی ان سے خاص عقیدت رکھتا تھا، آگرہ میں اسی بادشاہ کی خواہش سے آپ نے قیام فرمایا اور حدیث کا حلقہ قائم کیا۔

کیا تماشا ہے کسی صاحب کو ایک بے سند قصہ ہاتھ آگیا، شمس الدین ترک نامی کوئی صاحب تھے جو چار سو کتابیں حدیث کی لے کر ہندوستان کی طرف چلے لیکن ملتان ہی میں خبر ملی، کہ ہندوستان کا بادشاہ علاء الدین خلجی نماز پنجگانہ کا پابند نہیں ہے اس لیے رنجیدہ ہوئے اور اُلٹے پاؤں لوٹ گئے۔ گویا ان ترک صاحب کا لوٹ جانا علم حدیث سے ہندوستان کی محرومی کا سبب بن گیا ورنہ خدا جانے کیا واقعہ پیش آجاتا، مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوٹ کر کہاں تشریف لے گئے، خلجی کے زمانہ میں تو وسط ایشیا، خراسان و ایران تاتاری کفار کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کیا اسی فتنہ کی طرف لوٹ گئے، اور اگر کسی اسلامی حکومت ہی کی طرف اُلٹے پاؤں لوٹے تو ان کو دنیا کے کس خطہ میں ایسا بادشاہ مل گیا ہوگا جو اپنے وقت کا قطب تھا، یہاں بادشاہوں پر تنقید ہو رہی ہے، اور حال تو یہ ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے فرمانروا جو خلفاء کے نام سے موسوم ہیں ان کی زندگی دینی معیار پر کتنی درست تھی بلکہ ایک بڑی تعداد ان کی جیسی تھی وہ معمولی تاریخ پڑھنے والوں پر بھی مخفی نہیں، پھر کیا ان خلفاء کے زمانہ میں دمشق و بغداد کو چھوڑ کر محدثین بھاگ گئے تھے، ہو سکتا ہے کہ کسی صاحب کا کوئی خاص حال ہو، ورنہ واقعہ تو یہی ہے کہ سلاطین بلکہ خلفاء کے ان ناگفتہ بہ حالات کے باوجود علماء اپنے فرائض میں مشغول رہے، زیادہ سے زیادہ اگر کسی نے کچھ زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے تو یہی کیا ہے کہ فاسق امراء سے امداد یعنی اُنھوں نے منظور نہیں کی[1]۔

ایک طرف تو شمس الدین صاحب ترک کا یہ حال لوگ سُناتے ہیں لیکن دوسری طرف ہم

---

[1] ہماری علمی تاریخوں میں علماء سلف کے متعلق عموماً یہ الفاظ ملینگے کہ فلاں صاحب نہ سلطان سے جوائز لیتے تھے نہ اخوان سے۔ مثلاً امام ابو حنیفہؒ۔ بعض سلطان سے نہیں لیتے تھے لیکن اخوان سے لیتے تھے جیسے سفیان ثوری۔ اخوان سے مراد عام مسلمان جو ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ بعض سلطان اور اخوان دونوں سے لیتے تھے جیسے ابراہیم نخعی امام اوزاعی و کل دجتہ

دیکھتے ہیں کہ علاء الدین خلجی نہیں بلکہ ہندوستان کا وہ خونیں بادشاہ محمد تغلق جس کے مظالم کی داستان کی گونج اس وقت تک ختم نہیں ہوئی ہے اور آئندہ اپنے اپنے موقع پر کچھ حالات اس کے اس کتاب میں بھی ملینگے، بہرحال علاء الدین خلجی جیسا کچھ بھی تھا لیکن محمد تغلق کے مقابلہ میں تو شاید اس کو فرشتہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اسی تغلق کے عہد میں شمس الدین ترک جیسے مجہول الحال عالم نہیں، بلکہ علامہ جمال الدین مزی، حافظ شمس الدین ذہبی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے تلمیذ رشید مولانا عبد العزیز اردبیلی دلی تشریف لاتے ہیں اور محمد تغلق کے دربار میں باریاب ہوتے ہیں، نزہۃ الخواطر میں مولانا عبد العزیز کے تذکرہ میں یہ الفاظ درج ہیں۔

قرء بدمشق علی شیخ الاسلام تقی	دمشق میں شیخ الاسلام تقی الدین بن تیمیہ حرانی اور
الدین ابن تیمیۃ الحرانی وبرهان	بران الدین برکج وجمال الدین مزی وشمس الدین
الدین البرکج وجمال الدین المزی و	ذہبی وغیرہ علماء سے تعلیم پائی تھی، پھر ہندوستان
شمس الدین الذهبی وعلی غیرهٖ من	آئے اور محمد شاہ تغلق کے مقربین میں داخل ہوئے
العلماء ثم قدم الهند وتقرب الی محمد	بادشاہ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا اور بڑی
شاہ تغلق فاحسن الیہ واکرمہ ص۹۵	عزت کی۔

ابن بطوطہ کے حوالہ سے صاحب نزہۃ نے یہ قصہ بھی نقل کیا ہے کہ مولانا عبد العزیز اردبیلی نے محمد تغلق کو ایک دن ایک حدیث سنائی جو بادشاہ کو بے حد پسند آئی، بہت خوش ہوا، اتنا خوش کہ جوشِ مسرت میں

قبل قدمی الفقیہ وامران یوتی	اس عالم (عبد العزیز اردبیلی) کے بادشاہ نے قدم چوم
بصینیۃ ذهب فیها الفا تنکۃ	لیے اور حکم دیا کہ سونے کی سینی میں دو ہزار تنکے لائے
فصبها علیہ بیدهٖ وقال لك مع	جائیں خود بادشاہ نے اٹھ کر مولانا پر ان تنکوں کو نچھاور کیا
الصینیۃ (نزہت ص۶۵)	اور کہا کہ سینی کے ساتھ یہ تنکے آپ کے ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ شمس الدین ترک جیسے گمنام مولوی سے جب آج یہ نتیجہ نکالا جا رہا ہے کہ علم حدیث کا جو دریائے بے کراں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، وہ خلجی کی بے دینی کی وجہ سے

سے کردا پس ہوگئے، اور اسی لیے ہمارا ہندوستان علم حدیث سے بیگانہ ہوکر رہ گیا، لیکن ابن بطوطہ کی اس چشم دید شہادت سے میں کیا نتیجہ نکالوں۔ سخاوی، ملا علی قاری، ابن حجر مکی وغیرہ کے تلامذہ کے سوا ابن تیمیہ، ذہبی، مزی جیسے کبار محدثین کے براہِ راست شاگرد جس ملک میں آئے اور قیام کیا، ایسی زبردست قدر افزائیاں جن کی ہوئی ہوں کہ سر پر تنکے نچھاور کیے جاتے ہوں، وہاں علم حدیث کے چرچے کی کیا نوعیت ہوسکتی ہے۔ سو آپ کے سامنے محض سرسری طور پر صرف تذکرہ علماء ہند جیسی عام کتابوں سے جو فہرست محدثین کی اور اُن کے خدمات کی آپ کے سامنے نکال کر میں نے رکھ دی ہے کیا وہ ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لیے کافی نہیں جو اس زمانہ میں پھیلائی جا رہی ہیں کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اس سے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی قیمت پیدا کرنی مقصود ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ سعدی کا مطلب کچھ اس کے سوا ہے یعنی برطانوی عہد میں عمل بالحدیث کے نام سے مسئلہ چہارگانہ کا جو فتنہ اُٹھایا گیا اور ان ہی چار مسئلوں کی اشاعت کا نام حدیث کی اشاعت رکھا گیا ہے، در پردہ ہندوستان کی حدیث کی سرگرمیوں کو اسی فتنہ کی طرف منسوب کرنا مقصود ہے، اب[1] حدیث کی بحث کو اسی نقطہ پر ختم کر کے ہندی نصاب تعلیم کے متعلق جو دوسری مشہور تنقید ہے، ذرا اُس کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔

معقولات کا الزام

جو کچھ آج ہے، یہی کل بھی تھا جن دماغوں کی یہ منطق ہے اُن کی طرف سے ایک بڑا الزام ہندوستانی مولویوں پر یہ بھی ہے کہ ان کے نصاب کا بڑا حصہ ان لفظی گورکھ دھندوں اور ذہنی موشگافیوں بلکہ عقلی کج بحثیوں میں گم ہوگیا ہے۔ جن کی تعبیر عموماً "معقولات" کے لفظ سے کی جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ

---

[1] ہندوستان میں علم حدیث کی خدمت میں کیا کچھ کیا گیا ہے اس کی تفصیل پڑھنی ہو تو مولانا سید سلیمان ندوی کے مضامین کے اس سلسلہ کو پڑھنا چاہیے جو مدت ہوئی اسی عنوان سے معارف میں شائع ہوا ہے۔ اس وقت وہ مضمون میرے سامنے نہیں ہے، ورنہ شاید اور اضافہ کرتا، مولانا نے تو اس موضوع پر مستقل کتاب ہی گویا لکھ دی ہے۔

اسلامی حکومت نے جس وقت اس ملک میں دم توڑا اور اپنی آخری سانس پوری کی ہے اس وقت عربی تعلیم گاہوں میں جو نصاب مروج تھا اُس کا یہی حال تھا، متن، متن کے ساتھ شرح، شرح کے ساتھ حاشیہ، حاشیوں کے حاشیوں کا ایک بے پایاں سلسلہ تھا جو پڑھایا جاتا تھا، اور قدیم درسگاہوں میں شاید اب بھی پڑھایا جاتا ہے[1]۔

لیکن معقولات کی بھرمار کا یہ قصہ کب ہمیشہ سے ہے؟ میں اسی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، گویا یہ اس کی اجمالی تاریخ ہوگی۔ اس ملک کے تعلیمی نصاب کو جن انقلابات سے گزرنا پڑا ہے ظاہر ہے کہ ساتویں صدی یعنی باضابطہ وطن بنا کر مسلمان اس ملک میں جب آباد ہوئے تو اُس وقت عربی زبان عقلی علوم کی کتابوں سے معمور ہو چکی تھی، اس لیے ہمارا وہ حال تو ہو نہیں سکتا تھا، جو ان اسلامی ممالک کا ہے جہاں پہلی صدی ہی میں اسلام پہنچ چکا تھا، ان ممالک میں مدت تک مسلمانوں کے تعلیمی نصاب میں نہ منطق تھی نہ فلسفہ، نہ یہ چیزیں تھیں نہ رہ سکتی تھیں، لیکن جس زمانہ میں ہم اس ملک میں آئے ہیں، اس وقت اگرچہ سب کچھ ہو سکتا تھا لیکن جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے مسلمانوں نے اس ملک میں پہنچ کر تعلیم کا جو طریقہ اختیار کیا، اس میں بچوں کو حسب دستور پہلے قرآن ناظرہ پڑھا لیا جاتا تھا۔ قرآن پڑھانے والے معلموں کو عموماً مقری کہتے تھے، آج ان مقریوں کی جو بھی حالت ہو لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کے دنوں میں اس مسئلہ کو اتنی کس مپرسی میں نہیں ڈال دیا گیا تھا، جس میں وہ ہمارے عہد مرگ میں مبتلا ہے، حضرت نظام الاولیاء سلطان جی سے فوائد الفواد میں یہ بیان منقول ہے کہ بداؤں جو حضرت کا مولد پاک ہے، وہاں جس شخص سے اپنے بچپن میں قرآن پڑھا تھا وہ ایک غلام ہندو تھا حضرت والا ہی کی زبانی اس "غلام ہندو" مقری کی تعلیم کا حال سُنیے فرماتے ہیں۔

---

[1] خاکسار نے مولانا برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے "مبحث علم" کا رسالہ قطبیہ اس طریقہ سے پڑھا تھا، قطبیہ قطبیہ کی شرح میرزاہد کی۔ میرزاہد کا منہیہ پھر دونوں کے حواشی غلام یحییٰ بہاری کے، پھر مولانا عبدالعلی بحر العلوم کا حاشیہ، اور ان سب پر مولانا عبدالحق خیرآبادی کا حاشیہ، بیچ بیچ میں خود مولانا بھی اپنے ان حواشی کو پڑھاتے تھے جو اپنے اُستاذ کے حاشیہ پر انھوں نے لکھے تھے یعنی مولانا عبدالحق کے حاشیہ پر حاشیہ ۱۲

"غلام ہندو بود او را شادی مقری گفتندے، یک کرامت او آں بود کہ ہر کہ یک تختہ قرآن پیش او خواندے خدائے تعالیٰ او را تمام قرآن روزی کردے۔ (فوائد الفواد ص ۱۵۴)

ظاہر ہے کہ اس لفظ "ہندو" سے یہ مُراد نہیں ہو کہ وہ ہندو مذہب رکھتے تھے، بلکہ مطلب یہی ہے کہ نسلاً ہندو تھے، مسلمان ہونے کے بعد ان کا نام شادی رکھ دیا گیا تھا، یہ لاہور کے رہنے والے کسی صاحب کے غلام تھے، جن کا پیشہ بھی یہی بچوں کو قرآن پڑھانا تھا، اسی ملفوظ میں اس کا بھی ذکر ہو کہ ان کے آقا لہاور (لاہور) میں رہتے تھے، غالباً مسلمان ہونے کے بعد اپنے آقا ہی سے قرآن پڑھا، اُنھوں نے آزاد کر دیا، بداؤں میں آکر آقا ہی کے پیشہ کو اختیار کر لیا، بہر حال باوجود نسلاً ہندو ہونے کے سُنیے بچوں کو قرآن پڑھانے والے اس زمانہ میں کس قابلیت کے لوگ ہوتے تھے، سلطان جی ہی کی شہادت ہو کہ "قرآن بہفت قرأت یاد داشت" (فوائد ص۱۵۴) یعنی سبعہ کے قاری تھے، یہ تو علم کا حال تھا، قال کے ساتھ جو حال تھا اُس کا اندازہ تو حضرت ہی کے اسی بیان سے ہو سکتا ہو جس کی تعبیر آپ ہی نے کرامت سے فرمائی ہو۔ اس کے سوا ان کی بعض اور کرامتوں کا بھی اس کتاب میں ذکر ہے، اس سے مسلمانوں کی اس نسلی بے تعصبی کا بھی اندازہ ہوتا ہو جس کا تحفہ ہر جگہ مسلمان تقسیم کرتے پھرتے تھے، اللہ اللہ شودروں کو نیچ اور ناپاک سمجھنے والا، وید کی آیت اگر ان کے کان میں پڑ جائے تو پگھلے ہوئے رانگے سے اس کان اور کان والے کو ختم کر دینا جس ملک کا مذہبی عقیدہ اور دھرم تھا، کیسا عجب تماشا تھا کہ اسی ملک کے ایک غلام کو قرآن پڑھایا جاتا ہو، قرآن کی ساتوں قرأتوں کا ماہر بنایا جاتا ہو، اور درسِ قرآن کی مسند پر اُسے جگہ دی جاتی ہو، قریشی اور ہاشمی سادات شاگرد بن کر اس کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اس زمانہ میں معلوم ہوتا ہو کہ مقری یعنی بچوں کو قرآن پڑھانے کا کام وہی لوگ کرتے تھے جو باضابطہ فنِ قرأت سے واقف ہوتے تھے، علاء الدین خلجی کے عہد میں دلّی کے ایک مقری کا ذکر صاحب نزہۃ الخواطر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

الشیخ الفاضل علاء الدین المقری الدھلوی احد العلماء المبرزین فی القرأۃ والتجوید کان یدرس ویفید بدھلی۔ (ص ۸۵)	شیخ فاضل علاء الدین مقری دہلوی ان لوگوں میں سے ایک آدمی ہیں جو قراۃ وتجوید میں سر آمد روزگار تھے دلی میں لوگوں کو پڑھاتے اور فائدہ پہنچاتے تھے۔

جستہ جستہ کتابوں میں اس زمانہ کے مقریوں کا جو ذکر ملتا ہے، اگر جمع کیا جائے تو ایک مقالہ تیار ہو سکتا ہے۔

قرآن کے بعد ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق فارسی کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں میر خورد لکھتے ہیں

والدہ درمکتب فرستاد کلام اللہ بخواند وتمام کرد وکتابہا خواندن گرفت۔ (ص ۹۵)

ان کتابہا سے فارسی ہی کی کتابیں مراد ہیں، جو عموماً اس زمانہ میں مکاتب میں پڑھائی جاتی تھیں کہ وہی حکومت کی زبان بلکہ مسلمانوں کی زبان تھی، فارسی اور فارسی کتابوں کا مذاق مسلمانوں پر کتنا غالب تھا۔ اس تاریخی لطیفہ سے اس کا پتہ چل سکتا ہے، طبا طبائی صاحب سیر المتاخرین نے بنگالہ کے بازیگروں کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ دلی میں آکر جو تماشے ان بازیگروں نے دکھائے ان میں ایک دلچسپ تماشہ یہ تھا۔

کلیات سعدی شیرازی آوردند بکیسہ گذاشتہ چو برآوردند دیوان حافظ برآمد آں راچوں بکیسہ بردند دیوان سلمان ساوجی برآمد، بازچوں کیسہ نمودند دیوانِ انوری ہم چناں چند مرتبہ کتاب را درکیسہ کردند دہر مرتبہ کتاب دیگر برآوردند۔ (سیر المتاخرین ص ۲۴۵ ج ۱)

سوچا جا سکتا ہے جس دور میں بازیگر بھی بازیگری میں سعدی و حافظ سلمان ساوجی انوری کے دواوین وکلیات ہی دکھایا کرتے تھے۔ اس وقت عام پبلک پر فارسی کی ان کتابوں کا کیا اثر ہوگا انگریزی کی عمر بھی ہندوستان میں قریب قریب سو ڈیڑھ سو سال کے ہو چکی ہے لیکن کیا اس تماشے میں ہندوستانیوں کو کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے جس میں شکسپیر، ٹنی سن، ورڈسورتھ، ملٹن وغیرہ کی نظموں

کی کتابیں دکھائی جائیں۔

بہرحال تعلیم کی ایک منزل تو فارسی ہی کی کتابوں پر ختم ہو جاتی تھی، اگرچہ مجھے اس میں شک ہے کہ فارسی تک پڑھنے والے طلبہ بھی عربی میں کچھ شُد بُد پیدا کر لیتے تھے یا نہیں، چونکہ باوجود تلاش کے اب تک کوئی صریح شہادت اس سلسلہ میں مجھے نہیں ملی ہے، اس لیے دعویٰ تو نہیں کر سکتا، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانہ کے لکھے پڑھے آدمیوں کا جہاں کہیں تذکرہ ملتا ہے، بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی بہت عربی اتنی عربی جس سے قرآنی آیتوں کا مطلب عام مشہور حدیثوں کا ترجمہ سمجھ لیتے ہوں، سب ہی سیکھ لیتے تھے۔ اسی لیے اس زمانہ کے لوگ بے تحاشا اپنے مراسلات و خطوط کتابوں میں قرآنی آیات اور حدیثوں کو استعمال کرتے ہیں حالانکہ دانشمندوں (یعنی باضابطہ عربی زبان کے جاننے والوں) میں ان کا شمار نہیں ہوتا تھا۔

کچھ بھی ہو، تعلیم کی ایک منزل ایسی ضرور تھی، جس کے ختم کرنے والے دانشمند، یا مولوی یا ملا مولانا وغیرہ الفاظ کے مستحق نہیں قرار پاتے تھے، اس کے بعد دوسری منزل شروع ہوتی تھی، یعنی باضابطہ عربی زبان میں عربی اور اسلامی علوم کے سیکھنے کا مرحلہ پیش آتا تھا، جہاں تک تلاش و تتبع سے معلوم ہوتا ہے تعلیم کا یہ حصہ بھی دو منزلوں میں منقسم تھا، میر خورد نے سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں لکھا ہے۔

چوں در علم فقہ و اصول فقہ استعضارے حاصل کرد، شروع در علم فضل کرد" (ص ۱۰۱)

"شروع در علم فضل کرد" اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک درجہ تو فاضل کا تھا، جو علوم اور کتابیں اس درجہ میں پڑھائی جاتی تھیں ان ہی کا نام علم فضل تھا۔ اور اس سے پہلے گویا جو کچھ پڑھایا جاتا تھا فضل کے مقابلہ میں ہم اس کو "علم ضروری" کا درجہ قرار دے سکتے ہیں، یعنی اس کو ختم کیے بغیر کوئی مولوی (جسے اُس زمانہ میں دانشمند کہتے تھے) کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا۔ دانشمندی کے اس درجہ کے لیے کن کن کتابوں کا پڑھنا ضروری تھا، اس کا پتہ حضرت عثمان سراج صاحب بنگال کے اس واقعہ سے چلتا ہے، میں کسی جگہ ذکر کر چکا ہوں کہ بنگال سے بالکل نوعمری میں یہ حضرت

نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں آکر شریک ہوگئے تھے، اگرچہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم کا شوق رکھتے تھے، کیونکہ میر خورد ہی نے لکھا ہے جب بنگال سے یہ دلی پہنچے تو

"کاغذ و کتاب خود کہ جز آں دیگر رختے نداشت" (ص ۲۸۸)
سامان ''

یعنی کاغذ و کتاب کے سوا کوئی دوسرا سرمایہ اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، لیکن خانقاہ میں پہنچ کر وارد ین وصادرین کی خدمت میں کچھ اس طرح مشغول ہوئے کہ لکھنے پڑھنے کا موقعہ نہ مل سکا میر خورد لکھتے ہیں کہ جس وقت ہندوستان کے مختلف اقطار و جہات میں حضرت نے چاہا کہ اپنے نمائندوں کو روانہ کریں تو قدرتاً بنگال کے لیے ان ہی کی طرف خیال جا سکتا تھا کہ ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو لیکن اس کی قوم کی زبان کے ساتھ) قرآنی اصول کا اقتضا بھی یہی تھا لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ دانشمندی کے ضروری درجہ کی بھی تکمیل اُنھوں نے نہیں کی ہے، تو فرمایا۔

"اوّل درجہ دریں کار علم ست" (ص ۲۸۸)

حضرت مولانا فخرالدین بھی مجلس میں تشریف فرما تھے، اُنھوں نے سلطان جی سے عرض کیا۔

"در شش ماہ اورا دانشمند (مولوی) می کنم"

اور اسی کے بعد "دانشمندی" کے ضروری درجہ کی تعلیم حضرت عثمان سراج کی شروع ہوگئی، ان کو جو کتابیں پڑھائی گئی تھیں میر خورد بھی ان کتابوں میں حضرت عثمان سراج کے شریک تھے، انھوں نے ان کتابوں کی فہرست دی ہے، لکھا ہے

"الغرض خدمت مولانا سراج الدین در کبر سن تعلیم کرد، و برابر کاتب حروف (میر خورد) در آغاز تعلیم میزان و تصریف و قواعد و مقدمات او تحقیق کرد" (ص ۲۸۹)

جس کا مطلب یہی ہوا کہ شروع میں جیسا کہ اب بھی دستور ہے، صرف کی تعلیم سے ابتدا کی گئی، اس وقت یہی معلوم ہوتا ہے کہ میزان ہی سے عربی زبان شروع ہوتی تھی[۱]۔ آگے کتابوں کا نام

۱؎ ملا عبدالقادر بداؤنی اپنی تاریخ کے متعدد مقامات پر اس قسم کی عبارت لکھتے ہیں۔ مثلاً شیخ وجیہ الدین (بقیہ برص ۱۳۸)

نہیں ہے، بلکہ صرف میں جو جو چیزیں سکھائی جاتی ہیں، مثلاً تصریف (گردان)، قواعد تعلیل وغیرہ کے قاعدے، ان کو یاد کرائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میزان کی سادہ گردانوں کے بعد صرف کے متعلق جو دوسری چیزیں ہیں کسی خاص کتاب کا پڑھانا شاید ضروری نہ تھا، خصوصاً سراج عثمان کے ساتھ مولانا فخر الدین کا جو وعدہ شش ماہ کا تھا اس کے لیے بھی غالباً ان کو خود اس کے لیے کام کرنا پڑا، میر خورد نے لکھا ہے کہ

مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ بجہت او تصریفے مختصر و مفصل تصنیف کرد و اورا عثمانی نام نہاد" ص ۲۸۹

غالباً یہ وہی کتاب ہے جو عربی مدارس میں اس وقت تک زرادی کے نام سے مشہور ہے، خلاصہ یہ ہے کہ صرف کی تعلیم کے بعد دانشمندی یا مولویت کے درجہ ضروری ہیں ان کو جو کتابیں پڑھائی گئیں وہ یہ ہیں جیسا کہ میر خورد ہی رقمطراز ہیں کہ حضرت عثمان سراج نے مولانا فخر الدین سے صرف کی تعلیم پانے کے بعد

پیش مولانا رکن الدین اندپتی برابر کاتب حروف کافیہ و مفصل و قدوری و مجمع البحرین تحقیق کرد و بمرتبہ افادت رسید" (ص ۲۸۹)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف کے سوا نحو میں کافیہ و مفصل اور فقہ میں قدوری و مجمع البحرین یہ دونوں کتابیں دانشمندی کے ضروری درجہ کے لیے کافی سمجھی جاتی تھیں، کافیہ تو نصاب میں اب بھی شریک ہی ہے، البتہ مفصل اب ایک زمانہ سے خارج از درس ہو چکی ہے، اسی کی قائم مقامی شرح ملا جامی کرتی ہے، اسی طرح فقہ میں قدوری بھی نصاب میں اس وقت تک شریک ہے، البتہ مجمع البحرین نہیں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہ مجمع البحرین شرح وقایہ کی قائم مقام تھی، عام طور سے علماء اب مجمع البحرین سے واقف نہیں ہیں۔ یہ ابن الساعاتی کی مشہور کتاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۷) گردانی کے متعلق ہے کہ از صرف ہوائی تا قانون شفا و مفتاح یعنی صرف ہوائی سے لے کر ان بڑی بڑی کتابوں جیسے قانون و شفا ابن سینا مفتاح سکاکی پر ان کے حواشی ہیں جس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ علماء ہند میں فلسفہ و طب بلاغت کی یہ اعلیٰ کتابیں مروج تھیں، ان ہی کے ساتھ "صرف ہوائی" نامی کوئی کتاب بھی اس زمانہ میں ابتدائی کتاب صرف کی تھی۔

ہے۔ قدوری اور النسفی کے فقہی منظومہ دونوں کے مسائل کو پیش نظر رکھ کر ابن الساعاتی نے یہ متن مرتب کیا تھا، اور بڑا جامع مفید متن تھا، اس کی جگہ شرح وقایہ کب سے مروج ہوئی صحیح طور پر تو نہیں کہہ سکتا لیکن ملا عبدالقادر نے شیخ احمدی فیاضؒ انبیٹھوی کے ذکر میں لکھا ہے کہ

فقیر در صحبت شریف ایشاں رسیدہ زمانیکہ شرح وقایہ می گفتند۔ (ص ۸۴)

بہرحال میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں دانشمندی کے لیے علم کا جتنا حصہ ضروری خیال کیا جاتا تھا، اُس زمانہ کے حساب سے ہم اس کو شرح جامی اور شرح وقایہ تک کی تعلیم کے مساوی قرار دے سکتے ہیں، آگے میر خورد ہی نے لکھا ہے "بہ مرتبہ افادت رسید" یعنی عام مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے جتنے علم کی ضرورت اس زمانہ میں کافی سمجھی جاتی تھی چونکہ اتنا علم فراہم ہو چکا تھا اس لیے حضرت سلطان جی نے ان کو افادہ کے مقام پر سرفراز فرمایا۔

بہرحال اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے کہ فضل کے مقابلہ میں علم کا جو ضروری درجہ تھا اُس میں بس یہی صرف ونحو اور فقہ کی دو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، تو سمجھا جا سکتا ہے کہ اس درجہ تک، ہمارے نصاب میں اس زمانہ کی حد تک نہ منطق کی کوئی کتاب داخل تھی اور نہ فلسفہ کی۔

ہاں! اس کے بعد فضل کا درجہ شروع ہوتا تھا، کبھی کبھی ملا عبدالقادر وغیرہ اس درجہ کی کتابوں کو "کتب منتہیانہ" بھی کہتے ہیں۔

درجہ فضل کی کتابیں

بالکل یقینی طور پر تو نہیں بتایا جا سکتا لیکن جستہ جستہ جو چیزیں مجھے ملی ہیں، مثلاً مولنا

لہ ملا صاحب نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ تفسیر حدیث وسیر تاریخ خوب می دانست۔ حدیث ہی کا غالباً اثر تھا کہ در قرأت فاتحہ عقب امام نسبت بہ میاں می گفت" یعنی ان کی طرف منسوب ہے کہ قراۃ خلف الامام کے قائل تھے دیکھو ص ۲۲ ج ۳ بدایونی)

قاسم جو سلطان جی کے خواہرزادہ ہیں ان کی تفسیر لطائف التفسیر کے حوالہ سے میر خورد نے نقل کیا ہے کہ مولانا جمال الدین دہلوی سے انہوں نے

بشرف اجازت ہدایہ و بزدوی وکشاف و مشارق و مصابیح مشرف گردید ص۲۰۶

اور ایک اور سندھی عالم جلال الدین نامی ہی کے ذکر میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں :-

یدیم اشتغالہ بالہدایہ والبزدوی و المشارق والمصابیح والعوارف وغیرہا (ص۲۵ نزہۃ)	ہمیشہ ہدایہ ، بزدوی ، مشارق ، مصابیح ، عوارف وغیرہ کتابوں میں مشغول رہتے تھے۔ (یعنی درس و تدریس میں ان کتابوں کے لگے رہتے تھے)

جس کا یہی مطلب ہوا کہ فضل یا جن کا نام "کتب منتہیانہ" تھا، وہ صرف یہی تھیں، یعنی فقہ میں ہدایہ اگرچہ ممکن ہے کہ ہدایہ کے ساتھ بعض دوسرے متون علاوہ قدوری و مجمع البحرین کے پڑھائے جاتے ہوں، کیونکہ محمد تغلق کے عہد کے مشہور عالم مولانا معین الدین عمرانی جنہیں تغلق نے شیراز قاضی عضدالدین صاحب موافقف کو بلانے کے لیے بھیجا تھا، ان کے تصنیفات میں ہم کنزالدقائق کی شرح کا نام بھی پاتے ہیں، صاحب نزہۃ لکھتے ہیں

وللعمرانی مصنفات جلیلۃ منہا شروح وتعلیقات علی کنزالدقائق والحسامی ومفتاح العلوم ص۱۶۵	عمرانی کی چند بلند پایہ کتابیں ہیں جن میں کنزالدقائق حسامی و مفتاح العلوم کے شروح و تعلیقات بھی ہیں۔

ظاہر ہے کہ درس میں اگر یہ کتاب کنز نہ تھی تو شرح لکھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوسکتی تھی، اسی طرح اصول فقہ میں اصول بزدوی آخری کتاب معلوم ہوتی ہے، اور اس کا چرچا ہم ہندوستانی تعلیم کے ابتدائی عہد میں بہت زیادہ پاتے ہیں، لیکن جیسے فقہ میں ہدایہ کے ساتھ کچھ اور ذیلی متون کا پتہ چلتا ہے، گذشتہ بالا عبارت نیز اس کے سوا دوسرے قرائن و تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اصول فقہ میں الحسامی اور اس کی شرح تحقیق بھی اس زمانہ میں پڑھائی جاتی تھی، ملا عبدالقادر نے خود اپنے متعلق لکھا ہے کہ شیخ عبداللہ بداؤنی سے

زمانیکہ شرح صحائف در کلام وتحقیق در اصول فقہ بلا زمش می خواندم مے بدائونی

جس سے معلوم ہوا کہ اکبری عہد سے پہلے حسامی کی شرح غایۃ التحقیق یہاں زیر درس تھی، کنز کے متعلق بھی ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ میاں حاتم سنبھلی سے

از کتاب کنز فقہ حنفی نیز سبقے چند تیمناً وتبرکاً خواند (ص ج ۳)

جو دلیل ہے کہ کنز بھی نصاب میں شریک تھی۔

اسی طرح ساتویں اور آٹھویں صدی کے درمیان دلی کے عالم مولانا سعدالدین محمود بن محمد کا تذکرہ ہم کتابوں میں پاتے ہیں، جن کے تالیفات میں منار کی ایک شرح افاضۃ الانوار کا ذکر کیا جاتا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی نصاب میں اصول فقہ کا یہ مشہور متن یعنی المنار نسفی بھی داخل تھا، بعد کو اسی کی بہترین شرح ملا جیون ہندی نے نورالانوار کے نام سے لکھی جو مصر میں بھی چھپ چکی ہے۔

تفسیر میں عموماً کشاف کا ذکر کیا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کشاف سے ہندوستانی علماء کو خاص دلچسپی تھی، آٹھویں صدی کے ایک ہندی عالم مولانا مخلص بن عبداللہ نے کشف الکشاف کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا ذکر حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اور ملا علی قاری نے آثار حنفیہ میں کیا ہے، حضرت سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ باوجودیکہ تعلیمی وتدریسی کاروبار سے بے تعلق ہو چکے تھے، لیکن کشاف سے آپ کو بھی خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ فوائد الفواد میں مختلف مواقع پر اس کا ذکر ملتا ہے، امیر خورد نے بھی حضرت والا کے ایک مرید مولانا رکن الدین چیغر کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

درخطے مثال زمانہ، بیشترے کتب معتبر چنانکہ کشاف ومفصل وجزآں بہ جہت حضرت سلطان المشائخ کتابت کردہ رسانید (ص ۳۱۷)

الغرض تفسیر میں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس کو خاص اہمیت حاصل تھی، اگرچہ بعض علماء کے تذکروں میں مدارک کا بھی ذکر ملتا ہے۔ شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں مولانا محمد شیبانی

جن کا ذکر آگے بھی آرہا ہے ان کے حالات میں لکھا ہے۔

"تفسیر مدارک میان اہل مجلس بیان فرمودے" (ص ۱۸۶)

تفسیر ہی میں دو اور کتابوں ایجاز اور عمدہ کا بھی ذکر کتابوں میں ملتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ علماءِ ہند کا ان کے ساتھ بھی استغال رہتا تھا، فوائد الفواد میں سلطان المشائخ کے حوالے سے ایک قصہ کے سلسلہ میں یہ بیان منقول ہے۔

از مولانا صدر الدین کولی شنیدم کہ او گفت من وقتے بہ مولانا نجم الدین سامی بودیم او از من پرسید بچہ مشغول باشی گفتم بمطالعہ تفسیر پرسید کدام تفسیر گفتم کشاف و ایجاز و عمدہ (ص ۱۰۹)

یوں ہی تفسیر نیشاپوری[1] تفسیر عرائس البیان، تفسیر ناصری، تفسیر زاہدی یہ سب کتابیں بکثرت علماء کے زیر نظر تھیں اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جس عہد میں علماء اور مشائخ ہی نہیں بلکہ اس ملک کے وزراء و امرا بھی قرآن کی تفسیر لکھا کرتے تھے تو پھر اسی سے قیاس کرنا چاہیے کہ اس فن کے ساتھ دوسروں کی دلچسپیوں کا کیا حال ہوگا، تغلقیوں کے عہد کے مشہور امیر کبیر تاتار خاں[2] ہیں،

---

[1] تفسیر نیشاپوری کے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان ہی میں بہ مقام دولت آباد دکن لکھا گیا ہے خود اسی کتاب میں سورۃ النساء کے خاتمہ پر مصنف ہی نے لکھا ہے۔ علقہ الحسن بن محمد المشتہر بنظام النیشاپوری ببلاد الہند فی دار مملکتہا المدعو بدولت آباد فی اوائل صفر ۷۳۰ھ دیکھو تفسیر مذکور بر حاشیہ جریر طبری ج ۶ ص ۳۹ یعنی ۷۳۰ھ ہجری میں بہ مقام دولت آباد کتاب کا یہ حصہ لکھا گیا اور یہ وہی زمانہ ہے جب دلّی کو اُجاڑ کر محمد تغلق نے دولت آباد کو بسانا چاہا تھا۔ بہ ظاہر مصنف کتاب بھی دلّی سے دولت آباد تمام مہاجرین کے ساتھ آئے۔ آٹھویں صدی کے آغاز کی غالباً یہ پہلی تفسیر ہے جس میں معنوی خصوصیات کے ساتھ بڑی خصوصیت ترجمہ کی ہے۔ ایران میں جو نسخہ اس کا چھپا ہے اور بعض قلمی نسخے اس کے فقیر کی نظر سے جو گزرے ہیں سب میں بالالتزام بزبان فارسی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ درج ہے۔ کیا تعجب ہے کہ محمد تغلق ہی کے اشارہ سے یہ کتاب لکھی گئی ہو۔ ۱۲

[2] امیر تاتار خاں کی شخصیت بھی اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لکھا ہے کہ غیاث الدین تغلق کو اپنے فتوحات کے سلسلہ میں ایک پڑا ہوا بچہ ملا جس کے متعلق معلوم ہوا کہ آج ہی کا پیدا شدہ ہے، بے رحم ماں باپ اس بچہ کو چھوڑ کر کہیں غائب ہوگئے بادشاہ کو بچہ پر ترس آیا اور حکم دیا کہ شاہی نگرانی میں اس بچہ کو لے لیا جائے۔ یوں تاتار خاں کی پرورش شاہی محل میں ہونے لگی، خدا کی شان جب جوان ہوئے تو غیر معمولی دل و دماغ کا ثبوت پیش کرنے لگے۔ غیاث الدین نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی اور خاص لوگوں میں ان کو داخل کر لیا۔ (بقیہ بر ص ۱۴۳)

جن کے حکم سے فتاوی تتارخانیہ مُدوّن ہوا، ان کے حالات میں صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے۔

صنف کتابا فی التفسیر وسماہ التاتارخانی وھو اجمع ما فی الباب	انھوں نے ایک کتاب تفسیر میں لکھی جس کا نام تاتارخانی ہے اور اپنے موضوع میں وہ ایک جامع کتاب ہے۔

خیر فصل کے درجہ کی لازمی درسی کتاب کشاف ہی معلوم ہوتی ہے، حدیث میں مشارق الانوار کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ مصابیح بھی پڑھائی جاتی تھی۔

یہ تو دینیات کی کتابوں کی کیفیت تھی باقی نحو وصرف کے سوا علوم آلیہ میں معانی وبیان بدیع، عروض وقوافی کی کتابوں کے ساتھ ادب کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں عام طور پر ان کو علوم عربیت یا لغت ہی کہتے تھے۔ میر خورد نے سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے کہ

"بقدر دوازدہ سالہ کم وبیش لغت می خواندم"

سلطان المشائخ ہی کے ایک مرید مولانا شمس الدین دہلوی کے ذکر میں صاحب نزہۃ نے نقل کیا ہے

کان فاضلا بارعا فی العروض والقوافی والشعر والانشاء وکثیر من العلوم و الفنون (۵۶)	یہ فن عروض وقوافی شعر وانشا وغیرہ علوم میں ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے۔

افسوس ہے کہ ان علوم کی کتابیں جو اس عہد میں زیر درس تھیں تفصیل سے ان کا پتہ نہیں چلتا البتہ مولانا معین الدین عمرانی کے ذکر میں گذر چکا کہ انھوں نے سکاکی کی مفتاح العلوم پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲) محمد تغلق کا زمانہ آیا تو اس وقت بھی بڑے بڑے جلیل عہدوں کے فرائض انجام دیے فیروز کے عہد میں بھی وزارت کے منصب پر مدتوں قابض رہے، علم سے خاص دلچسپی تھی، تاتارخاں کے حکم سے مولانا عالم نے چار ضخیم جلدوں میں فقہ حنفی کا فتاوی مرتب کیا جس نے تمام اسلامی ممالک میں خاصی شہرت حاصل کی حلب کے ایک عالم ابراہیم بن محمد نے اس فتاوی کی ایک تلخیص بھی تیار کی ہے، کشف الظنون میں اس فتاوی کے متعلق کافی معلومات ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہندستان کے اکثر علماء کو بھی نہیں معلوم ہے کہ یہ فتاوی کہاں تیار ہوا، عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ تاتاریوں میں سے کسی سلمان بادشاہ کی مرتب کرائی ہوئی کوئی چیز ہے، کتابوں میں بکثرت اس کے حوالے آتے ہیں۔ اور ایک یہی کیا "فتاوی حمادیہ" حنفی فقہ کا کتنا مشہور فتاوی ہے لیکن کون جانتا ہے یہ کتاب بھی ہندستان ہی میں لکھی گئی

شرح لکھی تھی۔ بہ ظاہر قیاس یہی ہوتا ہے کہ یہی کتاب معانی بیان و بدیع میں پڑھائی جاتی ہوگی۔ تفتازانی کی دونوں کتابیں مختصر و مطول بعد کو ہندوستان پہنچیں اسی طرح ادب میں صرف مقامات حریری کا پتہ چلتا ہے سلطان المشائخ نے تو حریری زبانی یاد کی تھی، شیخ محدث دہلوی کے اس بیان سے کہ "مقامات حریری پیش شمس الملک کہ صدر ولایت بود تلمذ کرد و یاد گرفت" (ص ۵۵) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید پوری حریری حضرت نے یاد فرمائی تھی، لیکن میر خورد نے لکھا ہے کہ

شمس الملۃ والدین کہ در علم و فضل در عصر خود مستثنیٰ بود و بیشترے استادان شہر شاگرد او بود ایں علم بحث کرد و چہل مقالہ حریری یاد گرفت (سیر الاولیاء ص ۱۰۱)

جس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ صرف حریری ہی آپ نے شمس الملک سے نہیں پڑھی تھی بلکہ "ایں علم بحث کرد" یعنی علم ادب کی تعلیم ان سے حاصل کی تھی، دوسری بات یہ ہے کہ کامل حریری نہیں بلکہ اس کے چالیس مقامے یاد کیے تھے۔

بہر حال اس زمانہ کے ضروری اور نصاب فضل دونوں کے متعلق جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے، یہی معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر و حدیث، فقہ، اصول فقہ کی دینیات میں اور نحو و صرف، ادب، معانی، بیان وغیرہ کی عربیت کے سلسلہ میں تعلیم ہوتی تھی، ابھی اس سے بحث نہیں کہ یہ تعلیم کس حد تک کافی ہو سکتی تھی، اس کا ذکر تو انشاء اللہ آگے آئیگا۔ میں بالفعل یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معقولات کے جس الزام سے ہندی نظام تعلیم کو بدنام کیا جارہا ہے اس کا ان صدیوں میں یعنی ساتویں اور آٹھویں میں پتہ بھی نہیں چلتا، انتہا یہ ہے کہ منطق و فلسفہ، ریاضی وغیرہ تو دور کی چیزیں، علم کلام تک کی کتابوں کا ذکر عام علماء کے تدریسی نظام میں نہیں ملتا، البتہ آٹھویں صدی جب ختم ہو رہی تھی، اور دلّی میں لودیوں کے انہی پنجوں نے پھر ایک مرکزی حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، تو اس خاندان کے دوسرے بادشاہ سلطان سکندر لودی کے عہد میں جو ایک خاص تعلیمی انقلاب ہوا جس کا ذکر ابھی آرہا ہے، اس وقت کتابوں میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے، ملا عبد القادر بدایونی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ

قبل ازیں بغیر از شرح شمسیہ و شرح صحائف از منطق و کلام در ہند شائع نہ بود (بدایونی ج ا ص ۳۲۳)

سکندر لودی ۸۹۴ھ میں تخت نشین ہوا، یعنی نویں صدی گویا گذر رہی تھی، اس وقت تک یہاں کے نصاب میں منطق اور کلام دونوں علوم کا سرمایہ لے دے کر قطبی اور شرح صحائف پر ختم ہو جاتا تھا، قطبی کو تو خیر سب ہی جانتے ہیں، لیکن یہ شرح صحائف کوئی اتنی ہی معمولی کتاب ہے کہ طاش کبری زادہ نے اس کی شرح کا تو ذکر ہی نہیں کیا ہے، صحائف کے متن کے متعلق لکھا ہے۔

صحائف سمرقندی کی کتاب ہے، میں سمرقندی کے حالات سے مطلع نہ ہو سکا۔	الصحائف للسمرقندی لم اقف علی ترجمتہ (ص ۴۹)

بہر حال شرح شمسیہ یعنی قطبی کے ساتھ ممکن ہے کہ منطق کے بعض چھوٹے رسائل ایساغوجی وغیرہ بھی پڑھائے جاتے ہوں، بلکہ کلام کی حالت تو اس سے بھی زبوں تر معلوم ہوتی ہے، فتاویٰ تاتارخانیہ میں کلام اور کلامی مباحث کے متعلق یہ عجیب فقرے پائے جاتے ہیں، جنہے خصوصیت کے ساتھ دولت ترکیہ عثمانیہ کے ایک عالم نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ہندوستان کے علماء کا جو خیال اس زمانہ تک علم کے متعلق تھا چونکہ اس کا پتہ چلتا ہے میں بھی نقل کرتا ہوں، فتاوےٰ تاتارخانیہ میں علم کلام کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔

علم کلام کے مسائل سے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور نئی باتیں بدعات کو گویا برانگیختہ کرتا ہے۔ عقائد میں ان سے پراگندگی اور پریشانی پھیلتی ہے۔ یا کلامی مسائل سے دلچسپی لینے والے عموماً کم سمجھ ہوتے ہیں یا ان کا مقصود تلاش حق نہیں بلکہ صرف دوسروں کے مقابلہ میں غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے	انها تودی الی اثارۃ الفتن والبدع وتشویش العقائد او یکون الناظر فیہ قلیل الفهم او طالبا للغلبۃ لا للحق

(منقول از مفتاح السعادہ)

آج ممکن ہے کہ قدیم علمائے ہند کے اس فیصلہ کو تنگ نظری پر محمول کیا جائے لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ کلامی مباحث جس زمانہ میں بھی کسی ملک میں چھڑے ہیں، بجز فتنوں کی پیدائش اور نئے نئے خیالات نئی نئی موشگافیوں کے اس کا حاصل کسی زمانہ میں بھی کچھ نکلا ہے؟

"غیبی حقائق" یعنی جن سے عموماً علمِ کلام میں بحث کی جاتی ہے مثلاً عذاب قبر حشر و نشر الجنۃ والنار معادیات کے سلسلہ میں یا حق تعالیٰ کی صفات و ذات کے مسائل مبدء میں، ان کے متعلق صاف اور سیدھا راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کو سچا مان کر پھر جو کچھ پیغمبر ان غیر محسوس غیبات کے متعلق علم عطا کرتے چلے جائیں، بغیر کسی ترمیم و اضافہ کے آدمی مانتا چلا جائے جو صحابہ کا حال تھا، ورنہ دوسری راہ یہ ہے کہ سرے سے پیغمبر کے دعوئے نبوت ہی کا انکار کر دیا جائے لیکن پیغمبر کو سچا بھی مانتے چلے جانا، اور پھر وہ علم جو پیغمبر عطا کرتے ہوں اس میں شک اندازی بھی کرتے رہنا، سوچنے کی بات ہے کہ بلادت فہم، قلتِ عقل کے سوا اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے یا پھر وہی بات ہوتی ہے کہ بعض ناپاک و نجس اغراض کو سامنے رکھ کر لوگ ان مباحث میں اس لیے اُلجھتے ہیں تاکہ اپنی ذہانت کی داد لیں، انتشار کا زور دکھا کر عوام کو احمق بنائیں جس کا تماشا آج ہم ان رسائل و اخبارات میں دیکھ رہے ہیں، جنھوں نے اس قسم کے مذہبی مسائل کو اپنا تختۂ مشق بنا رکھا ہے، کبھی جنت کا مضحکہ اُڑایا جاتا ہے، کبھی ملائکہ کا، کبھی عرش کا، کبھی کرسی کا۔ کیا اپنے تفوق کے سوا ان لوگوں کے سامنے تلاشِ حق کا واقعی کوئی جذبہ ہوتا ہے؟

میں تو خیال کرتا ہوں کہ صرف یہی چند فقرے ان تازہ دم زندہ مسلمانوں کی صحتِ فہم، سلامت ذہن کا کافی ثبوت اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں، زندہ قوموں کی زندگی کی پہلی علامت یہی ہوتی ہے کہ قدرت ان کے فہم عمومی کو سلجھا دیتی ہے اس کا کتنا کھلا ثبوت ہمیں ان مسلمانوں کی اس رائے میں مل رہا ہے جو پردیس میں آباد ہونے اور اپنا دین پھیلانے کے لیے اس ملک میں حاکمانہ قوتوں کے ساتھ آئے تھے۔

خیر اس وقت میری بحث کا دائرہ صرف ایک تاریخی مسئلہ تک محدود ہے۔ کہنا یہی چاہتا تھا کہ معقولات کا جو الزام ہندوستان کے اسلامی نصاب پر لگایا جاتا ہے اس کی ابتدائی تاریخ تو یہ تھی کہ دو سو سال یعنی سکندر لودی کے زمانہ تک معقولات کا جتنا حصہ ہمارے نصاب میں پایا جاتا تھا، وہ صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

لیکن کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اتنے دنوں تک ہندوستان ان عقلی علوم سے ناآشنا رہا، میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مسئلہ تو نصاب کا ہے، نصاب کی حد تک تو میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف ضروری بلکہ فرض کے درجوں میں بھی معقولات کا عنصر صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا، یعنی لازمی طور پر اس نصاب کے ختم کرنے والوں کو معقولات کی جن کتابوں کا پڑھنا ضروری تھا وہ صرف یہ تھیں، لیکن جو لوگ کسی خاص فن یا شعبۂ زندگی میں ترقی کرنا چاہتے تھے ان کے لیے راستہ بند نہ تھا۔

اسی زمانہ میں جس وقت اس ملک میں مذکورہ بالا نصاب نافذ تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ عوام ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے سلاطین وملوک کے متعلق کتابوں میں لکھا جاتا ہے، مثلاً محمد تغلق ہی کے متعلق آپ کو عام تاریخوں میں یہ فقرہ ملیگا۔

در اکثر علوم خصوص تاریخ ومعقولات ونظم وانشاء وغیرہم مہارت تام داشت (سیر المتاخرین ج ۱ ص ۲۲۴)

ظاہر ہے کہ جن فنون میں محمد تغلق کی خصوصی مہارت کا ذکر کیا گیا ہے ان میں تاریخ تو ایسا علم اس زمانہ میں نہیں سمجھا جاتا تھا جس میں وسعتِ نظر پیدا کرنے کے لیے آدمی استاد کا محتاج ہو، میں جہاں تک خیال کرتا ہوں عہد حاضر سے پہلے کسی ملک اور قوم نے تاریخ کو تدریسی مضمون نہیں قرار دیا تھا، بلکہ ہمیشہ اس فن کا شمار ان فنون میں تھا، جن میں مہارت پیدا کرنے کے لیے اس فن کی کتابوں کا مطالعہ کافی سمجھا جاتا تھا، صرف مسلمانوں نے اپنے عہد میں تاریخ کے اس حصّہ کو جس کا تعلق نبوت وعہد نبوت وصحابہ سے تھا، چونکہ دین کی بنیاد اس پر قائم تھی اس لیے حدیث وسیر کے نام سے ایک خاص فن مرتب کر کے اُنھوں نے درس میں داخل کیا، جہاں تک میرا خیال ہے یورپ نے اپنے نشأۃ جدیدہ میں حدیث ہی کی جگہ اپنے اسلاف یونان ورومان کی تاریخوں کو تعلیمی نصاب میں داخل کیا۔ بتدریج پھر یہی ذوق اتنا غالب آیا

کہ یونانیوں اور رومیوں سے آگے بڑھ کر ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ جدید یونیورسٹیوں میں شریک نصاب ہوگئی، اور گو عام طور سے اس زمانہ میں مشہور کر دیا گیا ہے کہ تاریخی واقعات کی تنقیح و تنقید کے اصول کو ابتداءً یورپ نے مشہور اسلامی مورخ ابن خلدون سے سیکھا ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابن خلدون نے اصول حدیث ہی کی روشنی میں بجائے خاص روایات کے عام تاریخی حوادث و واقعات پر بھی ان کو منطبق کرنا چاہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یوں بھی اسلامی مورخین کے ایک بڑے طبقہ کی نگاہوں سے تحقیق و تنقید کے یہ قاعدے اوجھل نہیں تھے، البرنی نے ایک ہندوستانی مورخ مولانا کبیر الدین دہلوی کے متعلق جو الفاظ لکھے ہیں میں اُن کا ترجمہ نزہۃ الخواطر سے نقل کرتا ہوں، آپ ان پر غور کیجیے۔ البرنی مولانا کبیر الدین دہلوی کو ان الفاظ میں روشناس کرتے ہیں:۔

احد العلماء البارعین فی السیر و	ان علماء میں تھے جنہیں سیر و تاریخ میں خاص امتیاز حاصل
التاریخ لم یکن لہ نظیر فی عصرہ	تھا، انشاء اور فن ترسل و بلاغت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے
فی الانشاء والترسل و البلاغۃ	تھے، عربی و فارسی میں ان کے بلیغ انشاء کے نمونے موجود ہیں
لا نشاء بلیغ بالعربیۃ والفارسیۃ	ان کی متعدد کتابیں تاریخ میں بھی ہیں۔
ومصنفات عدیدۃ فی التاریخ۔	

ان مدحی الفاظ کے بعد سنیے وہی لکھتے ہیں:۔

صنف کتبا فی فتوح السلطان	انہوں نے علاء الدین خلجی کی فتوحات کے متعلق چند کتابیں
علاء الدین محمد شاہ الخلجی لکنہ	لکھیں لیکن اپنی ان کتابوں میں بادشاہ کی مدح سرائی
بالغ فیہا فی المدح والاطراء و	میں مبالغہ کیا اور عبارت میں زبردستی رنگ پیدا کرنے کی
التانق فی العبارۃ خلافا	کوشش کی جو مورخین کے طریقے کے خلاف ہے یعنی
لاداب المؤرخین من ایراد الخیر	مورخ کا فرض تو یہ ہے کہ بھلی بُری تعریف کی ہو یا
والشر والحسن والقبیح والمناقب	مذمت کی سب ہی طرح کی باتیں جو واقع ہوئی ہوں

المعائب۔ (نزہۃ ص ۱۱۵) انہیں بیان کرے۔

گو چند مختصر فقرے ہیں لیکن اسی سے آپ کو اسلامی مورخین کے اس نقطۂ نظر کا سُراغ مل سکتا ہے جو تاریخی واقعات کے اندراج میں ان کے پیشِ نظر رہتا تھا۔

بلکہ سچ یہ ہے کہ اس زمانہ کی تاریخوں کی وثاقت و اعتماد کا خواہ جتنا بھی جی چاہے ڈھنڈورا پیٹا جائے اور اس کے مقابلہ میں اسلامی مورخین کی تحمیق و تجہیل میں جتنا بھی مبالغہ کیا جائے، لیکن جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اُس کا کیسے انکار کیا جائے۔ آج بجائے تاریخ نگاری کے تاریخ سازی کا جو کام ہر قوم انجام دے رہی ہے، رائی سے پربت بنانے کی جو کوششیں مسلسل جاری ہیں، مقصد پہلے طے کر لیا جاتا ہے اور اسی کے لحاظ سے واقعات جمع کئے جاتے ہیں، ان میں پیشہ ورانہ چابکدستیوں سے رنگ بھرا جا رہا ہے اور ان ہی بنیادوں پر ایسی گمنام کس مپرس قومیں جو چند صدیوں پہلے کسی شمار و قطار میں بھی نہ تھیں، انتہائی دیدہ دلیریوں کے ساتھ ان کی تہذیب و تمدن کا افسانہ اونچے سروں میں گایا جا رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائنس و میکانکی ترقیوں کا موجودہ عہد بھی ان کے سامنے بے حقیقت تھا، ایک طرف تو یہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف تحقیق و تنقید کے ان مدعیوں کو دیکھا جا رہا ہے کہ گزشتہ واقعات ہی نہیں، بلکہ جن حوادث سے دنیا اس وقت گزر رہی ہے، اُن ہی کی تعبیر ہر قوم کے مورخین ایسے الفاظ میں پیش کر رہے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کے بیان کو صحیح مانا جائے تو دوسرے کے بیان کو قطعی جھوٹ قرار دینے پر انسانی منطق مجبور ہو جاتی ہے، ابھی ابھی چند سال پیشتر جنگ عظیم کے حادثہ ہائلہ سے یورپ نکلا ہے جنگ کے مختلف فریقوں نے دن کی روشنی کے اس واقعہ کو جن شکلوں میں پیش کیا ہے کیا ان سے حقیقت تک پہنچنا آسان ہے؟ لیکن آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ اسلامی مورخین کے ابو الآباء علامہ ابن جریر طبری المولود ۲۲۴ھ نے آج سے تقریباً ہزار سال پیشتر اپنی مشہور تاریخ کے دیباچہ میں حسب ذیل رائے تاریخی واقعات کے اندراج میں قلم بند کی ہے۔

وليعلم الناظر في كتابنا هذا ان اعتمادي في كل ما احضرت ذكره فيه مما شرطت اني راسمه فيه انما هو على ما رويت من الاخبار اللتي انا ذاكرها والآثار اللتي انا مسندها الى رواتها دون ما ادرك بحجج العقول واستنبط بفكر النفوس الا اليسير القليل منه .

میری کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کتاب میں جن واقعات کے ذکر کا میں نے ارادہ کیا ہے اور جن کی نگارش کا میں نے بیڑا اٹھایا ہے، ان کے متعلق میرا بھروسہ صرف ان خبروں پر ہوگا جن کا میں اس کتاب میں ذکر کرونگا اور جن کی سند ان واقعات کے بیان کرنے والوں تک میں پہنچاؤنگا لیکن عقلی استدلال اور ذہنی قیاس سے جو نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں میں ان کا ذکر نہیں کرونگا، مگر بہت تھوڑی نادر چیزیں۔

اس کے بعد علامہ اپنے اس طرز عمل اور التزام کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اذ اكان العلم بما كان من اخبار الماضيين وما هو كائن من انباء الحادثين غير واصل الى من لم يشاهدهم ولم يدرك زمانهم الا باخبار المخبرين ونقل الناقلين دون الاستخراج بالعقول والاستنباط بفكر النفوس (ص ۵ ج ۱ ۔ الطبری)

کیونکہ گذرے ہوئے لوگوں کے واقعات اور جو حوادث گذر چکے ہیں ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا ہے ان تک ان کی خبریں براہ راست نہیں پہنچی ہیں، اور نہ انہوں نے ان کا زمانہ پایا ہے ان حوادث کے متعلق نقل کرنے والوں نے جو نقل کیا ہو ان کے علم کی یہی صورت ہے نہ کہ عقلی قیاس آرایوں اور فکری جولانیوں کی راہ سے ان کا علم حاصل کیا جائے۔

ذمہ داری کا یہی صحیح احساس اسلامی مورخین میں اس وقت تک بیدار رہتا تھا جب وہ واقعات کو اپنی کتابوں میں درج کرتے تھے، اسی لیے ہر قسم کی جنبہ داریوں سے الگ ہو کر ایک مورخ کا جو فرض ہو سکتا ہے وہ ادا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ مولانا کبیر الدین دہلوی کی تاریخ ناقابل اعتبار ٹھہرائی گئی، ان پر الزام یہی لگایا گیا ہے کہ خیر کے ساتھ شر کا، اچھی باتوں کے ساتھ بری باتوں کا،

حُسن کے ساتھ قبح کا، مناقب و محامد کے ساتھ معائب و مثالب کا ذکر انھوں نے نہیں کیا، جو مورخ کے فرض منصبی کے قطعاً خلاف ہی لیکن کیا کیجیے کہ تنقید و تحقیق، تبصّر و تفتیش کے ان بلند بانگ دعووں کے ساتھ جن کے چرچوں سے کان بہرے ہوگئے ہیں عملاً اس زمانہ کا محقق مورخ جو کچھ بھی کر رہا ہی وہ یہی کر رہا ہی۔

میں تو خیال کرتا ہوں کہ دنیا جب کبھی فیصلہ کے لیے آمادہ ہوگی تو اُس کے سامنے کچھ تو میں تو ایسی نظر آئینگی جن کے حال کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہی یعنی ان کی کوئی قومی تاریخ ہی نہیں ہی، زیادہ تر اقوام عالم کا یہی حال ہی اور عصر جدید کی روشنی میں جو قومیں جو اپنی تاریخیں بنا رہی ہیں، چونکہ یہ تاریخیں لکھی نہیں گئی ہیں بلکہ بنائی گئی ہیں اس لیے ان پر اعتماد کی کوئی امکانی صورت آنے والوں کے سامنے باقی نہ رہیگی، لے دے کر تاریخ کا جو حصّہ بھی استناد کا درجہ حاصل کریگا، وہ اسلامی مورخین کی یہی غیر جانبدارانہ تاریخیں ان شاء اللہ ثابت ہونگی، مگر دنیا کبھی انصاف کے لیے آمادہ ہوگی، اس کی توقع مشکل ہی۔

یہ تو ایک ذیلی بات تھی جس کا ذکر کر دیا گیا، میں یہ کہہ رہا تھا کہ محمد تغلق کے متعلق جب کہا جاتا ہی کہ معقولات میں مہارت تامہ رکھتا تھا تو اس مہارت کا کیا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ اس نے عام مروجہ نصاب کے مطابق صرف قطبی اور صحائف تک علوم عقلیہ کی تعلیم ختم کردی تھی، اور باوجود اس کے بھی اس کا شمار فنون عقلیہ کے ماہرین میں تھا یا یہ خیال درست ہوسکتا ہے کہ درسًا تو اس کی تعلیم عقلی علوم کی ان ہی کتابوں تک محدود تھی، آئندہ اُس نے صرف مطالعہ کے زور سے اپنی قابلیت بڑھائی تھی۔

مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ قطبی صرف منطق کی ایک کتاب ہی، فلسفہ کے کسی مسئلہ سے اس کتاب کو دور کا بھی تعلق نہیں، رہی صحائف وہ تو عقائد کی ایک مختصر کتاب تھی، بھلا اس کے پڑھنے والے کی نظر الٰہیات، طبیعات و ریاضیات وغیرہ کے فلسفیانہ ابواب تک کیسے پہنچ سکتی ہی، اور نہ ان کتابوں کو پڑھ کر بذاتِ خود کوئی شفا اشارات، مجسطی وغیرہ کا مطالعہ کرسکتا ہی اور ہم محمد تغلق

کو دیکھتے ہیں کہ وہ زیادہ شائق انہی کتابوں کا تھا، البدر الطالع شوکانی کے حوالے سے صاحب نزہت نے محمد تغلق کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ

اهدی الیه رجل اعجمی الشفاء لابن سینا بخط یاقوت فی مجلد واحد فاجازه بمال عظیم یقال انه قدره مائتا الف مثقال او اکثر (ص ۱۳۵)	ایک ایرانی شخص نے محمد تغلق کے دربار میں ابن سینا کی شفاء کا ایک نسخہ پیش کیا جو یاقوت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، اور ایک جلد میں تھا، تغلق اس سے اتنا خوش ہوا، کہ پیش کرنے والے کو اس نے بڑا انعام دیا جس کا اندازہ کیا گیا تو دو لاکھ مثقال یا اس سے زیادہ ہوگا۔

اس کی تصریح شوکانی نے نہیں کی ہے کہ مثقال سے کیا مراد ہے چاندی کی یہ مقدار تھی یا سونے کی، صبح الاعشیٰ میں بھی قلقشندی نے ابن الحکیم الطیاری کے حوالہ سے تغلق ہی کا یہ قصہ نقل کیا ہے

ان شخصا قدم له کتبا فحثی له حثیة من جوهر کان بین یدیه قیمتها عشرون الفا مثقال من الذهب (ص ۹۵ - ج ۵)	ایک آدمی نے محمد تغلق کے سامنے چند کتابیں پیش کیں، تو بادشاہ نے جواہرات جو اس کے سامنے رکھے ہوئے تھے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس کے حوالہ کیے، ان جواہرات کی قیمت سونے کے سکہ کے لحاظ سے بیس ہزار مثقال تھی۔

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں بھی عقلیات ہی کی تھیں، بہرحال محمد تغلق کے اس اعلیٰ فلسفیانہ مذاق کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ کسی استاد سے پڑھے بغیر اتنی بصیرت ان علوم میں اس نے پیدا کرلی تھی، آخر فلسفہ تاریخ نہیں ہے جس میں مزاولت اور کثرت مطالعہ سے آدمی چاہے تو تبحر پیدا کرلے سکتا ہے۔ پھر جب تاریخ ہمیں بتلاتی بھی ہے کہ مولانا عضد الدین جن کے متعلق نزہۃ الخواطر میں ہے۔

احد العلماء المبرزین فی المنطق والحکمة	منطق وفلسفہ کے سربرآوردہ علماء میں سے ایک ہیں۔

اور یہی مولانا عضد الدین تغلق کے استاد تھے جیسا کہ اسی کتاب میں ہے کہ

قرأ علیه شاه محمد تغلق	محمد تغلق شاہ نے انہی مولانا عضد الدین سے تعلیم پائی تھی

ان کی تعلیم سے محمد تغلق کس حد تک متاثر تھا اس کا اندازہ آپ کو اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو اسی کتاب میں ہے۔

اعطاہ اربعہ مائۃ الاف تنکہ — چار لاکھ تنکے اس نے مولانا کو اس دن عطا کئے جس دن وہ

یوم ولی الملک — ملک کا والی ہوا یعنی تخت نشین ہوا۔

میرا خیال ہے کہ تغلق نے ان ہی مولانا عضد الدین سے فلسفہ اور معقولات کی کتابیں پڑھی تھیں اب ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں بادشاہ کا رجحان ان علوم کی طرف ہو ناممکن ہے کہ ملک کے عام باشندوں پر اس کا اثر نہ پڑے، بھلا جس زمانہ میں منطق و فلسفہ کے اساتذہ کو چار چار لاکھ روپیہ وقت واحد میں بطور انعام بخشا جاتا ہو فلسفہ کی ایک ایک کتاب کے معاوضہ میں پیش کرنے والے کو دو دو لاکھ مثقال مل رہے ہوں، اس زمانہ میں لوگوں کا جتنا رجحان بھی ان علوم کی طرف زیادہ ہو گیا ہو محل تعجب نہیں ہو سکتا خصوصاً ایسے زمانہ میں جب "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے عام کلیہ کا ممالک پر زیادہ اثر ہو۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ محمد تغلق کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے علماء جو منطق و فلسفہ، ریاضی، ہیئت ہندسہ میں کافی مہارت رکھتے ہیں، دلی میں ان کی معقول تعداد پائی جاتی ہے، وہی مولانا معین الدین عمرانی جو شیراز قاضی عضد کو لانے کے لیے بھیجے گئے تھے علاوہ علوم دینیہ کے لکھا ہے کہ

کان ذا قوۃ فی النظر و ممارسۃ — ان کی نظری قوت بڑی دقیق تھی، منطق اور کلام میں

جیدۃ فی المنطق والکلام (ص ۱۶۵) — زبردست مہارت رکھتے تھے۔

محمد تغلق ہی کے درباریوں میں ایک مولانا علم الدین بھی تھے، البرنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان کی خصوصیت ہی یہ بیان کی ہے کہ معقولات کے تمام فنون میں یگانہ روزگار تھے، صاحب نزہۃ نے بھی لکھا ہے۔

احد العلماء المبرزین فی العلوم — علوم حکمیہ (فلسفیانہ علوم) میں ان کا شمار سربرآوردہ لوگوں

الحکمیۃ... کان یدرس و یفید بدھلی — میں تھا یہ دلی میں درس دیتے تھے اور لوگوں کو علمی فوائد پہنچاتے تھے

آگے یہ بھی لکھا ہے کہ

جعلہ محمد شاہ تغلق ندیما لہ و — محمد شاہ تغلق نے ان کو اپنا مصاحب بنالیا تھا، بادشاہ کے مقربین

کان یقربہ ویذاکرہ فی العلوم (ص ۱۴) — میں تھے محمد شاہ ان سے علمی مسائل میں بحث و مباحثہ کرتا تھا۔

اور کچھ ایک محمد تغلق کی خصوصیت نہیں ہے تغلق سے پہلے اور تغلق کے بعد جن جن خاندانوں کے سلاطین دلّی میں یا دوسری صوبہ داری حکومتوں میں تھے تقریباً ہر ایک کے زمانہ میں ان علوم کے ماہرین کا ایک گروہ پایا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ان کو اسی لیے وظائف جاگیر وغیرہ دے کر بٹھا دیتی تھی کہ ملک میں نصابی علوم کی تعلیم کے بعد کسی خاص فن کا اگر کسی کو ذوق ہو تو اپنی اس علمی پیاس کو ان لوگوں سے بجھا سکتا ہے۔ فیروز تغلق کے زمانہ میں مولانا عبدالعزیز دہلوی ایک مشہور عالم تھے جن کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے "احد العلماء المبرزین فی العلوم الحکمیہ" یعنی فلسفیانہ علوم میں اپنے وقت کے سربرآوردہ لوگوں میں تھے، صاحب نزہتہ نے لکھا ہے کہ ان ہی مولانا عبدالعزیز نے سنسکرت کی ایک کتاب جس کا نام "باراہی سنگھتا لاتپل بہت بن باراہ مہر" بتایا ہے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ہے، لکھا ہے کہ

ترجم منہا احکام الکسوف والخسوف — اسی کتاب سے مولانا عبدالعزیز نے چندر گرہن، سورج گرہن

وکائنات الجو وعلامات المطر و — اور فضائی حوادث (ابر و باد وغیرہ) بارش کی علامتیں، علم

علم القیافتہ والفال وغیرہا (ص ۹) — قیافہ اور فال وغیرہ کا ترجمہ کیا۔

نزہتہ الخواطر سے ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس فارسی کتاب کا ایک نسخہ عالیجناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی مدظلہ العالی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

فیروز شاہ ہی کے عہد میں مولانا جلال الدین کرمانی ایک عالم تھے لکھا ہے کہ

کان عالما بارعاً فی المعقول والمنقول (ص ۳۳) — عقلی اور نقلی علوم میں ماہر تھے۔

میں صرف چند نظائر پیش کرنا چاہتا ہوں، استیعاب مقصود نہیں ہے، بتانا صرف یہ ہے کہ جس زمانہ میں ہندوستان کا عام تعلیمی نصاب معقولات میں صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود

تھا، ان ہی دنوں میں عقلی علوم کے ان ماہرین کی ایک بڑی جماعت اس ملک میں درس و تدریس میں مصروف تھی، جن لوگوں کو ان علوم کا شوق ہوتا تھا، وہ بطور اختیاری مضامین کے عام نصاب کی تکمیل کے بعد ان علوم کو پڑھا کرتے تھے، لوگوں کو معلوم نہیں ہے ورنہ جب کتابوں میں یہ لکھا ہوا تھا کہ منطق و فلسفہ کے مشہور امام علامہ قطب الدین الرازی التحتانی کے براہ راست شاگرد بھی ہندوستان پہنچ کر فنونِ عقلیہ کی تعلیم دے رہے تھے، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ان علوم کے متعلق کون کون سی کتابیں نہ پڑھائی جاتی ہونگی، میرا مطلب یہ ہے کہ فیروز تغلق نے علاء الدین خلجی کے بنائے ہوئے تالاب کے بند پر جو ایک خوبصورت عمارت تیار کی تھی جس کے متعلق برنی کے حوالہ سے صاحب نزہۃ نے نقل کیا ہے۔

کان بنائہا طویل العماد متسع	اس کی عمارت لمبے لمبے اونچے ستونوں پر قائم تھی
الساحۃ کثیر القباب والصحون	اور ایک وسیع میدان میں تھی، عمارت پر بکثرت قبے بنے
لم یعمر مثلہا قبلہا ولا بعدہا	ہوئے تھے، نیز بکثرت درمیان درمیان میں صحن تھے، ایسی
(نزہۃ ص ۲۲)	عمارت مدرسہ کی نہ اس سے پہلے بنی نہ بعد۔

البرنی نے تو یہاں تک اس عمارت کے متعلق مبالغہ کیا ہے کہ

انہا من عجائب الدنیا فی ضخامتہا	اپنی جسامت اور عظمت نیز وسیع گذرگاہوں پاکیزہ آب و
وسعۃ ممرہا وطیب مائہا	ہوا کے لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہونا
وھوائہا ما ابتغی من دخلہا	چاہیے جو اس میں داخل ہو جاتا ہے پھر اس سے نکلنا
عنہا حولا (ص ۲۲)	نہیں چاہتا۔

لہ صاحب مفتاح السعادہ نے لکھا ہے کہ قطب الدین رازی مصنف قطبی اور قطب الدین شیرازی شارح حکمۃ الاشراق و مصنف درۃ التاج وغیرہ یہ دونوں ہم نام وہم عصر عالم ایک ہی زمانہ میں شیراز کے ایک مدرسہ میں اُستاذ مقرر ہوئے، بالائی منزل پر شیرازی پڑھاتے تھے اس سبب ان کو قطب الدین فوقانی اور نچلی منزل میں قطب الدین رازی درس دیتے تھے اس لیے ان کو قطب الدین تحتانی کہتے تھے۔

عمارت جب تیار ہوگئی تو اس دانش پژوہ معارف پرور بادشاہ نے اس کا مصرف یہ لیا کہ علامہ قطب الدین رازی کے تلمیذ رشید مولانا جلال الدین دوانی جب ہندوستان تشریف لائے تو آپ کو اسی عمارت میں ٹھہرایا گیا، اور مولانا نے اس عمارت کو اپنا مدرسہ بنا لیا، نزہۃ الخواطر میں ان ہی مولانا جلال الدین کے متعلق یہ الفاظ ہیں۔

احد العلماء المشهورين بالدرس	درس وافادہ میں جو علماء مشہور رہیں ان میں یہ ایک سرآوردہ
والافادة قرأ العلم على المشيخ	عالم آپ کی ذات بھی ہو آپ نے علم شمسیہ کے شارح
قطب الدين الرازي شارح الشمسيه	شیخ قطب الدین رازی سے حاصل کیا اور ہندوستان
وقدم الهند (ص۲۲)	تشریف لائے۔

آگے اسی بالائے بند کی عمارت میں مولانا کے درس وتدریس کا قصہ بیان کیا گیا ہو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاص فن (معقولات) کے سوا مولانا اس مدرسہ میں حدیث وتفسیر کا بھی درس دیتے تھے لکھا ہو۔

كان يدرس الفقه والحديث والتفسير	وہ فقہ حدیث وتفسیر اور دوسرے نفع بخش علوم
وغيرها من العلوم النافعة۔	کی وہاں تعلیم دیتے تھے۔

صاحب نزہۃ نے اس کے بعد اس کی بھی تصریح کی ہو کہ

وانتفع به ناس كثيرو اخذوا عنه	ان سے لوگوں کو بہت نفع پہنچا اور بکثرت لوگوں نے ان سے
(ص ۲۲)	علم حاصل کیا۔

اور صرف قطب الدین رازی ہی نہیں بلکہ اہل تاریخ خصوصاً دکن کی تاریخ کے جاننے والوں پر مخفی نہیں کہ بہمنی حکومت کا مشہور علم دوست اور خود عالم متبحر حکیم بادشاہ سلطان فیروز شاہ بہمنی نے مولانا فضل اللہ انجو سے تعلیم حاصل کی تھی، مولانا غلام علی آزاد نے مولانا انجو کے متعلق لکھا ہے کہ۔

فضل اللہ انجو شاگرد رشید علامہ تفتازانی (روضۃ الاولیاء ص۲۳)	یعنی فضل اللہ انجو علامہ تفتازانی کے شاگرد رشید ہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ علامہ تفتازانی کے معاصر وہم چشم علامہ سید شریف جرجانی رحمۃ اللہ علیہ کے براہِ راست پوتے میر مرتضیٰ شریفی نے بھی ہندوستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا، ملّا عبدالقادر نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

نبیرہ میر سید شریف جرجانی ست قدس سرہ در علوم ریاضی واقسام حکمت ومنطق وکلام فائق برجمیع علمائے ایام بود۔

یہ (میر مرتضیٰ) میر سید شریف جرجانی کے پوتے ہیں، ریاضی اور فلسفہ کے تمام شعبے منطق اور کلام میں اپنے عہد کے تمام علماء پران کو برتری حاصل تھی۔

اور یہ چیزیں تو خیر ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں، بڑا امتیاز ان کا یہ تھا کہ

در مکہ معظمہ رفتہ علم حدیث در ملازمت شیخ ابن حجر اخذ کردہ اجازت تدریس یافت (ص ۳۲۰ ج ۳)

مکہ معظمہ جاکر علم حدیث انہوں نے شیخ ابن حجر سے حاصل کیا اور اس کے پڑھانے کی اجازت حاصل کی۔

یعنی وہی علم جس کے متعلق باور کرایا گیا ہے کہ اس میں ہندوستان کی بضاعت مزجاۃ ہی حرم کے مسندالوقت سے اس کی تعلیم اور سند حاصل کرکے میر صاحب نے ہندوستان میں اپنے فیض کا دریا جاری کیا تھا، بداؤنی نے لکھا ہے کہ مکہ معظمہ سے میر صاحب

بدکن آمدہ از دکن بہ آگرہ آمدہ بر اکثرے از علماء سابق ولاحق تقدیم یافت وبدرس علوم وحکم اشتغال داشت تا درسنہ اربع وسبعین وتسعمائۃ دہشتم بروضہ رضواں خرامید (ص ۳۲۱)

پہلے دکن تشریف لائے اور دکن سے آگرہ (اکبر بادشاہ کے زمانہ میں) آئے، یہاں پہنچ کر ان کو اگلے پچھلے علماء سب پر تقدم حاصل ہوا، میر صاحب کا شغل علوم اور حکمت کا پڑھنا پڑھانا تھا ۱۲

اب جو قطب رازی یا تفتازانی و جرجانی کے علمی بلند پائگی سے ناواقف ہیں، ان کو اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن اہل علم کا جو گروہ ان بزرگوں کے کمالات وفضائل سے واقف ہے، خصوصاً عقلی علوم میں جو مقام ان لوگوں کا تھا، وہ کیا ایک لمحہ کے لیے یہ مان سکتا ہے کہ ہندوستان عقلی علوم و فنون جن کا اس زمانہ میں رواج تھا، ان سے بیگانہ رہ سکتا تھا، افسوس ہے کہ کوئی مفصل فہرست مجھے ان کتابوں کی نہ مل سکی جو ہندوستان میں منطق وفلسفہ کلام، ریاضی، ہندسہ وہیئت وغیرہ کی پڑھائی

جاتی تھیں، یوں بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب ان بزرگوں کے یعنی رازی وتفتازانی کے براہ راست تلامذہ اور میر سید شریف کے سگے پوتے اس ملک میں اپنے حلقہائے درس قائم کیے ہوئے تھے، تو متداول کتابوں میں کونسی کتاب ہوگی جو نہ پڑھائی جاتی ہوگی۔ آج بھی جن کتابوں پر ہمارے یہاں کے علوم عقلیہ کی انتہا ہوتی ہے، مثلاً شرح مطالع منطق میں، محاکمات فلسفہ میں، شرح مواقف، شرح مقاصد کلام میں، جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ساری کتابیں ان ہی بزرگوں کے رشحات قلم کے نتائج ہیں۔

اور کچھ یہ حال صرف منطق وفلسفہ ہی کا نہیں تھا ہر عہد میں ابتدا سے آپ کو ہندوستان کے عام مرکزی شہروں میں ایسے جلیل القدر اطبا نظر آئینگے جو علاج ومعالجہ کے ساتھ ساتھ طبی کتابوں کے درس وتدریس کا کام بھی انجام دیتے تھے، نزہتہ الخواطر میں علاء الدین خلجی کے زمانہ کے مشہور طبیب مولانا صدر الدین الحکیم کے ترجمہ میں لکھا ہے۔

له ید بیضا فی علوم الاولیۃ العالیۃ	ان کو ان علوم میں جن سے دوسرے فنوں کے سمجھنے میں
کان یتطبب ویدرس فی دار الملک	مدد ملتی ہے یعنی علوم آلیہ اور بلند پایہ علوم (علوم عالیہ) میں
دھلی۔ (ص ۶۱ نزہتہ)	زبردست دستگاہ حاصل تھی وہ طبابت بھی کرتے تھے اور
	پایہ تخت دہلی میں درس بھی دیتے تھے۔

خلجی ہی کے عہد میں حکیم بدر الدین بھی تھے، جن کی تشخیص وغیرہ کے قصے عجیب ہیں، نزہتہ ہی میں ان کے متعلق بھی یہی لکھا ہے۔

انتهت الیه رئاسۃ التدریس و	ان پر تدریس (یعنی علوم طبیہ کی تدریس) کی ریاست ختم
صناعۃ الطب (ص ۶۱)	ہوتی ہے، اور فن طب کی۔

اسی طرح آپ کو اس ملک میں ان ہی علماء کے اندر اسٹرانومی (ہیئت) نجوم، اقلیدس وغیرہ کے ماہرین کا ایک گروہ نظر آئیگا جو پڑھنے والوں کو ان علوم کی تعلیم دے رہے ہیں۔ حسن گنگو بھمنی کے دربار میں صدر شریف کا شمار ان لوگوں میں ہے جو علوم ہندسیہ میں اپنے وقت کے امام تھے، نزہتہ الخواطر میں ہے کہ

احد العلماء المبرزین فی الھیئۃ والھندسۃ و النجوم (ص۶۳)	ہیئت، ہندسہ، نجوم میں سرآمد روزگار لوگوں میں سے تھے۔

اسی دکن میں مشہور ہیئت داں ملا طاہر تھے، جن کا پہلے تو خواجہ جہاں کے دربار سے تعلق تھا، لیکن بعد کو احمد نگر کے بادشاہ برہان نظام شاہ کے اصرار پر ملا طاہر کو خواجہ جہاں نے احمد نگر بھیج دیا ملا پیر محمد شروانی نے ان ہی سے مجسطی پڑھی تھی، اور ان کا یہی پڑھنا احمد نگر کے دربار سے تعلق کا ذریعہ بنا، ملا عبد النبی احمد نگری نے مذکورہ بالا واقعات کو اپنی مشہور کتاب دستور العلماء میں درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ برہان نظام شاہ ملا طاہر سے خود پڑھتا تھا، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

درہفتہ دو روز بدرس علمائے پایہ تخت درآں مدرسہ (جواب جامع احمد نگر ہے) مشغول می گشت و کتب تحصیلی مذکور می شد، و درآں درس سید جعفر برادر شاہ طاہر و شاہ حسن الجواد، و ملا محمد شیباپوری، و ملا حیدر استرآبادی و ملا ولی محمد و ملا رستم جرجانی، و ملا علی مازندرانی، و ابو البرکۃ، و ملا عزیز اللہ گیلانی و ملا محمد استرآبادی و قاضی زین العابدین و قاضی لشکر ظفر بیگ، و سید عبد الحق کنابدار پرگنہ انبر و شیخ جعفر و مولانا عبد الاول و قاضی محمد نور المخاطب بافضل خاں و شیخ عبد اللہ قاضی و دیگر فضلاء و طلبہ حاضر می شدند، و برہان نظام شاہ باستاد خود ملا پیر محمد شروانی از شروع درس تا اختتام بدو زانوے ادب می نشست و خود ہم رد و قدح سوال و جواب می نمودہ (ضمیمہ دستور العلماء ص ۲۵)

ملا پیر محمد شروانی اکبر کے ساتھ دکن آتے ہوئے دریائے نربدا میں ڈوب مرے۔ ملا پیر محمد سے مجسطی پڑھنے کے بعد جس کا موقع ان کو دکن کے مشہور قلعہ پرینڈا میں ملا تھا، ملا طاہر کے متعلق برہان شاہ کے پاس یہ رباعی لکھ کر پیش کی تھی۔

در وصف کمالش عقلا حیرانند ۔۔۔ بقراط حکیم و بوعلی نادانند
با ایں ہمہ علم و فضل و کمال ۔۔۔ در مکتب او الف می خوانند

ادر ملا طاہر سے تو خیر دکن کا ایک بادشاہ پڑھتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اسی سرزمین دکن میں ایسے بادشاہ بھی تھے جو دوسرے علوم کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ فن ریاضی کا درس دیتے تھے، فیروز شاہ بہمنی

کے متعلق مولانا آزاد نیز دیگر مورخین نے لکھا ہے کہ "در ہفتہ روز شنبہ و دوشنبہ و چہارشنبہ درس می گفت" جس میں ایک دن یعنی ہفتہ کے پہلے دن شنبہ کو بادشاہ صرف "زاہدی شرح تذکرہ درہیئت و اقلیدس درہندسہ (روضۃ الاولیاء ص ۲۲) پڑھاتا تھا۔

فیروز شاہ کو علم ہیئت میں اتنا غلو پیدا ہو گیا تھا کہ آخر میں اُس نے طے کر لیا تھا کہ "در دولت آباد رصد بندد" بادشاہ نے اپنی امداد کے لیے اس فن کے چند ماہرین فن کو بیرون ہند سے بلایا بھی تھا، مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے حکم سے

حکیم حسن گیلانی، و سید محمد گازرونی باتفاق علماء دیگر باین کار مشغول شدند لیکن بنابر بعضے امور کہ ازانجملہ فوت حکیم حسن علی بود کار رصد ناتمام ماند" (ص ۲۲)

انتہا تو یہ ہے کہ انہی علماء میں ایسے لوگ بھی تھے، جو موسیقی کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، شیخ ضیاء الدین بخشی جو دراصل بداؤں کے باشندے تھے، عام علوم دینیہ کے سوا طب میں کمال رکھنے کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ

کانت لہ ید بیضاء فی الطب والموسیقی ص۲۶ ان کو طب اور موسیقی میں بڑی دستگاہ حاصل تھی

ابن سینا کی طبی کتاب "کلیات قانون" کے مقابلہ میں آپ نے ایک کتاب "الکلیات و الجزئیات" نامی لکھی ہے، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یونانی دواؤں کے ساتھ ساتھ خاص اُن دواؤں کا تذکرہ بھی التزام کے ساتھ کیا گیا ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں ہر جگہ ان دواؤں کے نام کو درج کیا ہے، جس نام سے وہ ہندوستان میں مشہور ہیں، حضرت ضیاء بخشی سلطان المشائخ کے معاصر ہیں، شیخ محدث نے ہی ان کا ترجمہ لکھا ہے یہ لطیفہ اسی میں ہے کہ

در زمان شیخ نظام الدین اولیاء سہ ضیاء بودند ضیاء سنامی کہ منکر شیخ بود، ضیاء برنی کہ معتقد و مرید او بود و ضیاء بخشی کہ نہ منکر بود نہ مرید[1] (ص ۱۰۵)

---

[1] مولانا ضیاء الدین سنامی اور سلطان المشائخ میں جو تعلق تھا اُس کا ذکر شیخ محدث نے اخبار میں ان الفاظ میں کیا ہے "معاصر شیخ نظام الاولیاء بود و آنم بشیخ الدیت سماع اجتناب کردے" لیکن شیخ المشائخ نے (باقی برصفحہ ۱٦۱)

اسی زمانہ میں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے جن کے متعلق تو سب ہی جانتے ہیں، صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے۔

اشہر مشاہیر الشعراء فی الھند لم یکن	ہندی شعراء کی مشہور ترین ہستی جن کی نظیر علم و معرفت
لہ نظیر فی العلم والمعرفۃ والشعر والموسیقی	شعر اور موسیقی نیز دوسرے فنون میں نہ ان سے پہلے
وفنون اُخر قبلہ ولا بعدہٗ (ص ۳۸)	اس ملک میں پائی گئی اور نہ بعد کو۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ملّا عبدالقادر بداؤنی باوجود ملّا ہونے اور کیسی ملّائیت کہ اکبر کا فتویٰ خود اپنے متعلق ملّا صاحب نے یہ نقل کیا ہے کہ

چناں فقیہ متعصب ظاہر شد کہ ہیچ شمشیرے رگ گردن تعصب او را نتواند برید (بداؤنی ۳۹۹)

مگر اسی متعصب فقیہ کے متعلق مولانا آزاد نے لکھا ہے:- بین نوازی ہم بقدرے دانست[۱] (مآثر الکرام)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۰) اس اجتناب کے متعلق جو آپ کرتے تھے لکھا ہے: "شیخ جز معذرت وانقیاد پیش نیامدے و در تعظیم مولانا دقیقہ نامرعی نہ گذاشتے"

یہ قصہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ مولانا سنامی جب مرض الموت میں بیمار تھے، سلطان المشائخ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ وہی جو عمر بھر شیخ سے اجتناب کرتے تھے سنتے ہیں آج کیا کر رہے ہیں: مولانا دستار چہ خود را بپائے انداز شیخ انداخت" اپنی پگڑی حضرت کے قدموں کے نیچے بچھوائی تاکہ اسی پر چل کر بستر علالت تک آئیں، لیکن سلطان المشائخ نے کیا کیا۔ "شیخ دستار چہ برچید بر چشم نہاد" حضرت نے مولانا کی پگڑی اٹھا کر آنکھوں سے لگائی، یہ تھے اس زمانہ میں بزرگوں کے تعلقات قصہ اسی لفظ پر ختم نہیں ہوا، سلطان المشائخ جب سامنے آکر بیٹھے تو مولانا نے آنکھیں حضرت سے برابر نہ کیں، جوں ہی اٹھ کر مکان سے باہر ہوئے آواز آئی" مولانا برخاست" مولانا ختم ہوگئے، سلطان المشائخ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے "یک ذات حامی شریعت بود حیف آں نیز نماند" (ص ۱۰۹)

یہ تھے محمدؐ کے غلاموں کے قلوب کی لگاوٹیں، آنکھیں الگ ہیں لیکن دل ہر ایک دوسرے کے ساتھ اٹکا ہوا ہے، آج آنکھیں ملی ہوئی ہیں، اور دل ٹوٹے ہوئے ۱۲۔

[۱] جہاں تک ملّا صاحب ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ان کا یہ ذوق دراصل "در عہد جوانی چنانکہ افتد دانی" ہی کے زیر اثر تھا، اپنی تاریخ میں ایک موقع پر انھوں نے لکھا ہے "دریں سال فقیر را تتابع قوارع مصائب و تازیانہائے مصائب گوشمال زد حق تعالیٰ از بعضے ملاہی و مناہی کہ باں مبتلا بود توبہ کرامت فرمود و آگاہی برزشتی اعمال قبائح افعال بخشید ع "آہ اگر من چنیں بمانم آہ" ملّا صاحب نے اس کے بعد چند شعر اور بھی لکھے ہیں جن کا ایک مصرع ہے ع "بشنداز خاطرم آواز بربط و طنبور" جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے اس فعل کو شرعاً جائز نہیں سمجھتے تھے ایک کمزوری

اور اُس زمانہ میں یہ کوئی نئی بات نہ تھی، علم کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں ان چیزوں کی گنجائش بھی نکل آئی تھی، ملا عبدالقادر تو خیر اکبر کے دربار کے ملا تھے اپنی کمزوریوں کا انہیں خود اعتراف ہے لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ تک کے متعلق مستند ذرائع سے یہ بات نقل کی جاتی ہے کہ فنی حیثیت سے آپ کا شمار موسیقی کے ماہرین میں تھا جس کی تصدیق ملفوظات عزیزیہ کے مختلف مقام سے بھی ہوتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں موسیقی بھی فلسفہ کی ایک مستقل شاخ سمجھی جاتی تھی، نہ صرف یونانی فلاسفر بلکہ حکمار کا جو گروہ مسلمانوں میں پیدا ہوا، عموماً اس فن پر بھی ان کی کتابیں پائی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اشراقی فلسفہ میں چونکہ علوم نیرنجات و طلسمات کو بھی داخل کر دیا گیا تھا، اس لیے باہر ہی میں نہیں ہندوستان میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو ان علوم میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ ملا فتح اللہ شیرازی جو اکبری دربار کے مشہور عالم ہیں جن کا ذکر آگے بھی آرہا ہے ملا عبدالقادر نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

در وادی الہیات و ریاضیات و طبیعیات و سائر اقسام علوم عقلی و نقلی و طلسمات و

نیرنجات و جرّ اثقال نظیر خود در عصر نداشت (بداؤنی، ص ۳۱۵)

"طلسمات و نیرنجات" دراصل اشراقی فلسفہ کی شاخ تھی، فلسفہ میں کمال حاصل کرنے والے ان فنون میں بھی مہارت حاصل کرتے تھے، خود شیخ مقتول شہاب الدین سہروردی کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ کبھی کبھی وہ اس قسم کے تماشے بھی لوگوں کو دکھاتے تھے[1] مسلمان حکما ہیں

[1] مثلاً لکھتے ہیں کہ دمشق سے نکلتے ہوئے راستہ میں شیخ الاشراق کا جھگڑا ایک گڈریے سے ہوگیا، گڈریے نے شیخ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا، ایسا معلوم ہوا کہ مونڈھے سے شیخ کا ہاتھ اکھڑ کر گڈریے کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس حال کو دیکھتے ہی بیچارہ گڈریا تو ہاتھ پھینک کر بھاگ گیا، شیخ نے بڑھ کر اُسے اٹھا لیا، اور اپنے ساتھیوں سے آکر مل گئے، بجائے ہاتھ کے دیکھا گیا تو رومال تھا۔ امام اوزاعی سے ایک یہودی اشراقی کا قصہ اسی قسم کا منقول ہے کہ یہودی نے ایک مینڈک پکڑا، امام اوزاعی بھی سفر میں ساتھ تھے، عیسائیوں کے ایک گاؤں میں اس مینڈک کو جب بیچنے لگا تو دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ سور ہے، کسی غریب عیسائی نے سور سمجھ کر خرید لیا، جب یہودی دام لے کر گاؤں سے باہر ہوا تو پھر مینڈک اصلی صورت پر واپس آگیا، گاؤں والوں نے یہودی کا پیچھا کیا، امام اوزاعی کہتے ہیں کہ جونہی وہ لوگ قریب ہوئے یہودی کی گردن سے ایسا معلوم ہوا کہ سر الگ

یہ چیزیں اشراقی فلسفہ کی راہ سے آئی تھیں، اور خواص ہوں یا عوام سب جانتے تھے کہ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

فتح اللہ شیرازی جن علوم میں مہارت رکھتے تھے اس میں آپ علم جرالثقال" کو بھی پا رہے ہیں یہ فن بھی "حکمت" کا ایک جز تھا، نہ صرف بیرونِ ہند بلکہ ہر زمانہ میں وہی لوگ جو فلسفہ و منطق میں غلو رکھتے تھے، حکمت کی اس شاخ سے بھی واقفیت رکھتے تھے، اسی فن اور علم الحیل کی مدد سے حکیم علی نے وہ مشہور تالاب بنایا تھا جس میں غوطہ مارنے کے بعد آدمی کو سیڑھیاں ملتی تھیں، ان سیڑھیوں سے نیچے اُترنے کے بعد ایک فرش و فروش کے سجے سجائے کمرہ میں آدمی داخل ہو جاتا تھا جس میں وہ دوازدہ (دس بارہ) آدمی کے اُٹھنے بیٹھنے کی گنجائش تھی، دسترخوان چنا ہوا ہے، طاقوں میں کتابیں رکھی ہوئی ہیں، حکیم علی کے اس طلسمی تالاب میں اکبر بادشاہ بھی گیا تھا اور جہانگیر بھی تزک میں جہانگیر نے خود اپنا دیکھا ہوا مشاہدہ پیش کیا ہے، حکیم علی کا چراغ بھی مشہور ہے، جس سے حمام چوبیس گھنٹے گرم رہتا تھا اور چراغ نہیں بجھتا تھا، مآثر الامراء وغیرہ میں ان ہی حکیم علی کے متعلق لکھا ہے کہ اکبر جب اطلاق لبطن کے مرض میں مبتلا ہوا، دست کسی ترکیب سے نہیں رُکتے تھے، تو حکیم علی کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲) ہوکر زمین پر لوٹنے لگا، گاؤں والے یہ تماشا دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگے، اور وہی سر جو دھڑ سے الگ پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا اوزاعی سے پوچھ رہا تھا" یا اباعمرہل ذہبوا (ابو عمر کیا گاؤں والے بھاگے) انہوں نے کہا ہاں! تو اچھل کر پھر گردن پر قائم ہوگیا۔ اتحاف میں ان اشراقی تماشوں کا ذکر طاش کبری زادہ نے کیا ہے مشہور مصنف علامہ سکاکی کے متعلق یہی لکھتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ مفتاح العلوم جیسی کتاب لکھتے تھے اور دوسری طرف اسی قسم کے علوم کے ذریعہ سے عجیب تماشے دکھاتے تھے، روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ وزیر بغداد سے ان سے ایک دفعہ جھگڑا ہوگیا سکاکی نے عمل کے زور سے سارے بغداد کی آگ باندھ دی، کسی کے گھر کا چولھا روشن نہیں ہوتا تھا، تین دن کے بعد خلیفہ کو معلوم ہوا کہ سکاکی کی یہ شرارت ہے، لجاجت سے کہلا بھیجا کہ مخلوق مصیبت میں ہے اب اپنے عمل کو اٹھالیں، سکاکی نے کہلا بھیجا کہ "تا وزیر بر کون سگ من بوسہ ندہد چناں نہ کنم"۔ واللہ اعلم پھر کیا ہوا، یہ قصے میں نے اس لیے نقل کیے ہیں کہ اس زمانہ کے علماء کا جو مذاق تھا اس پر ان سے روشنی پڑتی ہے۔ سکاکی کے متعلق روضۃ الصفا میں اور بھی قصے نقل کیے ہیں۔ ہندوستان میں بھی ایسے مولوی پائے جاتے تھے، شیخ علاء الدین کنتوری کا قصہ مشہور ہے، شیخ احمد شرعی کی تسبیح کا قصہ بھی اخبار الاخیار میں پڑھیے عارف حسینی کے قصے بداؤنی نے لکھے ہیں ۱۲۔

بلا کر بہت غصہ ہوا، حکیم نے کیسہ سے دوا نکالی" در کوزہ آب انداخت فوراً بستہ شدہ (ص ۱،۵ ماثر الامراء ج ۱) یعنی دوا ڈالنے کے ساتھ ہی پانی برف بن کر جم گیا حکیم نے بادشاہ کو دکھایا کہ دوائیں تو ہمارے پاس ایسی ہیں لیکن آپ پر اثر نہ کریں تو میں کیا کروں، بادشاہ نے حکم دیا کہ یہی دوا مجھے دی جائے حکیم نے انکار کیا لیکن ضدی بادشاہ نے نہ مانا، اسی کو استعمال کیا، دست تو رک گئے لیکن اب ایسا قبض و نفخ ہوا کہ اس کی اذیت بھی ناقابل برداشت تھی، پھر اطلاق و اسہال کی دوا دی گئی" اطلاق زیادتی کرد تا درگذشت (ص ۱،۵)، گویا اکبر کا یہی بیجا اصرار جان لیوا ہوا، واللہ اعلم بالصواب۔

میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ تھی کہ اس زمانہ کے اہل علم ان علوم میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، فتح اللہ شیرازی کے متعلق خود ان کے دیکھنے والے ملا عبد القادر بداؤنی کی شہادت ہے کہ

در علوم عربیت و حدیث و تفسیر و کلام نیز نسبت او مساوی ست و تصانیف خوب دارد (بداؤنی ج ۳ ص ۱۵۴)

اور دوسری طرف تذکرہ علماء ہند میں اسی حدیث و تفسیر و کلام کے عالم کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ

"از مصنوعات او اشیائے بود کہ خود حرکت می کرد و آرد سائیدہ می شد و آئینہ کہ از دور و نزدیک اشکال غریبہ در و مرئی می گشت و بندوقے کہ بیک گردش دوازدہ آواز می داد" (صفحہ ۱۶۰)

مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور کتاب دربار اکبری میں بھی میر فتح اللہ کی تفسیر خلاصۃ المنہج و منہج الصادقین کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ میر صاحب نے حسب ذیل چیزیں ایجاد کی تھیں۔

بادآسیا یعنی ہوا کی چکی چل رہی ہے، آئینہ حیرت نزدیک و دور کے عجائب و غرائب تماشے دکھا رہا ہے توپ ہے کہ تخت پر چڑھی ہے، قلعہ شکن توپ ہے، پہاڑ سامنے آجائے تو چوڑیوں کی طرح حلقہ حلقہ الگ، ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر چڑھ جاؤ۔ (دربار اکبری ص ۶۸۱)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبری عہد ہی میں کیا کیا چیزیں یہی مدرسے کے ملا حاشیہ نویس ایجاد کر چکے تھے پانی کو روک کر اس کے نیچے مکان بناتے تھے برف جمانتے تھے ایسی کوئی حرارت پیدا کر سکتے تھے جو بجھ نہیں سکتی تھی، حیوانی قوتوں کی امداد کے بغیر حرکت پیدا کرتے تھے اور ایسی تیز حرکت کہ جس سے

آتا پس جاتا تھا، پورٹ ایبل توپ جس وقت جس بلندی پر چاہیں اُسے چڑھا کر وہاں سے فیر کرسکتے تھے، اور سب سے عجیب تر بندوق وہ تھی جس سے ایک گردش میں دس آوازیں ہوتی تھیں گویا ایک قسم کی مشین گن تھی۔

اور کچھ اکبر کے زمانہ کی خصوصیت نہ تھی، اس سے پہلے بھی اہل علم کا طبقہ ہندوستان میں اپنے علمی کمالات کی نمائش مختلف شکلوں میں کرچکا تھا۔ فیروز تغلق کے زمانہ میں لکھا ہے کہ ایک گھڑی ہندوستان میں ایجاد ہوئی تھی جس کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے۔

یخرج فی کل ساعۃ منہا صوت عجیب یترنم بھذا البیت ؎	اس گھڑی سے ہر گھنٹہ پر ایک آواز پیدا ہوتی ہے یعنی نغمہ کے ساتھ یہ شعر گھڑی سے سنائی دیتا ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔
بر ساعتے کہ بر در شاہ طاس می زنند	بادشاہ کے دروازہ پر ہر گھنٹہ میں جو گھڑیال بجاتے ہیں،
نقصان عمر می شود آں یاد می دہند	یہ یاد دلاتے ہیں کہ عمر کا اتنا حصہ ختم ہو گیا۔

واللہ اعلم اس کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ گھڑی ہونے کے سوا گویا ایک قسم کا گراموفون بھی تھا، کوئی ایسی ترکیب کی گئی تھی کہ بجائے بے معنی آواز کے اس سے یہ مسلم شعر پیدا ہوتا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اسلامی سلاطین کا کوئی سا زمانہ ہو، نہروں، تالابوں، سڑکوں، پل وغیرہ کے ذریعہ سے جو حیرت انگیز کام انجام دیے گئے، تعمیرات کا جو سلسلہ ان بادشاہوں کے عہد میں نظر آتا ہے، یا طبابت اور کاشتکاری کے متعلق جو اصلاحات مسلمانوں نے اپنے قرن میں ہندوستان میں جاری کیے شاید ان کی نظیر اس زمانہ میں بھی پیش نہیں ہوسکتی، نزہۃ الخواطر میں صرف فیروز تغلق کے متعلق لکھا ہے کہ :

؎ اگرچہ نہ کسی اور کتاب میں دیکھا گیا ہے اور نہ روایۃً اس کا ذکر کسی سے سننے میں آیا ہے لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سی تاریخ ہند فارسی میں ہے جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ اس کتاب میں بنگال کے بادشاہ غیاث الدین جسے حافظ کی غزل نے شہرت دوام بخشی ہے اس بادشاہ کے تذکرہ میں شیخ محدث لکھتے ہیں۔ "در انجا دبنگال میں کسی جگہ) پلے بستہ است بقدر ۱۰ روزہ راہ (ص ۸۹) اتنا بڑا پل جس پر دس دن تک لوگ مسلسل چلتے رہیں، میں نہیں جانتا کہ بنگال میں کہاں تھا یا کہاں ہے؟ یا واللہ اعلم اس کا کیا مطلب ہے ۱۲۔

انه حفر خمسين نهراً وبنى اربعين مسجداً و	اس بادشاہ نے پچاس نہریں کھدوائیں، چالیس
عشرين زاوية ومائة قصر وخمسين مارستاناً	مسجدیں، بیس خانقاہیں، سو محلات اور پچاس
ومائة مقبرة وعشر حمامات ومائة جسر و	شفاخانے، سو مقبرے، دس حمام اور سو پل ڈیڑھ
مائة وخمسين بئراً ص۱۱۱	سو کوئیں بنوائے۔

ظاہر ہے کہ باضابطہ انجنیری کے ماہروں کے بغیر ایسے کام کا انجام پانا ناممکن ہے، اسی کتاب میں ہے۔

اما الحدائق فانها اسس الفا ومائتی	(فیروز کے زمانہ میں) جو باغات لگے اس کی تفصیل یہ ہے
حديقة بناحية دهلی وثمانين حديقة	کہ اس شخص نے دو ہزار باغوں کی بنیاد قائم کی، جن
بناحية شاه درا واربعين حديقة بناحية	میں : سو باغ تو دلی کے نواح میں تھے اور اسی باغ
چتور كانت فيها سبعة اقسام العنب[۱۱۱]	شاہ درا کے نواح میں اور چالیس باغ چتور کے اطراف
(ص ۱۱۱)	میں ان باغوں میں صرف انگور سات قسم کے ہوتے تھے

کیا باغبانی کا یہ عظیم کاروبار نباتات میں علمی مہارت پیدا کیے بغیر جاری ہو سکتا ہے، جس ملک میں کھٹے انگور بھی نہ مل سکتے ہوں، سات سات قسم کے شیریں انگور کیا محض ہندوستان کے جاہل مالی پیدا کر سکتے تھے، واقعہ وہی ہے کہ اس زمانہ کے اختیاری علوم و فنون میں سب ہی طرح کے علم تھے، اپنے اپنے ذوق کے مطابق جس علم میں جو چاہتا تھا کمال پیدا کرتا تھا[۱] اور جو حال علوم کا تھا وہی زبانوں کا بھی تھا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ مثلاً عربی زبان ہی کو لیجیے، عربی زبان کے الفاظ و محاورات کا ایک ذخیرہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی آسمانی کتاب پیغمبر کے ملفوظات اور ان کی زندگی یعنی حدیث اور مذہبی علوم مثلاً فقہ اصول فقہ کلام و تصوف وغیرہ ہیں اتنی عربی کا سیکھنا تو ہر اس شخص کے لیے لازمی

[۱] ملا نور الدین ہمایوں کے دربار کے ملا تھے۔ "در علوم ریاضی و ہندسہ و نجوم و حکمت ممتاز" (ص ۱۹۰) بداؤنی۔ سرہند کے قریب سفیدون کا پرگنہ جاگیر میں ملا تھا، ملا عبد القادر بداونی نے لکھا ہے کہ "از آب جو (دریائے جمنا) جوئے کندہ تا پنجاہ کردہ راہ بجانب کرنال واز آنجا پیش تر براہ کہ می رود از آں آب زراعت بسیار کردہ باعث ترفیہ رعایا گردید ص۱۹۰" یہ تھے اس زمانہ کے ملاؤں کے کارنامے۔

تھا جو دانشمند یا ملا مولوی بننا چاہتا تھا۔

باقی عربی زبان کا وہ حصہ جس میں نظم ونثر کا اعلیٰ ادب محفوظ ہے، اور جاہلیت وایام جاہلیت کی چیزیں عربی کے جس حصہ میں پائی جاتی ہیں اس حصہ کی تعلیم اگرچہ لازمی تو نہ تھی، بلکہ اختیاری مضامین جیسے بہت سے تھے، ان ہی میں ادب عربی کا یہ حصہ بھی تھا، جن لوگوں کا میلان اس کی طرف ہوتا تھا، وہ اس میں خصوصی کمال پیدا کرتے تھے، ہر زمانہ میں آپ کو ایک گروہ اس قسم کے ادیبوں کا ہندوستان میں بھی نظر آئیگا، اس زمانہ میں جب سے انگریزی جامعات میں حکومت اپنی حاکمانہ ضرورتوں سے انگریزی ادب ہی کی تحصیل کو اصل مترار دیے ہوئے ہے، باقی علوم وفنون کی تعلیم بطور نمک چشی کے ہوتی ہے، تھوڑی بہت مشق اگر کرائی جاتی ہے تو حساب وکتاب کی، کہ اچھے کلرکوں کے لیے دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنے حکام عالی مقام کے مقاصد کو صحیح طور پر سمجھ کر اس کی تعبیر کرسکیں، اور اپنا مطلب ان کو سمجھا سکیں جس کے لیے انگریزی میں بول چال کی مشق ضروری ہے، اور دوسری ضرورت دفتریوں کے لیے یہ ہے کہ سرکاری حساب وکتاب کو درست رکھیں۔ ساری یونیورسٹاں، ہندوستان کے کالج سب کا واحد مقصد صرف یہی ہے، لیکن سائنس وآرٹس ان کی مختلف شاخوں کے خوبصورت ناموں کا لبادہ اُڑھا کر مقصد میں کامیابی حاصل کی جارہی ہے جو کلرک بن رہا ہے، دفتری اور صرف کسی دفتر کا دفتری بنایا جارہا ہے وہ مسکین سمجھ رہا ہے کہ میں مورخ بن رہا ہوں اور حکیم، ادیب بن رہا ہوں اور فلسفی۔

خیر مغربی جامعات کی تقلید میں عربی مدارس کے طلبہ سے تقاضا کیا جارہا ہے کہ تم عربی زبان میں بولنے چالنے کی مہارت کیوں نہیں حاصل کرتے علماء کی قیمت جن فرضی اتہامات کی بنیاد پر گھٹائی جارہی ہے یا اُن کی جہالت کے چرچوں سے آسمانوں کو سر پر اٹھالیا گیا ہے اس کی سب سے قوی تر دلیل یہ ہے کہ مولوی جب عربی میں تقریر وگفتگو پر قادر نہیں ہے، تو کیسے سمجھا جائے کہ وہ عربی داں ہے، حالانکہ میں عرض کرچکا ہوں کہ مولویوں کے لیے جس عربی کا جاننا ضروری ہے وہ صرف وہی عربی ہے جس میں ان کا دین ہے، باقی بازار میں خرید وفروخت کی عربی، یا اپنے حاکموں اور سرکاری

افسروں سے خطاب کرنے کے لیے جس زبان کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ اس عربی کی ضرورت ان ہی لوگوں کو ہوسکتی ہے جو عربی ممالک کے باشندے ہوں، لیکن جس ملک کی مادری زبان عربی نہیں ہے، وہاں کا حال تو یہ ہے کہ جمعہ کے خطبہ کی سیدھی سادی عربی جس کے اسی پچاسی فیصدی الفاظ سے ہندوستان کے مسلمان عموماً واقف ہوتے ہیں، لیکن بایں ہمہ اسی حلقہ سے جس سے ایک طرف مولویوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے، کہ جب تک عربی زبان میں بات چیت کی مہارت تم حاصل نہ کرلوگے ہم تمہیں مولوی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان ہی کی طرف سے مسلسل اس کا تقاضا بھی پیش ہورہا ہے کہ خطبہ کی زبان بدلی جائے مسلمانوں کو بھینس بناکر کب تک یہ مولوی بین سناتے رہینگے۔

مجھے کہنا یہ ہے کہ عربی زبان میں بات چیت تقریر و خطابت کا مطالبہ بالکل ایک جدید مطالبہ ہے ورنہ مسلمانوں میں عقل کی کبھی اتنی کمی نہیں ہوئی کہ جس زبان کو وہ خود نہ سمجھتے ہوں اسی زبان میں وعظ و تقریر کرنے پر مولویوں کو انھوں نے مجبور کیا ہو، بلکہ ہر ملک میں علماء نے وہاں کے عوام کو عموماً اسی زبان میں خطاب کرنے کی کوشش کی ہے، جسے وہاں کے باشندے سمجھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ عربی میں تقریر و بیان کے مسئلہ کو علماء نے ان ممالک میں جہاں کی مادری زبان عربی نہیں ہے کبھی اہمیت نہیں دی، لیکن اس کا یہ مطلب کبھی نہیں تھا کہ عربی زبان کے اسلامی ذخیرہ کے سوا عربی ادب کی عام نظم و نثر میں کمال پیدا کرنے یا اس زبان میں تقریر و تحریر کی قوت حاصل کرنے کا جنہیں شوق تھا، اس شوق کی تکمیل سے ان کو روکا گیا، عربیت کی عموماً کمزور ہونے کی شکایت سب سے زیادہ ہندوستان میں کی گئی ہے، لیکن ساتویں صدی سے اس وقت تک بتایا جائے کیا کوئی زمانہ ہندوستان پر ایسا گذرا ہے کہ بطور اختیاری مضمون کے اس ملک کے بعض اہل علم نے عربیت میں کمال نہ پیدا کیا ہو، آخری صدیوں کو تو جانے دیجیے، جن میں ملا محمود جونپوری، مولانا غلام علی آزاد حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہم جیسے نامی گرامی ادباء اس ملک میں پیدا ہوتے رہے۔ میں قدوری اور بزودی والے دور کو لیتا ہوں، جس کے متعلق سمجھا جاتا ہے

کہ یہاں کے مولوی چند فقہی متون کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے۔

ابھی کچھ دیر پہلے آپ علامہ رضی الدین حسن صغانی کا ذکر سن چکے جو ہندوستان سے سفیر بن کر بارگاہِ خلافت بغداد بھیجے گئے تھے کہ ان ہی کی کتاب "عباب" سے فیروزآبادی نے قاموس تیار کی ہے، آپ یہ بھی سن چکے کہ خود سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کو حریری کے چالیس مقالے زبانی یاد تھے، فیضی نے اپنی بے نقط تفسیر سواطع میں جس کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئیگا، عربی لغت میں اپنی جس دستگاہ اور تبحر کا ثبوت پیش کیا ہے، کیا اس کا کوئی انکار کرسکتا ہے، خود حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ ارشد حضرت نصیر چراغ دہلوی کی صحبت کی ہم عجیب تاثیر پاتے ہیں، آپ کے مریدوں میں ایک نہیں متعدد حضرات مثلاً قاضی عبدالمقتدر کندی، شیخ احمد تھانیسری، مولانا خواجگی وغیرہ کا ادب عربی سے خصوصی تعلق ہے، شیخ احمد تھانیسری اور قاضی عبدالمقتدر کے عربی قصائد تو عام کتابوں میں نقل کیے جاتے ہیں، خصوصاً آخرالذکر کا لامیہ جس کا مشہور مطلع ہے

یا سائق الظعن فی الاسحار والاصل　　　سلم علی دار سلمیٰ و ابک ثم سلی

یا شیخ احمد کا قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

اطار لبی حنین الطائر الغرد　　　وہاج لوعۃ قلبی النائح الکمد

میں خود تو ادیب نہیں ہوں لیکن ارباب علم و معرفت سے سنا ہے کہ دونوں قصیدے ان بزرگوں کی اس مہارت اور قدرت کو ثابت کرتے ہیں جو عربی ادب میں انہیں حاصل تھی۔

مولانا خواجگی کی جلالتِ شان کے لیے یہی کافی ہے کہ علامہ شہاب الدین دولت آبادی ان ہی کے ساختہ و پرداختہ ہیں، قصیدہ بانت سعاد کی جو شرح مصدق الفضل کے نام سے انھوں نے لکھی ہے، اور ہر شعر کے متعلق صرف و نحو، معانی، بیان، بدیع، عروض و قوافی ان سات

---

[1] کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مشہور عربی قصائد جیسے یہی کعب بن زہیر والا قصیدہ "بانت سعاد" قصیدۂ تائیہ ابن فارض قصیدہ بردہ وغیرہ کو عموماً لوگ زبانی یاد کرتے تھے۔ ملا مبارک ناگوری کے حال میں ملا عبدالقادر نے لکھا ہے:۔

قصیدۂ فارضیہ تائیہ کہ ہفتصد بیت ست و قصیدہ بردہ و قصیدہ کعب بن زہیر و دیگر قصائد محفوظ (ص ۴۲)

ادبی علوم سے بالالتزام بحث کرتے ہیں، وہی ان کی قابلیت کی کافی شہادت ہوسکتی ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہندوستان کا یہ عہد یعنی سلطان المشائخ اور ان کے خلیفہ خاص حضرت چراغ دہلوی کا زمانہ ایسا زمانہ ہے جس میں ان بزرگوں کے ادبی ذوق نے دوسروں پر کافی اثر ڈالا ہے۔ یہ ایک مستقل مقالہ کا مضمون ہے۔ اس وقت میرے لیے صرف یہی اشارہ کافی ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے جس ملک میں قاموس کے حافظ ایک نہیں متعدد پائے جاتے ہوں، اسی کے متعلق باور کرایا جاتا ہے کہ چند فقہی متون کی عربی سے زیادہ ادب عربی کی قابلیت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا، برہان پور کے بزرگ شیخ عبدالوہاب جو آخر میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں رہ گئے تھے جن کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے، براہ راست شیخ محدث ان کے شاگرد ہیں، ان کی شہادت ہے "قاموس لغت بے مبالغہ می تواں گفت کہ گویا ہمہ یاد داشت ص ۲۷۲ (اخبار) مولانا غلام علی آزاد نے خود اپنے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، لکھا ہے کہ "قاموس اللغۃ من اولہ الی آخرہ: ازبر داشتند (مآثر ص ۲۵۰) بلگرام کے ایک بزرگ شیخ عبدالکریم کے ترجمہ میں میر صاحب ہی نے لکھا ہے "مقامات حریری تمام بر نوک زبان داشت (ص)

اور بات کچھ کتابوں ہی یا نظم و نثر تک محدود نہ تھی، عربی میں تقریر و بیان کا جو مطالبہ آج مولویوں سے کیا جارہا ہے آپ کو اسی ہندوستان میں ایک سے زائد مثالیں ایسے علماء کی ملینگی جنہوں نے ہندوستان ہی میں تعلیم پائی، اور یہاں سے ایک دن کے لیے باہر نہیں گئے لیکن بے محابا عربی میں تقریر کرتے تھے، اجمیر شریف کے علماء میں ایک بزرگ شیخ محمد شیبانی ہیں، شیخ محدث نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے، بزبان عربی و فارسی تقریر کردے (ص ۱۸۴)

مالوہ کے اسلامی دارالملک شادی آباد مانڈو کے ایک بزرگ شیخ جلال الدین قریشی ہیں، شیخ محدث ہی ان کے متعلق بھی تصریح فرماتے ہیں "بزبان عربی و فارسی و ہندی سخن کردے" ۲۴۹ اور یہ حضرات تو خیر طبقہ اہل علم سے تعلق رکھتے ہیں، حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ جس ہندوستان کے متعلق "جاء الحکیم ورای النبض" [1] کا لطیفہ بازاروں میں پھیلایا گیا ہے، اپنی نیک نامی کے لیے بزرگوں

[1] (ملاحظہ ہو ص ۱۰۱)

کو بدنام کیا جا رہا ہے، اسی ملک کے بعض سلاطین ایسے تھے جو عربی زبان کے بہترین مقررین میں شمار ہوتے تھے، دکن کے بادشاہ سلطان محمود شاہ بہمنی انار اللہ برہانہ کے ترجمہ میں صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں۔

کان من خیار السلاطین عادلا باذلا	نیک ترین بادشاہوں میں تھے عدل والے انصاف
کریما فاضلا عا۔ فا بالغتہ العربیۃ	والے خیر و خیرات کرنے والے صاحب علم و فضل تھے
والفارسیۃ یتکلم بھما فی غایۃ الطلاقۃ	عربی اور فارسی کے ماہر تھے دونوں زبانوں میں انتہائی
(ص ۱۵۷)	فصاحت و زبان آوری کے ساتھ گفتگو کرتے تھے

اور یہ چند جستہ جستہ مثالیں ہیں اس بات کی کہ ہر صدی میں ایک طبقہ اس ملک میں ایسے لوگوں کا پایا جاتا تھا جس نے عربی کے سوا جسے میں خالص اسلامی عربی کہتا ہوں، ادبی عربی کی بھی معیاری قابلیت رکھتا تھا جس کا سیکھنا ہر دانشمند یا مولوی کے لیے اگرچہ غیر ضروری تھا لیکن جن کو ادب کا فطری مذاق تھا ان کے لیے ساز و سامان کی اس ملک میں کبھی کمی نہیں ہوئی اور یہ کیفیت کچھ عربی ہی کی نہیں تھی، ہندی علما میں مجھے ایسے متعدد افراد نظر آتے ہیں، جنہوں نے عربی کے تعلیمی مروجہ نصاب کو ختم کرکے ہندوستان کی خاص علمی زبان سنسکرت میں بھی کمال پیدا کیا ہے، نزہۃ الخواطر کے مؤلف نے شیخ علی حیدری کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

الشیخ الفاضل علی الحیدری احد القادمین	فاضل شیخ حیدری ان علما میں ہیں جو باہر سے ہندوستان
الی بلاد الھند دخل الگجرات و سکن بمدینۃ	میں آئے اور کھمبائت میں قیام کیا، ہندو پنڈتوں
کھمبائت ولازم احبار الھنود واخذ عنھم	کے گروہ سے انہوں نے اہل ہند کے علوم سیکھے
علوم اھل الھند وتعلم لغتھم وصحبھم مدۃ	ان کی زبان سیکھی اور مدت تک ان کے ہمراہ رہے

(حاشیہ صفحہ ۱۸۰) واللہ اعلم واقعہ سے اس کا کس حد تک تعلق ہے کہ ایک ہندی مولوی کو ضرورت ہوئی اردو کے اس جملہ کی عربی بنانے کی یعنی حکیم آیا اور اس نے نبض دیکھی تو اس اردو فقرہ کا مذکورہ بالا الفاظ میں اس نے جو ترجمہ کیا جو ظاہر ہے کہ کایستھوں کی فارسی یا اس زمانہ کے عام ہندستانیوں کی سنتے ہیں کہ انگریزی ہر جس پر انگریز عموماً ہنسنے لگتے ہیں

من الزمان واظهر علیه حقیقة الاسلام	پھر جو پنڈت ان کا استاد تھا اس پر اسلام پیش کیا،
فمن الله تعالیٰ علیه بالملة الحنیفیة	خدا نے پنڈت پر احسان کیا اور وہ مسلمان ہو گیا
البیضاء اسلم بسببه خلق کثیر من اهل	اس کی وجہ سے گجرات میں لوگ بکثرت اسلام
گجرات لمن کانوا یعرفون فضله وکماله ص۴۶	میں داخل ہوئے۔

اور علی حیدر تو خیر باہر سے آکر ہندوستان میں متوطن ہو گئے تھے، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے بلگرام کے ایک عالم شیخ عنایت اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ "در جمیع فنون عربی وفارسی" میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ "ہندی وسنسکرت و بھاکا و موسیقی ہندی اقتدارے بہم رسانند" (ص ۲۲۲) اس وقت کے علماء کے متعلق جو رائے بھی قائم کی جائے، لیکن مسلمانوں کے عہدِ حیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب شمس بازغہ ملا محمود جون پوری جیسے فاضل یگانہ کی ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ ایک طرف "شمس بازغہ در حکمت و فرائد در فن بلاغت املا کرد" کے سلسلہ میں ان کا قلم جولانی دکھا رہا تھا، شاہ جہاں کو اس پر آمادہ کر رہے ہیں کہ سلاطین پیشین نے اپنے اپنے ممالک میں مختلف زمانوں میں رصد خانے تیار کیے ہیں ہندوستان میں آپ بھی ایک رصد خانہ تعمیر کیجیے، لکھا ہے کہ ملا صاحب نے رصد خانہ کے لیے مقام کا بھی انتخاب کر لیا تھا، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ

> زمینے کہ برائے رصد تجویز کردہ بود بعد چندے ظاہر شد کہ یکے از حکمائے پیشیں آں محل برائے رصد انتیا کردہ بود۔ (مآثر، ص ۲۰۲)

جس سے فن ہیئت ونجوم میں ان کی دقتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے لیکن جس کا دماغ فلسفہ ریاضی بلاغت وادب عربی میں اس طرح کام کر رہا تھا۔ ان ہی ملا محمود کو ہم ہندوستان کے خاص فن "نائکا بھید" کے مطالعہ میں بھی مصروف پاتے ہیں، نائکا بھید کس چیز کا نام تھا، مولانا آزاد اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

---

لہ باوجود شاہی منظوری کے ہندوستان کا یہ رصد خانہ نہ بن سکا۔ لکھا ہے کہ بلخ کی مہم پیش آگئی وزیر نے ایسے وقت میں رصد خانہ کے مصارف کو غیر ضروری قرار دے کر تجویز کو ملتوی کروا دیا ۱۲۔

"آں چناں ست کہ ہندیاں معشوقہ را با عتبار ادا و انداز و درجات عمر و مراتب الفت و
بے الفتی وغیر ذالک چندیں قسم گفتہ اند و ہر قسم را نامے معین ساختہ و اشعار آبدار در ہر قسم نظم آوردہ"

یعنی وام مارگیت کا ہندوستان میں جب شباب تھا، مذہب تک اس زمانہ میں صرف مردوں اور عورتوں کے باہمی اجتماع میں منحصر ہو کر رہ گیا تھا، اسی زمانہ میں ہندوؤں نے نت نئے قسم کے علوم وفنون جو ایجاد کیے تھے جن میں اکھاڑہ اور پاتر بازی کا ذکر پہلے آچکا ہے، یہ نائکا بھید بھی اسی جنس کا ایک فن تھا، گویا موجودہ اصطلاح میں ہم اسے سکسولوجی (جنسیات) کہہ سکتے ہیں، ملا محمود نے اس فن کا بھی مطالعہ کیا اور اس پر ایک مستقل کتاب لکھی تھی، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اختیاری مضامین کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔

دانشمندی یا ملائیت کے لیے جن علوم کا پڑھنا ضروری تھا ان کی تحصیل کے بعد اور کبھی کبھی اس کے ساتھ بھی بطور اختیاری مضامین کے اپنے اپنے رجحان و ذوق کے مطابق علوم (سائنس) فنون وصناعات (آرٹس) زبانوں (لنگویجز) میں سے جن چیزوں کے پڑھنے کی ضرورت تھی ان کے ماہرین سے عموماً لوگ پڑھنے تھے، اور جن کے لیے صرف علمی مشق یا مطالعہ مزاولت یا ممارست کی حاجت تھی، لوگ اس میں مشغول ہو جانے تھے، حتیٰ کہ جن لوگوں کا میلان تصوف کی طرف ہوتا، تو وہ بھی ایک طرف مجاہدات و ریاضات، اربعینات ذکر و شغل میں مصروف ہوتے تو دوسری طرف کم از کم اس زمانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ اس فن کی کتابیں بھی اپنے شیوخ سے پڑھا کرتے تھے، سلطان المشائخ کے ذکر میں آپ کو ملیگا کہ نصابی علوم کی تکمیل کے بعد جب اس راہ کی طلب آپ میں پیدا ہوئی اور حضرت بابا شیخ فریدالدین شکر گنج فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آپ حاضر ہوئے تو بابا صاحب نے اور جن مشاغل میں ان کو لگایا ہو اس کا ذکر تو کتابوں میں نہیں ملتا، لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خاص چیز کے ساتھ جسے میں سلسلۂ چشتیہ کی اہم خصوصیت سمجھتا ہوں، ان شاء اللہ اس کا تفصیلی ذکر آئندہ آئیگا اس کے سوا باضابطہ آپ نے بابا صاحب سے تصوف کی چند کتابیں پڑھیں، بلکہ عجیب بات

یہ ہے کہ تصوف کے ساتھ عقائد کی ایک خاص لیکن اہم کتاب تمہید ابو الشکور سالمی بھی اس سلسلہ میں آپ کو پڑھائی گئی، سیر الاولیاء اور فوائد الفواد دونوں میں آپ سے یہ فقرہ نقل کیا گیا ہے کہ اپنے شیخ کے سامنے

سہ کتاب در یکے قاری بودم و دو سماع و ششم و شش باب از عوارف پیش شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید شکر گنج گذراندم۔ تمہید ابو الشکور سالمی تمام پیش شیخ شیوخ العالم خواندم۔

(سیر الاولیاء ص ۱۰۶)

اور اس زمانہ میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، ارباب طریقت عموماً اپنے مریدوں کو عملی مجاہدات کے ساتھ علمی تعلیم بھی دیا کرتے تھے حضرت شاہ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کے ملفوظات میں بھی آپ کو مختلف مقامات میں ایسی عبارتیں مسلسل ملتی چلی جائینگی کہ

مولانا نصیر الدین امام و قاضی صفی رالمحض احیاء العلوم می گذشت (ص ۴۵)

کہیں نظر آئیگا "قاضی منہاج الدین دردن حصاری را صحبت شیخ الشیوخ می گذشت" (ص ۴۸) کہیں ملیگا: "بیچارہ (جامع ملفوظات) را مع قاضی حمید الدین ناگوری می گذشت" (ص ۵۸)

الغرض یوں ہی آپ کو ان مختلف کتابوں کا ذکر ملیگا جو اس زمانہ میں حضرات صوفیہ اپنے ارادتمندوں کو پڑھایا کرتے تھے۔

ان ہی علماء میں ایک معقول تعداد ایسوں کی بھی ملیگی جنھوں نے فن تذکیر و وعظ کی مشق بہم پہنچائی، بہ ظاہر لوگوں کا خیال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علماء ہند میں وعظ گوئی کا رواج کوئی نئی بات ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ہندوستان کے اسلامی دور کا کوئی قرن بحمد اللہ ان بزرگوں سے

لہ میں اس کتاب سے پہلے ناواقف تھا مولوی امداد امام اثر نے اپنی کتاب روضۃ الحکما جس میں جدید مغربی فلاسفر اور ان کے نظریات کا تذکرہ اردو زبان میں پہلی دفعہ کیا گیا ہے۔ اسی کتاب میں تمہید کی تعریف پڑھی، دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں اس کا ایک قدیم مطبوعہ نسخہ ہاتھ آیا۔ پڑھنا شروع کیا تو اتنی دلچسپ سلجھی ہوئی کتاب معلوم ہوئی کہ ختم ہی کرنا پڑا، اب تک اس کا پتہ نہ چلا کہ اس کتاب کے مصنف ابو الشکور کہاں کے تھے۔ حصار کے ایک مولوی صاحب نے ان کا وطن حصار کے اطراف میں بتایا تھا ۱۲۔

خالی نہیں رہا ہے جنہوں نے اپنی سحر بیانیوں سے عام مسلمانوں کے ایمانی جذبات کو بیدار رکھنے کی کامیاب کوششیں نہ کی ہوں، آج تقریروں کا زور ہے، بیانوں کا طوفان برپا ہے، لیکن کیا اس کی نظیر ہم اس زمانہ میں پیش کرسکتے ہیں۔ محمد تغلق کے عہد میں ابن بطوطہ مشہور اندلسی سیاح ہندوستان آیا ہے، اپنے سفرنامہ میں سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک تربیت یافتہ عالم مولانا علاء الدین اودھی جو عام طور پر نیلی کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں، ان کے متعلق ابن بطوطہ کی بچشم دید گواہی ہے، وہ آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

هو یعظ الناس فی کل جمعة فیتوب کثیر منهم بین یدیه ویحلقون رؤسهم ویتواجدون ویغشی علی بعضهم شاهدته وهو یعظ فقرء قاری بین یدیه یا ایها الناس اتقوا ربکم ان زلزلة الساعة شیء عظیم (الآیة) ثم کررها الفقیه علاء الدین فصاح احد الفقراء من ناحیة المسجد صیحة عظیمة فاعاد الشیخ الآیة فصاح الفقیر ثانیا ووقع میتا کنت من صلی علیه وحضر جنازته (ص ۲۱)

ہر جمعہ کو علاء الدین نیلی وعظ کہتے ہیں ان کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں کو توبہ نصیب ہوتی ہے، ان کے وعظ میں لوگ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں اور بیچ بیچ میں سننے والوں پر وجد طاری ہوتا ہے بعضوں پر تو غشی طاری ہوجاتی ہے ایک دن ایک شخص میرے سامنے بیہوش ہوا جس وقت شیخ وعظ کہہ رہے تھے، قاری نے آیۃ پڑھی (جس کا ترجمہ ہے، لوگو! ڈرو اپنے رب سے اس گھڑی کی بھونچال سخت ہے یعنی قیامت کی) مولانا نیلی نے اس آیت کو چند بار دہرایا اتنے میں فقیروں میں سے ایک آدمی چیخ اٹھا جو مسجد کے کسی حصہ میں تھا، ایک چیخ ماری شیخ نے آیت کو پھر دہرایا اس نے پھر چیخ ماری اور بے جان ہوکر گر پڑا میں بھی ان لوگوں میں تھا جنہوں نے اس شخص کے جنازہ کی نماز پڑھی اور اس کے جنازہ میں حاضر ہوئے۔

سلطان المشائخ ہی کے زمانہ میں صاحب کتاب "نصاب الاحتساب" مولانا ضیاء الدین سنامی تھے جن کا ذکر گذر چکا ہے، ان کے معاصر ضیاء الدین برنی نے اختلاف مسلک کے باوجود

اپنی تاریخ میں یہ شہادت ادا کی ہے۔

> للسنا می الید البیضاء فی تفسیر القرآن الکریم وکشف حقائقہ یذکر فی کل اسبوع ویحضر مجلسہ ثلاثۃ الاف من الناس من کل صنف ویتاثرون بمواعظہ حتی انہم یجدون حلاوتہا الی الاسبوع الآخر

قرآن کی تفسیر میں ان کو کمال ہے، وہ ہفتہ میں ایک دفعہ وعظ کہتے ہیں، ان کے وعظ میں تین تین ہزار آدمیوں کا مجمع ہو جاتا ہے جن میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے وعظ سے متاثر ہوتے ہیں، اتنا اثر لیتے ہیں کہ دوسرے ہفتہ تک اس کی حلاوت اپنے اندر پاتے ہیں۔

نویں صدی میں مولانا شعیب نامی عالم دلی میں تھے۔ شیخ محدث نے ان کے متعلق لکھا ہے

> در زمانے کہ او وعظ گفتے و قرآن خواندے ہیچ کس را مجال عبور ازاں راہ نبودے اگرچہ خود بار گراں بر سر داشتے (اخبار، ص ۲۵۵)

ہندوستان کے اس دور میں اسلامی مذکرین وخطبا کی کتنی قدر ومنزلت کی جاتی تھی اس کا اندازہ ابن بطوطہ کے اس بیان سے ہوتا ہے، جو محمد تغلق کے متعلق اس نے لکھا ہے۔

> امر ان یہیأ لہ منبر من الصندل الابیض القماری وجعلت مسامیرہ وصفائحہ من الذہب الصق باعلاہ حجر یاقوت عظیم وخلع علی ناصر الدین خلعۃ مرصعۃ بالجوہر ونصب لہ المنبر فوعظ وذکر فلما نزل قام السلطان الیہ وعانقہ وارکبہ علی فیل وضربت لہ سراجۃ من الحریر الملون وصیوانہا

تغلق نے واعظ کے متعلق حکم دیا کہ سفید صندل کا منبر ان کے لیے تیار کیا جائے جس میں کیلیں اور پتر سونے کے لگائے گئے تھے، اور منبر کے اعلیٰ حصہ میں ایک بڑا یاقوت جڑا گیا، واعظ جن کا نام ناصر الدین تھا ان کو ایک مرصع خلعت عطا ہوئی جس میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے، وہی منبر ان کے لیے بچھایا گیا، مولانا ناصر الدین اس پر چڑھے وعظ بیان کیا، بادشاہ اس کے بعد کھڑا ہوا اور ان سے بغل گیر ہوا اور ہاتھی پر سوار کیا،

من الحرير وخباءً ايضاً كذلك فجلس الواعظ فيها وكان بجانبها اوانى الذهب واعطاه السلطان اياها وذلك تنور كبير بحيث يسع فى جوفه الرجل القاعد وقدر ان وصحاف وكل ذٰلك من الذهب وكان اعطاه عند قدومه مأته الف دينار (نزہۃ الخواطر، ص ۲۱)

اور ان کے لیے ایک خیمہ جو رنگین حریر کا بنا ہوا تھا نصب کیا گیا۔ اس خیمہ کے اندر کا کمرہ بھی حریر ہی کا تھا، اسی میں واعظ بیٹھے۔ ان کے اردگرد سونے کے برتن تھے جسے بادشاہ نے سب انہی کو دے دیا۔ وہ ایک بڑا تنور تھا جس کے اندر ایک بیٹھا ہوا آدمی غائب ہو سکتا تھا دو ہانڈیاں اور پیالے تھے سب سونے کے جس وقت واعظ ہندوستان آئے تھے تو بادشاہ نے ان کو ایک لاکھ اشرفی دی تھی۔

ہندوستان کو باضابطہ دارالاسلام بنا کر مسلمانوں نے ابتداء میں جب ملک کو وطن بنایا تو گو وہ زبان جس نے آئندہ ترقی پاکر اردو کی شکل اختیار کی، اس کی آفرنیش کی داغ بیل پڑ چکی تھی، لیکن پھر بھی عموماً وعظ وتذکیر کی زبان فارسی ہی تھی، لیکن اس ملک کی مقامی ضروریات کا اندازہ کرکے واعظینِ اسلام میں سے بعض حضرات اپنے مواعظ میں نثر نہیں تو نظم کی حد تک ہندی زبان کے اشعار بے محابا استعمال کرتے تھے، ملا عبدالقادر بداؤنی نے حضرتِ مخدوم شیخ تقی الدین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "چنداین" نامی ہندی مثنوی کہ

"دربیان عشق لورک وچاندا عاشق ومعشوق والحق خیلے حالت بخش است مولانا داؤد بنام او نظم کردہ"

واللہ اعلم یہ کونسی کتاب ہے، اردو زبان کی تاریخ کے مطالعہ کرنے والے والوں کی نظر اس مثنوی پر پڑی ہے یا نہیں، بداؤنی نے لکھا ہے "از نہایت شہرت دریں دیار احتیاج بہ تعریف ندارد" (ص ۲۵۰) بہرحال ایک عالم مسلمان کی یہ ہندی مثنوی اگر کہیں اب بھی مل سکتی ہو تو اردو زبان

---

[1] بداؤنی نے لکھا ہے۔ فیروز تغلق کے وزیر خان جہاں کے بیٹے جوناشہ جو باپ کے مرنے کے بعد خان جہاں کے لقب سے ملقب ہوئے، اسی جوناشہ کے نام مولانا داؤد نے یہ مثنوی معنون کی تھی جس کے معنی یہی ہوئے کہ فیروز تغلق کے عہد کی یہ کتاب ہے۔

کی پہلی باضابطہ بنیادی کتاب شاید بھی قرار پا سکتی ہی، خیر یہ الگ مسئلہ ہو، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مخدوم شیخ تقی الدین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بداؤنی نے لکھا ہی کہ

"مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی در دہلی بعضے ابیات تقریبی اد را بر جسری خواندہ مردم

را از استماع آں حالت غریبہ می داد"

آگے لکھتے ہیں کہ

"چوں بعض افاضل آں عہد شیخ (مخدوم تقی الدین) را بر سیدند کہ سبب اختیار ایں مثنوی ہندوی چیست"

مخدوم نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"تمام اں حقائق دمعانی ذوقیست وموافق بوجدان اہل ذوق عشق ومطابق بہ تفسیر بعضے از آیات قرآنی"[منتخب]

اس سے معلوم ہوتا ہی کہ اسلامی معارف وحقائق کو علمار نے اسی زمانہ میں ہندوستان کی مقامی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا، بداؤنی نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا ہی کہ

"خوش آوازان ہند حالا ہم بسواد خانی آں صید دلہا می نمائند"

جیسا کہ میں نے عرض کیا اس مثنوی سے میں ذاتی طور پر خود واقف نہیں ہوں، اور نہ بداؤنی کے سوا کہیں دوسری جگہ اس کا ذکر ملا ہی اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ جس زبان کو "ہندی زبان" سے بداؤنی موسوم کر رہے ہیں، اس کے الفاظ کس نوعیت کے تھے، اتنا تو یقینی ہے کہ اس میں ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جنہیں فیروز تغلق کے عہد ہی میں مسلمان عام طور پر سمجھ سکتے تھے، ورنہ ظاہر ہی کہ اس کے سننے سے عام مسلمانوں پر "حالت غریبہ" کیسے طاری ہو سکتی تھی امیرا خیال ہی کہ جب یہ مثنوی اکبر کے عہد تک عام طور سے سنی سنائی جاتی تھی، اور خوش آوازان ہند بسواد خوانی او صید دلہا" کرتے تھے تو غالب قرینہ یہ ہی کہ کہیں نہ کہیں اس کے نسخے ضرور پائے جاتے ہونگے، کاش! اس مثنوی کا "انجمن ترقی اردو" پتہ چلاتی، ممکن ہی کہ انجمن نے اس کا نسخہ مہیا کر لیا ہو[۱] لیکن

---

[۱] بعد کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو سے اس مثنوی کا ذکر آیا تو اس سے وہ واقف نہ تھے، خدا کرے پڑھنے والوں میں کسی صاحب کو اس مثنوی کا علم ہو تو انجمن ترقی اردو کو چاہیے کہ وہ مطلع فرما دیں۔

مجھے اس کا علم نہ ہو، اگر ایسا ہی ہو تو یہ مثنوی اس کی مستحق ہے کہ اس پر مستقلاً کام کیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تذکیر و وعظ میں مہارت و مشق پیدا کرنے والوں کا ایک گروہ ہر عہد میں پایا گیا ہے، میں نے بطور نمونے کے یہ چند قدیم مثالیں پیش کی ہیں، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں متعدد واعظوں کا پتہ چلتا ہے، جن کے مواعظ سلطان جی نے عہد طفولیت میں سُنے تھے خصوصاً شیخ نظام الدین ابوالموئد جو ایلتمش عہد کے مشہور علماء میں ہیں ان کے وعظ کا تذکرہ عموماً فرماتے شیخ محدث نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، چونکہ بڑی موثر چیز ہے "اخبار" ہی سے نقل کرتا ہوں سلطان المشائخ فرماتے ہیں:-

"دراں ایام کودک بودم درک معانی چنداں براو نمودہ است روزے در تذکیر او آمدم

آگے ان کی دوگانہ کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ

بالاے منبر رفت، مقری بود او را قاسم گفتندے خوش خواں روایتے بخواند بعد ازاں

شیخ نظام الدین ابوالموئد رحمۃ اللہ علیہ آغاز کرد کہ "بخط پایاے خود نوشتہ دیدہ ام"

حضرت کا بیان ہے کہ صرف ان الفاظ کا سامعین پر اتنا اثر پڑا کہ "ہمہ در گریہ شدند" اس کے بعد اُس رباعی کا جسے حضرت نظام الدین ابوالموئد نے اپنے والد کے ہاتھ کا نوشتہ پایا تھا، پہلا یہ شعر پڑھا۔

برعشق تو و بر تو نظر خواہم کرد جاں در غم تو زیر و زبر خواہم کرد

فرماتے ہیں کہ شعر کا پڑھنا تھا کہ "نعرہا از خلق برآمد" بار بار اسی شعر کو دہراتے جاتے تھے اور اہل محفل میں شور برپا تھا، ایسی حالت طاری ہوئی کہ دوسرا شعر رباعی کا یاد نہیں آتا تھا یہ فرما کر "اے مسلمانان دو مصراع دیگر یاد نمی آید چہ کنم" کہتے ہیں کہ کچھ ایسے لہجہ میں یہ بات آپ نے فرمائی کہ مجمع اس پر بھی برہم ہوگیا، آخر اسی مقری قاسم نے یاد دلایا، دوسرا شعر رباعی کا یہ تھا

پُر درد دلے بخاک در خواہم شد برعشق سرے ز گور بر خواہم کرد

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اس دن کا وعظ صرف ان ہی دو مصرعوں پر ختم ہوگیا۔

اس سے اس زمانہ کے وعظ کا جو طریقہ ہندوستان میں جاری تھا اُس کا بھی پتہ چلتا ہے

یعنی کوئی خوش الحان مقری (قاری) پہلے قرآن کی کوئی آیت پڑھتا، واعظ اسی آیت کو عنوان بنا کر تقریر شروع کر دیتا تھا یہی طریقہ اس زمانہ میں بیرون ہند کے اسلامی ممالک میں مروج تھا نیز مواعظ میں اثر آفرینی کے لیے اشعار کا استعمال معلوم ہوتا ہے کہ علما کی قدیم سنت ہے، جب مخدوم شیخ تقی الدین جیسی جلیل القدر ہستی جن کا تذکرہ سلطان المشائخ مخدوم شاہ شرف الدین یحیی منیری جیسے اکابر شاندار الفاظ میں فرماتے ہیں۔ فارسی اور عربی سے آگے بڑھ کر "لورک اور چاندا" کی ہندی مثنوی کے اشعار تک اپنے وعظوں میں استعمال فرماتے تھے تو اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے لیکن سچی بات یہی ہے کہ گو خطابت بھی ایک قسم کا آرٹ اور مشقی چیز ہے تاہم تاثیر کے لیے کچھ اور باتوں کی بھی ضرورت ہے، علاء الدین خلجی کے زمانہ میں مولانا کریم الدین دلی کے ایک واعظ تھے، البرنی کے حوالے سے صاحب نزہۃ الخواطر نے ان کے متعلق یہ بیان نقل کیا ہے:۔

کان ینشد فی مواعظہ کثیراً من الاشعار	اپنے وعظوں میں خود تصنیف اشعار پڑھنے کی ان
من انشائہ و یسجع الکلام و لذلک	کو عادت تھی، اور مقفی گفتگو کرتے تھے۔ اسی لیے لوگ
لم یعجب الناس ولا یاخذ بمجامع	ان کے وعظ کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ دلوں
القلوب فلا یحضر فی مجلسہ الا قلیل	پر اثر ہوتا تھا، ان کی مجلس وعظ میں اسی وجہ سے
من الناس . . (ص۱۱۰)	کم آدمی شریک ہوتے تھے۔

حالانکہ البرنی ہی کی یہ بھی شہادت ہے کہ

لہ انشاء یدل علی قدرتہ علی البیان نظماً و	ان کی انشاء اچھی ہے نظم و نثر دونوں پر قدرت
نثراً (،،)	رکھتے ہیں۔

بہر حال اس وقت تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ نصابی کتابوں سے لوگوں کو مغالطہ نہ کھانا چاہیے، بلکہ گرد و پیش کے دوسرے واقعات کو پیش نظر رکھ کر رائے قائم کرنی زیادہ قرین صواب ہوگا۔

لہ دیکھیے اخبار الاخیار، فوائد الفواد، معدن المعانی وغیرہ ۱۲۔

اب میں پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں، یعنی ہمارے تعلیمی نصاب میں صدیوں معقولات کا حصہ صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا، تو پھر آئندہ کیا واقعات پیش آئے جن کا آخری نتیجہ وہ ہوا کہ خالص اسلامی علوم کی کتابوں کے مقابلہ میں معقولات کا پلہ اتنا جھک گیا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے عربی مدارس میں منطق و فلسفہ و کلام کے سوا گویا دوسرے فنون کی کتابیں پڑھائی ہی نہیں جاتی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ آخر زمانہ میں ہمارا جو نصاب درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہوا اس میں حدیث کی ایک کتاب مشکوٰۃ اور تفسیر میں جلالین بیضاوی کی صرف ایک سورہ بقرہ کے بعد شرح وقایہ کی اولین، اور ہدایہ کی آخرین یعنی معناوہ فقہ کی ایک ہی کتاب ہوئی گویا بیضاوی کی ایک سورہ کا اگر لحاظ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ضرورت والے نصاب میں نہیں بلکہ نصاب نصل میں بھی خالص دینیات کی کل تین کتابیں جلالین، مشکوٰۃ، شرح وقایہ و ہدایہ کے سوا کنز و قدوری کے مختصر فقہی متون کے بعد تقریباً چالیس[1] پچاس کتابیں جو پڑھائی جاتی تھیں وہ خالص عقلیات کی کتابیں ہیں یا ایسی کتابیں ہیں جن کا بظاہر تعلق تو کسی دوسرے فن سے ہے لیکن درحقیقت ان کا طرز بیان اول سے آخر تک وہی معقولات کی کتابوں کا سا ہے، انتہا یہ ہے کہ شرح ملا جامی بہ ظاہر نحو کی کتاب ہے لیکن جاننے والوں سے مخفی نہیں ہے کہ نحوی مباحث کو بھی اس میں عقلیت کا رنگ دیا گیا ہے اور جب نحو کی کتاب کا یہ حال ہے تو پھر اصول فقہ یا کلام کی جو کتابیں ہیں ان میں منطقیت اور عقلیت کی جس حد تک گنجائش پیدا ہو سکتی تھی ظاہر ہے، آج ہی نہیں ابتداء سے علماء کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اصول فقہ کو فقہ سے وہی نسبت ہے جو منطق کو فلسفہ سے

---

[1] درس نظامیہ کے نصاب نصل یا انتہائی کتابوں کے نصاب میں دینیات کی صحیح متنوں میں کل تین کتابیں داخل ہیں، ان کے سوا جو کچھ ہے وہ خالص عقلیات یا نیم عقلیات ہی کی کتابیں ہیں جن کی تعداد چالیس پچاس سے متجاوز ہے، ممکن ہے کہ جنھوں نے غور نہیں کیا ہو، انہیں کچھ اچنبھا سا ہو، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کی ایک اجمالی فہرست ہی دیدی جائے۔ جلالین، مشکوٰۃ، ہدایہ مع شرح وقایہ معلوم ہو چکا کہ درحقیقت اس کورس میں حقیقی دینیات کی یہی تین کتابیں ہیں، اب سنیے اول سے آخر تک اس نصاب میں کیا پڑھایا جاتا ہے:- (باقی برصفحہ ۱۸۲)

ہے (دیکھیے مسلم الثبوت) باقی علم کلام کے متعلق تو سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا وہ ایک فلسفہ ہے، اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جب عنصریات کائنات الجو تک کے مباحث کلامی کتابوں کے اجزاء بنا دیے گئے ہیں، تو اس کے فلسفہ ہونے میں کون شبہ کر سکتا ہے، یہی حال ان کتابوں کا ہے جو عربیت کے نام سے پڑھائی جاتی ہیں، یعنی معانی، بیان، بدیع کی دونوں نصابی کتابیں مختصر المعانی اور مطول پڑھنے والوں کو ان کتابوں میں جتنی ذہنی لذت ملتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اسی حد تک وہ ان علوم کے مسائل کا تحقیقی مذاق بھی اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے جس کا نہایت صفائی کے ساتھ ہمیں اقرار کرنا چاہیے، میں اب چاہتا ہوں کہ مندرجہ ذیل دو سوالوں سے بحث کروں۔

(۱) مدت تک جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، ہندوستان کے تعلیمی نصاب میں منطق و کلام کی تعلیم صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھی۔ پھر کیا صورتیں پیش آئیں کہ ہمارا نصاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۱) صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، بدیع المیزان، مرقاۃ، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم، ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، بعض مقامات میں شرح سلم بحر العلوم، شرح مطالع خالص منطق میں۔ ہدیہ سعیدیہ، میبذی، صدرا، شمس بازغہ۔ بعض مقامات میں شرح ہدایۃ الحکمۃ خیر آبادی، شرح اشارات شفا، فلسفہ میں توشیحیہ، تصریح، شرح چغمینی۔ بعض مقامات میں تذکرہ، بست باب۔ ہیئت میں۔ اقلیدس، مبادی الحساب (ریاضی میں) ان کے سوا میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال، میر زاہد امور عامہ اکثر مقامات میں میر زاہد رسالہ و ملا جلال کے ساتھ بحر العلوم۔ یہ کتابیں کچھ خاص طریقہ کی ہیں جنہیں بجز معقولات کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا، اب اصول فقہ میں اصول شاشی، حسامی، نور الانوار، توضیح مع تلویح، مسلم کلام میں۔ شرح عقائد نسفی، شرح عقائد جلالی۔ اور بعض مقامات میں شرح تجرید قوشجی، شرح تجرید کے حواشی قدیمہ و جدیدہ، میر باقر کی الافق المبین جس کا شمار امور عامہ کے مباحث ہی میں ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا تھا مختصر المعانی اور مطول کا شمار بھی اسی سلسلہ میں ہونا چاہیے اور شرح جامی کو بھی میں اسی قبیلہ کی کتاب قرار دیتا ہوں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ میں نے اس سلسلہ میں عموماً ان ہی کتابوں کا شمار کرایا ہے جو درس نظامیہ پڑھانے والی تعلیم گاہوں میں آج سے چالیس پچاس برس پیشتر تقریباً دوامی حیثیت سے پڑھائی جاتی تھیں، ان کے سوا بھی مرزا جان خوانساری، میر باقر، صدر شیرازی، شریف جرجانی کے حواشی، عبد الحکیم سیالکوٹی کے حواشی، خیر آبادیوں میں مولانا فضل حق، مولوی عبد الحق کے حواشی ہیئت و ہندسہ میں کر وغیرہ کی کتابیں مروج تھیں، اگر ان کو بھی شمار کر لیا جائے تو شاید تعداد پچاس سے آگے بڑھ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کتابوں کا نام مستحضر نہ رہا ہو۔

عقلیات کی ان لامحدود کتابوں سے معمور ہو گیا؟

(۲) اگرچہ اس زمانہ میں سلف کے اس طرزِ عمل کا عموماً مضحکہ اڑایا جاتا ہے، اور یہی بھی یہی بات کہ خالص دینیات و اسلامیات کی کل تین کتابوں پر قناعت کر کے اس بری طرح اسلامی نصاب کو عقلیات سے پاٹ دینا بظاہر تعجب خیز ہی نہیں، بلکہ شاید ایک مسلمان کے لیے غصہ انگیز بھی ہو، اور غیظ و غضب کا یہی جذبہ مضحکہ کی صورت اختیار کر لے، مگر آج میں چاہتا ہوں کہ الفاظ کے ہنگاموں سے الگ ہو کر غور کروں کہ واقعی بزرگوں کا یہ طرزِ عمل کیا اسی درجہ قابل نفرین وملامت ہے، جس کا آج اسے مستحق قرار دیا جا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلا سوال ایک تاریخی سوال ہے میں بتا چکا ہوں کہ نویں صدی جب گذر رہی تھی، یعنی سکندر لودی کی تخت نشینی (۸۹۴ھ) تک تقریباً دو سو سال تک منطق و کلام کی مقدار ہمارے نصاب میں وہی قطبی و شرح صحائف کی حد تک تھی لیکن دلی کے تخت پر جب سکندر لودی پہنچا تو گو ہماری عام تاریخوں میں اس کے عہد کا تذکرہ کچھ زیادہ اہمیت کے ساتھ نہیں کیا جاتا، لیکن یہ تو سیاسی تاریخوں کا حال ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جہان گیری جہاں داری کے لحاظ سے سکندری عہد کے متعلق کچھ بھی کہا جائے لیکن علمی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری مختلف حیثیتوں سے سکندر کا عہد عہد آفریں قرار پانے کا مستحق ہے، شیخ محدث اخبار الاخیار میں ارقام فرماتے ہیں "زمان دولت سکندر زمان صلاح و تقویٰ و دیانت و امانت و علم و وقار بود" اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ "او را با علماء و صلحاء و اکابر و اشراف میلے عظیم شد"

ایک مطلق العنان بادشاہ میں جب کسی چیز کا "میل عظیم" پیدا ہو جائے تو اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ شیخ محدث ہی فرماتے ہیں۔

"لہٰذا از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بہ سابقہ استدعاء، وطلب، و بعضے بے آں

در عہد دولت او تشریف آوردہ توطن ایں دیار اختیار کردند" ص ۲۲۷

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گو اس سے پیشتر کے بادشاہوں کے عہد میں بیرونِ ہند سے آنے والوں کا

ایک سلسلہ اس ملک میں جاری تھا، مگر عموماً انعام و اکرام لے کر پھر یہ حضرات اپنے اصلی اوطان کی طرف لوٹ جاتے تھے سکندر ہی شاید پہلا ہندی بادشاہ ہے جس نے ان بزرگوں کو بھی جنہیں خود دعوت بھیج کر اس نے ہندوستان بلایا، جیسا کہ "سابقہ استدعا" سے ظاہر ہے یا جو خود اس کی قدردانیوں کا حال سن کر اس ملک میں آئے سب کو باصرار ہندوستان ہی میں رہنے اور اس کو وطن بنانے پر اس نے اصرار کیا، شیخ نے اس کے بعد اس عہد کے بزرگوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، لکھا ہے:۔ "چنانچہ اکثر بزرگان دریں طبقہ کہ مذکور می شوند از ان قبیل اند"

شیخ محدث پر عہد سکندری کے غیر معمولی امتیازات کا جو اثر تھا، اس کا اظہار آخر میں بایں الفاظ فرماتے ہیں۔ "بالحقیقۃ محامد زمان سلطنت آن سلطان سعادت نشان از حد تقریر و تحریر خارج است" ظاہر ہے کہ یہ کسی شاعر کا مبالغہ آمیز دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک عالم و محدث کی تاریخی شہادت ہے آخر میں سعدی کے اس مشہور شعر

اگر ایں جملہ را سعدی املا کند ۔۔۔ مگر دفترے دیگر انشا کند

پر عہد سکندری کے محامد و خصوصیات کے ذکر کو حضرت نے ختم فرمایا ہے، کاش! ان کے قلم سے "دفترے دیگر" عہدِ سکندری کے متعلق انشا پذیر ہو جاتا، تو علمی اور دینی تاریخ میں ہندوستان کے ایک اہم اور قیمتی مواد کا اضافہ ہو جاتا، اگرچہ مختلف تاریخوں میں جو بکھرے بکھرے واقعات ملتے ہیں، کوئی چاہے تو ان کو سمیٹ کر اس زمانہ کی انقلابی خصوصیتوں اور نئے اقدامات کو اجاگر کر سکتا ہے، اس بادشاہ کو حکومت کا وقت بھی کافی ملا ہے یعنی موجودہ زمانہ میں عموماً سرکاری خدمات کی جو انتہائی مدت ہے اس سے زیادہ ہی زمانہ ہے تقریباً تیس سال اس نے بادشاہی کی مدسمجھا جا سکتا ہے کہ اتنی طویل مدت میں کسی بادشاہ کا "میل عظیم" کن چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے کچھ قدرتی بات یہ بھی ہے کہ جس زمانہ میں جس قسم کے بادشاہ ہوتے ہیں، اسی قسم کا مذاق عوام میں بھی پھیل جاتا ہے۔ علم و فن کی جو قدردانیاں سکندری حکومت کی طرف سے مسلسل ہو رہی تھیں ان کے سوا ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف عہد سکندری کے مشہور امیر کبیر ملک زین الدین

اوران کے بھائی زبرالدین کا حال جیسا کہ شیخ محدث ہی نے لکھا ہے۔

"متعلاقہ صلاح وتقوی و خدمتگاری، اکثر علماء و مشائخ وقت را بایشاں محبتے ورجوع آمد"[۲۲۶]

اخبار ہی میں یہ بھی ہے کہ دلی کے نواح میں عموماً جو سیر حاصل شاداب گاؤں اور مواضع تھے ملک زین الدین نے بادشاہ سے انہیں جاگیر میں حاصل کر لیا تھا۔ ان کے بھائی زبرالدین جو حکومت کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، عموماً ان ہی دیہاتوں اور سبزگاہوں میں "علماء و صلحاء و صوفیاں ہمہ درصحبت او خوش می گذرانیدند (ص ۲۲۶) گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ علماء و صلحاء کے یہ دونوں بھائی اس زمانہ میں شاہی میزبان تھے۔ اسی طرح اسی زمانہ میں ایک خوش باش شخص شیخ جمالی دلّی میں تھے خود بھی صاحب علم و بصیرت تھے لکھا ہے کہ

بزیارت حرمین شریفین مشرف شدہ، مولانا عبدالرحمٰن جامی و جلال الدین محمد دوانی را علیہ الرحمۃ دریافتہ (اخبار الاخبار ص۲۲)

ان ہی شیخ جمالی کے صاحبزادے میاں عبدالحیی تھے جنہیں "مبلغ کثیر از ترکہ پدر رسیدہ بود" لیکن ان کا بھی یہی دستور تھا،

"در زمان افغانان ہر کہ از جنس طالب علم یا شاعر یا قلندر از ولایت بایں جانب می افتاد

لہ دراصل یہ لوگ بذات خود تو خاص کسی دولت و ثروت کے مالک نہیں تھے بلکہ شاہی خاندان کے ایک اہم رکن رکین خانجہاں نامی کی طرف سے شاہی دربار میں وکیل تھے اور خاں جہاں اُس وقت وہ ہزاری منصب پر سرفراز تھے، سکندر کو کچھ خان جہاں سے سوء مزاجی پیدا ہوگئی تھی، لیکن اپنی ناراضی کو وہ خان جہاں پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہتے ہیں اس نے درپردہ خاں جہاں کی ساری جاگیر کے متعلق ملک زین الدین کو یہ خفیہ فرمان لکھ دیا تھا۔ "ہر چیز از اموال و املاک خاں جہاں باشد تصرف نمائد و ہر نوع کہ داند خرچ کند چنانکہ خان جہاں را بریں معنی اطلاع نباشد" آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ از زین الدین حساب گرفتہ نشد ہیچ کس را باو کارے نیست" (اخبار الاخبار ص۲۲۶)

گویا درپردہ ملک زین الدین ہی کو خان جہاں کی جاگیر سلطان نے حوالہ کر دی تھی، اور خاں جہاں نام نہاد مالک تھے۔ شیخ نے لکھا ہے کہ ملک زین الدین نے اس دولت سے ناجائز نفع نہیں اُٹھایا بلکہ "ہمہ را بمصارف خیر و محال ثواب رسانید"

درمنزل او بود و بر ہر یک مہربانیہا و خدمتہا می کرد[1]۔

شیخ محدث نے لکھا ہے، کہ باپ کا سارا متروکہ " در مدتے از عمر خود صرف اوقات یاراں کرد (ص ۲۲۱)

بہر حال ان چند مثالوں سے اس چہل پہل کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے، جو دلی میں اس وقت تعلیم و تعلم علم و فن کے متعلق قائم ہو گئی تھی،

سکندر کے زمانہ میں اور کن کن پہلوؤں سے کیا کیا نئی باتیں پیدا ہوئیں، کن کن چیزوں میں کیا کیا انقلابات ہوئے، اس وقت ان کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے، بلکہ صرف "تعلیمی نصاب" میں جو انقلاب پیدا ہوا صرف اُسی کو ظاہر کرنا ہے، اس قصہ کا ذکر مولانا غلام علی آزاد شیخ محدث اور ان سے پہلے ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ دلی میں ارباب علم و فضل کا عہد سکندری میں جو غیر معمولی مجمع اکٹھا ہو گیا تھا، ان ہی میں دو بھائی شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ بھی تھے، دراصل یہ دونوں حضرات ملتان کے علاقہ میں تلنبہ نامی کسی قصبہ کے رہنے والے تھے، جو شاید اب کوئی غیر معروف گاؤں ہے، ان دونوں حضرات کو فن تدریس میں کمال حاصل تھا، شیخ عبداللہ کو تو سکندر نے دلی ہی میں رکھ لیا، اور مولانا عزیز اللہ سنبھل (مراد آباد) روانہ کر دیے گئے، جو اس زمانہ میں اس علاقہ کا مرکزی شہر تھا، سلطان سکندر شیخ عبداللہ کے طریقۂ درس و تعلیم کا گویا عاشق تھا، بدایونی نے لکھا ہے کہ "می گویند کہ سلطان سکندر در وقتِ درس شیخ عبداللہ مذکور می آمد (ص ۳۲۳)، اور آ کر کیا کرتا تھا، لکھتے ہیں کہ " در گوشۂ مجلس آہستہ می نشست و بعد از فراغ درس سلام علیکم گفتہ بایک دگر صحبت می داشتند (بدایونی ج ا ص ۳۲۴)

ایک مطلق العنان بادشاہ کا حلقۂ درس میں یوں دبے پاؤں آنا، اور درس کا سننا، اس وقت تک سنتے رہنا جب تک کہ درس ختم نہ ہو لے ۔ بہ ظاہر شاید معمولی بات معلوم ہو، لیکن

---

[1] قریب قریب ان کا حال وہی تھا جو ان دنوں سرکار آصفیہ کے پایۂ تخت (حیدر آباد دکن) میں مخدوم و محترم جناب مولوی فیض الدین صاحب وکیل کی حالت ہے۔ تقریباً بیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ممالک اسلامیہ خصوصاً عرب کے باشندے اس ملک میں جب آتے ہیں تو بغیر کسی اجازت و طلب کے مطلقاً وکیل صاحب کے وہ مہمان ہو جاتے ہیں، علماء کا قیام بھی زیادہ تر

شاہی رعب و دبدبہ کا حال جنہیں معلوم ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، خود تاریخوں میں اس کا نقل ہونا اس کی اہمیت کی دلیل ہو، مولانا عبداللہ ایک بہترین مدرس ہونے کے سوا بلا کے پڑھانے والے تھے، بداؤنی نے لکھا ہے کہ

"از استادان شنیدہ شد کہ زیادہ از چہل عالم تحریر نحریر از پائے دامن شیخ عبداللہ

مثل میاں لادن وجمال خاں[1] دہلوی ومیاں شیخ گوالیاری ومیراں سید جلال بداؤنی

ودیگراں برخاستہ اند" (ص ۳۲۴)

چالیس سے زیادہ معمولی نہیں "تحریر و نحریر" علما جس کے حلقہ درس سے اٹھے ہوں، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے کتنوں کو پڑھایا ہوگا۔ آج بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور کلیات وجوامع سے بھی سالہا سال گذر جانے کے بعد بمشکل چند ہی آدمی ایسے نکلتے ہیں جن کا علم وفضل قابل ذکر ہو، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہو کہ شیخ عبداللہ کے درس کی کیا نوعیت تھی۔

ان کے بھائی مولانا عزیز اللہ کے متعلق بھی بداؤنی ہی نے لکھا ہو کہ

"استحضارے عجیب داشتند کہ مغلقات متفطن ہر طور کتاب بے مشکل منتہیانہ را می خواندو بے مطالعہ درس
باوادہ معلومات حاضرہ ۱۲۔
می گفتند"

اسلامی علوم کی کتابوں کے درس وتدریس کا جن لوگوں کو تجربہ ہو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کا استحضار یعنی درس کی انتہائی کتابوں کا مطالعہ کے بغیر پڑھانے والے ہزاروں میں کوئی ایک دو ہی عالم ہوتے ہیں۔ خاکسار خود اپنے تیس چالیس سالہ تعلیمی تجربات کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہے کہ گو اس عرصہ میں ہر قسم اور ہر طبقہ کے علما، سے پڑھنے پڑھانے کا موقع ملتا رہا جن میں بعض اپنے عصر کے امام اور شیخ الکل تھے لیکن ایک حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہو کہ میاں لادن اور جمال خاں حقیقی بھائی ہیں، جمال خاں کے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں: "اعلم علمائے زماں خود بود در علوم عقلیہ ونقلیہ خصوصاً فقہ وکلام وعربیت وتفسیر بے نظیر بود بر شرح مفتاح محاکمہ کرد وعضدی را کہ کتاب منتہیانہ ست می گویند چہار بار از اول تا آخر درس گفتہ" (بداؤنی ص۴۲) نوے سال عمر پائی ۹۸۴ھ میں

کے سوا اس قسم کے استحضار کا تجربہ کسی کے متعلق نہیں ہوا، ملا عبدالقادر ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا عزیز اللہ کے علم کی پختگی اور ذہن کی تیزی کا یہ حال تھا کہ طلبہ

بارہا بامتحان پیش آمدہ اسولہ لا مدفع لہا	بسا اوقات بطور جانچ کے طلبہ شیخ عزیز اللہ کے سامنے
می آوردند شیخ مشارٌ الیہ در وقت افادہ	ایسے سوالات پیش کرتے جن کا جواب نہ ہوتا، لیکن شیخ
مشاحل ساختہ (ص ۱)	عین درس وافادہ کے وقت ان کو اسی وقت حل کر دیتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عہد سکندری کے انہی دونوں بزرگوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے درس و تدریس کا سلسلہ ختم ہوتا تھا، مولانا آزاد نے عبداللہ تلبنی کے ذکر میں لکھا ہے۔

برچار بالش افادہ نشست و شش جہت را بنشر لوامع علوم منور ساخت (ص ۱۹۱)

ہدایہ کے ہندوستانی شارحین میں مولانا الہداد جونپوری کی خاص شہرت ہے، مولانا آزاد کا بیان ہے کہ وہ "تلمیذ مولانا عبداللہ تلبنی نور اللہ ضریحہ ..... است" (ص ۱۹۲) اسی طرح شیخ عزیز اللہ نے جن شاگردوں کو پیدا کیا، ان میں مشہور و معروف صاحب درس عالم مولانا حاتم سنبھلی بھی ہیں، یہ اُستاد ہی کا رنگ تھا کہ ان کے درس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے :-

در مدت عمری گویند کہ از سی بار متجاوز شرح مفتاح را و از چہل مرتبہ بیش تر مطول را از بائے بسم اللہ تا تائے تمت درس گفتہ (ص ۳۲۴)

لہ مگر بدایونی کے بیان سے کچھ اور ہی بات ثابت ہوتی ہے، عہد سکندری کے علماء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، صاحب تصنیفات لائقہ و کتب فائقہ شیخ الہدیہ جونپوری است کہ بر ہدایہ فقہ شرحے مشتمل بر چند جلد نوشتہ" اگرچہ بجائے الہداد کے مطبوعہ نسخہ میں الہدیہ کا لفظ چھپا ہوا ہے لیکن یہ وہی الہداد ہیں جنہیں مولانا آزاد تلبنی کا شاگرد بتاتے ہیں، مگر بدایونی نے اس کے بعد جو یہ لکھا ہے کہ "سکندر لودی علماء دیار خود جمع کردہ بہ یک جانب شیخ عبداللہ و شیخ عزیز اللہ و جانب دیگر شیخ الہدیہ و پسر او را در بحث معارض ساخت" (ص ۳۲۵) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہدیہ یا الہداد کو تلبنی سے تلمذ کا تعلق نہ تھا کیونکہ اُستاد کے مقابلہ میں شاگرد کا میدان میں اُترنا کم از کم اس زمانہ کے اصول کے خلاف تھا، واللہ اعلم ۱۲۔

ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ بارہ سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ میاں حاتم سنبھلی کی قدم بوسی سے سرفراز ہوا تھا، ان کی خانقاہ میں قصیدۂ بردہ زبانی یاد کیا اور "کنز" کے ابتدائی اوراق تبرکاً ان سے پڑھے تھے، میاں صاحب نے ملا کو کلاہ و شجرہ بھی دیا تھا، درس و تدریس کے بعد جب درویشی رنگ میاں حاتم پر چڑھا تو

دہ سال در صحرائے نواحی سنبھل و امروہہ سر و پا برہنہ می گشت دریں مدت سر او بہ بالین و بستر نہ رسید (منتخب ج ۳ ص ۴)

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے ان دونوں ملتانی مدرسوں (شیخ عبداللہ و شیخ عزیز اللہ) کی اس حیثیت اور مقام کا اندازہ ہو سکتا ہے جو ہندوستان کے تدریسی و تعلیمی حلقوں میں ان کا قائم ہو گیا تھا اب سُنیے بالاتفاق ہمارے تعلیمی مورخین کا یہ بیان ہے کہ

"ایں ہر دو عزیز (شیخ عبداللہ و عزیز اللہ) ہنگام خرابی ملتان در ہندوستان آمدہ علم معقول را دریں دیار رواج دادند" (بداؤنی ص ۳۲۳)

مولانا غلام علی آزاد نے بھی اسی کی تصدیق کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

از خرابی ملتان او و شیخ عزیز اللہ تلبنی رخت بدار الخلافہ دہلی کشیدند و علم معقول را دریں دیار مروج ساختند۔ (مآثر ص ۱۹۱)

ورنہ اس سے پیشتر جیسا کہ عرض کرتا چلا آ رہا ہوں ان ہی مورخین کی یہ اتفاقی شہادت ہے۔[1]

قبل ازیں (یعنی ملتان کے ان دو کہنہ مشق عہد سکندری کے مدرسوں سے پہلے) بغیر از شرح شمسیہ (یعنی قطبی) و شرح صحائف از علم منطق و کلام در ہند شائع نہ بود (بداؤنی ص ۳۲۴۔ مآثر ص ۱۹۱)

جس کے یہی معنی ہوئے کہ "علم معقول" کی کتابوں کی زیادتی کا دور دورہ اسی زمانہ کے بعد

---

[1] ان عبارتوں پر نظر پڑنے کے بعد مجھے خوشی ہوئی جب مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کی کتاب ہندستان کی اسلامی درسگاہوں سے یہ معلوم ہوا کہ اسلامی ہند کے سب سے بڑے مورخ خصوصاً علمی تاریخ کے یعنی مولانا عبدالحیی مرحوم سابق ناظم ندوہ بھی معقولات کے متعلق پہلے انقلابی اقدام کا زمانہ سکندری عہد ہی کو خیال کرتے تھے اور انہی دونوں ملتانی عالموں کو اس

شروع ہوا، رہا یہ سوال کہ عہد سکندری کے تعلیمی نصاب میں معقولات کی کن کن کتابوں کا اضافہ ہوا، کوئی مفصل فہرست تو اس کی اب تک نہیں مل سکی ہے لیکن جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اسی قرن میں ملتان کے اندر ہم ایک مشہور معقولی عالم کو پاتے ہیں، جن کا نام مولانا سماء الدین تھا شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ یہ مولانا سماء الدین

جامع بود میانِ علوم رسمی و حقیقی .... وگویند پیش مولانا ثناء الدین کہ از شاگردان

میر سید شریف جرجانی بود تلمذ کردہ (ص ۲۱۱)

شیخ ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملتان ہی کے رہنے والے تھے، اور وہیں زمانہ دراز تک افادہ و استفادہ کی مجلسیں ان کے دم سے گرم تھیں، مگر ملتان کی بربادی کے بعد یہ بھی اس شہر کو چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے تھے شیخ کے الفاظ یہ ہیں :۔

"از ملتان بہ سبب بعضے وقائع کہ دراں دیار واقع شد برآمد" (ص ۲۱۱)

مولانا عبد اللہ رحمۃ اللہ کے متعلق بھی جیسا کہ گذر چکا ہے لکھا جاتا ہے کہ ملتان کی تباہی نے ان کو ہندوستان کی طرف رخ کرنے پر مجبور کیا، اور یہی قصہ مولانا سماء الدین کا بھی بیان کیا جاتا ہے، بجائے دلی کے یہ رن تھنبور[1] اور بیانہ کی طرف چلے گئے تھے گو آخری عمر دلی ہی میں گذری، شیخ محدث نے لکھا ہے کہ "سن کبیر داشت" ۹۰۱ھ میں وفات ہوئی یعنی سکندری دور حکومت میں ان کا انتقال

---

[1] یہ رنتھنبور ہندوستان کے ان مشہور قلعوں میں تھا جو استحکام و مضبوطی کے سوا اپنی مقامی خصوصیت میں بے نظیر تھا، مولوی محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ رن پہاڑ کو کہتے ہیں اور تھمبور کے معنی "جوشن پوش" جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ در اصل دو پہاڑ رن اور تھمبور برابر چلے گئے ہیں، قلعہ تھمبور پر ہے، علاء الدین خلجی نے رائے تھمبور دیو سے اس قلعہ کو فتح کیا، اکبر کے زمانہ میں اس پر راجہ سرجن کا قبضہ پھر ہو گیا تھا، اکبری اقبال نے ایک مہینہ بارہ دن میں اس کی قلعہ کشائی کی، لکھا ہے کہ ساٹھ ساٹھ من کی توپیں ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھادی گئی تھیں، ایک ایک توپ کو دو دو سو بیل اور سات سات سو آٹھ آٹھ سو کہاروں نے کھینچا، ایک ایک توپ سات سات من کا گولہ منہ سے اگلتی تھی، چند ہی دیر کے بعد راجہ نے اطاعت قبول کرلی قلعہ اکبر کے حوالہ کردیا۔ مولانا محمود حسن ٹونکی جنہوں نے ابتداء اسلام سے اس وقت تک کے ان مصنفین اسلام کی جنہوں نے عربی زبان میں کتابیں لکھی ہیں ایک ضخیم تاریخ عربی میں معجم المصنفین نامی لکھی ہے اور حکومت آصفیہ نے اس عجیب و غریب کتاب کی تدوین و ترتیب پر ہزارہا ہزار روپے خرچ کیے ہیں، اسی کتاب میں ایک موقع پر یہ عجیب اطلاع دی ہے کہ سوائی مادھو پور جو

بھی ہوا۔

کوئی خاص تصریح تو نہ ملی، لیکن غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ شیخ عبداللہ و شیخ عزیز اللہ نے ممکن ہے معقولات کا علم ان ہی مولانا سماء الدین سے حاصل کیا ہو، جب وہ یعنی مولانا سماء الدین بہ یک واسطہ میر سید شریف جرجانی کے شاگرد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان عقلی فنون کا ان پر جتنا غلبہ ہو کم ہے، اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ شرح مطالع، شرح حکمۃ العین، شرح مواقف جیسی کتابیں جن میں آخر الذکر دو کتابیں خود میر سید شریف اور اول الذکران کے استاذ قطب الدین رازی کی کتابیں ہیں، یہاں کے نصاب میں شریک ہوئی ہونگی، خصوصاً شرح مطالع پر جب میر صاحب کا معرکۃ الآرا حاشیہ بھی موجود ہے، بلکہ میر جرجانی کے ساتھ ساتھ علامہ تفتازانی کی کتابیں بھی اسی زمانہ میں شریک درس ہوئی ہوں تو کچھ تعجب نہیں ہے، تفتازانی کی کتاب مطول کا نام سب سے پہلے مجھے شیخ عزیز اللہ کے شاگرد رشید میاں حاتم سنبھلی کے تذکرہ میں ملتا ہے، بداؤنی کے حوالہ سے گذر چکا کہ چالیس مرتبہ سے زیادہ اس کتاب کو اول سے آخر تک اُنھوں نے پڑھایا تھا خیر معقولاتی کتابوں کے اضافہ کا یہ تو پہلا دور تھا، اس کے بعد لودیوں کی حکومت ختم ہو جاتی ہے، بابر مغل حکومت قائم کرتے ہیں، اتنا تو ہر اسکول کا بچہ بھی جانتا ہے کہ بابر کے بعد ہندوستان کا بادشاہ ہمایوں عقلی علوم کا حد سے زیادہ دلدادہ تھا[لہ] مشہور ہی ہے کہ اس کی موت ہی یوں واقع ہوئی کہ اپنے کتب خانہ کی سیڑھیوں سے وہ اُس وقت گرا جب ستارۂ زہرہ کے طلوع مسائی کا افق پر انتظار کر رہا تھا، تاہم تعلیمی حلقوں میں کسی خاص انقلاب کا اثر اس کے زمانہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ ہمایوں کے بعد دور اکبری شروع ہوا، مختلف دینی اور عقلی قلابازیوں سے گذرتے ہوئے اکبر کا دربار صرف فلسفہ اور حکمت کا دربار بن گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ شیراز کے ایک معقولی عالم غیاث منصور کے تفلسف اور منطق کا شہرہ ایران سے گذر کر ہندوستان پہنچ چکا تھا، اکبر تک یہ خبر پہنچائی گئی تھی کہ آج کل ایران میں ایک فلسفی ہے جو

"بہ نماز و عبادات و دیگر چیزہا اسے مقید نیست" (بداؤنی۔ ص ۳۱۵)

[لہ] شیخ محدث نے اپنی اس فارسی تاریخ میں جس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے، ہمایوں کے متعلق لکھا ہے "با علوم ریاضی د

جس خبط میں اکبر اس زمانہ میں مبتلا ہو چکا تھا، اُس کا اقتضا، تھا کہ جہاں تک ممکن ہو، اسی قسم کے لوگ دربار میں جمع کیے جائیں، ملّا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کی تلاش اکبر کو اس سبب سے رہتی تھی "کہ درسخناں مذہب و دین با ایں شاں ماشاۃ خواہد کرد" اتفاقاً اکبر کو خبر ملی کہ غیاث منصور کا ایک "شاگرد بے واسطہ" ان دنوں بیجاپور آیا ہوا ہے، یہ وہی ملّا فتح اللہ شیرازی ہیں جن کا کچھ ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

"درو ادی الہیات وریاضیات وطبیعیات و سائر اقسام علوم عقلی و نقلی ... نظیر خود نداشت"

ملّا عبدالقادر نے لکھا ہے: "برحسب فرماں طلب از پیش عادل خاں دکھنی (والی بیجاپور) بفتح پور رسید"[۲۱]

اگرچہ دلچسپ لطیفہ یہ پیش آیا کہ میر فتح اللہ کے متعلق اکبر کے جو توقعات تھے وہ غلط ثابت ہوئے میر امامیہ مشرب کے پیرو تھے، ملّا بداؤنی کا بیان ہے کہ فلسفہ و حکمت میں اس استغراق کے باوجود

"درو ادی مذہب خود استقامت تمام ورزیدہ ... دقیقہ از دقائق تعصب در دین فرو نگذاشت"

انتہا یہ ہے کہ

"درعین دیوانخانہ کہ ہیچ کس یارائے آں نداشت کہ علانیہ ادائے صلوٰۃ کند نماز بفراغ بال وجمعیت خاطر بمذہب امامیہ میگذارد"

لکھا ہے کہ "انچہ ما پنداشتیم" کی اس غلطی پر اکبر "مطلع شد اورا از زمرۂ ارباب تقلید شمردہ ازاں وادی اغماض فرمود" اور "بجہت رعایت علم وحکمت وتدبیر و مصلحت در تربیت او دقیقہ فروگذاشت نرفت"

مولانا غلام علی آزاد نے لکھا ہے:

"بکم ترفرصت بدولت مصاحبت فائز و قامت امتیاز بخلعت صدارت کل آراست"[۲۲]

یعنی "صدر جہانی" کے عہدہ پر میر فتح اللہ سرفراز ہوئے۔ اکبری دربار کے امیر مظفر خاں تربتی کو حکم دیا گیا کہ ان کی چھوٹی لڑکی میر فتح اللہ کے ازدواج میں دی جائے، بتدریج میر کا اقتدار بڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچا کہ "گو بہ بمنصب سہ ہزاری رسیدہ بود" (مآثر) اور آخر میں راجہ ٹوڈرمل وزیر اعظم کی وزارت میں بھی میر فتح اللہ کو شریک کر دیا گیا، بلکہ ملّا عبدالقادر کا بیان تو یہ ہے کہ

"درمنصب وزارت باراجہ ٹوڈرمل شریک ساختند امادیرانہ درکاروبار باراجہ درآمدہ دارو مداری می نمود" (ص ۳۱۶)

میر کو اکبر کے دربار سے امین الملک عضدالدولہ کے خطابات بھی وقتاً فوقتاً ملتے رہے، اکبر پر میر اور ان کی مختلف الجہات قابلیتوں کا کتنا اثر تھا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ سفر کشمیر سے واپسی کے موقعہ پر شہر ماندوجان میں جب میر فتح اللہ چند روزہ بیماری کے بعد راہی ملک عدم ہوئے تو اکبر روتا جاتا تھا اور یہ الفاظ بے ساختہ زبان پر جاری تھے۔

"میر وکیل و حکیم و طبیب منجم ما بود اندازہ سوگواری کہ تواند شناخت اگر بدست فرنگ افتادے وسائر محاصل حکومت وخزائن دربرابر خواستنے دریں سودا فراواں سودے کردمے" (مآثر ص ۲۳۵)

فیضی نے اکبر کی اسی سوگواری کی طرف اپنے مرثیہ میر میں اشارہ کیا ہے۔

شہنشاہ جہاں را در وفاتش دیدہ پرنم شد   سکندر اشک حسرت ریخت کافلاطون عالم شد

بہرحال گذشتہ بالا معلومات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میر فتح اللہ کی ہستی اکبری عہد میں کتنی وزندار و مؤثر ہستی تھی، اب اس کے بعد تعلیمی مورخین کا یہ بیان سنیے مولانا غلام علی آزاد فرماتے ہیں:-

"تصانیف علمائے متاخرین ولایت (ایران و خراسان وغیرہ) مثل محقق دوانی و میر صدرالدین و میر غیاث منصور و مرزا جان میر فتح اللہ شیرازی در ہندوستان آورد"

صرف یہی نہیں کہ ان ولایتی مشہور معقولیوں کی کتابیں وہ ہندوستان لائے کہ کتابوں کے لانے اور لیجانے کا کاروبار تو برابر ہی جاری تھا، اصل چیز جو قابل غور رہے وہ مولانا آزاد کا یہ فقرہ ہے کہ ان ہی میر فتح اللہ نے ان مصنفین کی کتابوں کو "در حلقۂ درس انداخت" (ص ۲۳۰)

شاید اس زمانہ میں اس کا سمجھنا دشوار ہو کہ ایک طرف تو میر فتح اللہ وزارت عظمیٰ کے کاروبار میں دار و مداری کرتے تھے، اکبر کے عظیم المرتبت ہندوستان کا بجٹ (موازنہ) تیار کرتے تھے، مولانا آزاد نے لکھا ہے:-

"میر فیصلے چند متضمن کفایت سرکار، ورفاہ رعایا از نظر گذرانید مرجۂ استحسان یافت" (مآثر ص ۲۳۰)

بلکہ اکبری عہد میں فینانس (مالیات) کی تنظیم کا مسئلہ خاص شہرت رکھتا ہے گو بہ ظاہر اس کارنامہ کو ٹوڈرمل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن کتابوں میں ہم جب ٹوڈرمل کے متعلق یہ پڑھتے ہیں کہ

"پیش از در ممالک ہند متصدیاں بقانون ہنود دفتری نوشتند راجہ ٹوڈرمل از نویسندگان ایران اخذ ضوابط نمودہ دفتر را بطور ولائت (ایران) درست کرد" (سیر المتاخرین ص ۲۰۰)

تو یہ باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جن ایرانی نویسندگان سے ٹوڈرمل نے دفتر کے ان ضوابط کو اخذ کیا تھا، ان میں سب سے بڑا ہاتھ ٹوڈرمل کے شریک وزارت عظمیٰ میر فتح اللہ شیرازی ہی کا ہوگا، حاصل یہ ہے کہ میر صاحب ایک طرف تو مہمات سلطنت میں مصروف نظر آتے ہیں، اور قلم ہی کی حد تک نہیں، ملا عبدالقادر بداؤنی نے لکھا ہے کہ فوجی کوچ میں میر کی ٹھاٹھ یہ ہوتی تھی۔

"تفنگ بر دوش وکیسہ دارو بر میان بستہ چوں قاصداں بصحرا در رکاب (اکبر) دوید" ص ۳۱۶

(بندوق [۱]، بارود [۲])

جب ٹوٹ جانے والی توپ اور ایک گردش میں گیارہ فیر والی بندوق کے موجد میر صاحب ہی تھے تو ان کے اس ٹھاٹھ پر تعجب کیوں کیجیے، مولانا غلام علی نے لکھا ہے کہ خاندیس کے حاکم راجہ علی خاں سے جو فوجی مقابلہ پیش آیا اس کی کمان میر فتح اللہ ہی کرتے تھے۔

ایک طرف ان کی کشوری اور فوجی مشغولیتوں کا یہ حال ہے لیکن دوسری طرف ہم دن کو تدریسی کتابوں کی حاشیہ نگاری میں مصروف پاتے ہیں، مولانا آزاد کا بیان ہے:۔

---

[۱] اگر کوئی بیچارہ مسلمان ہندوؤں کے قدیم طریقہ کو ناقص ٹھہرا کر جدید ضابطہ کو نافذ کرتا تو بے محابا اس پر تعصب کا تیر چلا دیا جاتا، لیکن شکر ہے کہ یہ انقلاب ایک ہندو وزیر کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا۔ مولوی عبدالحق صاحب (ترقی اردو) سچ کہتے ہیں کہ اردو زبان ہندوؤں کی پیدا کی ہوئی ہے۔ انہی نے اپنی دیسی زبانوں میں فارسی عربی الفاظ ملا کر ایک نئی بولی کی بنیاد ڈالی جو رفتہ رفتہ موجودہ شکل تک پہنچ گئی، اور فارسی چھوڑ کر ہندوؤں کی اس بولی کو مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیا، آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ انگریز اپنی زبان میں ہندوستانی الفاظ نہیں ملاتے لیکن ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی جس زبان کو آج بول رہا ہے انگریزی الفاظ کی اس میں کتنی بھرمار ہوتی ہے۔

از مصنفات او تکملہ حاشیہ علامہ دوانی ملا جلال بر تہذیب المنطق و حاشیہ و بر حاشیہ مذکور

متداول ست (ص ۲۳۸)

اور یہی نہیں کہ فرصت کے اوقات میں اکبر کے دربار کا یہ وزیر باتدبیر کبھی کبھی اپنی مدرسی زندگی کو ان علمی مشغلوں سے تازہ کیا کرتا تھا، بلکہ علم کا زہر اس علم گزیدہ شخص پر کچھ اس بُری طرح چڑھا ہوا تھا کہ کبھی کبھی ذکا ہی طور پر نہیں بلکہ باضابطہ جیسا کہ بداؤنی کا چشم دید مشاہدہ ہے کہ "یہ تعلیم اطفال امرا مقید بود" (ص ۳۱۶) خدا ہی جانتا ہے کہ ان کو فرصت کیسے میسر آتی تھی کہ "ہر روز بمنازل مقربان رفتہ" درس تدریس کے مشغلہ کو جاری کیے ہوئے تھے، صرف اعلیٰ درجوں کی انتہائی کتابوں ہی تک ان کا درس محدود نہ تھا بلکہ ملا بداؤنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ اور لوگوں کے "امرا زادہائے دیگر ہفت وہشت سالہ بلکہ خورد تر آں را معلم صبیانی می کرد" (ص ۳۱۶)

ایک طرف یہ تو آپ سُن ہی چکے کہ دوانی، صدر شیرازی، مرزا جان کی کتابوں کو وہ ہندوستان میں پھیلا رہے تھے، شرح ملا جلال پر حاشیہ لکھتے تھے، قرآن کی تفسیر میں کتابیں تصنیف کر رہے تھے، اور دوسری طرف ان کے تدریسی اور تعلیمی ذوق کی یہ انتہا تھی کہ ان سات آٹھ بلکہ ان سے بھی خورد سال امیرزادوں کو وہ بقول بداؤنی "تعلیم لفظ وخط دائرہ بلکہ ابجد ہم می داد (ص ۳۱۶) اور یہی چیز تھی جس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ اس زمانہ میں اس کا باور کرنا دشوار ہے[1]۔ اب خیال کیجیے کہ ملتان سے شیخ عبداللہ و عزیز اللہ معقولات کا جو ذخیرہ لائے تھے

[1] ابن خلدون کے مقدمہ کا مشہور فقرہ "العلماء ابعد الناس عن السیاسۃ" (یعنی علماء سیاسیات میں کورے ہوتے ہیں) اگرچہ یہاں علماء سے وہ اصطلاحی علماء مراد نہیں ہیں جنھیں اس زمانہ میں مولوی ملا وغیرہ کہتے ہیں، بلکہ عام علمی طبقہ مراد ہے، جیسا کہ ابن خلدون نے اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے، ممکن ہے جہانگیری کی حد تک ابن خلدون کا یہ نظریہ صحیح ہو کہ علمی افکار والے میدان جنگ میں عموماً صرف احتمال آفرینیوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بازی وہی لیجاتا ہے جو "نہ آرسی جانتا ہو نہ فارسی" جس کا کچھ تجربہ اس زمانہ میں بھی ہو رہا ہے لیکن سیاست کا دوسرا حصہ جسے ہم "جہاں داری" کہہ سکتے ہیں، کم از کم ہندوستان میں تو ابن خلدون کا نظریہ غلط ثابت ہوا ہے سب جانتے ہیں کہ اسلامی بادشاہانِ ہند میں بہترین شاداب عہد شاہجہاں کا ہے۔ کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے (باقی بر صفحہ ۱۹۶)

گو سکندری حکومت کی سرپرستی انہیں بھی حاصل تھی اور اسی لیے جس حد تک ان علوم کو ان دونوں نے رواج دینا چاہا اُس حد تک وہ مروج بھی ہو گئے لیکن ایران سے عقلیت کے جس طوفان کو میر فتح اللہ ہندوستان لائے اُسے تو سلطنت کی صرف پشتیبانی ہی نہیں حاصل تھی، بلکہ حکومت کے اساطین و اراکین کے گھر گھر میں ایک ایک بچہ کو میر صاحب یہ شیرازی شراب پورے انہماک و توجہ سے پلا رہے تھے، سوچنے کی بات ہے ملک کے تعلیمی ماحول پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا تھا، یقیناً یہی اس کا نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہی ہو کر رہا، جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا ہے۔

"ازاں عہد (از عہد فتح اللہ شیرازی) معقولات را رواجے دیگر پیدا شد" (ص ۲۴۰)

مولانا غلام علی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس "رواج دیگر" کا بڑا موثر سبب یہی تھا کہ میر صاحب نے کثرت سے اس ملک میں اپنے شاگرد پیدا کر دیے "جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند" خصوصاً جب میر کی محفل کے حاشیہ والوں میں عوام ہی نہیں، امراء زادگانِ حکومت ہوں،

اور یہ تھا ہمارے تعلیمی نصاب کا دوسرا انقلابی دور، یقیناً اسی زمانہ میں شرح تجرید قوشجی کے حواشی قدیمہ وجدیدہ واجد کا رواج اس ملک کے ارباب تعلیم میں ہوا، اور اسی زمانہ میں مرزا جان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۵) کہ شاہجہانی دور کے اس امتیاز میں شاہ جہاں کے مُلّا وزیر اعظم ملا سعد اللہ کی دماغی صلاحیتوں کو دخل نہ تھا۔ افسوس ہے کہ ملا سعد اللہ کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہوئی، ورنہ نظام الملک طوسی جیسے وزراء میں ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہندی بادشاہوں میں کچھ بھی ہو، اسے حکومت کی کتنی ہی قلیل مدت ملی ہو، لیکن شیر شاہ بادشاہ کے جہانگیرانہ اور جہاندارانہ دونوں کارنامے قطعاً غیر معمولی ہیں، ارباب خبرت و بصیرت جانتے ہیں کہ اکبری عہد کے اصلاحات کا بڑا حصہ آئین شیر شاہی سے ماخوذ ہے۔ شیر شاہی قدیم سڑکیں اب بھی ہندستان کے طول و عرض میں اس بادشاہ کی بیداری و اولوالعزمی کا گیت گا رہی ہیں، لیکن ان شیر شاہی کارناموں میں اگر مجھے جونپور کے مدرسوں کی وہ تعلیم نظر آتی ہے جو رغبتے بہ تحصیل عربیت نمود (سیر المتاخرین ص ۱۵۸) کے بعد شیر شاہ کو حاصل ہوئی تو اس خیال سے مجھے کیوں ہٹایا جا سکتا ہے۔ والتفصیل یجز الی التطویل۔

الفنسٹن اور برنیر نے ملا سعد اللہ شاہجہانی وزیر کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں: "سرزمین ہند میں سعد اللہ خاں سے بڑھ کر کوئی مدبر کوئی قابل کوئی راستباز وزیر پیدا نہیں ہوا، اس کی ذات پر ہندوستان جتنا ناز کرے بجا ہے" (حیات جلیل صفحہ ۲۸) اور میں کہتا ہوں کہ ہندستان کی تعلیم کا ملایانہ نظام جتنا چاہے ملا پر فخر کر سکتا ہے۔

سے کے حواشی محاکمات و عضدیہ و قدیمہ وغیرہ نے یہاں مقبولیت حاصل کی، دوانیؔ کی دونوں درسی کتابیں حسال تک نصاب میں شریک تھیں، اور پرانے مدرسوں میں اب بھی ہیں۔ یعنی ملّا جلال اور عقائد جلالی اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں، ملا فتح اللہ شیرازی کے بعد ہندوستان میں معقولات کی جو کتابیں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں عجیب بات ہے کہ ان کا تفصیلی تذکرہ ہمیں ایک ایسے شخص کے ذکر میں ملتا ہے جو مسلمان تو نہیں تھا، لیکن اس زمانہ کی درسی کتابیں آگرہ میں پڑھایا کرتا تھا، اس کا نام کامراں تھا اور حکیم کامراں کے نام سے مشہور تھا، دبستان المذاہب میں

لہ یہ دوان نامی قریہ کی طرف نسبت ہے، ہمارے مدارس میں عموماً اس لفظ کا تلفظ واو کی تشدید کے ساتھ کیا جاتا ہے، لیکن خود ایک ایرانی مورخ اس کے متعلق لکھتا ہے: دوان علی وزن ہوان۔ دوسری کتابوں میں بھی ضبط اعراب کرتے ہوئے یہی لکھا گیا ہے، اسی کتاب میں ہے کہ گازرون کا یہ ایک قریہ ہے۔ اسی میں ہے کہ علامہ دوانی نے ایک پہاڑ کی چوٹی پر منزل عالی بنوائی تھی جو دشت ارژن کی طرف مشرف تھی یہ دشت ارژن وہی ہے جس کی قدیم ایرانی جغرافیہ نویسوں نے بڑی تعریف بیان کی ہے، سرسبز و سیح مرغزار موسم برسات میں ایک جھیل تیس میل لمبی پیدا ہو جاتی تھی جس میں مچھلیاں بھی بکثرت ہوتی تھیں۔ وارژن تلخ بادام کو کہتے ہیں غالباً اس کا جنگل کبھی وہاں تھا۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے اپنے مطالعہ کے لیے یہ محل تعمیر کیا تھا۔ روضات الجنات جس کتاب سے یہ مضمون لیا گیا ہے اس کے مصنف نے لکھا ہے کہ "ہوالی الآن باقٍ یری من بعید" (ص ۱۳۲) یعنی علامہ کی یہ پہاڑی کوٹھی اب بھی موجود ہے دور سے نظر آتی ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ وسعت و استحکام دونوں لحاظ سے یہ عمارت غیر معمولی ہوگی اس سلسلہ میں اس کا ذکر بیجا نہ ہوگا مدارس والے تو واقف ہیں لیکن عوام نہ جانتے ہوں اور عوام کیا اب تو خواص بھی مشکل سے واقف ہونگے کہ قدیمہ جدیدہ اجد کیا چیز ہے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے محقق طوسی نے علم کلام میں تجرید نامی متن لکھا تھا علامہ علی قوشجی نے اس کی شرح لکھی شرح پر دوانی نے حاشیہ لکھا، ان کے معاصر امیر صدر الدین الاشتکی نے بھی شرح تجرید پر حاشیہ لکھا جس میں دوانی پر چوٹیں کی گئی تھیں، دوانی نے اس کا جواب لکھا، الاشتکی نے پھر اس کا جواب لکھا، دوانی نے جواب الجواب تحریر کیا، یوں دوانی کے تین حاشیے قدیمہ جدیدہ اجد ہوگئے۔ صدر الدین مرگئے تھے ان کے بیٹے امیر غیاث منصور جو غیاث الحکماء کے نام سے مشہور ہیں والد کی طرف سے جواب لکھا، اب اُدھر بھی وہی تین قدیمہ جدیدہ اجد ہوگئے۔ ذہنی زور آزمائیوں کا ان کتابوں میں طوفان اُبلتا تھا، علماء نے درس میں داخل کیا ان پر حواشی مرزا جان آقا حسین خوانساری نے لکھے اور اب عفت الدیار محلها و مقامها خاکسار کے خاندانی کتب خانہ میں یہ سارے حواشی قلمی موجود تھے جن کا کچھ حصہ نواب صدر یار جنگ بہادر کے کتب خانہ حبیبیہ میں محفوظ کرا دیا گیا کہ اب نہ ان کا کوئی پڑھنے والا ہے نہ پڑھانے والا مقصود اس ذکر سے یہ ہے کہ ایک ایک گاؤں میں علم کا سرمایہ کتنا محفوظ تھا۔ لہ (برصفحہ ۱۹۸)

اس شخص کا تذکرہ تفصیل سے پایا جاتا ہے، لکھا ہے کہ حکیم کامراں شیرازی او نیز

"حکیم کامراں شیرازی او نیز ہ سپر کیش مشائین ست علوم عقلی و نقلی رانیکو مستحضر بود"

یعنی بجائے کسی دین کے فلسفہ مشائیہ ہی کو اس نے اپنا کیش اور مذہب بنا لیا تھا، یہ بھی لکھا ہے کہ

"بعد از کسب کمال بگووہ کہ از بنادر فرنگ است افتاد و بہ مجالست ایشاں رغبت نمودہ کیش نصاریٰ

جلوہ گر آمد، لاجرم انجیل رانیکو آموخت و از علوم ایشاں مایہا اندوخت و بعد ازیں بہ ہند آمدہ بار اجہا

آشنا شدہ و بکیش ایشاں گام زدہ و شاستر ہندوی یعنی علوم ایشاں نزد براہمہ فاضل بخواندہ و دراں نیز

سر آمد دانایان ہند شد"

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کے مروجہ علوم و فنون کے علاوہ حکیم کامراں نے یورپین پادریوں اور ہندی پنڈتوں سے بھی ان کے علوم سیکھے تھے، اسی کتاب میں لکھا ہے :-

---

(حاشیہ صفحہ ۱۹۱) ؎ دبستان المذاہب ایک دلچسپ کتاب ہے، اس کا مصنف کون ہے صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا بعض لوگ اس کو داراشکوہ کی کتاب بتاتے ہیں بعضے ملا محسن فانی کشمیری کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن مآثر الامراء میں ہے "ذوالفقار اردستانی موبد تخلص دردبستان خود کہ حاوی اکثر اعتقادات اہل ہنود و مجوس و مذاہب مروجہ اہل اسلام است" (ج ۲ ص ۲۹۲) جس سے معلوم ہوا کہ اس کا مصنف یہی ذوالفقار اردستانی ہے، لیکن خود کتاب کی اندرونی شہادتوں سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف کوئی مسلمان نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ ذوالفقار کسی مسلمان ہی کا نام ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم ۱۲

(حاشیہ صفحہ ہذ) ؎ لیکن یہ واقعہ ہے کہ حکیم کامراں کسی مذہب کا پابند نہ تھا، بہ ظاہر پارسی النسل آدمی معلوم ہوتا ہے ایرانی علماء سے عربی و فارسی کی تحصیل کی تھی، فلسفہ میں غلو تھا اور فلسفہ ہی کو اس احمق نے اپنا مذہب بنا لیا تھا، دبستان المذاہب والے نے لکھا ہے کہ "موسیٰ را جادوگر دانستے و رقی موسیٰ خواندے، و عیسیٰ را طبیب شمردے و حکیم عیسیٰ بن یوسف نجار گفتے" العیاذ باللہ۔ یوں ہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی شان میں وہی پرانا قول "شاعر او مجنون" کو ان الفاظ میں دہراتا۔ "محمد رسول اللہ را ملک الشعرائے عرب نامیدے" اور اس حد تک تو غنیمت ہے بیچارے کرشن جی مہاراج کو کہتا "کشن اوتار را چھنال یعنی شہوت پرست و زانی خواندے" اگرچہ اس میں کامراں کی شرارت کے سوا خود اُن بیہودہ روایتوں کو بھی دخل ہے جنہیں ہندو کرشن جی کے بارے میں پھیلاتے رہتے ہیں، اشارہ وہی گوپیوں کے قصے کی طرف کر رہا ہے۔ کامراں نے اپنا مذہب فلسفہ قرار دیا تھا جب مر رہا تھا تو صاحب دبستاں نے لکھا ہے: "پیوستہ بقراءت الٰہیاتِ شفا و ترجمہ اثولوجیا مشغول و شاداں می سرود" یہ بھی کہتا تھا کہ بہ نجات فلاسفہ ایمان دارم و از ادیان و ند ہب سبلے زادم، و در ہنگام گذشتن (جب دم نکل رہا تھا) (باقی بر صفحہ ۱۹۹)

"در ہزار و پنجاہ ۱۰۵۰ھ در سرائے فرخ نزدیک بہ اکبرآباد بسر منزل تجرد گزید"

یعنی ایک ہزار پچاس ہجری میں آگرہ کے نزدیک سرائے فرخ نامی مقام میں اس کا انتقال ہوگیا چونکہ "عمر او از صد سال گذشتہ بود" اس لیے ضرور ہے کہ ہندوستان میں اس نے اکبر جہاں گیر کے زمانہ کے سوا شاہ جہاں کا عہد بھی کچھ پایا تھا۔ صاحب دبستاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیشہ تو اس کا تجارت تھا، جیسا کہ عموماً پارسیوں کا مذاق ہے لیکن اسی کے ساتھ درس بھی دیتا تھا منجملہ بہت سے شاگردوں کے کامراں کا ایک شاگرد کوئی عبدالرسول نامی شخص بھی تھا، دبستاں میں ہے کہ کامراں نے اسی عبدالرسول کو خود پڑھایا تھا، چونکہ اس بیان سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ملا فتح اللہ کے بعد ہندستان میں معقولات کی کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، اس لیے بجنسہ صاحب دبستاں کے الفاظ میں ان کتابوں کے نام اور ان کے درس کی جو ترتیب بھی نقل کرتا ہوں لکھا ہے کہ

"بعد از صرف و نحو شرح شمسیہ (قطبی)، آں گاہ طبعیات شرح ہدایت حکمت حسین بن معین الدین میبذی، و پس امور عامہ شرح حکمۃ العین و بعد ازاں شرح تجرید با حواشی و بعد ازاں طبعیات شرح اشارات و پس الٰہیات شفا تعلیم کرد"

شرح تجرید با حواشی کا مطلب وہی ہے کہ صدر معاصر اور دوانی کے مناظرانہ حواشی جو قدیمہ، جدیدہ، اجد کے نام سے مشہور ہیں۔ نیز مرزا جان کے جو حواشی ان پر ہیں، ان کی تعلیم بھی اس زمانہ میں مروج تھی، حکیم کامراں علاوہ فلسفہ کے ریاضی کی کتابیں بھی پڑھاتا تھا، دبستاں ہی میں ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۵) نام واجب الوجود و عقول و نفوس و کواکب می گفت۔ وصیت کی تھی کہ دفن کرنے کی میرے یہ صورت ہو "مرا سر بہ مشرق و پا بہ مغرب دفن کنید کہ جمیع بزرگاں چوں ارسطو و افلاطون چنیں خوابیدہ اند" اس کا ایک غلام یا نوکر ہوشیار تھا حسب وصیت "بر سر قبرش تا یک ہفتہ ہر روز شب بخوران کواکب کہ آں روز و شب بدو تعلق دارد بیفروخت واں خورد و پوش کہ منسوب بداں کوکب است بہ براہمہ و مستحقاں رساند" کامراں کے مزاج میں ظرافت بھی تھی اس سے پوچھا گیا کہ خلاصہ عقیدہ سنی و شیعہ بیان کن۔ جواب داد کہ عقیدہ سنی این ست بعد حمد اللہ تعالیٰ و نعت رسول صلوٰۃ اللہ و رحمۃ اللہ علی جمیع الفاسقین و الفاسقات و الفاجرین و الفاجرات، و عقیدہ شیع این ست بعد حمد اللہ تعالیٰ و نعت رسول صلوٰۃ اللہ لعنۃ اللہ علی جمیع المومنین المومنات و المسلمین المسلمات"۔ عجیب مسخرہ تھا

"ملا یعقوب نزد او تحریر اقلیدس و شرح تذکرہ خواند"

واللہ اعلم بالصواب دبستان کی یہ روایت کہاں تک درست ہے کہ "میر شریف مطول و تفسیر بیضاوی خواندہ" یہ میر سید شریف جرجانی نہیں بلکہ دوسرے میر شریف ہیں اسی میں یہ بھی ہے کہ

"ملا عصام پیش او تفسیر بیضاوی خواندہ ..... و توضیح و تلویح کہ در اصول فقہ حنفی ست خواندہ" ص ۳۱

خدا جانے یہ ملا عصام کون ہیں اور حکیم کامراں سے پڑھنے کا موقع ان کو ہندوستان میں ملا یا ہندوستان سے باہر کیونکہ ملا عصام جو مشہور ہیں وہ تو غالباً ہندوستان نہیں آئے۔

بہر حال کچھ بھی ہو، اس سے ایک طرف اس زمانہ کی درسی کتابوں کا حال اگر معلوم ہوتا ہے، تو اسی کے ساتھ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں بھی تھے لیکن چونکہ پڑھتے پڑھاتے تھے ان ہی علوم و فنون کو جو مسلمانوں کے یہاں مروج تھے، اس لیے علاوہ معقولات کے دینیات

ؔ غالباً یہ وہی ملا یعقوب ہیں جو ملا یعقوب کشمیری کے نام سے مشہور ہیں، صرفی تخلص کرتے تھے بداؤنی نے اپنی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے کہ "بزیارت حرمین شریفین مشرف شدہ و سند حدیث از شیخ ابن حجر داشتہ" ملا صاحب کے ملنے والوں میں تھے ان کے نام خطوط بھی ہیں جو اسی تاریخ میں منقول ہیں، ملا یعقوب کے متعلق بداؤنی کی شہادت ہے "در جمیع علوم عربیت از تفسیر و حدیث و تصوف مشارٌ الیہ و معتمد علیہ و سند امام ست" (ص ۱۴۲) ملا عبدالقادر نے یہ بھی لکھا ہے: "تفسیرے در آخر عمر چوں تفسیر کبیری خواست کہ بنویسد دو پارہ مسودہ کردہ ناگاہ سرنوشت ازل پیش آمد" یعنی مرگئے۔

یہ بھی اسی میں ہے کہ پادشاہ مغفرت پناہ (ہمایوں) و ہم شاہنشاہی (اکبر) را نسبت بوئے اعتقاد غریب بود، شرفِ صحبت اختصاص یافتہ و منظور نظر شفقت اثر گشتہ و معزز و مکرم و محترم بود" آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان میں علم حدیث کے جاننے والے کیسے کیسے لوگ ہیں لیکن بعض لوگ ہیں کہ ایک صغانی پر قصہ ختم کر دیتے ہیں، صرف منتخب التواریخ سے بیسیوں آدمیوں کے نام منتخب کیے جا سکتے ہیں۔

ؔ حکیم کامراں کے تذکرے سے جہاں درسی کتابوں کا سراغ ملتا ہے وہیں اس کا بھی کہ ہندوستان میں شفا، اشارات حکمۃ العین، شرح تجرید، شرح تذکرہ وغیرہ کتابیں عام طور پر پائی جاتی تھیں۔ اثولوجیا جو مسلمانوں میں ارسطو کی کتاب سمجھی جاتی ہے، اگرچہ اس کی نہیں بلکہ نیو افلاطن اسکندرانی کی اشراقی کتاب ہے، لیکن بہرحال فلسفہ کی چوٹی کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، آپ سن چکے وہ بھی موجود تھی، دبستان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صد سالہ بڈھے کے پاس بڑا کتب خانہ تھا۔

کتابہائے حکما را بہ ہشیار نامی سپرد ہشیار در آگرہ کتابہائے او را بخش کردہ بہ یاران فرستاد (ص ۳۰)

یا نیم دینیات کی کتابوں کا بھی وہ درس دیتے تھے، اور مسلمان طلبہ ان سے پڑھتے تھے۔ آپ کو حکیم کامراں کے قصہ سے اس کا بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ عقلی علوم کے کیسے کیسے ماہرین اس ملک میں آآکر اکٹھے ہو رہے تھے، اسی قسم کے مشرب و مسلک کا ایک آدمی دستور نامی بھی تھا جو بلخ میں پیدا ہوا تھا اور "درسال ہزار و پنجاہ و چہار" یعنی حکیم کامراں کے مرنے کے چار سال بعد "بلاہور آمد" صاحب دبستان نے لکھا ہے کہ

"در خدمت شاگرد ملا میرزا جان تحصیل حکمت نمود پس با یران خرامیده و با میر محمد باقر داماد و شیخ بہاء الدین محمد و ابوالقاسم فندرسکی و فضلائے دیگر و علمائے شیراز صحبت داشته ما بہا اندوخت" (دبستان ص ۲۰۶)

ایک اور پارسی عالم ہیربد کو بھی صاحب دبستان نے بایں الفاظ روشناس کیا ہے "حکیم الٰہی ہیربد کہ در لاہور نامہ نگار (مصنف کتاب) بدو رسید" اس کے بعد لکھتا ہے: "او مردے بود از نژاد زردشت خشور یزداں در دانش پارسی رسا" جس سے معلوم ہوا کہ وہ پارسیوں کا کوئی موبد تھا، لیکن اس زمانہ میں ان لوگوں کا کیا حال تھا، لکھا ہے کہ

"تحصیل عربیت و حکمیات در شیراز نموده با فرہنگیاں فرنگ صحبت داشته انجام بہند پیوست"

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغربی علوم و فنون سے پارسیوں کی دلچسپی بہت قدیم ہے، اور یہ تو خیر غیر مسلم لوگ ہیں، جنہوں نے مسلمانوں سے معقولات کی تعلیم حاصل کی تھی، فتح اللہ شیرازی کے بعد اکبر اور اکبر کے بعد بھی مسلمان معقولیوں کا ہندوستان میں تانتا بندھ گیا تھا، فارغی شیرازی جس کا ہیں نے کہیں پہلے بھی ذکر کیا ہے، ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ "برادر شاہ فتح اللہ ست" اسی فارغی شیرازی کے صاحبزادے میر تقی کے متعلق ملا عبدالقادر کی شہادت ہے کہ "در علم ہیئت و نجوم قائم مقام

ؔ پارسیوں کا خیال ہے کہ ہم مسلمان لوگ رسول اور نبی کے لفظ سے جو مراد لیتے ہیں وہی معنی پارسی میں "خشور" کے ہیں حکیم کامراں سے اسی دبستان میں مختلف اقوام کے ہداۃ اور ان زبانوں میں ان کے جو نام ہیں، نقل کیا ہے بعض چیزیں اس میں بالکل نئی ہیں "پیغمبران فارس کہ ابا، و زردشت و امثال آنند وایشاں را وخشور گویند و رسولاں یونان و روم کہ فیثا غورس، و ہرمس و امثال ایشانند وایشاں را صاحب ناموس خوانند و انبیاء ہند کہ رام و کشن و مانند ایشانند ایشاں را اوتار نامند و پیغمبران اتراک اغیر بت داغوز خاں وایشاں را بولماس سرایند و پیغمبران اسلامیہ کہ از آدم صفی تا محمد ایشاں را رسل گویند" ص ۳۰۵

شاہ فتح اللہ بود" ملا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے "کہ مقیر پارۂ از بست باب ..... پیش او گذرانید"
میر فتح اللہ کا حال اور ان علوم میں جوان کا پایہ تھا، خصوصاً ریاضیات کے متعلق ملا عبد القادر نے لکھا ہے "دریں فن آں قدر حالت داشت کہ اگر بادشاہ متوجہ می شدند رصد می توانست بست" (ج ۳ ص ۱۵۴) جو رصد بندی کی قدرت رکھتا ہو، اس کی قائم مقامی کوئی معمولی بات نہیں ہے، اکبر ہی کے زمانہ میں علامہ جلال الدین دوانی کے گھرانے کے ایک عالم عین الملک جن کا خطاب تھا ہندوستان آئے، اگرچہ ملازم تو وہ شعبۂ طبابت میں تھے خصوصاً امراض چشم اور کحالی قدح زنی میں کمال تھا، لیکن جب یہ معلوم ہے کہ "از جانب والدہ از فرزندان علامہ جلال الدین دوانی" (ص ۲۳۰) تو ان کی معقولیت جس پیمانہ پر ہوگی ظاہر ہے، اکبر ہی کے زمانہ میں ملا نور اللہ شستری بھی ایران سے آئے اور لاہور کے قاضی ہوئے، قاضی نور اللہ کا مذہب جو کچھ بھی ہو لیکن علوم عقلیہ بلکہ شاید نقلیہ[1] میں بھی جو دستگاہ ان کو حاصل تھی، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، شرح تجرید کے الہیات پر شرح چغمنی پر قدیمہ پر ان کے حواشی ان علوم کے ماہرین کے حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

عہد اکبری میں عقلیات کی جو کتابیں عام طور پر درس و تدریس میں زیر استعمال تھیں ان

---

[1] میں نے نقلیہ اس لیے لکھا کہ شیعی دینیات کے سوا ہم تاریخوں میں پاتے ہیں کہ ابن حزم کی محلی کا خلاصہ بھی انہوں نے لکھا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ محلی جیسی ضخیم کتاب تیس جلدوں میں ہندوستان آ چکی تھی، اس کتاب کے خلاصہ کرنے کی وجہ باوجود شیعی ہونے کے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکبر کے سامنے لاہور میں جب وہاں کے قاضی ضعف پیری کی وجہ سے گر پڑے تو اکبر نے حکم دیا ان کی جگہ دوسرے عالم کا تقرر کیا جائے، اب ان بڑے میاں سے کام نہ چلے گا، حکیم ابوالفتح نے نور اللہ شوستری کو پیش کر دیا۔ بظاہر انہوں نے تقیہ سے کام لیا اور اپنا مذہب ظاہر نہ کیا، صرف بادشاہ سے یہ اجازت چاہی کہ اہل سنت کے مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب کے مطابق اگر فیصلہ کروں تو مجھے اس کی اجازت دی جائے۔ اکبر نے اجازت دے دی۔ قاضی صاحب ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ہر مسئلہ میں کوئی ایسی صورت نکالتے جو امامیہ مذہب کے مطابق ہو جاتا اور کہہ دیتے کہ فلاں امام کے یہاں بھی یہ روایت ہے، غالباً اسی غرض سے محلی کا مطالعہ کرتے ہونگے اور اپنے کاروبار کے لیے اس کا خلاصہ کیا ہوگا، لیکن بات چھپی نہ رہی جہانگیر کے زمانہ میں ان کی ایک کتاب مجالس المومنین پکڑی گئی جو تبرا سے بھری ہوئی تھی، جہانگیر نے خاردار درّے سے حد لگانے کا حکم دیا، کہتے ہیں کہ نور جہاں جو جہانگیر کی پشت پر اس کے پیچھے بیٹھی رہتی تھی الامد دباتی رہی کہ ایسا نہ کرو، لیکن اس وقت اس کا حال اور تھا۔ جاناں بہ تو جان دادہ ام ایمان نہ دادہ ام کہتا جاتا تھا، قاضی نور اللہ درّہ کی مار سے مر گئے، شیعوں میں اسی لیے شہید ثالث کے نام سے موسوم ہیں دیکھیے نجوم السماء تاریخ علماء شیعہ۔

کا کچھ پتہ ملا عالم کابلی کے اس طرزِ عمل سے بھی ہوتا ہے جس کا تذکرہ ملا عبد القادر نے بایں الفاظ کیا ہے۔

"در بیاضِ خود تقریبے در بحث شرح مقاصد نوشتہ واشعارے کردہ کہ ایں عبارت از کتاب قصد است کہ از جملہ مصنفات کاتب است وہم چنیں تجدید در مقابل شرح تجرید ویک دو حاشیہ بر مطول نوشتہ وگفتہ کہ ایں تقریر نقل از کتاب طوّل است کہ در برابر مُطول واطول ست" (ج ۳ ص ۲۴)

مطلب یہ ہے کہ ملا عالم کے مزاج میں ظرافت وخوش طبعی کا فطری مادہ تھا، واقعہ میں ان کی کوئی تصنیف تو تھی نہیں لیکن قصد اور تجدید، طوّل یہ اپنی فرضی کتابوں کا نام رکھ دیا تھا، ملا صاحب نے ان کے اشعار بھی نقل کیے ہیں، جن میں اپنی ان فرضی کتابوں کا نام بھی لیا ہے اور اس زمانہ کی مشہور کتابوں مثلاً شرح مواقف شرح حکمۃ العین وغیرہ سے مقابلہ کیا ہے، بعض اشعار یہ ہیں۔

دیدہ بودی نسخہ تجدید | کہ مجدد رسید فیض جدید
کاندر وصد مواقف است نہاں | وزبیانش مقاصد ست عیاں
متن تجرید پیش اولنگ است | گلشن از قحط آب بیرنگ ست
لمداش بے تکلف واغراق | حکمت عین وحکمت اشراق

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرح مواقف، شرح مقاصد، شرح تجرید، شرح حکمۃ العین، حکمۃ الاشراق وغیرہ کتابوں کا اس زمانہ میں ہندوستان کے علمی حلقوں میں عام چرچا تھا۔

لیکن باوجود اس کے پھر بھی جہاں تک واقعات سے اندازہ ہوتا ہے ملک کے عام تعلیمی نصاب میں معقولات کی ان کتابوں کی حیثیت لازمی اجزاء وعناصر کی نہ تھی کیونکہ اکبر اور اکبر کے بعد ہم جہاں تک مستقبل کی طرف بڑھتے چلے آتے ہیں ہندوستان کے عام اہل علم پر معقول کا رنگ نظر آتا ہے کہ زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا ہے، اور نواور سیدنا الامام حضرت مجدد سرہندی قدس اللہ سرہ نے حالانکہ جو کچھ لکھا ہے عقلیت کے اسی رنگ کو پھاڑنے کے لیے لکھا ہے لیکن عقلیت کے خلاف ان کا سارا کلام جیسا کہ پڑھنے والوں پر مخفی نہیں سراسر عقلی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی حال

حضرت شاہ ولی اللہ اور مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہم جیسے بزرگوں کا ہے کہ نشانہ سب کا وہی غلط عقلیت ہے جس میں لوگ مذہب کے باب میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن عقلیت کی تردید جب تک خود اسی عقلیت کی راہ سے نہیں کی گئی ہو ایسی تردیدوں کو اپنے زمانہ میں کبھی پذیرائی میسر نہیں آئی، مجدد صاحب کی تجدید کا گر ہی یہ ہے کہ قرآنی اصول۔ ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (نہیں بھیجا ہم نے کسی رسول کو لیکن اس کی قوم کی زبان میں) کے زیر اثر انہوں نے کام کیا۔

خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ منطق و فلسفہ کے اس دور دورے کے باوجود جہاں تک واقعات کا اقتضاء ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان عقلی مضامین کی حیثیت مدت تک اختیاری مضامین کی رہی جہانگیری عہد کے عالم حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں، اخبار الاخیار کے آخر میں اپنے حالات شیخ نے خود لکھے ہیں، جن میں اپنی تعلیم کا بھی ذکر فرمایا ہے، اس سلسلہ میں جو کتابیں آپ نے پڑھی ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "سیزدہ سالہ بودم کہ شرح شمسیہ و شرح عقائد می خواندم" شرح شمسیہ سے تو وہی قطبی مراد ہے، اور شرح عقائد سے شاید شرح عقائد نسفی مقصود ہو، شرح صحائف کی جگہ غالباً شیخ نے یہی کتاب عقائد میں پڑھی تھی جو اب تک درس نظامیہ کے نصاب میں شریک ہے۔ آگے لکھا ہے کہ "در پانزدہ و شانزدہ مختصر و مطول را گذراندم" گذر چکا کہ علامہ تفتازانی کی ان دونوں کتابوں کا اضافہ شیخ عبداللہ و عزیز اللہ کے ذریعہ سے سکندر لودی کے زمانہ سے ہوا، اس کے بعد شیخ محدث فرماتے ہیں

"ہیش تر یا پس تر بیک سال از عدد کہ ظرفا در شمار عمر از ذکر آں ملاحظہ کنند از علوم عقلی و نقلی علوم آنچہ در افادہ و استفادہ از صورت و مادہ کافی و وافی باشد تمام کردم"

عبارت میں کچھ اغلاق ہے، یا کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے، حاصل یہی ہے کہ وہی پندرہ سولہ کی عمر کے ایک سال آگے یا پیچھے عقلی و نقلی علوم سے شیخ فارغ ہو گئے، جہاں تک میرا خیال ہے معقولات میں مذکورہ بالا کتابوں سے آگے شیخ نے شاید اس فن کے ساتھ زیادہ اشتغال نہیں رکھا، اپنے والد سے خود اپنے متعلق یہ مشورہ بھی شیخ نے نقل کیا ہے، کہ "تو یک مختصر از ہر علم بخواں ترا بسندست" ص ۳۱۱

ایسی صورت میں والد کی رائے سے اختلاف کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے، خود ان کی کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عقلیات سے شیخ کا تعلق بہت معمولی ہے۔ شیخ نے ایک موقعہ پر اگرچہ یہ بھی لکھا ہے کہ فاتحہ فراغ کے بعد "ملازمت درس بعضے از دانشمندانِ ماوراء النہر بطورے نمودہ شد" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماوراء النہر[1] کے بعض تازہ وارد علماء سے بعد کو بھی شیخ نے کچھ پڑھا تھا لیکن ان علماء کا ماوراء النہری ہونا یہ ظاہر کر رہا ہے کہ شیخ نے ان سے فقہ یا اصول فقہ جیسے علوم کی کوئی کتاب پڑھی ہوگی، ہاں ایران کے کسی عالم کا ذکر کرتے تو اُس وقت یہ سمجھنا شاید بعید نہ ہوتا کہ منطق یا فلسفہ کی کوئی کتاب پڑھی ہوگی۔

بہرحال اسی قسم کے مختلف قرائن و اسباب سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ دانشمندی کی سند کے لیے معقولات کی ان کتابوں کا پڑھنا ہر اس شخص کے لیے ضروری نہیں تھا جن کا رواج

---

[1] عجیب بات ہے کہ بعض لوگ جنہیں بخارا اور سمرقند یعنی جس کی دوسری تعبیر ماوراء النہر سے کرتے ہیں، چونکہ ان شہروں کے علمی ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہے اس لیے ہندوستان کی معقولیت کا الزام ان ہی بیچارے علماء پر ڈال دیتے ہیں جو ماوراء النہر سے ہندوستان آئے۔ حالانکہ تاتاری فتنہ کے بعد جب اس ملک میں پھر علم کا رواج ہوا تو اس میں زیادہ تر فقہ و اصول فقہ جیسے علوم تھے منطق و فلسفہ سے ان کا فوق بہت معمولی تھا، عبداللہ ازبک کے عہد میں جو اس زمانہ میں بادشاہ توران کہلاتا تھا ملا عصام اسفرائنی کے ذریعہ سے اس علاقہ میں جب منطق کا کچھ زور بندھا تو جیسا کہ ملا عبدالقادر بداؤنی نے قاضی ابوالمعالی کے ذکر میں یہ لکھ کر کہ "در فقاہت چناں بود کہ اگر بالفرض والتقدیر جمیع کتب فقہ حنفی از عالم برافتادے اومی توانست کہ از سر نوشت" یہ لکھا ہے کہ ان ہی قاضی ابوالمعالی نے ملا عصام اسفرائنی مع خبائث طلبہ از ماوراء النہر خارج نمودہ" وجہ یہ لکھی ہے کہ چوں ایں علم (منطق و فلسفہ) در بخارا و سمرقند شائع شد خبائث و شریر بر جاہلے سلیم الطبع رامی دیدند و می گفتند کہ ایں حمارست (یعنی گدھا ہے) چرا کہ لاحیوان از و مسلوب است و چوں انتفائے عام مستلزم انتفائے خاص است سلب انسانیت نیز لازم می آید" گویا اس طریقہ سے ہر اچھے بھلے مانس آدمی کو ثابت کر دیا جاتا تھا کہ وہ گدھا ہے۔ ملا صاحب نے لکھا ہے کہ اس حال کو دیکھ کر عبداللہ خاں شاہ توران را تحریص و ترغیب اخراج ایں جماعت نمودند مشروعیت تعلیم و تعلم منطق و فلسفہ بدلائل ثابت کرد" صرف یہی نہیں بلکہ روایتے نمود کہ اگر بکاغذے کہ منطق دراں نوشتہ باشد استنجا نمائند باکے نیست" یہ عبارت فقہ کی کتاب "جامع الرموز" کی ہے کہ یجوز الاستنجاء باوراق المنطق (منطق کے اوراق سے استنجاء جائز ہے) عبداللہ ازبک نے قاضی ابوالمعالی کے مشورہ کو مان لیا اور ملا عصام نیز ان کے طلبہ کو اسی جرم میں ملک سے بدر کر دیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ماوراء النہر بخارا سمرقند پر ہندوستان کی معقولیت کا الزام جو قائم کیا جاتا ہے صحیح نہیں ہے۔ قاضی ابوالمعالی کا فتاوی حال میں کتب خانہ آصفیہ نے خریدا ہے ۱۲۔

فتح اللہ شیرازی کے بعد اس ملک میں ہوا، بلکہ بات وہی تھی جس کا جی چاہتا تھا پڑھتا تھا اور اس حد تک پڑھتا تھا، جن کا ذکر میں نے حکیم کامراں کے تذکرہ میں کیا ہے۔

لیکن اس دور کے بعد جو مدت تک قائم رہا ہے ملک کے تعلیمی حلقوں پر ایک اور افتاد نازل ہوئی، اور اسی اُفتاد کا یہ اثر ہے کہ بتدریج معقولات کی کتابوں نے وہ اہمیت حاصل کی جس کا نظارہ درس نظامیہ کے مدارس حال حال تک کیا جا رہا تھا بلکہ کہیں کہیں ابھی وہی حالت باقی ہے، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ کہاں اسی ہندوستان کا وہ حال تھا کہ پوری تعلیمی زندگی میں طلبہ کو ایک شمسیہ اور شرح صحائف پڑھنا پڑتا تھا اور کہاں اب یہ صورت پیدا ہوگئی کہ معقولی رنگ کی کتابوں کی تعداد چالیس پچاس سے بھی زیادہ متجاوز ہوگئی، نصاب میں لزوم کی وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ سب کچھ پڑھ جائے لیکن ان تمام مقررہ کتابوں، کتابوں کے منہیات، حواشی شرح و تعلیقات کا اگر ایک ورق پڑھنے سے رہ گیا ہے تو اہل علم کے گروہ میں ایسے آدمی کا علم علم نہیں سمجھا جاتا تھا، اساتذہ سند دینے سے گریز کرتے تھے، عذر یہی پیش کیا جاتا تھا کہ گو تم نے حدیث و تفسیر فقہ وغیرہ دینی علوم کی سب کتابیں ختم کر لی ہیں لیکن معقولات کی فلاں فلاں کتاب تمہاری باقی رہ گئی ہے، ان کے پڑھے بغیر مولوی ہونے کی سند تمہیں کیسے دی جا سکتی ہے، صرف یہی نہیں بلکہ مولویت کے دائرہ میں امتیاز کا معیار یہ واقعہ ہے کہ اسی ہندوستان میں تقریباً دو سو سال تک یہ رہا ہے کہ معقولات کی ان نصابی کتابوں پر اس مولوی نے کوئی حاشیہ یا شرح لکھ کر ملک میں پیش کیا ہو۔

اس دو سو سال کا جو تصنیفی ذخیرہ عام علماء ہند کا ہے بجز چند استثنائی صورتوں کے زیادہ تر اس کا تعلق زواہد ثلثہ سلم اور شرح سلم، صدرا، شمس بازغہ کی حاشیہ نگاری سے ہے، ایک ایک مولوی بعض اوقات ایک ہی کتاب پر تین تین قسم کے حاشیے لکھ کر فضیلت کی داد دیتا تھا، مولوی عالم علی سندیلی کے ذکر میں لکھا ہے کہ "سہ حاشیہ بر صدرا صغیر و کبیر و اکبر دارد"[۱]

دور کیوں جائیے علمائے فرنگی محل کے حالات اُٹھا کر پڑھیے مشکل ہی سے کوئی عالم اس عقلی

خانوادہ میں ایسا مل سکتا ہے جس کے قلم نے معقولات کی مندرجہ بالا کتابوں میں سے سب پر یا چند پر کوئی حاشیہ یا شرح نہ لکھی ہو،[1] بلکہ اس مسئلہ پر ذرا اور توجہ و تعمق سے نظر ڈالی جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ گو نصاب میں معقولات کا اضافہ سکندری دور میں ہو یا اکبری میں ظاہر ہے کہ دلی ہی میں ہوا، لیکن معقولاتی علوم کیسے یا حاشیہ نگاری کا جتنا زور ہم ان علاقوں میں پاتے ہیں جن کی تعبیر مولانا آزاد کی اصطلاح میں "الغورب" ہے اور جہاں کے علماء ان کی زبان میں "الغواربہ" کے نام سے موسوم ہیں یعنی اودھ، الہ آباد، بہار، اتنا زور اتنی ہما ہمی ان علوم کی خود دلی اور دلی کے نواح و اطراف میں محسوس نہیں ہوتی، حتیٰ کہ پنجاب میں بھی نہیں؛ اور تقریباً یہی حال جنوبی ہند کا ہے۔

مثلاً ہم دلی کے اس سربرآوردہ علمی خاندان کو پیش کر سکتے ہیں، جو پچھلے دنوں یعنی فرخ سیر، محمد شاہ وغیرہ کے زمانہ میں علم کا سب سے بڑا خانوادہ تھا، میری مراد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان سے ہے، شاہ صاحب کے والد بزرگوار حضرت شاہ عبدالرحیم حالانکہ براہ راست خود میر زاہد کے شاگرد ہیں لیکن الغواربہ میں مرزا زاہد کے جن زواہد ثلثہ[2] نے وہ اہمیت حاصل کی تھی کہ کسی مولوی کو اپنے اقران میں امتیاز اس وقت تک حاصل ہی نہیں ہو سکتا تھا، جب تک کہ تبرکاً ہی سہی، اعلم ان العلم المتجدد کے دو لفظوں ہی پر سہی اس

[1] ایک دلچسپ بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ پچھلے دنوں ارباب مطابع نے فرنگی محل کے ان مولویوں سے جو آج کل موجود ہیں یا جن کا حال میں انتقال ہوا، معقولات کی نصابی کتابوں پر اگر کوئی حاشیہ لکھوایا تو مولوی صاحب نے عموماً اپنے خاندان کے بزرگوں کا کوئی حاشیہ اٹھا کر کتاب پر چڑھا دیا ہے اور ہر حاشیہ کی ابتدا عموماً ان الفاظ سے ہوتی ہے قال جد جد جد جدی (یعنی میرے دادا کے دادا کے دادا نے یوں فرمایا) یا کبھی قال جد جد جد امی (میرے دادا کے دادا کی والدہ کے بیٹے نے یوں فرمایا) یا قال جد جد جد عمی الی غیر ذلک من الصلات النسبیہ والصہریہ۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ علماء فرنگی محل کا کوئی خاندان ایسا نہیں ہے جس نے حاشیہ نگاری کی اس مہم میں اپنا حصہ نہ ادا کیا ہو۔ مشہور ہے کہ مولانا محمد حسن کا نپوری میر زاہد کے تیس تیس حاشیوں کو سامنے رکھ کر پڑھایا کرتے تھے۔

[2] زواہد ثلثہ سے مراد میر زاہد کی تینوں کتابیں میر زاہد رسالہ، ملا جلال، امور عامہ کے حواشی ہیں۔

نے چند حروف بنام حاشیہ منقوش نہ کردیے ہوں، لیکن ہمارے سامنے خود حضرت شاہ ولی اللہ کا اپنا ذاتی تعلیمی نصاب ہے جس کی تقریباً کل کتابیں آپ نے اپنے والد یعنی میرزاہد کے شاگردہی سے پڑھی ہیں، لیکن معقولات کا جتنا حصہ اس ولی اللّٰہی نصاب میں ہے لے دے کر وہ حسب ذیل کتابوں پر مشتمل ہے، خود انفاس العارفین کے آخر میں لکھتے ہیں

"از منطق شرح شمسیہ (قطبی) وطرفے از شرح مطالع .... واز حکمت شرح ہدایت الحکمۃ واز حساب وہندسہ بعض رسائل مختصرہ" ص۱۹۵

کہاں الفوار یہ کے نصاب کی وہ تیس چالیس معقولاتی کتابوں کا انبار، اور کہاں گنتی کی یہ چند کتابیں جن میں چھوٹی بڑی ملاکر بمشکل پانچ کتابیں ہوسکتی ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دلّی میں معقولات کی ان عام نصابی کتابوں کا سرے سے رواج ہی نہ تھا، آخر شاہ صاحب کے صاحبزادوں یعنی شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما نے زواہد پر نیز صدرا پر اور دوسری معقولی کتابوں پر حواشی کیوں لکھے اگر دلّی کے درس میں یہ کتابیں داخل نہ تھیں، بلکہ وہی مطلب ہے کہ دلّی اور اس کے اطراف و اکناف بلکہ پنجاب تک میں ان معقولی کتابوں نے لزوم کی وہ شکل نہیں اختیار کی تھی، جو حیثیت ان کی الفوار یہ میں ہوگئی تھی۔

ہندوستان کی تعلیمی تاریخ کا یہ دلچسپ لیکن مستحق توجہ مسئلہ ہے، مدت تک میری سمجھ میں اس کی کوئی صحیح توجیہ نہیں آئی تھی، تا آنکہ اس راز کو بھی خدا جزا خیر دے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ نے کھولا، آپ نے اپنی کتاب مآثر الکرام میں جہاں مذکورہ بالا دو تعلیمی انقلابوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہیں آپ کے قلم نے ایسے مواد فراہم کیے ہیں کہ ان کو پیش نظر رکھنے کے بعد شاید بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے، مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پہلے کہ میں اسے درج کروں ایک فاجعہ کا تذکرہ اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ واقعات کے سمجھنے میں اس سے مدد ملیگی۔

قصہ یہ ہے کہ محمد شاہ بادشاہ جو رنگیلے کے نام سے مشہور ہیں، ان کے دربار میں نیشاپور کا ایک سپاہی پیشہ آدمی سعادت خاں نامی داخل ہوا، ترقی پاتے ہوئے یہی سعادت خاں[1] نیشاپوری برہان الملک کے خطاب سے سرفراز ہوا، ارباب تاریخ کے لیے اگرچہ یہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہے، لیکن عام پڑھنے والوں کو یہ بتانا ضرور ہے کہ دلّی کے قتل عام والا نادر شاہ جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور بانی سلطنت آصفیہ حضرت آصف جاہ اوّل قدس سرہ و انار اللہ برہانہٗ کے ساتھ محمد شاہ دلّی سے باہر نکل کر نادر شاہ کو روکنے کے لیے آگے بڑھے، دونوں طرف فوجیں صف آرا تھیں، لیکن حملہ کس وقت کیا جائے۔ حضرت آصف جاہ کی رائے تھی کہ آج اس مسئلہ کو ملتوی رکھا جائے۔ اس وقت یہی سعادت خاں برہان الملک تھے جنہوں نے آصف جاہ کے مشورہ کی قصداً خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی تیاری کے بغیر نادر شاہی فوج کی طرف اقدام کر دیا اور اچانک کسی معمولی مقابلہ کے بغیر جیسا کہ ان کے سب سے بڑے طرفدار ہم مذہب مورخ طباطبائی صاحب سیر المتاخرین کی شہادت ہے کہ برہان الملک اپنے ہاتھی پر نادر شاہ کی فوج کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے کہ ان کے وطن نیشاپوری کا ایک نادر شاہی فوجی کہ "یکے از نوخاستہ اتراک نیشاپور بود" وہ برہان الملک کے سامنے گھوڑا بڑھا کر آتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہی "نوخاستہ ترک نیشاپوری" پکارتا ہے:۔

"محمد امین! دیوانہ شدہٗ باکہ می جنگی و بکدام فوج اعتماد داری"

یہ کہتا ہے، اور گھوڑے کی پشت سے اُچک کر برہان الملک کے ہاتھی کی عماری میں داخل ہو جاتا ہے، طباطبائی صاحب اس کے بعد ارقام فرماتے ہیں:۔

"برہان الملک کہ از ضابطہ ایران واقف بود موافق[2] آداب انجا اطاعت نمودہ اسیر پنجۂ تقدیر گردید۔"

---

[1] برہان الملک کا اپنے وطن میں اصلی نام محمد امین تھا، ہندوستان پہنچ کر سعادت خاں نام رکھا، آخر میں برہان الملک ہو گیا۔ اتفاق تو دیکھیے کہ ان کے ہم وطن نوخاستہ ترک سپاہی کا نام بھی امین ہی تھا ۱۲۔

[2] "موافق آداب ایران" اپنے آپ کو قید کرا دیا، اچھی عمدہ توجیہ ہے، تیاری کے بغیر حضرت آصف جاہ کی رائے کے خلاف حملہ کر دینا یہ بھی ایران ہی کا کوئی ضابطہ ہو گا۔

ہمراہ قزلباش (یعنی نوخاستہ نیشاپوری) بحضور نادر شاہ رسید، عفو تقصیرات او فرمودہ مورد الطاف وعنایات ساخت (سیر المتاخرین ص ۴۸۳)

اب اس کے بعد دلّی اور دلّی کے باشندوں پر مسلمانوں پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت مرحومہ پر جو کچھ گذری، تاریخوں میں پڑھیے، بلکہ اس کے لیے تو تاریخ پڑھنے کی بھی ضرورت کیا ہی، ہندوستان کے حافظہ سے نادری قتل عام کا ہولناک نظارہ کیا کبھی نکل سکتا ہی؟

بہر حال یہی محمد امین نیشاپوری پھر سعادت خاں پھر برہان الملک کے متعلق مولانا آزاد دوسروں کی نہیں اپنی آنکھوں دیکھی یہ شہادت قلم بند فرماتے ہیں کہ

"چوں برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد، واکثر بلاد عمدہ صوبہ الٰہ آباد و نیز دار الخیور جونپور و بنارس و غازی پور و کٹرہ مانک پور و کوڑہ جہاں آباد وغیرہا ضمیمۂ حکومت گردید"

دلّی اور دلّی کے اطراف وجوانب کے باشندے تو نادر شاہ کے ہاتھوں وہ سب کچھ بھگت چکے تھے، جو ان کے مقدر میں تھا، دلّی سے جو دور تھے غالباً یہ بھی "ضابطہ ایران" و "آداب اینجا" کی ایک شکل تھی کہ مولانا فرماتے ہیں، فرماتے کیا ہیں گواہی دیتے ہیں کہ جن پر مصیبت ٹوٹی تھی ان ہی میں سے ایک وہ بھی تھے، یعنی برہان الملک نے ان علاقوں کے گورنر ہونے کے ساتھ ہی یہ کیا کہ

"وظائف وسیور غالات خانوادہائے قدیم وجدید بیک قلم ضبط شد و کار شرفاء و نجباء بپریشانی کشید"

اور ابھی بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہی "ادب ایران" کے ضوابط کی تکمیل باقی تھی، مطلب یہ کہ ان برہان الملک سعادت خاں کے ایک بھانجے بھی ساتھ تھے

جن کی شادی بھی برہان الملک کی لڑکی سے ہوئی تھی یعنی خواہر زادہ و داماد دونوں تھے۔ محمد شاہی دربار سے ان کو بھی ابو المنصور صفدر جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا، مولانا فرماتے ہیں کہ

"بعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہر زادہ او ابو المنصور صفدر جنگ رسید وظائف و انقطاعات بدستور زیر ضبط ماند، و در اواخر عہد محمد شاہ ۱۱۵۸ھ صوبہ داری الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد و تتمہ وظائف آں صوبہ تا حال از آفت ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط آمد"

یعنی جو کچھ بچا کھچا سرمایہ الہ آباد کے علاقہ کے شرفا کے ہاتھ میں رہ گیا تھا، وہ بھی ختم ہو گیا، لیکن صفدر جنگ ابو المنصور صاحب کی صفدری ختم نہیں ہوئی، محمد شاہ کے بعد جب احمد شاہ تخت نشین ہوئے تو "در عہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ وزارت اعلیٰ صعود نمود"

مولانا نے تو مختصر الفاظ میں اس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے، اور تفصیل سے بھی بہت طویل، تاہم اتنا تو ہر شخص کو یاد رکھنا چاہیے کہ مغل دربار میں بادشاہوں کا اقتدار جوں جوں گھٹ رہا تھا یہ عجیب بات ہے کہ ارباب حل و عقد میں ان عناصر کا اضافہ ہو رہا تھا جنہیں اس زمانہ کی اصطلاح میں "ایرانیت" سے تعبیر کرتے تھے، ایرانیت کے مقابلہ میں ایک دوسرا عنصر بھی تھا جس کی تعبیر "تورانیت" سے کی جاتی تھی اور سچ پوچھیے تو ان دونوں لفظوں کے پیچھے "شیعیت" اور "سنیت" کی حقیقتیں پوشیدہ تھیں، محمد شاہ بادشاہ مرحوم ہی کے زمانہ میں اکثر صوبہ داریوں پر ایرانی عناصر کا قبضہ ہو چکا تھا، تورانیوں کے تنہا نمائندہ لیکن شوکت و ابہت، جلال و جاہ تدبیر و سیاست، شجاعت و دلیری میں سب پر تفوق رکھنے والے امیر مغل حکومت میں صرف حضرت آصف جاہ اول بانی دولت آصفیہ انار اللہ برہانہ تھے، محمد شاہ کی وفات کے بعد جب احمد شاہ تخت نشین ہوئے تو اُس وقت باوجودیکہ حضرت آصف جاہ دکن میں تھے، اور صفدر جنگ ابو المنصور والی اودھ احمد شاہ کے ساتھ دلی پہنچے، طبا طبائی صاحب سیر المتاخرین اپنے والد کے ساتھ دلی جا رہے تھے، لکھتے ہیں کہ راستہ میں محمد شاہ بادشاہ کی موت کے ساتھ

(ص ۲۰ ج ۳)

"آمدن صفدر جنگ ہمعناں احمد شاہ و جلوس او بر تخت سلطنت در باغ شالامار باغ دہلی مسموع شد"

ظاہر ہے کہ دلی کا میدان اس وقت خالی تھا، صفدر جنگ کی وزارت عظمیٰ کا مغتنم موقعہ اس سے

بہتر کیا ہو سکتا تھا لیکن طبا طبائی ہی کا بیان ہے کہ

"تجویز تعیین وزارت بنام صفدر جنگ با وجود اقتدار ولیاقت او بپاس رضا داشتہ آصف جاہ در حیز تعویق و تاخیر افتادہ" (ص ۸۶۹)

اور اس سے حضرت آصف جاہ اوّل کے اس خدا داد رعب و دبدبہ کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی نہ بادشاہی کی ہمت ہوتی تھی کہ صفدر جنگ کو وزارت عظمیٰ کی سند عطا کر دیں، اور نہ خود صفدر جنگ آصف جاہ کے مقابلہ میں قلمدانِ وزارت کی طرف ہاتھ بڑھانے کی جرأت کر سکتا تھا، مگر اہل سنت کے اقبال کا آفتاب گہن میں آچکا تھا، دکن مراسلات روانہ کیے گئے۔ حضرت آصف جاہ کی دلجوئی کے لیے بادشاہ نے بھی متعدد فرامین ان کی طلبی کے روانہ کیے، لیکن جواب میں "عذر پیری و اظہار عدم رجوع خود بدار الخلافت نگاشت" ص ۸۶۹ اور تقدیر بھی یونہی ظاہر ہوئی کہ اس معذرت نامہ کے چند ہی دن بعد حضرت آصف جاہ مسلمانوں کی اکثریت کو اس ملک میں بے یار و مددگار چھوڑ کر راہی باغ جناں ہوئے۔ دلی جب یہ خبر پہنچی تو صفدر جنگ ابو المنصور اچھل پڑا، طبا طبائی جوان کے ہم مشرب و ہم مذہب آدمی ہیں ان ہی کا بیان ہے۔

"خبر رسید کہ چہارم جمادی الاخری سال مرقوم الصدر آصف جاہ در سواد برہان پور وداع عالم عنصری نمودہ راہ سفر آخرت نمود .... آں زماں صفدر جنگ بہ خاطر جمع قامت قابلیت خود را بخلعت وزارت بیاراست"

ورنہ اس سے پہلے معذرت نامہ کے وصول ہو جانے کے بعد بھی

"صفدر جنگ جرأت بہ پوشیدن خلعت وزارت نہ نمود (ج ۳ ص ۸۶۹)

احمد شاہ بادشاہ کی طرف سے صفدر جنگ

روز دوشنبہ چہارم رجب بعنایت خلعت ہفت پارچہ مع چارقب وزارت و جواہر سرفراز و بخطاب جملۃ الملک، مدار المہام وزیر الممالک، برہان الملک ابو المنصور خاں صفدر جنگ سپہ سالار مخاطب گشت (ج ۳ ص ۸۶۹)

دبا ؤ اُٹھ چکا تھا، جس کا خوف تھا وہ سواد بُرہان پور میں جان جاں آفریں کو سپرد کرچکا تھا، اب تک تو صرف اودھ اور الہ آباد کی صوبہ داری کا زور تھا، اب تو جملۃ الملک وزیر الممالک کی قوت کے ساتھ ابوالمنصور خاں سریرآرائے مسند وزارت تھے۔

مولانا غلام علی آزاد اس وقت زندہ ہیں، جو کچھ گذر رہا تھا دیکھ رہے تھے، مختلف الفاظ کے ساتھ اس فاجعہ کا ذکر اپنی مختلف کتابوں میں فرمایا ہے۔ میں مآثر الکرام سے ان شہادتوں کو نقل کررہا ہوں۔ اس "داہیۃ کبریٰ" یعنی صفدر جنگ کی وزارت عظمیٰ کا تذکرہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں: "نائب صوبہ کار برار باب وظائف تنگ گرفت" کہ ہندی مثل "سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا" اسی موقعہ پر کہنے والے نے کہا تھا ؎

یا لَکِ قنبرۃ بمعمر خلا لکِ الجو فبیضی واصفری

(یعنی فضا ہر دیکھنے والی آنکھ سے خالی ہوچکی تھی، آزادی سے جس چڑیا کا جی چاہے، اب انڈے بچے دے، گائے اور چہچہائے)

مغلیہ حکومت کا وہ باز اشہب اُڑ چکا تھا پیرانہ سالی میں بھی جس کی قہرمانی نگاہیں یہ اثر رکھتی تھیں کہ وہ دکن میں تھا اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ دلی میں بھی قبائے وزارت کو اس وقت تک چھو بھی نہیں سکتے تھے جب تک کہ اس کی جانب سے کلی اطمینان نہ حاصل ہوگیا۔

حکومت سے جن لوگوں کی امداد صرف اس لیے ہورہی تھی کہ وہ علم اور دین کی خدمت میں مصروف تھے، ایک ایک کرکے سب کو ان امدادوں سے محروم کردیا گیا جو کل تک جاگیر والے تھے، اب اُن کے لیے رہنے کی جگہ کا ملنا بھی دشوار تھا، آسمان پر تھے زمین پر پٹک دیے گئے مولانا آزاد درد کی اس داستان کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

"وتا حین تحریر (یعنی وقت) ایں کتاب (مآثر الکرام) ایں دیار (پورب) پامال حوادث روزگار ست ولعل

لہ کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام مکہ سے کوفہ کی طرف روانہ ہوئے تو یہی شعر عبداللہ بن زبیر کو سنایا گیا، طبری میں تفصیل

اللہ یحدث بعد ذلک امرا" (مآثر ص ۲۲۳)

اس معاشی انقلاب کا نتیجہ

یہ صحیح ہے کہ اسلام کی تعلیمی اور دینی تاریخ کے ایوان نے بحمد اللہ حکومت کی پشتبانیوں کو صرف قیام و بقا ہی کے لیے نہیں بلکہ اپنی رفعت و بلندی کے لیے بھی ہمیشہ غیر ضروری ٹھہرایا ہے، ہماری پست ہمتیاں آج جن حیلہ تراشیوں کی آڑ میں پناہ ڈھونڈھیں اپنی تن آسانی و کاہلی کی توجیہ ہم جن سیاسی کمزوریوں کے ذریعہ سے کریں، لیکن اسی زمانہ میں جب سب کچھ ہمارا تھا، لندن و برلین نہیں بلکہ دمشق و بغداد عالم سیاست کے مرکز بنے ہوئے تھے، ابوحنیفہ امام الائمہ نے زہر کا پیالہ پی کر، دار الہجرت کے امام نے مونڈھوں سے اپنے ہاتھ اُتروا کر، احمد بن حنبل نے لہو میں نہا کر، بویطی الامام تلمیذ الشافعی نے جیل میں جان دے کر، خرتنگ جیسے کوردہ گاؤں کی نظر بندی میں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی آخری سانس پوری کر کے، بتایا جائے کہ اس کے سوا اور کس چیز کا ثبوت پیش کیا تھا کہ اسلامی علوم کا قصر رفیع اونچا ہوگا، اونچا ہوتا چلا جائیگا خواہ حکومتیں اس کی تعمیر میں کوئی حصہ لیں یا نہ لیں، نہ صرف پچھلی صدیوں میں بلکہ اسلام کی تیرہ صدیوں میں شاید ہی کوئی صدی اس تجربہ اور مشاہدہ سے تہی دامن ہوگی، خود ہندوستان میں بلند نظریوں کے جو نمونے پیش کیے گئے ہیں مختلف ابواب کے ذیل میں تھوڑا بہت ان کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے اور آئندہ بھی موقعہ موقعہ سے اپنے اپنے مقام پر ان کا تذکرہ کیا جائیگا لیکن ظاہر ہے کہ الحرب کے لیے سب پیدا نہیں کیے جاتے، بڑے گروکو تو القصعہ رپیالہ، ہی کی تلاش میں سرگرداں پایا گیا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اگر سب ہی "الحرب" والے بن جاتے تو بڑوں کی بڑائیاں بے معنی ہو جاتیں۔

کار مسیحانہ کشد ہر خرے

جام و سنداں کی بازیگری ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے۔

بہرحال اکثریت کے اعمال و افعال کے متعلق یہ کلیہ تو غلط ہے کہ معاشی محرکات کے سوا ان کی تہ میں اور کچھ نہیں ہوتا، مگر اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشی اسباب کو بھی ان میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے، شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے اخبار الاخیار میں اپنے بچپن کے ایک مذاکرہ کا ذکر فرمایا ہے جو ان کے ساتھی طلبہ کے درمیان ہوا تھا جس میں وہ خود بھی شریک تھے، فرماتے ہیں:۔

"یک بار طالب العلمان نشستہ از احوال یک دیگر تفحص می نمودند کہ نیت در تحصیل علم چیست بعضے طریق تکلف و تصنع بیہودہ می گفتند کہ مقصود ما طلب معرفت الٰہی ست، بعضے براہ سادگی و راستی رفتہ می نمودند کہ غرض تحصیل حطام دنیا ویست" (اخبار۔ ص ۳۱۲)

جن لوگوں نے اپنی تعلیم کا نصب العین "معرفت الٰہی" قرار دیا تھا، شیخ کی ان پر یہ تنقید کہ ان کا یہ دعویٰ صرف تکلف و تصنع پر مبنی تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بھی وہی بات تھی جس کا براہ سادگی و راستی دوسروں نے اظہار کر دیا تھا صرف اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ "پرسیدند بارے تو بگو کہ در تحصیل علم چہ نیت داری و نظر ہمت و قصد بر چہ می گماری" شیخ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں بھی جو بات تھی، میں نے بھی صاف صاف، وہی کہہ دیا یعنی

من اصلا ندانم کہ بر تحصیل علم معرفت الٰہی مترتب شود یا اسباب ملاہی، مرا باعث خود شوق ایں است کہ بارے بدانم کہ چندیں عقلاء و علماء گذشتہ اند چہ گفتہ اند و در کشف حقیقت معلومات و مسائل چہ درسفتہ اند"

گویا طلبہ کی اس ساری جماعت میں صرف شیخ کا نفس عالی تھا جس کے سامنے علم کی تحصیل کا مقصد صرف علم تھا، ورنہ ان کے بیان سے جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً سب ہی کے سامنے وہی "حطام دنیا" المعروف بہ "روٹی" ہی کا مسئلہ تھا، سادہ دلوں نے تو کھلے بندوں اس کا اقرار کر لیا، اور جنہوں نے اس اقرار سے گریز کیا اُن کے متعلق شیخ کے بیان سے معلوم ہوا کہ ان کی گفتگو صرف گفتگو تھی "اکل" ہی کی وہ بھی "ایک شکل" تھی، اس

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ آج ہی نہیں بلکہ عموماً بڑا طبقہ ان ہی لوگوں کا رہا ہے جن کی تعلیمی جد و جہد کے محرکات میں "معاشی وجہ" کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے، پہلے بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے۔ اور دنیا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ ندی کے کنارے جانے والے جاتے تو اسی نیت سے ہیں کہ پانی لائیں گے، لیکن کبھی کبھی "آب جو آمد و غلام بہ برد" کا قصہ پیش آجاتا ہے، یہی حال علم کا ہے، جس نے ابھی کچھ نہیں پڑھا ہے اُس بیچارے سے کسی بلند نظری کی آپ توقع ہی کیوں قائم کرتے ہیں، پڑھنے کے بعد بلاشبہ دیکھا جاتا ہے کہ کس نے اپنے علم کو "تن" پر مارا اور کس نے "علم" کی زد "جان" پر لگائی، مولانا روم کا شعر

علم را بر "تن" زنی مارے شود　　　علم را بر "جاں" زنی یارے شود

ظاہر ہے کہ علم کے استعمال کی ان دونوں غلط اور صحیح صورتوں کا موقع تو حصول علم کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے کہتے ہیں کہ الحاکم الصدر الشہید[1] کا جب حکومت سے کسی مسئلہ میں مقابلہ ہو گیا، بادشاہ وقت نے ان کے قتل کرنے کا اور انہوں نے قتل ہو جانے کا فیصلہ فرمایا تو اُس وقت اُن کی زبان پر یہ جاری تھا۔

تعلمنا العلم لغیر اللہ فابی العلم ان یکون الا للہ (مفتاح السعادۃ۔ ص ۱۴)　　　یعنی ہم نے علم کو خدا کے لیے نہیں سیکھا تھا لیکن خود علم نے انکار کیا اور وہ خدا ہی کے لیے ہو کر رہا۔

پس یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا "علم" غیر خدا کے لیے ہونے سے انکار کر جائے لیکن پہلے علم حاصل تو ہو لے۔

---

[1] یہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور حنفی امام ہیں، پہلے بخارا کے قاضی ہوئے اس کے بعد خراسان کے ساسانی امیر الحمید نے وزارت کے منصب پر سرفراز کیا، کچھ دن کے بعد کسی مسئلہ میں امیر نے ایسے فیصلہ پر مجبور کرنا چاہا جس میں دین اور علم کی صراحۃً خلاف ورزی لازم آتی تھی، انہوں نے انکار کیا، بادشاہ نے حکم دیا کہ دو درختوں کی شاخوں میں باندھ کر شاخوں کو پھر اس طرح کھولا جائے کہ ان کی لاش کے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ الحاکم کو اس کی خبر ملی، غسل کیا، حنوط ملا، کفن گلے میں ڈالا اور مذکورہ بالا فقرہ کہتے ہوئے، اپنے آپ کو جلاد کے حوالے کر دیا لاش اسی شکل کے ساتھ چیر دی گئی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

بہرحال قصہ یہ ہو رہا تھا کہ معقولات کی کتابوں کی بھرمار ہمارے نصاب میں جو ہوئی خصوصاً ان علاقوں میں جنہیں پورب کہتے ہیں، اس کے اسباب کیا تھے؟ اسی کے جواب میں آپ کے سامنے اس تاریخی حادثہ کو پیش کیا گیا جس کے شکار مشرقی ہند کے ارباب فضل و کمال ہوئے۔ ابو المنصور صفدر جنگ والی اودھ کی وزارت کے بعد جہاں کہیں وظائف جاگیروں کا تسمہ بھی لگا ہوا تھا، اُسے بھی کاٹ دیا گیا، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان بیچاروں پر کیا گذری ہوگی اور ان کو سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ میکالے کی تعلیمی رپورٹ میں جب مشرق اور مشرق کے سارے علمی مجاہدات کو یورپ کی کتابوں کی ایک الماری کے برابر ماننے سے بھی انکار کیا گیا تھا، اسی بنیاد پر قدیم تعلیم کا سارا نظام اچانک بدل دیا گیا۔ اور ہم جاہلوں کو تہذیب و تمدن کی روشنی میں لانے کے لیے کلیات وجوامع کے جال ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیے گئے۔ اس کے بعد

واذا راو اتجارۃ او لھوا انفضوا   اور جب دیکھا انہوں نے تجارت یا کھیل کود کو تو
الیھا وترکوک قائما   چل پڑے اُسی کی طرف اور چھوڑ دیا تجھے (اے پیغمبر) کھڑا

کا جو تماشا ہمارے سامنے ہونے لگا، اور ہو رہا ہے اس کے دیکھنے والوں کے لیے ان گذرے ہوئے بزرگوں کے حال کا اندازہ لگانا کیا دشوار ہے ادھر تعلیم کا نظام بدلا اور معمولی کشمکش کے بعد بڑے بڑے علما، فضلا، مشائخ اور صوفیاء کے گھرانوں کی اولاد کالجوں میں جا کر بھر گئی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن اور ان کی حدیث کو علم و فضل کے ان ہی خانوادوں نے صرف اس لیے تنہا چھوڑ دیا کہ مسلمانوں کے پس ماندہ غریب خاندان کے بچے ان کو پڑھ پڑھا لینگے۔ اور یہ تو میں کہتا ہوں ورنہ سادات کرام و شیوخ عظام کے ان تعلیم یافتہ صاحبزادوں کے سامنے تو یہ بھی نہیں ہے، عموماً قوم کی ایک بڑی تعداد ان کے نزدیک عربی مدارس کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر قومی توانائیوں کے عظیم ذخیرہ کو برباد کر رہی ہے۔

بس جو کچھ آج دیکھا جا رہا ہے اگر مولانا غلام علی آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے دو سوال

پہلے بھی یہی صورت پیش آگئی کہ

کار شرفا و نجبا بہ پریشانی کشید و اضطرار معاش مردم آنجا را از کسب علم باز داشتہ در پیشہ سپہ گری انداخت و رواج تدریس و تحصیل بآں درجہ نماند و مدارسے کہ از عہد قدیم معدن علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد و انجمنہائے ارباب کمال بیشتر برہم خورد انا للہ وانا الیہ راجعون ص۲۲۲

تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی "معاش کا اضطرار" خواص کے لیے نہ سہی لیکن عوام کے لیے یقیناً اضطرار کی بدترین صورت ہے، خصوصاً کھاتے پیتے، خوش حال خوش باش گھرانوں کے لیے یہ مصیبت دوہری مصیبت بن جاتی ہے، جس زندگی کے پشتہا پشت سے آبائی رسم و رواج کے زیر اثر وہ عادی ہوتے ہیں، اچانک اس سے جدا ہو جانا ان کے لیے گویا موت ہوتی ہے، انگریزی تعلیم کے رواج کے بعد بجائے غربا کے مسلمانوں کے متوسط طبقات کا رجحان جو اس تعلیم کی طرف زیادہ بڑھا اس کی یہی وجہ تھی، عربی مدارس کی تعلیم اس زندگی کو واپس نہیں دے سکتی تھی جس کے وہ متلاشی تھے، ملی یا نہیں ملی لیکن اسی زندگی کی توقع میں مسلمانوں کا یہ طبقہ کالجوں میں پل پڑا۔ اس وقت امت کے وہ غربا کام آگئے جن کے لیے عربی مدارس کی تعلیم آج معاشی اور جاہی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنی ہوئی ہے، کم از کم موجودہ معاشی سطح سے تو یہ تعلیم ان کو اوپر کھینچ لیتی ہے۔

خیر میں اس انقلاب کا ذکر کر رہا تھا، جو مولانا غلام علی کے سامنے "تعلیمی حلقہ" میں رونما ہوا۔ مولانا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی اضطرار نے لوگوں کو فوج کی طرف دھکیل دیا، کہ اس زمانہ میں خصوصاً ملک کے چپہ چپہ پر مرکزی حکومت کی کمزوری سے نفع اٹھا کر حکومت کے دعویداروں کا ایک غول ابل پڑا تھا، اور ہر ایک دوسرے کو مغلوب کرکے چاہتا تھا کہ ملک پر وہی قابض و متصرف ہو جائے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر ان مدعیوں کے فوجی مراکز قائم تھے، لوگ اسی میں جا جا کر اسی طرح بھرتی ہونے لگے جس طرح آج اسکولوں اور کالجوں میں بھرے چلے جاتے ہیں، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جس زمانہ کا یہ قصہ ہے اس زمانہ کی

ایک بڑی خصوصیت یہ بھی کہ خواہ کسی طبقہ کا آدمی ہو لیکن فن سپاہ گری اور اس کے لوازم سے گونہ واقفیت تقریبًا ہر ایک لیے ضروری تھا، آج علم و عرفان کے لیے جسمانی ضعف اور کمزوری سرمایۂ افتخار ہے، لیکن یہ عہد مرگ کا قصہ ہے، ورنہ ہم میں جب جان باقی تھی، عالم ہو یا صوفی قلم کے ساتھ تلوار کا دھنی ہونا بھی قریب قریب اس کے لیے ضروری[1] تھا۔

امیر الروایات میں حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ اور اس زمانہ کے ایک شخص کا مکالمہ درج ہے۔ شاہ صاحب نے اُس سے پوچھا "آپ نے قرآن بھی پڑھا ہے؟" اُس نے کہا ہاں، شاہ صاحب نے پوچھا کہ کچھ فارسی بھی پڑھی ہے، بولا ہاں، پوچھا گیا کچھ عربی بھی پڑھی ہے؟ اس نے کہا کہ "جی ہاں میر قطبی تک پڑھی ہے"

میر قطبی تک پڑھنے والے طالب العلم سے آگے دریافت کیا جاتا ہے۔ گھوڑے کی سواری

---

[1] عہد نبوت و صحابہ کو تو جانے دیجیے کہ اس زمانہ کا تو رسول بھی زرہ اور خود اور تلوار و تیر و ترکش کے ساتھ میدان میں اُترتا تھا، اس کے بعد بھی آپ کو ہر زمانہ کے ائمہ محدثین و فقہاء میں اس خصوصیت کی جھلک نظر آئیگی اور بعضوں کو تو اس میں اتنا کمال حاصل تھا کہ پیشہ وروں کو بھی ان کی اُستاذی تسلیم کرنی پڑتی تھی امام المحدثین حضرت امام بخاری کی تیر اندازی، شیخ الصوفیہ امام ابو القاسم کی نیزہ بازی کے تذکرے خصوصیت کے ساتھ کتابوں میں پائے جاتے ہیں، خود ہمارے ہندوستان کے علماء و صوفیہ کا بھی یہی حال تھا، مولانا غلام علی آزاد ہی کے متعلق کسی جگہ میں ذکر کرونگا کہ موقعہ آیا تو قلم پھینک کر مرہٹوں کے مقابلہ میں ذو الفقار حیدری کھینچ کر کھڑے ہوگئے، شیخ محدث نے مولانا احمد شرعی کے حالات میں لکھا ہے۔ "ایشاں در تیر اندازی نظیر نداشتند" ان ہی جامع العلوم نقلیہ و عقلیہ در سمیہ حقیقیہ" کی تیر اندازی کے کمال کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے شاگرد شیخ عبد الغنی سونی پتی بیان کرتے تھے کہ شیخ کی عمر جب ۹۶ سال کی تھی ایک "تیرمی انداختند تیرے بہ نشانہ رسیدہ بود گفتند اگر بگویند ہر تیر کہ بیندازم در سوفار تیر دیگر بندکنم دو ستہ تیر بہ ہمیں روش انداختند بعد ازاں گفتند کہ تیرہا ضائع می رود و اسراف می شود و گرنہ تیر بیک دگر بند کنم" (اخبار ص ۲۲۰) اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بندوق کا بہترین نشانہ لگاتے تھے اور یہی حال تقریبًا اپنے اپنے عہد میں عام علماء کا تھا عربی مدارس میں ورزش اور جسمانی ریاضت کی طرف سے غفلت جو برتی جارہی ہے جو بالکل نئی بات ہے، شکر ہے کہ اب پھر لوگوں کو ادھر توجہ ہونے لگی ہے۔ مگر خدا کرے کہ وہ مسرفانہ مغربی ملاعب ہمارے مدارس میں داخل نہ ہوں جن کے ایک ایک رکیٹ کی قیمت ساٹھ ساٹھ ستر ستر روپیہ ادا کرنی پڑتی ہے، آپ نے دیکھا کہ شیخ احمد شرعی ایسے قدر انداز ہونے کے باوجود اسراف کو اس شکل میں بھی ناجائز قرار دیتے ہیں۔ مطلع الانوار جو مولانا انوار اللہ خاں مرحوم حیدر آبادی استاذ السلطان کی سوانح عمری جس کا ذکر آئندہ بھی انشاء اللہ آئیگا اس میں لکھا ہے کہ مولانا انوار اللہ خاں کا معمول تھا کہ نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد تلاوت کرتے اور اس کے بعد ورزش۔ ورزش کا سلسلہ مرض الموت تک رہا۔ بعد ازاں ناشتہ ۱۰-۱۲ (ص ۳۱)

بھی سیکھی ہو؟ اُس نے کہا۔ ہاں، پھر پوچھا کہ فنون سپہ گری بھی سیکھے ہیں، اُس نے کہا۔ جی ہاں "پھکیتی بکیتی اور تیر اندازی وغیرہ سب سیکھے ہیں" (امیر الروایات)

یہی وجہ ہو کہ جب علم و فضل کی راہوں سے معاش کے جو ذرائع مہیا ہوتے تھے وہ مسدود ہوگئے تو لوگوں کے لیے پیشہ سپہ گری کا اختیار کرنا نسبتاً آسان معلوم ہوا۔

لیکن ظاہر ہو کہ جن کے یہاں پشتہا پشت سے پڑھنے پڑھانے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہو، ان کے سارے خاندانوں کا بالکلیہ علم سے ٹوٹ کر ایک ایسے پیشہ کو اختیار کرلینا علم سے جس کو دور کا بھی تعلق نہیں، آسان نہ تھا، مولانا غلام علی کے الفاظ "رواج تدریس و تحصیل ہاں درجہ نہ ماند" سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہو کہ تدریس و تحصیل کی گرم بازاری جس رنگ میں پہلے تھی، وہ باقی نہ رہی، بلکہ آج بھی جو حال ہو کہ گو اکثریت انگریزی تعلیم کی طرف جھک پڑی ہے لیکن غربا مسلمین کے عام طبقہ کے سوا اب بھی پرانے خاندانوں کے علما و مشائخ کسی نہ کسی طرح پُرانی تعلیم کی گاڑی گھسیٹے لیے جا رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ کچھ یہی صورت اس وقت بھی پیش آئی تھی خود مولانا آزاد نے بھی غم کی اس روداد کو ختم کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہو۔

"باوجود ایں خرابیہا رواج علم خصوص معقولات بہ کیفیتے کہ آنجاست (یعنی در پورب آں) در قلمروئے ہندوستان ہیچ جانیست" (ص ۲۲۳)

جس سے معلوم ہوا کہ گو بڑی تعداد تو اس حادثہ کے بعد "پیشہ سپہ گری" میں مبتلا ہوگئی لیکن پھر بھی ایک طبقہ علم والوں کا موجود تھا جو معقولات ہی کے رنگ میں سہی لیکن اپنے آبائی شیوۂ تعلیم و تعلم درس تدریس کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔

واقعات جو بکھرے ہوئے تھے ایک خاص سلسلہ کے ساتھ وہ آپ کے سامنے پیش کر دیے گئے غالباً نتیجہ تک پہنچنا اس کے بعد دشوار نہ ہوگا، بہر حال میں نتیجہ تک جن مقدمات کی راہنمائی میں پہنچا ہوں، گذشتہ بالا تاریخی مواد سے ان مقدمات کو مرتب کرکے خود ہی پیش کیے دیتا ہوں۔ یاد ہوگا کہ تلبن (ملتان)، کے مولویوں شیخ عبداللہ و عزیزاللہ کے بعد معقولات

اور اس فن کی کتابوں کی دوسری کھیپ ہمارے ملک میں میر فتح اللہ شیرازی کے ہاتھوں پہنچی، مولانا غلام علی کا بیان میں نے نقل کیا تھا کہ میر فتح اللہ کے بعد ہندوستان میں معقولات را رواجے دیگر پیدا شد"

اس وقت میں صرف اس اجمالی بیان کا ذکر کر کے آگے بڑھ گیا تھا، مگر اب بتانا چاہتا ہوں کہ "رواج دیگر" کے تفصیلی اسباب کیا تھے؟ اگرچہ فتح اللہ شیرازی کے متعلق ملا عبد القادر نے اپنی تاریخ کی تیسری جلد میں یہ عجیب خصوصیت لکھی ہے، یعنی ایک طرف تو ان کا یہ حال تھا کہ امیروں کے گھروں میں خود جا جا کر بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، لیکن دوسری طرف

"میر موصوف اگرچہ در مجالس بغایت خلیق و متواضع نیک نفس بود لیکن نعوذ باللہ از آں ساعت کہ بدرس اشتغال داشتے بشاگرداں غیر از فحش و الفاظ رکیکہ بہجو برزبانش نہ رفتے" (ص ۵۴)

خیر یہاں تک تو شاید ان لوگوں کو تعجب نہ ہو، جو پرانی طرز تعلیم کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں، بعض اہل کمال سے کمال کے نشہ میں اس قسم کی باتیں سرزد ہو جاتی تھیں، خصوصاً معقولات وغیرہ جیسے علوم کی کتابوں کے پڑھانے والوں میں یہ بات کبھی کبھی پائی گئی ہے کہ جو کتاب پڑھا رہے ہیں، کچھ اس کے مصنف کے نام کچھ شارح اور محشی کے نام اور کچھ اپنے ہم عصر اساتذہ کے نام جن کا نام اس فن میں مشہور ہو، صلواتیں سنایا کرتے تھے، مقصود اس سے خود اپنے فضل و کمال کا اظہار ہوتا تھا۔ ملا عبد القادر نے اس کے بعد لکھا ہے کہ میر فتح اللہ کی اس عادت بد کا

ۓ عظیم آباد پٹنہ کے مشہور طبیب حکیم عبد الحمید مرحوم جو مشہور علمی خانوادے صادق پور سے تعلق رکھتے تھے، ان کے متعلق مشہور تھا کہ پڑھانے کے وقت ان پر بھی یہی حال طاری ہو جاتا تھا میرے عم مرحوم مولانا حکیم ابو النصر رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے بیان کرتے تھے کہ کتاب قانون شیخ میں نے بھی حکیم صاحب سے شروع کی تھی لیکن پہلا سبق ہوا، کتاب کے مطلب سے پہلے حکیم صاحب نے ابن سینا کے نام وبے نقط کی شروع کی کہ میں پریشان ہو گیا، دو تین دن تک صبر کیا آخر میں پڑھنا چھوڑ دیا، حالانکہ حکیم عبد الحمید طبی قابلیت کے لحاظ سے بھی اپنے وقت کے ممتاز طبیبوں میں سے تھے، متعدد مواقع ایسے پیش آئے جن میں بڑے بڑے سول سرجنوں کو ان کے سامنے زک اٹھانی پڑی، فارسی میں ان کا قصیدہ حسن البیان نامی کتاب کے دیباچہ میں چھپا ہوا ہے، جو مولوی شبلی کے اس قصیدہ کے جواب میں ہے جسے اپنی کتاب

نتیجہ یہ ہوا کہ "ازیں جہت کم مردم بدرسِ اومی رفتند" مگر اس کے بعد ملّا صاحب کا یہ بیان کہ "و شاگردے رشید ہم ازو برنخاستہ" یہ میرے خیال میں صحیح نہیں ہے جس کی وجہ میں آئندہ بیان کرونگا، لیکن یہ بالکل ممکن ہے کہ میر کے پاس عام طلبہ اس لیے کم جاتے ہوں کہ ان کی صلواتوں میں اضاعت وقت کا ان کو اندیشہ ہوتا ہوگا۔[1]

بہرحال اگر یہ واقعہ صحیح ہے کہ "کم مردم بدرس اومی رفتند" تو پھر مولانا آزاد کا یہ بیان کہ ہندوستان میں معقولات کا رواج دیگر میر فتح اللہ کی توجہ و تعلیم کا رہینِ منت ہے، قابلِ غور ہو جاتا ہے واقعہ یہ ہے کہ میر فتح اللہ سے حکومت کے جن مہمات کا تعلق تھا، یوں بھی عام درس کی توقع ان سے مشکل ہے، وہ تو کہیے زمانہ ہی دوسرا تھا کہ لوگ جج بھی کرتے تھے اور درس بھی دیتے تھے، وزارت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور بچوں کو بھی پڑھاتے تھے، ورنہ اس زمانہ میں کہہ چکا ہوں کہ میر فتح اللہ تو خیر بڑے آدمی تھے، حکومت کے کسی ادنیٰ معمولی عہدہ دار سے تدریسی و تعلیمی مشاغل کی بھلا کوئی اُمید کرسکتا ہے، اس لیے اب خواہ ان کی بدزبانیوں کا نتیجہ ہو یا سرکاری مہمات میں انہماک ہو یہ سبب ہو، عام لوگوں نے اگر ان سے کم نفع اٹھایا ہو

---

[1] اس موقع پر ایک مشہور واقعہ کا بار بار خیال آرہا ہے اگرچہ خاک کے سامنے عالم پاک کا تذکرہ خلاف ادب ہے لیکن قدیم علماء کی بعض خاص خصوصیتوں کا اس سے پتہ چلتا ہے اس لیے دل عدم ذکر پر راضی نہیں ہے۔ مشہور ہے اور اپنے متعدد دیوبندی اساتذہ سے یہ روایت میں نے سُنی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ جس خداداد ذکاوت کے مالک تھے اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ عام مصنفین خصوصاً منطق و فلسفہ کی کوئی کتاب اگر آپ کسی کو پڑھانا شروع کرتے تو وہ بیچارہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، کہتے ہیں کہ مولوی عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ (صدر و شیخ الحدیث مدرسہ عبد الرب دہلی) شروع شروع جب مولانا کے پاس پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو شاید صدرا یا شمس بازغہ فلسفہ کی کوئی کتاب شروع ہوئی، مولوی عبد العلی صاحب نے سبق کی عبارت ختم کی اور مولانا جھنجھلاتے ہوئے فرماتے کہ بس بس ختم کرو، میاں اس مسئلہ میں قاسم کی سن لو، پھر ان کی سمجھنا، مولوی عبد العلی صاحب نے یہ انداز جو درس کا دیکھا تین چار دن بعد دبے پاؤں گھر روانہ ہوگئے۔ مولانا کو ان کے چلے جانے کا افسوس ہوا۔ شاید اُن کے گھر پہنچ گئے اور بھاگنے کی وجہ دریافت کی، مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت میں تو آپ سے کتاب پڑھنے گیا تھا لیکن آپ تو بجائے کتاب کے قاسم کی سناتے ہیں، مولانا نے معاہدہ فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا، کتاب ہی پڑھاؤنگا، تب پھر واپس ہوئے ۱۲۔

تو یہ محل تعجب نہیں ہے۔

لیکن میر صاحب کو اپنے علمی مذاق کے عام کرنے میں جس راہ سے کامیابیاں ہوئیں اس کا سب سے بڑا اہم راز ان کی وہ خاص ترکیب ہے جس کا تذکرہ ملا عبدالقادر بدا ٔونی ہی کے حوالہ سے گذر چکا، یاد ہوگا کہ ملا صاحب نے خود اپنی چشم دید گواہی میر فتح اللہ کے متعلق یہ دی تھی "بہ تعلیم اطفالِ امرا، مقید بود وہر روز بمنازل مقربان رفتہ" دربار کے امیروں کے بچوں کو وہ پابندی کے ساتھ باضابطہ شکل میں پڑھایا کرتے تھے، اور اپنے فلسفیانہ اور منطقیانہ مذاق کو بجائے عوام کے اس ملک کے خواص اور امیرزادوں میں اُنھوں نے پھیلا دیا۔ ہندوستان کے اعلیٰ طبقات پر جہاں تک میرے معلومات کا تعلق ہے، فارسی ادب کی نظم و نثر کا زیادہ اثر تھا، ان کا علمی مذاق دواوین و کلیات اور فارسی کے محاضرات و قصص و حکایات تاریخی روایات کے مطالعہ تک محدود تھا، ان کے درباروں میں علمی حیثیت سے اب تک اسی کا چرچا تھا، لیکن میر فتح اللہ نے ادبی مذاق کے ساتھ ساتھ معقولات کا چسکا بھی ان امیروں کو لگا دیا، اور قاعدہ ہے کہ کسی طبقہ میں ہو، جب کسی چیز کا رواج ہو جاتا ہے، تو پھر قانون توارث کے زیر اثر ایک قرن سے دوسرے قرن، دوسرے سے تیسرے قرن تک الا ماشاء اللہ وہ بات منتقل ہوتی چلی آتی ہے، طبقۂ اعلیٰ کو معقولات کا چاشنی گیر تو میر فتح اللہ نے اکبر کے عہد میں بنایا، لیکن بات وہاں سے منتقل ہوئی، چلی، چلتی آئی، تا آنکہ یہ واقعہ ہے کہ حال حال میں قدیم امیروں کا دور جب منقرض ہوا ہے، اس وقت تک یہ مذاق ان میں پایا جاتا تھا، رامپور کے موجودہ فرماں روا کے والد نواب حامد علی خاں بہادر اپنے اندر بہت سی قدیم امیرانہ خصوصیتوں کو زندہ رکھے ہوئے تھے، اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ زیادہ دن نہیں ہوئے، شاید بیس بائیس سال کی مدت گذری ہوگی انگریزیت کے اس عالم شباب میں حامد علی خاں کے دربار میں مناظرہ کی ایک مجلس گرم، اور بحث کا موضوع کیا تھا؟ سن کر تعجب ہوگا "جسم کے انفصال جوہری" کا مسئلہ جس سے عوام تو خیر اس زمانہ کے شاید اکثر مولوی بھی ناواقف ہونگے،

کہ یہ آخر ہے کیا بلا، لیکن ہندی امیروں میں جو بات نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آرہی تھی اسی کا اثر تھا کہ نواب مرحوم نے باضابطہ اپنے سامنے اس مسئلہ پر مولویوں کی دو متخالف جماعتوں میں مناظرہ کرایا، ایک طرف بہار کے مشہور منطقی مولوی عبدالوہاب بہاری تھے اور فریق ثانی کے سرگروہ ہمارے حضرت الاستاذ مولانا برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ بحث کا نتیجہ کیا ہوا، اس کا فیصلہ کون کرسکتا ہے، لیکن دیکھا یہ گیا کہ مہینوں دونوں طرف سے اشتہارات اور پوسٹروں کا سلسلہ شائع ہوتا رہا، جس میں ہر فریق اپنے غلبہ کا اعلان کرتا تھا۔ مولانا برکات احمد کے متعدد تلامذہ نے اس مسئلہ پر مستقل رسالے لکھے، اسی معقولی مذاق کا اثر تھا کہ حامد علی خاں ہمیشہ کسی منطقی مولوی کو اپنے یہاں اس لیے ملازم رکھتے تھے کہ جب کبھی معقولاتی ذوق کا غلبہ ہو تو اس مولوی کی باتوں سے وہ تسکین حاصل کریں، مدت تک لنبیٹھے کے منطقی عالم مولوی عبدالعزیز صاحب مرحوم کو غالباً دو سو روپیہ ماہوار صرف اسی کام کے لیے وہ دیتے رہے، گویا دربار کے لوازم میں جہاں شاعروں کا وجود ضروری تھا، جہاں تک میرا خیال ہے، میر فتح اللہ کی اس ترکیب کے بعد ایک اور عنصر (یعنی معقولیوں) کا بھی متوسل دربار ہونا امارت کی ایک شان بن گئی، کلب علی خاں مرحوم بھی ہمیشہ اسی نقطۂ نظر کے پیشِ نظر مولانا عبدالحق خیرآبادی کو بڑے اعزاز و احترام سے رکھا،

اور یہ تو پچھلے زمانہ کی باتیں ہیں اُس وقت تک کی جب رسّی جل چکی تھی، صرف اس کی اینٹھن باقی تھی، ورنہ کتابوں کو اٹھا کر دیکھیے مشکل ہی سے کسی مسلمان امیر ہی نہیں اس زمانہ کے ہندو راجہ کا دربار بھی معقولی مولویوں سے خالی نظر آئیگا، مہاراجہ الور، پٹیالہ، جے پور، کشمیر سب ہی کے یہاں شعرا، وغیرہ کے ساتھ ایک مد ان مولویوں کی بھی تھی، اور جب خالص ہندی امیروں پر یہ اثر مرتب ہوا تو امیروں کا جو خاندان نسلاً ایران سے تعلق رکھتا تھا مثلاً یہی برہان الملک اور صفدر جنگ بانیانِ حکومت اودھ، کہ یہ ایران سے ہندوستان اس وقت آئے ہیں جب ایران میں ملا باقر داماد، صدرائے شیراز، غیاث الحکماء، غیاث منصور وغیرہ کی

عقلیت و فلسفیت کا آفتاب سمت الراس پر چمک رہا تھا، سارا ایران بلکہ ایران کے ساتھ ہندستان بھی اس زمانہ میں ان لوگوں کی علمی عظمت کے چرچوں سے گونج رہا تھا۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب صفدر جنگ کے عہد اقتدار میں علم و فضل کے پرانے خانوادوں کو اچانک آسمان سے زمین پر پٹک دیا گیا، رزق و معاش کے دروازے ان پر بند کردیے گئے تو ان میں جو سپہ گری سے مناسبت رکھتے تھے وہ تو خیر بقول مولانا آزاد فوجوں میں بھرتی ہوگئے لیکن جو کسی وجہ سے بھی علم و فضل کے دامن سے لپٹے رہے، ان کے لیے معاشی مشکلات کے حل کی راہ اس کے سوا اور کیا باقی رہ گئی تھی کہ اہل ثروت و نعمت کا قرب ان ذرائع سے تلاش کیا جائے جن سے وہ خوش ہوتے تھے، نظائر و اشباہ مثالیں اور نمونے ان کے سامنے تھے، یہی ابو المنصور صفدر جنگ جنگی گردش قلم نے اودھ الہ آباد اور اس کے متعلقات کے علمی گھرانوں کو اُجاڑ دیا، ان ہی کو دیکھا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ہدایہ اور بیضاوی وغیرہ پڑھنے پڑھانے والے مولویوں پر رزق کا دروازہ تیزی سے بند کر رہے ہیں، اور دوسری طرف مشہور معقولی مولوی حمد اللہ سندیلوی جن کی شرح سلم تصدیقات اس وقت تک ہمارے نصاب میں "حمد اللہ" ہی کے نام سے شریک ہے، ان کے ساتھ صفدر جنگ کے تعلقات کی جو نوعیت تھی صاحب تذکرہ علماء ہند اس کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"نواب ابو المنصور خاں صوبہ دار اودھ بود سے دستار بدل برادرانہ داشت"

آپ سمجھے اس کا مطلب، دستور تھا کہ جو واقع میں بھائی نہ ہوتا تھا، اس کو کوئی بھائی بنانا چاہتا تو اپنی پگڑی یا ٹوپی اس کے سر پر اور اس کی پگڑی یا ٹوپی اپنے سر پر رکھتا، اسی کا نام "دستار بدل برادرانہ" تھا، اخوت کا جو تعلق اس رسم کے بعد قائم ہوتا تھا، وہ رشتہ کے تعلقات سے بھی آگے بڑھ جاتا تھا۔ آخر دم تک لوگوں کو اس کا لحاظ و پاس کرنا پڑتا تھا۔ غور کرنے کی بات ہے، کہ کہاں علم و کمال کی وہ بے قدری کہ بیک گردش قلم خاندان کے خاندان تباہ و برباد کردیے گئے، اور پھر وہی علم جب "معقولیت" کے رنگ میں پیش ہوا تو اس کی یہ قدردانی

کہ جلۃ الملک وزیر الممالک المغلیہ" اپنی دستار ایک معمولی قصباتی مولوی کے سر پر رکھ کر ان کو اپنا بھائی بناتا ہے، واللہ اعلم صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مولوی حمد اللہ کس اعتقاد کے آدمی تھے، کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے زیادہ تر اپنے اسی خاص فن معقولات ہی کے متعلق لکھا ہے، حمد اللہ شرح نصدیقات سلم کے علاوہ "حاشیہ بر شمس بازغہ و حاشیہ بر صدرا" (تذکرہ ص ۵۲) ان کے مشہور تصنیفات ہیں، اس لیے مذہبی اعتقاد کا پتہ چلنا آسان نہیں ہے، نسلاً تو یہ صدیقی ہیں، اور شاگرد بھی یہ ایک سُنی عالم مُلا نظام الدین سہالی کے ہیں، لیکن حمد اللہ میر باقر داماد کے متعلق عموماً "خیر اللحقہ بالمہرۃ" کا خطاب التزاماً چونکہ استعمال کرتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ فرقہ امامیہ کے عالم بہاء الدین عاملی کی کتاب زبدۃ الاصول (جو غالباً شیعی اصول فقہ کی کتاب ہے) اس کی بھی شرح لکھی ہے، اس لیے لوگوں کا عام خیال یہ ہے کہ انہوں نے ذاتی طور پر شیعہ مذہب اختیار کر لیا تھا، ممکن ہے کہ اس خیال میں کچھ واقعہ بھی ہو، لیکن سچ پوچھیے تو صفدر جنگ کی نگاہ میں ان کی جو غیر معمولی وقعت تھی، وہ دراصل ان کی معقولیت ہی تھی، لکھا ہے کہ اسی نواب نے دلی دربار سے "فضل اللہ خاں" کا خطاب بھی دلوا دیا تھا اور دہ میں ہے "چند دیہ از پیشگاہ بادشاہ وقت معاف یافتہ" (ص ۵۲)

اور مان بھی لیا جائے کہ مُلا حمد اللہ سے صفدر جنگ کے غیر معمولی تعلقات کی وجہ ان کا تشیع اور تبدیلی مذہب ہو، لیکن جن علماء کا ضمیر محض معاشی فراغبالی کے لیے تبدیل مذہب پر آمادہ نہ ہوتا تھا، خود ہی سوچیے کہ حکومت اودھ کی ان دراز دستیوں کے ان کے لیے چارہ کار ہی کیا رہ گیا تھا، خود ان کے مذہب کی فقہ، ان کی حدیث، ان کی تفسیر کی کوئی قیمت صفدر جنگ کے شیعی دربار میں نہ تھی۔ اب اس سے یا اس کے شیعی امراء سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ان مولویوں کے پاس اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ جس چیز کو امیروں کا یہ گروہ علم سمجھتا تھا اسی میں کمال پیدا کر کے اپنے آپ کو نمایاں کریں، تجربہ بتا رہا تھا کہ جن لوگوں نے اپنا مذہب نہیں بھی بدلا تھا لیکن معقولات میں دستگاہ پیدا کر کے شہرت حاصل کی تھی، اودھ کے اس

دربار میں ان کی قدر افزائی ہوتی تھی، فرنگی محل کے قریب قریب دو ہمنام مولوی جن میں ایک تو مولوی ظہور الحق اور دوسرے مولوی ظہور اللہ کے نام سے مشہور تھے، ان میں آخر الذکر صاحب کے تصنیفات کی فہرست حسب ذیل کتابوں پر مشتمل ہے۔

"تعلیقات حاشیہ زاہدیہ بر شرح تہذیب المنطق و حاشیہ بر دوحہ شمس بازغہ"

یعنی کل کی کل معقولاتی کتابوں سے ان کے حواشی کا تعلق ہے، صاحب تذکرہ نے لکھا ہے کہ "در عصر خود نامے بر آورد" لیکن ظاہر ہے کہ یہ نام ان کا ان ہی عقلی فنون میں روشن ہوا ہوگا۔ لکھا ہے کہ "در عہد یمین الملک سعادت علی خاں لکھنو بہ عہدہ افتاء مباہی گشت" (ص ۱۰۰) مگر ان کے دوسرے ہمنام یعنی مولوی ظہور الحق بیچارے بھی اسی فرنگی محل کے علماء میں ہیں لیکن۔

قرآن مجید حفظ کردہ اشتغال بقرأت آں و تفسیر بینی و مطالعہ کتب حدیث می داشت

و توجہ بہ معقولات ہرگز نمی کرد"

اس جرم کی سزا ان کو یہ ملی "تمام عمر بہ تنگی بسر کرد" (ص ۹۹)

بہر حال علماء اہل سنت کی ان خانہ بربادیوں میں خواہ کسی چیز کو بھی دخل ہو لیکن یہ واقعہ خواہ کسی وجہ سے جب ہو ہی چکا تو ان لوگوں کے لیے جو بہر حال اپنے خاندانی علمی وقار کو باقی رکھنا چاہتے تھے اُن کے لیے چارۂ کار ہی اس کے سوا کیا تھا کہ ان علوم میں کمال پیدا کریں، جن کی موجودہ حکومت قدردان تھی اور اسی کو میں ایک بڑا موثر سبب اس نصابی انقلاب کا قرار دیتا ہوں جو ہندوستان میں عموماً اور پورب میں خصوصاً پیش آیا، ماسوا اس کے ایک چیز اور بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر اور مستحق توجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے درباری

---

[1] آخر یہ کیسے کہہ سکتا ہوں برہان الملک نے جس شان کے ساتھ نادر شاہ کے حوالہ اپنے آپ کو پانی پت کے میدان میں کیا، جس کی توجیہ طباطبائی نے اداب ایران سے کی، خود یہی واقعہ جس کا ذکر کر چکا ہوں، اس گہری سازش کا پتہ دے رہا ہے اور اس راز سے پردہ اٹھا رہا ہے کہ نادر شاہ اچانک ایران کی سرزمین سے اچک کر کابل و قندھار کے علاقوں کو پامال کرتا ہوا ہندوستان کیسے پہنچا، اس وقت حکومت کن لوگوں کے ہاتھ میں تھی، جنہوں نے اس پر غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کی تدبیر کیا تھا، وہ تو خوش قسمتی سے ایک تورانی سردار (باقی بر صفحہ ۲۲۸)

امراء کے بچوں میں اپنے علمی مذاق کو عام کرکے جہاں "معقولیت" کے غلبہ کی راہ کھولی تھی، یہیں ایک واقعہ اور ہے، ملا عبدالقادر بدائونی نے تو لکھا ہے کہ میر فتح اللہ اپنی زبان کی کرختگی کی وجہ سے کسی شاگرد رشید کے پیدا کرنے میں ناکام ہوئے، مگر میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا کہ کلیتہً ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، تذکرہ علماء ہند میں اپنے عہد کے مشہور مرکزی مدرس مولانا عبدالسلام لاہوری کو "شاگرد میر فتح اللہ شیرازی" کے الفاظ سے روشناس کرایا گیا ہے، مولانا غلام علی آزاد نے بھی ملا عبدالسلام کے متعلق "معدن عقلیات و نقلیات بود" لکھ کر ان کے اساتذہ میں صرف میر فتح اللہ شیرازی کا ذکر کیا ہے، جس سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبدالسلام کے ممتاز استادوں میں میر فتح اللہ کے سوا کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے، اور یہ کہ وہ براہِ راست میر فتح اللہ ہی کے ساختہ پرداختہ ہیں، ملا عبدالسلام کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا آزاد نے یہ بیان فرمائی ہے کہ "قریب شصت سال درس گفت وجمعے کثیر را بہ پایۂ فضیلت رسانید..... نود سال عمر یافت" (ماثر ص ۲۲۶) میرے نزدیک تو میر فتح اللہ کے صرف یہی ایک شاگرد دوسروں کے بیسیوں شاگردوں کے مقابلہ میں بالکل کافی ہیں، ساٹھ ساٹھ سال تک مسلسل درس دینا آسان نہیں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جمعِ کثیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۷) حضرت آصف جاہ اوّل رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے کہ مغلئی حکومت موت کے پنجہ سے اس وقت نکل گئی۔ ورنہ جو بعد کو ہوا وہ شاید اُسی دن ہو جاتا۔ محمد شاہ کے بعد جس مغل بادشاہ احمد شاہ نے صفدر جنگ کو وزارت عظمیٰ کے جلیل عہدہ سے سرفراز کیا، تاریخ اٹھاکر پڑھیے اسی کے ساتھ صفدر جنگ نے کیا برتاؤ کیا۔ سب جانتے ہیں کہ صفدر جنگ کھلم کھلا باغی ہو کر علانیہ بادشاہ سے جنگ پر آمادہ ہو گیا۔ اس وقت دلی کے مسلمانوں کا جو احساس تھا طباطبائی نے جو غالباً دلی ہی میں تھے اس احساس کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے چونکہ صفدر جنگ کے ہم عقیدہ، ہم مذہب مورخ کا بیان ہے اس لیے شاید زیادہ قابل وزن ہو سکتا ہے، لکھتے ہیں:۔

کشا مرہ و پنجابیان علم محمدی برپا کردند ندا دادند کہ صفدر جنگ رافضی است جنگ با او کہ برخلیفۂ زماں خروج نمودہ جہاد است ہزاراں نفر از عوام زیر علم جمع گردید و شور و ہنگامہ دم چاریار گرم داشتند" (ج ۳ ص ۸۹۲)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفدر جنگ کا مذہبی تعصب کچھ پوشیدہ نہ تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ اودھ ہی کی حکومت پہلی حکومت ہے جس نے ہندوستان میں جمعہ اور جماعات کا رواج فرقہ امامیہ میں کرایا۔ دیکھیے تذکرہ مولوی الداد علی و ملا محمد علی کشمیری در کتاب نجوم السما تذکرہ علما شیعہ میں۔ ایسی صورت میں اس حکومت اور اس کے حکمرانوں کے متعلق عدم تعصب کا دعویٰ ظاہر ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

ان کے علم سے مستفید ہوا، اب سُنیئے کہ اس جمع کثیر میں جس شخص نے ملا عبدالسلام کے شاگردوں میں نمایاں امتیاز حاصل کیا، عجیب اتفاق ہے کہ ان کا نام بھی عبدالسلام ہی ہے، فرق یہ ہے کہ استاد عبدالسلام لاہوری ہیں اور شاگرد عبدالسلام اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ دیوہ کے تھے۔ گو آخر عمر ان کی بھی لاہور ہی میں گذری، اب تو خیر ان بیچاروں کا کون تذکرہ کرتا ہے لیکن درس کے قدیم حلقوں میں ملا عبدالسلام دیوی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا تھا، توضیح و تلویح اور بیضاوی پر ان کے معرکۃ الآرا حواشی ہیں، خصوصاً تلویح کا حاشیہ تو سمجھا جاتا ہے کہ اپنی نظیر نہیں رکھتا، شاہ جہاں بادشاہ کی طرف سے عساکر قاہرہ شاہی کے یہ مدتوں مفتی کے عہدے پر سرفراز رہے بادشاہ ان کی بیحد عزت کرتا تھا تذکرۂ علماء ہند کے مصنف نے "درس نظامیہ" کے بانی اول ملا نظام الدین (فرنگی محل) کے والد ملا قطب الدین سہالی[لہ] کے ترجمہ میں ان الفاظ سے ان کا تعارف کراتے ہوئے۔

"ملا قطب الدین سہالی صاحب ترجمہ امام الاساتذہ ومقدم الجہابذہ معدن علوم عقلیہ ومخزن فنون نقلیہ بود"

آگے یہ لکھا ہے کہ "اخذ علوم از ملا دانیال چوراسی شاگرد ملا عبدالسلام ساکن دیوہ" (ص ۱۶۸)

یہی بیان مولانا غلام علی آزاد کا بھی ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ آج جس نصاب کا نام نصاب نظامیہ ہے اور اسی کے متعلق معقولاتی کتابوں کی کثرت کی عام شکایت ہے اس نصاب کے بانی کا تعلیمی سلسلہ دراصل ملا فتح اللہ شیرازی پر منتہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ملا نظام الدین صاحب نصاب نظامیہ کو خود اپنے والد ملا قطب الدین سہالی سے استفادہ کا موقع جیسا کہ چاہیے تھا نہ مل سکا

تحصیل علوم متعارفہ بعد از شہادت والد ماجد خود از حافظ امان اللہ بنارسی و مولوی قطب الدین

لہ واقعہ ملا صاحب کی شہادت کا مشہور ہے کہ سہالی گاؤں میں عثمانی شیوخ بھی رہتے تھے، آپس میں جھگڑا ہوا عثمانیوں نے رات کے وقت بیچارے انصاری ملا کو شہید کر دیا۔ ملا صاحب نے چار صاحبزادے اپنے بعد چھوڑے عثمانیوں نے ملا صاحب کے گھر کو بھی جلا دیا تھا۔ سلطان اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی صلہ میں (باقی بر صفحہ ۲۳۰)

شمس آبادی نمودہ ۔ (ص ۲۴۱)
اور بنارسی شمس آبادی یہ دونوں حضرات ان کے والد ملا قطب الدین سہالی کے فیض یافتوں اور شاگردوں میں ہیں، گویا علمی شجرہ اگر بنایا جائے تو اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے:۔

میر فتح اللہ شیرازی
|
ملا عبدالسلام لاہوری
|
عبدالسلام دیوی
|
ملا دانیال چوراسی
|
قطب الدین سہالی

ملا قطب الدین شمس آبادی — امان اللہ بنارسی

ملا نظام الدین صاحب درس نظامیہ

جس کا یہی مطلب ہوا کہ میر فتح اللہ کا تعلیمی اثر صرف امیرزادوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ ہندوستان کے عام علمی خانوادے بھی ان کی تعلیم سے متاثر ہوئے، خصوصاً درس نظامیہ کے نصاب کی ترتیب جس ذات گرامی کی طرف منسوب ہے چند واسطوں سے میر فتح اللہ شیرازی پر ان کی تعلیم کا سررشتہ بھی منتہی ہوتا ہے۔

اب اس زمانہ میں اودھ کی حکومت کا نجباء و شرفاء کے ساتھ جو برتاؤ ہوا، اس کو اور ہندی امیرزادوں کو میر فتح اللہ کی تعلیم نے عقلیت کا جو چسکا لگا دیا اُس کو پھر خود ہندوستان کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۹) لکھنؤ کے خالی مکان کو جس میں کبھی فرنگی تاجر رہتے تھے ملا شہید کے پس ماندوں کے حوالے کر دیا ہندوستان کا تنہا یہی علمی خاندان ہے جس میں تقریباً دو صدی تک علم موروثی طریقہ سے منتقل ہوتا رہا، بلا مبالغہ سیکڑوں علماء اس خاندان سے اُٹھے اور تعلیمی طور پر تو شاید ہندوستان کے ہر صوبہ میں اس خاندان کے فیض یافتوں کی کثیر تعداد ہر زمانہ میں پائی جاتی ہے شمس آباد قنوج کے پاس ایک قصبہ کا نام ہے قطب الدین شمس آبادی نے نصف صدی تک طلبہ کو درس دیا، ملا محب اللہ بہاری شمس آبادی کے تلامذہ میں ہیں ۱۲۔

نظامیہ نصاب جس نے مرتب کیا، مسٹر فتح اللہ سے ان کا جو تعلیمی رشتہ اور تعلق ہے اس کو ان ساری باتوں کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اس کا جواب بآسانی مل جاتا ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے تعلیمی نصاب پر معقولی کتابوں کا وزن زیادہ کیوں پڑ گیا۔ اس واقعہ کی تاریخی تحلیل و تجزیہ کے بعد جو صورت پیدا ہوتی تھی وہ تو یہ ہے، آگے اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جن وجوہ سے متاثر ہو کر اپنے نصاب میں اس تغیر کو جو قبول کر لیا، یہ کہاں تک درست تھا۔

بات یہ ہے کہ واقعہ کی جو نوعیت تھی، تاریخی شہادتوں کی روشنی میں وہ آپ کے سامنے گذر چکی، حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت نصاب کی جو کچھ بھی ہو گئی تھی، وہ زمانہ کے انقلاب کا نتیجہ تھا جس سے ملک گزر رہا تھا، قریب قریب وہی صورت اس وقت بھی پیش آگئی تھی جو آج ہمارے سامنے ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ آج تو تعلیم کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا گیا ہے، ایک کا نام دینی علوم اور دوسرے کا دنیاوی علوم نام رکھا گیا ہے۔ دونوں کی تعلیم گاہیں الگ الگ ہیں دونوں کا نصاب جُدا جُدا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر نصاب کے پڑھنے والے اس نصاب اور اس کے آثار و نتائج سے قطعاً بے گانہ ہیں جسے اُنھوں نے نہیں پڑھا ہے، ملک میں پڑھے لکھے طبقہ کی دو مستقل جماعتیں قائم ہو گئی ہیں، امتیاز کے لیے ایک نام "علماء" دوسرے کو "تعلیم یافتہ" کہتے ہیں، دونوں کا دعویٰ ہے کہ عام مسلمانوں کی رہنمائی کا استحقاق ان ہی کو حاصل ہے اور ہے بھی یہی بات کہ جہل کی پناہ گاہ ہمیشہ علم ہی بنا رہا ہے، چونکہ دونوں کے پاس علم ہے، علم نے دونوں کے دل و دماغ کو منور کیا ہے، اس لیے عوام بیچارے جو علم سے تعلق نہیں رکھتے محتاج ہیں کہ جاننے والوں کے مشوروں اور آراء پر چلیں، مسئلہ یہاں تک تو درست ہے لیکن سوال آگے پیدا ہوتا ہے کہ اب علم کے نمائندے بجائے ایک کے دو طبقے ہیں، عوام پریشان ہیں کہ کس کے پیچھے جائیں کس کی سُنیں اور کس کی نہ سُنیں حالت تو یہ ہے کہ ان دونوں علمی گروہ میں سے جو بھی میدان خالی پاتا ہے، ہر ایک کو بجائے ایک کام کے مسلسل دو کام کرنے پڑتے ہیں، یعنی عوام کو اپنے سوا علم کے دوسرے طبقہ سے متنفر کرنا، ایک مستقل کام یہ ہے، اس کے

بعد پھر ان کے سامنے اپنی تجویزوں کو رکھنا، وقت کی زیادہ مقدار عموماً پہلے کام میں خرچ ہو جاتی
ہے، مسٹر اور مولانا، یا لیڈر اور علماء، تعلیم یافتہ یا مولوی، بتدریج ان دونوں الفاظ میں کشمکش
بڑھتی چلی جا رہی ہے، ہر ایک دوسرے کے وجود سے بے زار ہے، فسق، الحاد، بے دینی کا الزام
علماء تعلیم یافتوں پر عائد کر رہے ہیں تاریک خیالی، ابلہی، ناواقفیت کی تہمتیں علماء پر تعلیم یافتوں
کی طرف سے جوڑی جا رہی ہیں، اور جو کچھ بھی اس کشمکش میں ایک کا رویہ دوسرے کے ساتھ
آج چالیس پچاس سال سے ہے وہ ہمارے سامنے ہے، دن بدن یہ کشمکش بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے
میں یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج جس حال میں اس ملک کے بلکہ سارے جہان کے
مسلمان تعلیمی نصاب کی اس دوعملی کی وجہ سے گرفتار ہیں، کیا یہ کوئی خوش گوار صورت ہے اور
اس کی مستحق ہے کہ اس کو باقی رکھا جائے۔ کیا عوام کو علماء اور تعلیم یافتوں یا لیڈر اور ملّانوں کے
قدموں کی ٹھوکر میں اسی طرح ڈالے رکھنا کسی اچھے انجام کی ضمانت اپنے اندر رکھتا ہے کشمکش
کی یہ ناگوار صورت اگر اس قابل ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس کو ختم کیا جائے، تو پھر لوگوں نے ان
بزرگوں کی کیوں قیمت نہیں پہچانی جنہوں نے تیرہ سو سال کی اس طویل مدت میں علم کی اس
دوعملی اور تقسیم کو شدت کے ساتھ روکے رکھا، لوگ سوچتے نہیں ہیں، ورنہ میں مسلمانوں کے چند
اہم کارناموں میں ان کا ایک بڑا کارنامہ تعلیمی نصاب کی وحدت کو بھی سمجھتا ہوں، تیرہ سو سال
کی تاریخ ان کی گواہ ہے، کہ ان میں وہی تعلیم یافتہ بھی تھے جو علماء کہلاتے تھے، اور وہی علماء
تھے جنہیں آج تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے فلسفی بھی پیدا ہو رہے تھے، اور ریاضی داں بھی، حکیم بھی
مہندس بھی، محدث بھی، مفسر بھی، طبیب بھی، فقیہ بھی، شاعر بھی، ادیب بھی، صوفی بھی لیکن
یہ کیسی عجیب بات تھی کہ تعلیم کا ایک ہی نظام تھا جس سے یہ ساری مختلف پیداواریں نکل
رہی تھیں، مسلمانوں کے سب سے بڑے فیلسوف ابن سینا ہی کے حالات اُٹھا کر پڑھیے
ابن خلکان سے نقل کر رہا ہوں۔

اشتغل بالعلوم وحصّل الفنون دلما تحصیل علم میں مشغول ہوا اور فنون حاصل کیے اور جب

بلغ عشر سنین من عمرہ کان اتقن	دس سال کی عمر تھی تو اس شخص نے قرآن عزیز کے علم
علم القرآن العزیز والادب وحفظ	کو پختہ کیا، اور ادب کا علم حاصل کیا، نیز دین کے اصولی
اشیاء من اصول الدین وحساب	مسائل (عقائد وغیرہ) کو یاد کیا، اور اسی کے ساتھ
الھند والجبر والمقابلۃ (ج ۱ ص۱۵۲)	حساب الہند وجبر ومقابلہ کے فن کو بھی سیکھا۔

یہ ابن سینا کی عام تعلیم کا تذکرہ تھا، اس کے بعد جب اختصاص کا ارادہ ہوا تو ابو عبد اللہ ناتلی الحکیم کا ذکر کرنے کے بعد قاضی ابن خلکان راوی ہیں:۔

فابتدء ابو علی یقرء علیہ ایساغوجی	تب ابو علی نے ابو عبد اللہ ناتلی سے ایساغوجی پڑھی
واحکم علیہ علم المنطق واقلیدس	اور منطق کے علم کو مستحکم کیا، نیز اقلیدس اور مجسطی بھی
والمجسطی .... وکان مع ذلک	ان ہی سے پڑھی لیکن ان فلسفیانہ علوم کی تعلیم کے
یختلف فی الفقۃ الی اسماعیل	ساتھ ساتھ اسی زمانہ میں وہ اسماعیل زاہد کے پاس
الزاھد یقرء ویبحث ویناظر (ص۱۵۲)	علم فقہ کی تحصیل کے لیے آمد و رفت رکھتے تھے، فقہ ان سے پڑھتے تھے اور اس فن پر بحث ومناظرہ کرتے

یہ ہے اسلامی عہد کے سب سے بڑے تعلیم یافتہ کی تعلیمی رپورٹ، یہی بات سوچنے کی تھی جسے کسی نے نہیں سوچا، حالانکہ اس کے سوا جو کچھ تھا سب کچھ سوچا گیا۔

ہندوستان کے قدیم نصاب پر اعتراض کیا گیا کہ اس میں حدیث کی تعلیم کے لیے صرف ایک کتاب تھی، تفسیر میں صرف جلالین پڑھائی جاتی تھی، اور وجہ ہی ہے، آپ سن چکے ہیں کہ فقہ میں اگرچہ چند کتابوں (قدوری، کنز، شرح وقایہ، ہدایہ) کا نام لیا جاتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ ضروری نصاب میں فقہ صرف قدوری تک اور اعلیٰ تکمیلی نصاب میں کنز[1] چند ورقی متن کے علاوہ معناً

---

[1] اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، بظاہر کنز وغیرہ متون کی کتابیں موٹے موٹے حروف اور طویل الذیل حواشی کے ساتھ جس طرح چھاپی جارہی ہیں، دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کوئی بڑی کتاب ہے، لیکن جن حروف میں آج کل اخبارات وجرائد یومیہ وغیرہ شائع ہوتے ہیں ان ہی حروف میں مثلاً کنز کو اگر لکھا جائے (باقی بر صفحہ ۲۴۴)

صرف ایک ہی کتاب فقہ کی پڑھائی جاتی تھی یعنی شرح وقایہ کے عبادات، اور ہدایہ کے معاملات جس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ دو کتابیں نہیں ہیں، بلکہ مسائل کے لحاظ سے دیکھا جائے تو فقہ کی ایک ہی کتاب پڑھائی جاتی تھی۔

لیکن کیا ان چند گنی چنی کتابوں کا درس ان علوم میں تبحر اور وسعتِ نظر پیدا کرنے کے لیے کافی نہ تھا؟ گو کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے لیکن ع کب تک روکوں دل میں آہ، میرا اس باب میں جو ذاتی خیال ہے اس کا اظہار اپنا ایک ایمانی فرض سمجھتا ہوں، فیصلہ کرنے والے اس کے بعد جو چاہیں فیصلہ کریں۔ پس

چل مرے خامے بسم اللہ

درسِ حدیث کی اصلاح

آج نصاب کے اصلاحی دائروں کا ایک بڑا کارنامہ جس کا بار بار اظہار کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر پہلوں کو مطعون اور ملام بنایا جا رہا ہے، وہ حدیث کا درس ہے، سمجھا جاتا ہے کہ ایک بڑا نقص تھا پرانے نصاب یا یوں کہیے کہ مشارق ومصابیح یا مشکوٰۃ والے نصاب کا جس کی اصلاح جدید نصاب میں صحاح ستہ کی کتابوں کے اضافہ سے کی گئی کسی دوسرے کو نہیں بلکہ ایسی ہستی کو میں اس باب میں شہادت کے لیے پیش کرتا ہوں، جن کی طرف درسِ حدیث کے اس اصطلاحی کارنامے کو منسوب کیا جا رہا ہے، میری مراد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۳) تو بلا مبالغہ کسی معمولی سی نوٹ بک میں پوری کتاب سما سکتی ہے، ان متون کی نوعیت میرے خیال میں اُن یادداشتوں کی ہے جنہیں لکچر وغیرہ دینے کے لیے لوگ نوٹ کر لیتے ہیں، اور ان ہی کو دیکھ کر تقریر کرتے جاتے ہیں۔ ہمارے علماء نے اس کی عجیب مشق بہم پہنچائی تھی، دس دس صفحات میں جس کی تفصیل آسکتی ہے اسی مضمون کو دو سطر دو سطر میں اس طرح بند کر سکتے تھے کہ سارے مفصل مضمون پر وہ عبارت حاوی ہو سکتی تھی۔ یہ ایک کمال تھا جسے اب نقص ٹھہرایا گیا ہے، قضاء افتاء کے کام کرنے والے حضرات ان یادداشتوں کو زبانی یاد کر لیتے تھے، نتیجہ یہ تھا کہ فقہ کے سارے ابواب ومضمون کے عنوان اُنہیں محفوظ رہتے تھے ۱۲

اللہ علیہ سے ہے، اپنی کتاب انفاس العارفین میں درسِ حدیث کے ان طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے جو حرمین میں مروج تھے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

باید دانست کہ درس حدیث را نزدیک علماء حرمین سہ طریق است یکے طریق سرد کہ شیخ یا قاری وے تلاوت کتاب کند، بے تعرض مباحث لغویہ وفقہیہ و اسماء رجال وغیرآن ودیگر طریق بحث وحل کہ بعد تلاوت یک حدیث بر حفظ غریب و ترکیب عویص، ودیم قلیل الوقوع از اسماء اسناد و سوال ظاہر الورود ومسئلہ منصوص علیہا توقف کنند وآں را بہ کلام متوسط حل نمائند وآنگاہ پیش روند وعلی ہذا القیاس ۔ سویم طریقہ امعان وتعمق کہ برہر کلمہ ما لہا وعلیہا وما یتعلق بہا بسیار ذکر کنند، مثلاً در کلمہ غریبہ وترکیب عویص، شواہد آں از کلام شعراء واخوات کلمہ در اشتقاق ومحال استعمال وے ذکر کنند ودر اسماء الرجال احوال ایں قوم وسیرت ایشاں بیان نمائند ومسائل فقہیہ را بر آں مسئلہ منصوص علیہا تخریج نمائند وبادنی مناسبت قصص عجیبہ وحکایات غریبہ بگویند

(ص ۱۸۰)

معلوم ہونا چاہیے کہ علماء حرمین میں حدیث کے پڑھانے کے تین طریقے ہیں، ایک طریقہ کا نام سرد (رواروی) ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ استاذ یا پڑھنے والا کتاب کو پڑھتا چلا جائے، اس طور پر کہ لغوی مباحث اور فقہی جھگڑوں، یا اسماء الرجال وغیرہ کی باتوں سے تعرض نہ کرے، اور دوسرے طریقہ کا نام بحث وحل کا طریقہ ہے یعنی کسی حدیث کے پڑھنے کے بعد اس کے اجنبی اور نادر الفاظ یا کوئی ترکیبی دشواری ہو، اس پر یا ایسے اسماء سند کے جو غیر معروف ہوں اور ان کا ذکر کم آتا ہو اسی طرح ایسے اعتراضات جو کھلے کھلے طریقہ سے وارد ہوتے ہیں، یا جن مسائل کا اس حدیث میں صراحۃً تذکرہ کیا گیا ہو، اُن پر استاد ٹھہرے اور متوسط طریقہ کی گفتگو ان پر کرکے ان کو حل کرے، اس کے بعد آگے بڑھتا چلا جائے تیسرا طریقہ درس کا وہ ہے جس کا نام امعان وتعمق کا طریقہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کے ہر ہر لفظ اس کے سارے متعلقات ما لہا وما علیہا پر بحث کی جائے اور خوب بحث کی جائے مثلاً جہاں کوئی ذرا اجنبی لفظ آیا، یا کوئی مشکل ترکیب سامنے آئی اُس کے حل میں شعراء کے کلام سے شہادت پیش کرنا شروع کرے اور اُس کے مماثل کلمات ان کے مواد

اشتقاق اور استعمال کے مقامات کو واضح کیا جائے۔ اسی
طرح رجال کے اسماء جہاں جہاں آئیں اُن پر بحث کرنا شروع
کردے ان کے حالات ان کی سیرت بیان کی جائے اور جس مسئلہ کا
اس حدیث میں صراحۃً ذکر آیا ہو، اُس پر قیاس کرکے جو مسائل
غیر منصوصہ پیدا ہوتے ہوں، فقہ کی کتابوں کے ان مسائل کا
تذکرہ کیا جائے۔ اسی طرح ذرا ذرا سی مناسبت اور حیلے سے عجیب و
غریب قصے اور نادر حکایات کا دریا بہایا جائے۔

حضرت شاہ صاحب نے درسِ حدیث کے ان تین طریقوں کا تذکرہ فرمانے کے بعد ہر طریقے کے متعلق اپنی رائے بھی ظاہر فرمائی ہے، تیسرا طریقہ یعنی جس میں ہر غریب اجنبی لغت کے آنے کے ساتھ ہی استاذ شعراء کے اشعار سنانا شروع کردے، اور اس کے ہم معنی ہم شباہت الفاظ کی تحقیق کرتے ہوئے، ہر لفظ کی سوانح عمری یعنی ابتداءً یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا، پھر بتدریج عہد بعہد مختلف معانی میں استعمال ہوتے ہوئے اب کس معنی میں استعمال ہوتا ہے، ہر استعمال کے محل کو ظاہر کرتے ہوئے کلام عرب سے اس کی شہادت پیش کی جائے، یوں ہی سند کے ہر راوی کے متعلق رجال کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، اُس کا مسلسل ذکر کرنا فقہی مسائل اور ان کے تمام جزئیات قریبہ بعیدہ جن کا اس حدیث سے خواہ دور ہی کا تعلق کیوں نہ ہو، ان کو بھی بیان کرتا چلا جائے۔ ساتھ ہی معمولی معمولی مناسبتوں کو آڑ بنا کر اپنے معلومات جن کا کسی فن سے بھی تعلق ہو، اظہار کیا جائے۔ درس حدیث کے اس طریقہ کے متعلق شاہ صاحب کی رائے ہے کہ یہ طریقہ

طریقہ قصاص است کہ قصد از اں اظہار
فضیلت وعلم است یا غیر آں واللہ
اعلم نہ روایت و تحصیل علم۔

یہ واعظوں اور قصہ خوانوں کا طریقہ ہے، اور مقصود اس قسم کے
پڑھانے والوں کا محض اپنی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے یا اس
کے سوا کوئی اور غرض واللہ اعلم، (بہرحال) یہ نہ روایت
حدیث کا طریقہ ہے، اور علم حاصل کرنے کا ذریعہ۔

صرف یہی نہیں بلکہ درس حدیث کے متعلق آج مختلف دائروں میں جن امور پر لوگوں کو ناز ہے، سُنیے شاہ صاحب ہی سے سُنیے فرماتے ہیں :۔

باید دانست کہ اشتغال محدث باحوال رجال سند بعد تصحیح اسماء انہا و معرفت وثوق شاں خصوصاً در صحیحین و غیر آں	معلوم ہونا چاہیے کہ محدث کا سند کے رجال سے ان لوگوں کے نام کی تصحیح کے بعد اور یہ جاننے کے بعد کہ ان کا شمار ثقات میں ہے خصوصاً صحیحین کے رجال ہوں یا ان کے سوا صحاح کی کتابوں

یعنی صحاح کی موجودہ کتابوں کے متعلق رجالی مباحث ۔

یا اشتغال بفروع فقیہ و بیان اختلاف مذاہب فقہا، و توفیق در اختلاف روایات و ترجیح بعض احادیث بر بعض	فقہی جزئیات کے ساتھ مشغول ہونا، اور فقہا کے مذاہب کو بیان کرنا اور ان روایتوں میں تطبیق دینا، روایتوں کے اختلاف کو بیان کرنا، ایک روایت کو دوسری روایت پر ترجیح دینا۔

دونوں ہی کے متعلق اُستاد الکل نے الکل مجدد و درس حدیث فی الہند کا فیصلہ ہے کہ یہ ساری باتیں

از امعان و تعمق ست و اوائل اُمت مرحومہ بدیں امور مشغول نہ بودند۔	یہ سب لا حاصل فکر و غور اور ژرف نگاہی ہے۔ اُمت کے ابتدائی طبقات کے لوگ ان امور میں مشغول نہ تھے

لیجیے جب یہ ساری باتیں "امعان و تعمق" ہیں تو پھر جن لوگوں نے اپنے تعلیمی نصاب میں مشارق ومصابیح یا مشکوٰۃ ہی کو درس حدیث کے لیے کافی قرار دیا تھا، ان پر اعتراض کرنے کا حق کیا ان لوگوں کو باقی رہ جاتا ہے جو اپنے آپ کو شاہ ولی اللہ اور ان کے طریقہ تعلیم کا وارث سمجھتے ہیں شاہ صاحب نے درس حدیث کے اور دو طریقوں یعنی سرد والا طریقہ اور بحث وحل والا طریقہ ان دونوں کے متعلق شاہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ بحث وحل کا طریقہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے، جنہوں نے حدیث شروع کی ہو، مثلاً مشکوٰۃ یا مشارق ان کو شروع کرائی گئی ہو، فرماتے ہیں ۔

بنسبت مبتدین اہل توسط طریقہ بحث وحل	مبتدیوں اور متوسط استعداد والوں کے لیے بحث وحل کا طریقہ مفید ہے

اور یہی کیا بھی جاتا تھا کہ مشکوٰۃ وغیرہ جیسی کتاب کے ذریعہ سے لوگوں کو حدیث کے ان لغوی الفاظ

جن میں غرابت وندرت ہوتی تھی ان کے معانی بتا دیے جاتے تھے، جہاں کہیں کوئی نحوی ترکیب کے لحاظ سے کوئی دقت ہوئی اُسے سلجھا دیا گیا، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ مبتدیوں اور اہل توسط کو پڑھا دینے کے بعد ان کے مشائخ حرمین میں سے شیخ ابو طاہر جو گویا ان کے سب سے بڑے شیخ فی الحدیث ہیں ان کا طریقہ وہی سرد کا تھا، یعنی صحاح کی بطور تلاوت کے ان کے سامنے گذار دی جاتی تھیں، فائدہ اس کا یہ بتایا ہے۔

تا زود سماع حدیث وسلسلہ روائیت درست کنند۔	تاکہ حدیث کے سننے کا قصہ جلد ختم ہو اور روایت کا سلسلہ لوگ درست کرلیں۔

باقی تفصیلی بحث کے لیے شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

باقی مباحث بر شروح حوالہ می کردند زیرا کہ ضبط حدیث امروز مدار آں بر تتبع شروح است۔	باقی مباحث جو حدیث کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں (ان کے اُستاد) ان مباحث کے لیے کہہ دیتے تھے کہ حدیث کی شرحوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اب حدیثوں کے معانی ومطالب کو ضبط وگرفت میں لانا اس کا دار ومدار

شرح پڑھنا ضروری

جس کا یہی مطلب ہوا کہ مشکوٰۃ جیسی کسی متن حدیث کی کتاب کو حل وبحث کے طریقے سے پڑھنے کے بعد آگے صحاح کی کتابوں کے پڑھانے کا مطلب بطور تبرک سمجھیے یا سلسلہ روایت کی درستگی سمجھیے، اور کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا تھا، جو یوں بھی مناولہ[1] وغیرہ کے طریقوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ کتابوں کی تدوین کے بعد "اسناد کی درستگی" کا مسئلہ بھی تبرک کے سوا اور کیا رہ گیا ہے، امام بخاری تک مثلاً ان کی کتاب اب تواتر کے ساتھ منسوب ہے، کسی متواتر چیز کے اسناد کی حاجت ہی کیا باقی رہتی ہے، سند کی اہمیت جو کچھ تھی تدوین کتب سے پہلے تھی یہی چیز ہمارے قدیم علماء، اور پرانے نصاب والوں کے پیش نظر تھی، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے

---

[1] یہ محدثین کا ایک طریقہ تھا کہ جس کی قابلیت پر اعتماد ہوتا تھا پڑھائے بغیر کتابوں کی روایت کرنے کی اجازت عطا فرماتے تھے جس کے مختلف طریقے تھے۔ اصولِ حدیث کی کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھیے ۱۲

کہ ان پر نکتہ چینیوں کا جو سلسلہ آج پچاس سال سے جاری ہے اس کی بنیاد کیا ہے، دیدہ دلیری یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کا نام لے کر ان نکتہ چینیوں میں زور پہنچایا جاتا ہے، مگر آپ دیکھ چکے کہ خود حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذاتی خیال اس معاملہ میں کیا ہے، حدیث میں درساً جس چیز کو پڑھانے کی حاجت ہے، وہ مشارق ہو یا مصابیح یا مشکوٰۃ وغیرہ کتابوں میں سے کسی ایک کتاب سے حاصل ہو جاتی ہے، اس کے بعد سرداً یا مناولۃً صحاح ستہ وغیرہ کی اجازت سو پہلے بھی لوگ یہی کرتے تھے کہ ہندوستان ہی کے کسی صاحب سند محدث سے اجازت لے لیتے تھے، یا حج وغیرہ کی تقریب سے جب حرمین جاتے تھے تو وہاں سے سند لے آتے تھے، علماء کے تذکرے پڑھیے عموماً آپ پائینگے کہ اس قسم کی سند کے حاصل کرنے کا رواج ان میں بھی تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اوروں کا تو میں نہیں کہتا، دارالعلوم دیوبند، یا اس کے سلسلہ کے جو مدارس یا علماء ہیں عموماً صحاح ستہ کے درس بطریقہ سرد ہی کا ان میں رواج ہے، پچھلے دنوں اخباروں میں ناواقفوں کی طرف سے جب یہ شائع کرایا گیا کہ دیوبند میں بخاری کے چالیس چالیس پچاس پچاس ورق ایک دن میں ہو جاتے ہیں، حضرت مولانا حسین احمد متع اللہ المسلمین بطول بقائہ پر الزام لگایا گیا کہ سال بھر تک وہ سیاسی مشاغل میں منہمک رہتے ہیں، اور ختم سال پر اسی طریقہ سے کتابوں کا عبور کرا دیتے ہیں، تو درس حدیث کے راز سے جو نا آشنا ہیں انہوں نے تعجب کے ساتھ ان خبروں کو پڑھا، حالانکہ ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حدیث کے پڑھانے کا صحیح طریقہ ہی یہ ہے ورنہ اس راہ کو چھوڑ کر جو لوگ دوسرے طریقے اختیار کرتے ہیں، آپ سن چکے مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ اسے "طریقہ قصاص" قرار دیتے ہیں، اور بجز ایک بیجا طریقہ اظہار فضل و علم کے اس کا حاصل ان کے نزدیک عالم حالات میں اور کچھ نہیں ہے، جو چیز مطالعہ اور مزاولہ سے استاد کی تعلیم کے بغیر آسکتی ہے، سچی بات تو یہی ہے کہ اس کو پڑھانے کی حاجت کیا ہے، نصف صدی گذشتہ میں غیر مقلدیت کا طوفان جب ہندوستان میں اٹھا تو اس طوفان کے مقابلہ کے لیے احناف کی طرف سے جو لوگ کھڑے ہوئے ظاہر ہے کہ ان بیچاروں نے حدیث

وہی مشارقی و مشکوٰتی طریقہ سے پڑھی تھی لیکن آستینیں چڑھا کر جب یہی لوگ میدان میں اُترے تو کون نہیں جانتا کہ ان ہی میں مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جیسے لوگ تھے اور ان بزرگوں کے متعلق تو شائد کچھ کہا بھی جاسکتا ہے لیکن بالکلیہ جنہوں نے صرف درس نظامیہ والی حدیث سے زیادہ اور کوئی چیز اس فن میں استادوں سے نہیں پڑھی تھی مثلاً صاحب آثار السنن مولانا شوقؔ نیموی وغیرہ ان بزرگوں نے فنِ رجال، تنقید احادیث میں جن دقیقہ سنجیوں کی عملی شہادتیں پیش کی ہیں، کیا اس کے بعد بھی اس کا کوئی انکار کرسکتا ہے کہ یہ چیز درس کی نہیں بلکہ مطالعہ و مزاولت سے تعلق رکھتی ہے۔

قدیم نظامی نصاب میں اصلاح کا دوسرا دعویٰ ان علمی دائروں کی طرف سے پیش ہوا یا ہو رہا ہے، جن میں ادب عربی کو اہمیت دی گئی۔ شور برپا کیا گیا کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب عربی میں ہے پیغمبر کے ملفوظات اور پیغمبر کی سیرت عربی میں ہے مسلمانوں کا قانون اور اُن کا اعتقادی و عملی دستور حیات عربی میں ہے، ان کی تاریخ، ان کے سارے علمی کارنامے عربی میں ہیں لیکن قدیم نصاب میں اس کی اہمیت گھٹادی گئی، باور کرایا گیا، کہ جدید ادبی نصاب میں جو کتابیں نظم و نثر یا متعلقہ فنون ادبیہ کی رکھی گئی ہیں، ان کی تعلیم حاصل کیے بغیر نہ کوئی قرآن سمجھ سکتا ہے نہ حدیث، نہ فقہ، نہ تصوف، نہ کلام و عقائد۔ تقریباً پچاس ساٹھ سال سے اس کا بھی ہنگامہ برپا ہے لیکن کیا یہی واقعہ ہے؟

لہ آپ کا اسم گرامی مولانا ظہیر احسن اور تخلص شوق تھا۔ حدیث خصوصاً نقد رجال میں ان کا جو پایہ تھا اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ان کی دقتِ نظر کے مداحوں میں تھے، آپ نیمی (بہار) میں پیدا ہوئے، اور مولانا عبدالحیی فرنگی محلی سے درس نظامیہ کی تکمیل کرکے پٹنہ میں مطب کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف کا کاروبار شروع کیا۔ آثار السنن کے چند ابتدائی حصے ملک میں شائع ہوئے کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی لیکن افسوس عمر کم پائی، کتاب ناتمام رہی، پھر بھی جتنا حصہ شائع ہوچکا ہے حنفی مدارس میں بعضوں نے اس کو نصاب کا جزء قرار دیا ہے۔ یہ کتاب حنفی مکتب خیال کی تائید میں محدثانہ اصول پر مرتب کی گئی ہے۔ علامہ تھانوی نے اس کا تکملہ بھی کرایا ہے۔ مولانا شوق اردو زبان کے بڑے نامور شعراء میں تھے۔ جلال لکھنوی سے زبان کے مسئلہ میں تحریری مناظرہ بھی کیا تھا جس میں مولانا ہی کی جیت ہوئی تھی۔ ایک بڑی دردناک مثنوی اردو میں لکھی ہے، اور بھی بیسیوں

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور پھر اپنے اس دعوے کو دہراتا ہوں کہ عربی زبان اسلام کے بعد دو مستقل حصّوں میں تقسیم ہوگئی ہے، ایک حصّہ اس کا وہ ہے جس میں قرآن، حدیث اور اسلامی ادبیات محفوظ ہیں، اور دوسرا وہ ہے جس میں جاہلی شعراء، یا عہد اسلامی کے انشا پردازوں یا شعر کہنے والوں کا کلام ہے، واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان کے سابق الذکر سرمایہ کی یہ حالت ہے کہ عموماً مسلمانوں کی وہی مادری زبان ہے، اور جہاں یہ ممکن نہ ہوسکا وہاں کی مقامی زبانوں میں عربی زبان کے اس حصّہ کا ایک بڑا ذخیرہ کچھ اس طرح گھل مل گیا ہے کہ تھوڑی بہت بھی عربیت سے مناسبت پیدا کرلینے کے بعد لوگ قرآن و حدیث یا اسلامی ادبیات والی عربی کو سمجھنے لگتے ہیں، پھر جیسے جیسے مشق و مزاولت بڑھتی ہے عربی زبان کے اس حصّہ پر ان کو پورا قابو حاصل ہوجاتا ہے، لیکن اس حصّہ پر باضابطہ قابو یافتہ ہونے کے بعد بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ عربی زبان کا وہ دوسرا حصّہ یعنی وہی جاہلیت کے کلام یا دواوین، محاضرات و مسامرات کی انشائی کتابوں والی عربی سے بھی ان کو پوری مناسبت پیدا ہو، کیونکہ عموماً اس حصّہ میں ایسے الفاظ ایسی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں جو اسلامی ادبیات والی عربی کے مقابلہ میں کچھ اجنبی سی محسوس ہوتی ہے، محض قرآن و حدیث، فقہ وکلام و تصوف والی عربی سے اس جاہلی عربی کو قابو میں لانا تقریباً ناممکن ہے قریب قریب ایسی حالت ہوگئی ہے کہ فارسی زبان سیکھ کر جیسے پشتو زبان کوئی نہیں سمجھ سکتا، کیونکہ یہ دونوں دو مستقل جداگانہ چیزیں ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک کے سیکھنے سے دوسری کا علم حاصل نہیں ہوسکتا، اور یوں بھی ان میں سے کسی ایک کی عربی دوسری کی عربی پر موقوف نہیں ہے بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص جاہلیت کے اشعار میں سے کسی ایک شعر کا مطلب بھی آپ سے نہ بیان کرسکے، لیکن اسی پر قرآن کی جس آیت حدیث کے جس ٹکڑے، فقہ کی جس عبارت کو آپ پیش کرینگے بغیر کسی دقت کے اس کے معانی و مطالب کو آپ کے سامنے بیان کرتا چلا جائیگا واقعہ تو یہی ہے شعوری یا غیر شعوری حیثیت سے یہی بات بزرگوں کے پیش نظر تھی، اس لیے لازمی نصاب میں انھوں نے جاہلی عربی کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی جتنی کہ اس زمانہ میں دی گئی، یا دی

جاری ہی۔ لیکن واقعہ بہر حال واقعہ تھا، اس غیر اسلامی عربی کی ضرورت جب قرآن و حدیث نقہ وغیرہ کی عبارتوں کے حل کرنے میں بہ ظاہر لوگوں کو محسوس نہیں ہوتی تو دیکھا جاتا ہے کہ زبردستی وہی بات جو شاہ صاحب نے لکھی ہے کہ

کسی اجنبی لفظ شکل ترکیب کے متعلق شہادت میں شعراء کا کلام اشتقاق کے مواد اور طریقہ استعمال کے مواقع	در کلمہ غریبہ و ترکیب عویص شواہد آں از کلام شعراء واخوت کلمہ در اشتقاق و محال استعمال وے۔

بغیر کسی ضرورت کے درسوں ہیں یا کتابوں میں ٹھونستے چلے جاتے ہیں، اور اتفاق سے ہزار ہا ہزار الفاظ کے بعد کہیں کسی ایک آدہ لفظ کے ترجمہ میں یا کسی ترکیب کے سلجھانے میں اپنی اس عربی سے ان کو کوئی ایسی بات ہاتھ آجاتی ہی جو نسبتاً اس مقام کے لیے زیادہ موزوں ہو تو پھر کیا ہی۔ اپنی عربیت وادبیت کی شان میں قصیدہ خوانی کا وہی اسٹیشن قرار پاتا ہی، اُمت کے پچھلوں کی لعنتیں اگلوں پر موسلا دھار بارش بن کر برسنے لگتی ہیں، حالانکہ صاف بات یہ تھی کہ عربی زبان کا یہ حصہ بجائے خود ایک قیمتی اور قابل قدر چیز ہے، لیکن نصاب میں اس کی حیثیت لازمی مضامین کی نہیں تھی۔ اس لیے جیسا کہ بزرگوں کا طریقہ تھا کہ اختیاری مضمون کی حیثیت سے اگر کوئی اس عربی کو پڑھنا چاہتا تھا، تو اس کے لیے درس و مطالعہ دونوں ہی کی راہیں کھلی ہوئی تھیں، لیکن بلا وجہ لفظی مغالطوں سے لوگوں کو متاثر کرکے سارے قرآن و حدیث فقہ و کلام کو اسی عربی دانی پر موقوف کر دینا، اور نصاب میں سب سے زیادہ اسی کو اہمیت دے کر لازمی مضامین سے بھی زیادہ اس پر زور دینا کسی کو اس سے دلچسپی ہو یا نہ ہو، لیکن ہر طالب العلم پر اس کے پڑھنے پڑھانے اور مشق و مزاولت کو فرض عین قرار دینا، غالباً صرف ایک زبردستی ہی، خدا ہی جانتا ہی کہ اس طبقہ کی یہ زبردستی کب ختم ہوگی

جہاں تک میں سمجھتا ہوں قدیم نظامی نصاب کے متعلق اس زمانہ میں جو اصلاحی قدم اُٹھایا گیا ہی زیادہ تر اس کا تعلق ان ہی دو چیزوں سے ہی، تیسری بات جس کا مطالبہ تو مدتوں سے جاری ہی، لیکن عملی حیثیت سے اب تک لوگوں کی توجہ اس کی طرف جیسی کہ چاہیے نہیں ہوئی ہی،

وہ جلالین بیچاری کا لطیفہ ہے، کہا جاتا ہے کہ قرآن کے متعلق اس نصاب میں صرف یہی ایک کتاب داخل ہے جس کے الفاظ قریب قریب قرآنی الفاظ کے ہم عدد ہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قرآن فہمی کا اگر یہ مطلب ہے کہ اس کے الفاظ کے معانی اور جملوں کا سادہ مطلب لوگوں کی سمجھ میں آجائے، تو اس کے لیے جلالین کیا میرے نزدیک تو صرف قرآن کا سادہ ترجمہ بھی کافی ہے، بلکہ جلالین دراصل قرآن کے عربی ترجمہ ہی کی ایک شکل ہے، مشکل الفاظ مشکل ترکیبوں کو اس میں حل کر دیا گیا ہے، کہیں کہیں کوئی تفصیل طلب بات ہوتی ہے تو اجمالاً اس کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے، اس حد تک یقیناً جلالین کافی ہے۔

لیکن اگر قرآن فہمی سے مقصود قرآنی حقائق و معارف تک رسائی ہے تو یوں کہنے کے لیے جس کے جو جی میں آئے کہہ سکتا ہے مگر تجربہ شاہد ہے کہ اس کی حد ہے نہ انتہا، تیرہ سو سال سے قرآن پڑھا جا رہا ہے، کوشش اس کے سمجھنے کی جاری ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ اب تک کتابوں میں بیان کیا گیا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے، جو ابھی نہیں بیان کیا گیا ہے، وہ ایک بے تھاہ کتاب ہے جس کا نہ اور ہے نہ چھور، ایسی صورت میں مناسب تو یہی ہے کہ سیدھے سادے معانی اور قرآن کا جو ظاہر مطلب ہو سکتا ہے، بس طلبہ کو درساً یہ پڑھا دیا جائے اس کے بعد چھوڑ دیا جائے بندے کو اور اس کے خدا کو اپنے اپنے ظرف کے حساب سے جس کے لیے جتنا مقدر ہے وہ علم کے اس سرچشمہ سے قیامت تک پیتا چلا جائیگا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی قرآن کے متعلق مشہور روایت کے الفاظ

لا یخلق علی کثرۃ الرد ولا تنقضی	قرآن بار بار دہرانے سے پرانا نہیں ہوتا اس
عجائبہ (ترمذی وغیرہ)	کے عجائبات ختم نہیں ہونگے۔

ایک ایسا تجربہ ہے جس کی توثیق تجربہ کرنے کے بعد ہی ہو سکتی ہے، آج کیا عہد صحابہ ہی سے یہ بات چلی آتی ہے، بخاری ہی میں ہے کہ عبد اللہ ابن عباس یہ فرماتے تھے۔

کان عمر یدخلنی مع اشیاخ بدر	حضرت عمر مجھے بدر کے کہنہ سال صحابیوں کے ساتھ اپنی

فكان بعضهم وجد في نفسه
فقال لم تدخل هذا معنا
ولنا ابناء مثله فقال عمر
انه من علمتم فدعاه ذات
يوم فادخله معهم فما رئيت
انه دعاني يومئذ الا ليريهم
فقال ما تقولون في قول
الله تعالیٰ اذا جاء نصر الله
والفتح، فقال بعضهم امرنا
ان نحمد الله ونستغفره اذا
نصرنا وفتح علينا وسكت
بعضهم فلم يقل شيئاً فقال
لي كذلك تقول يا ابن عباس
فقلت لا قال فما تقول قلت
هو اجل رسول الله صلى
الله عليه وسلم اعلمه له قال
اذا جاء نصر الله والفتح
فذلك علامة اجلك فسبح
بحمد ربك واستغفره
انه كان توابا فقال عمر ما
اعلم منها الا ما تقول۔

مجلس میں جگہ دیتے تھے، ان کے اس طرزِ عمل کا بعضوں کو
احساس ہوا، اور بولے کہ لڑکا ہم لوگوں کے ساتھ کیوں شریک
مجلس کیا جاتا ہے، حالانکہ اس عمر کے تو ہمارے لڑکے ہیں حضرت
عمر نے فرمایا کہ ابنِ عباس کے متعلق تم جانتے ہو کہ وہ کن میں
سے ہے، بہرحال ایک دن ابن عباس کو خاص کر حضرت عمر نے
بلوایا اور ان ہی بزرگ صحابیوں کی مجلس میں ان کو شریک کیا
(ابن عباس کہتے ہیں کہ جس وقت مجھے اس طریقہ سے بلایا گیا
اسی وقت میں سمجھ گیا کہ حضرت عمر نے آج مجھے اسی لیے بلایا ہے تاکہ
ہیں ان لوگوں کو کچھ دکھلاؤں (ابن عباس حسب الحکم حاضر ہوئے
حضرت عمر نے مجلس کو مخاطب کر کے پوچھا) خدا کا قول "اذا
جاء نصر الله والفتح" جو قرآن میں ہے اس کے متعلق آپ
لوگوں کا کیا خیال ہے؟ جواب میں بعضوں نے کہا کہ ہمیں حکم دیا گیا
ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہم حمد کریں اور اپنے گناہوں کی مغفرت اس سے
چاہیں۔ جب خدا کی مدد آگئی اور ہمارے منشا کے مطابق مکہ،
فتح ہو گیا۔ یہ تو بعضوں نے کہا اور بعضوں نے سکوت اختیار کیا،
کچھ نہ بولے، اب حضرت عمر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم
بھی ابن عباس یہی کہتے ہو! میں نے عرض کیا جی نہیں حضرت
عمر نے کہا تو پھر تم کیا کہتے ہو، میں نے عرض کیا۔ اس آیت میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے، خدا نے حضور
کو اس سے مطلع کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کی مدد آگئی اور مکہ
فتح ہو گیا تو یہ تمہاری وفات کی نشانی ہے، اس لیے چاہیے کہ اللہ

کی تعریفوں کی پاکی بیان کرو اور اس سے مغفرت چاہو، کیونکہ اللہ توبہ
قبول کرنے والا ہے۔ تب حضرت عمر نے کہا میں بھی اس آیت کے متعلق
نہیں جانتا لیکن وہی بات جو تم نے کہی۔

حالانکہ جن بزرگوں نے سکوت فرمایا اور کچھ نہ کہا، یا جنھوں نے جو سیدھا سادہ مطلب تھا وہ بیان کیا، یہ سب کے سب "اشیاخ بدر" ہی معلوم ہوتے ہیں، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان سے چھوٹے ہیں مگر جہاں

مثل امتی کالمطر لا یدری اولہ خیر ام اخرہ (صحاح) — میری اُمت کی حالت بارش کی ہے کچھ نہیں بتایا جا سکتا کہ مفید بارش کا پہلا حصہ ہوگا یا آخر کا۔

کا قانون ہو، وہاں اس میں کیا حرج ہے کہ کسی چھوٹے کی نگاہ وہاں پہنچ جائے، جہاں بڑے کی نہ پہنچی ہو، اور یوں بھی قریب ہو، یا بلندی کے مدارج کا ان کا مدار تو اخلاص و صداقت پر ہے، یہ بالکل ممکن ہے کہ قرآن کا مطلب ایک مولوی خوب طرارے سے بیان کرتا ہو، لیکن خدا کے پاس اس کی کوئی وقعت نہ ہو، اور ایک جاہل ناخواندہ مخلص مومن حق تعالیٰ کی نگاہ میں اپنے باطنی اخلاص کی بنیاد پر مدارج عالیہ کا مستحق ہو، آخر جن بزرگوں کی نظر سورۂ اذا جاء کے اس پہلو پر نہ تھی، جس کی طرف ابن عباس نے اشارہ کیا، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس کی تصدیق فرمائی، کیا محض اس وجہ سے ان کا جو کام بدری صحابی ہونے کی وجہ سے تھا، اس میں کوئی کمی پیدا ہو جائیگی، دراصل ابن عباس کے اس اثر سے جو بخاری میں ہے اب بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے، جو قرآن فہمی کی مختلف صورتوں میں عام لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں، قرآن کے بینات سے ایک بات ایک شخص کی سمجھ میں آ رہی ہے مگر اس کو روکا جاتا ہے کہ جو بات پہلوں نے اس آیت سے نہیں سمجھی تمہاری سمجھ میں اگر وہ آ بھی رہی ہو تو نہ سمجھو

خیر یہ ایک جداگانہ بحث ہے، میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن فہمی کی جو یہ دوسری صورت ہے درس کے ذریعہ سے اس کا احاطہ ناممکن ہے، اور سیدھے سادے مطلب کے لیے کوئی سی

چھوٹی موٹی تفسیر جلالین، مدارک، بیضاوی کافی ہے، سو آپ سُن چکے ہیں کہ اسلامی ہندوستان کے ابتدائی عہد میں تو یہاں کشاف ہی پڑھائی جاتی تھی، لیکن بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب معقولات کی کتابوں کا بوجھ زیادہ بڑھ گیا، تو بجائے کشاف کے جلالین رکھ دی گئی اور مناسبت پیدا کرنے کے لیے بیضاوی کے سورۂ بقرہ کو کافی خیال کیا گیا۔ اس لحاظ سے جہاں تک میرا خیال ہے، ہے بھی یہ کافی، رہا تفسیروں کا وہ سلسلہ جس میں قصص و حکایات یا اسرائیلیات کا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے، پہلی بات تو یہی ہے کہ حدیث پڑھنے والوں کے لیے ان روایتوں کا سمجھنا ظاہر ہے کہ کچھ دشوار نہیں ہے، علاوہ اس کے بیس تیس، چالیس چالیس جلدوں والی تفسیروں کا درس یوں بھی کب ممکن ہے، تجربہ بھی بتا رہا ہے کہ جلالین و بیضاوی پڑھنے والوں کو ان تفسیروں کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی، پھر جو چیزیں یوں ہی اُستاد کی اعانت کے بغیر لوگوں کی سمجھ میں آ ہی رہی ہو، اُس کو خواہ مخواہ اُستادوں سے پڑھنے کی کیا حاجت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک پچیس تیس سال کے غور و فکر سے میں نصاب کے مسئلہ میں جس نتیجہ تک پہنچا ہوں، وہ یہی ہے کہ تبحر و احاطہ مطالعہ و وسعت معلومات کے لیے نہیں بلکہ اُستاد سے پڑھنے اور درس کی حد تک چند مختصر فقہی متون کے سوا بزرگوں نے دینیات (یعنی حدیث، تفسیر، فقہ) کے لیے اگر ان تین کتابوں (جلالین، مشکوٰۃ، ہدایہ و شرح وقایہ) کو کافی خیال فرمایا تھا، تو اس میں اُنھوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی، بلکہ اس ذریعہ سے اُنھوں نے تعلیمی نظام کی وحدت کو قائم رکھنے کی جو راہ نکالی وہ ایسی عجیب و غریب بات ہے کہ ہر زمانہ میں اس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، وہ لعنت جس میں مختلف تعلیمی نظامات کے لحاظ سے کوئی قوم مبتلا ہو جاتی ہے اس سے جب چاہا جائے نجات حاصل کرنے والے نجات حاصل کر سکتے ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ جب تک علوم دینیہ کا اقتدار باقی تھا، اس وقت تک تو دینیات کی جتنی کتابیں چاہیں ہم پڑھا سکتے تھے، لیکن جب زمانہ نے رنگ بدلا، مثلاً وہی حادثہ جو برہان الملک اور صفدر جنگ وغیرہ کے زمانہ میں پیش آیا، یا اس سے بھی زیادہ بدترین حالت

میں ہم جو اس وقت گرفتار ہیں، حکومت اور سوسائٹی دونوں میں صرف ان علوم وفنون کی وقعت ہے جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، ایسی حالت میں بآسانی بجائے اس علمی فتنہ کے جس کا تماشا دور حاضر میں ہم کر رہے ہیں، کہ تعلیم کے دو مستقل سلسلے ایک ساتھ ملک میں جاری ہیں ایک طرف جوامع وکلیات یونیورسٹیوں اور کالجوں کی تعلیم اور اُن کے تعلیم یافتہ حضرات ہیں، اور دوسری طرف دینی مدارس ومکاتب اور اُن کے پڑھے ہوئے علماء وفضلا ہیں، ہر ایک دوسرے کے علم دوسرے کے نقطہ نظر سے ناواقف ہے اور ان کو ناواقف بنا کر رکھا گیا ہے لیکن اسی کے ساتھ علم کا دعویٰ دونوں کو ہے، عوام ان کے ہاتھوں میں فٹ بال کی گیند بنے ہوئے ہیں، ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش ہے، جو جاری ہے، ایک صمار بکیا عیار فتنہ ہے جس کے مفاسد دن بدن بڑھتے چلے جا رہے ہیں، ان ہی خانہ جنگیوں میں مسلمانوں کا دین بھی برباد ہو رہا ہے اور دنیا بھی عوام پریشان ہیں کہ وہ کس کا ساتھ دیں، کس کی بتائی ہوئی راہوں پر چلیں، مولوی جب ان کے پاس آتے ہیں تو تعلیم یافتوں کی مغرب زدگیوں، دینی بے باکیوں، غلامانہ ذہنیتوں کا ماتم کرتے ہیں، ان کی منڈی ہوئی داڑھیوں، بود وباش کے یوروپین طریقوں کو شہادت میں پیش کر کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے دلوں میں ان کی نفرت کا تخم بوتے ہیں، ان کا مذاق اُڑاتے ہیں، بھری مجلسوں میں اُنہیں منبر ومحراب سے رسوا کرتے ہیں

اور یہی حال تعلیم یافتوں کا ہے کہ مولویوں کی قدامت پرستیوں، تنگ نظریوں، غربت کی وجہ سے ان کی پست زندگی کے نمونوں پر فقرے کستے ہیں، ان پر چھچھوری حرکتوں کا الزام لگاتے ہیں، مسلمانوں کو معمولی معمولی جزئی غیر منصوص مسائل پر طیش دلا دلا کر لڑانے کا انہیں مجرم ٹھہراتے ہیں۔

ایک طبقہ عوام کی گردنیں پکڑ کر آگے کی طرف ڈھکیل رہا ہے، دوسرا ان ہی بیچاروں کا دامن پکڑ کر پیچھے کی طرف گھسیٹ رہا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ علم کے دونوں نمائندے گھر کی اس منحوس لڑائی میں ذلیل ورسوا ہو رہے ہیں، نہ ان کا اثر قائم ہوتا ہے، نہ ان کی بات چلتی ہے، مسلمانوں کو

نہ دین پر عمل کرنے کا موقعہ ملتا ہے، نہ دنیا میں آگے بڑھنے کی توفیق میسر آتی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا اگر مسلمانوں کی برباد بھی ہو جائے تو اس سے تسلی مل سکتی تھی کہ دین تو ان کا باقی ہے، لیکن آج تعلیم کے ان دو مختلف الجہت نظام کے مختلف نتائج نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اُس کا آخری انجام یہ دیکھا جا رہا ہے کہ غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے اندر العیاذ باللہ دین کی نفرت پرورش پا رہی ہے، سوچنے کی بات ہے کہ جن لوگوں کی رسائی خود بھی دین کے اصلی سرچشموں تک نہیں ہے، اور جن کی رسائی ہے جب ان ہی کا اقتدار عوام کے قلوب سے مٹ رہا ہے، تو کیا بات صرف ان ہی لوگوں تک محدود ہو کر رہیگی، دین کے عالموں کی رسوائی یقین مانئے کہ خدانخواستہ اگر اس کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو لا فعلہ اللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں خود دین کی رسوائی پر اس ناپاک تحریک کا خاتمہ نہ ہو، خاکم بدہن خدانخواستہ اگر ایسا ہوا، اور جو حالات ہیں ان کے دیکھتے ہوئے کیا کہا جا سکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے، تو اس کا الزام کیا صرف کسی ایک ہی طبقہ پر ہوگا،

مصیبت کا احساس سب کو ہے لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ کیا اسکولوں اور کالجوں کے نام نہاد[۱] دینیات کے کورس کے اضافہ سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائیگا، یا پھر عربی

---

[۱] نام نہاد ہی نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں زبردستی دینیات کے نام سے کچھ دنوں سے جو مضمون پڑھایا جاتا ہے اُس کا اتنا نفع تو ضرور ہے کہ ان اسکولوں اور کالجوں میں مولویوں کے لیے کچھ تنی جانداد یں قائم ہو گئی ہیں لیکن طلبہ پر اس کا کیا اثر مرتب ہو رہا ہے، یہ افسانہ خود اس مضمون کے پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں سے سُنا جا سکتا ہے، عموماً ان اسکولوں اور کالجوں کے دینیات کے گھنٹے لڑکوں کی تفریح کے گھنٹے بنے ہوئے ہیں۔ اس مضمون کے اُستادوں کا استعمال ان جدید تعلیم گاہوں میں مفرحات کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقی اور مرکزی مضامین کے ساتھ دینیات کی یہ طفیلی جبری تعلیم بچوں میں عموماً اُلٹا اثر پیدا کر رہی ہے، بجائے اعزاز و اکرام کے دین کی اہانت و تحقیر کا ذریعہ دینیات کی یہ تعلیم بنی ہوئی ہے۔ رہی انگریزی اور مولویانہ سائنس جن عربی مدارس میں داخل ہوئی ہے اس کے تجربات بھی آپ کے سامنے ہیں، اصلاح نصاب کے سب سے بڑے علم بردار مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے متعلق مختلف ذرائع سے مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ زمانہ اور ماحول کا یہ اثر ہے کہ طلبہ میں توازن باقی نہیں رہتا، انگریزی کی شد بد کے بعد دینیات کے طلبہ میں خود اپنے مضامین اپنی مولویت سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ مذہبی علماء کے مشاغل مثلاً امامت، خطابت وغیرہ کے (باقی بر صفحہ ۲۴۹)

تعلیم گاہوں میں انگریزی کی چند ریڈریں یا روشن خیال مولویوں کے نزدیک جس چیز کا نام سائنس ہے، اس مولویانہ سائنس کی تعلیم کا دینی مدارس میں اجراء، اس مرض کا علاج ہے، میں اس کے متعلق "وفی الشمس ما یغنیك عن زحل" کے سوا اور کیا پڑھ سکتا ہوں، عیاں راچہ بیاں، جس سوراخ میں بار بار ہاتھ دینے کے بعد بچھوؤں کے ڈنک کے سوا اور کسی چیز کا تجربہ نہ ہوا اسی سوراخ میں بار بار مسلسل ہاتھ دیئے چلا جانا اور تب نہیں تو اب کی جھوٹی امیدوں میں تسلی ڈھونڈنا، کیا ایمانی عقل اس پر راضی ہو سکتی ہے ۔ من جرب المجرب حلت به الندامة کے سوا آزمائی ہوئی تدبیروں کے آزمانے کا آخری نتیجہ اور کیا ہو سکتا ہے، مرض کے اسباب کی غلط تشخیص اور اسی غلط تشخیص کی بنیاد پر مریض کا جو غلط علاج ہو رہا ہے اہل بصیرت اس تماشے کو تقریباً پون صدی سے دیکھ رہے ہیں، اور دل ہی دل میں پڑھ رہے ہیں۔ (لسان العصر)

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر یہ چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے

میرے نزدیک تو ان ساری تباہ کاریوں اور بربادیوں کے انسداد کی واحد تدبیر کوئی نئی تدبیر نہیں بلکہ نظام تعلیم کی وحدت کا قدیم اصول ہی ہو سکتا ہے، ہمیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ بزرگوں کے سیکڑوں بلکہ اب تو ہزار سال بھی کہا جا سکتا ہے۔ الغرض اپنے طویل تجربوں کے بعد تعلیم کی جو راہ بنا دی تھی اگر اسی راہ پر پھر غور کیا جاتا تو میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ مشکلات کے حل کی راہ اسی سے پیدا ہو سکتی تھی

یہی بات کہ قدیم نصاب میں دینیات کے مضامین (قرآن، حدیث، فقہ) کو محوری اور اساسی مضمون قرار دے کر درس کے لیے ہر مضمون کی ایک ایک ٹھوس جامع حاوی، مختصر کتاب کا انتخاب کر کے دینیات کے لیے پورے نصاب میں جیسا کہ میں نے عرض کیا صرف تین کتابوں کو کافی قرار دیا گیا، اور اس کے بعد پڑھنے والوں کے لیے ایک وسیع

مقالات گیلانی ص ۱۲

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۸) کام کو مولویوں کا یہ گروہ باوجود مولوی ہونے کے اپنی شان سے گری ہوئی بات تصور کرتا ہے، میرے خیال میں تو لعنت کی یہ آخری شکل ہے کہ خود اپنے آپ پر آدمی لعنت بھیجنے لگے، وہ خود جو کچھ ہے دینی کام سے

میدان چھوڑ دیا گیا، جس میں جب ضرورت تھی تو فارسی کے نظم و نثر کی بیسیوں کتابوں کی مکتبی زندگی میں اور منطق، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، اصول کلام، ادب عربی کی تقریباً ساٹھ ستر کتابوں کی اعلیٰ عربی تعلیم میں کافی گنجائش نکل آئی، پھر جب تک موقعہ تھا ان غیر دینیاتی مضامین کی حیثیت اختیاری مضامین کی رہی، اور جیسے جیسے زمانہ کا مطالبہ بڑھتا گیا ان مضامین میں سے جن کو لازم قرار دینے کی حاجت ہوئی، انہیں لازم قرار دے دیا گیا اور یوں ہی مسلمانوں کے اس واحد تعلیمی نظام سے منطقی ملّا، فلسفی ملّا، مہندس ملّا، ادیب ملّا، شاعر ملّا، الغرض باوجود ملّا ہونے کے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہی بن بن کر نکلتے رہے

کیا بسہولت تمام آج بھی بزرگوں کے اسی تعلیمی منہاج کو سامنے رکھ کر ہم حقیقی اور خالص دینیات کے ان اساسی مضامین کی ان ہی تین کتابوں کو باقی رکھتے ہوئے وہی فارسی جو کچھ دن پہلے ہندوستان کی حکومت کی زبان تھی، اور وہی معقولات جن کی مغل دربار میں قیمت ملتی تھی، بجائے ان غیر دینیاتی مضامین کے عصر حاضر میں حکومت کی جو زبان ہے اور موجودہ حکومت جن علوم و فنون کے پڑھنے والوں کا اپنی ضرورتوں کے لیے مطالبہ کر رہی ہے، ہم زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے ٹھیک اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر، اپنے نصاب میں ان جدید مضامین کو شریک کر کے بجائے فلسفی ملّا کے سائنٹسٹ ملّا اور بجائے منطقی ملّا کے سائکولجسٹ ملّا وغیرہ ملاؤں کی مختلف قسم نہیں پیدا کر سکتے۔

ملائیت کہیے یا دینی علوم ان کے لیے جب صدہا سال تک وہی تین کتابیں کافی سمجھی گئیں، تو پھر آج بھی اسی ملائیت کے لیے یا ایک دینی عالم ہونے کے لیے بھی تین کتابیں کیوں کافی نہ ہوں گی۔

میں نہیں سمجھتا کہ اگر اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کی جو مدت اس وقت مقرر ہے یعنی بی اے ہونے کے لیے کم از کم چودہ سال کی تعلیم ضروری ہے، اس چودہ سال کے نصاب میں دینیات کی ان تین کتابوں (قرآن، مشکوٰۃ، ہدایہ و وقایہ) کی جگہ نہیں نکل سکتی۔

اور بالفرض ضروری غیر ضروری مضامین کی اسکولوں اور کالجوں میں جو کثرت ہے یعنی وہ مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں جو اُستاد کے بغیر طلبہ کو نہیں آسکتے، اور ان مضمونوں کو بھی پڑھایا جاتا ہی جنہیں اُستادوں کے بغیر یوں ہی ہر پڑھا لکھا آدمی پڑھ سکتا ہی اور پڑھتا ہی اگر بدتمیزی کے اس طوفان میں ان تین کتابوں کے لیے جگہ نہ نکل سکتی ہو تو کیوں نہیں ہم اپنے سارے دینی اور دنیوی تعلیمی نظامات کو بجائے دوئی کے وحدت کے رنگ میں ڈھال لیں، اور اپنا نصاب خود بنائیں، تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہی، ورنہ سچ یہ ہی کہ بزرگوں کے اس عجیب و غریب نمونے پر جب سے مجھے تنبہ ہوا ہی یعنی دینیات، کی کل تین کتابوں کے سوا اثلاثیت کے نصاب کا سارا میدان غیر دینیاتی کتابوں سے بھرا ہوا جو محسوس ہوا تو حقیقت یہ ہی کہ اسی وقت سے میں اپنے اندر اس یقین کو پاتا ہوں کہ اسی میدان کو قدیم مطالبے والے غیر دینی علوم کو نکال کر بآسانی موجودہ مطالبوں کے مطابق والے مضامین کے لیے پوری قوت اور کافی وسعت دلی کے ساتھ ہم جگہ نکال سکتے ہیں، مثالاً میں نے آپ کے سامنے ابن سینا کے تعلیمی نصاب کا ایک حصہ ابن خلکان سے نقل کیا تھا۔ اگر اسی نمونہ کو سامنے رکھ لیا جائے اور ابتدائی تعلیم کی بنیاد اسی نمونہ پر رکھی جائے ابن خلکان نے لکھا تھا کہ

"دس سال کی عمر تک ابن سینا نے قرآن عزیز اور ادب پڑھا، کچھ عقائد کے مسائل یاد کیے اور حساب الہند وجبر و مقابلہ سکھا"

حساب الہند سے وہی ہندوستان کے حساب کا قدیم طریقہ مراد ہی جس میں پہاڑے وغیرہ یاد کرا کے آئندہ جمع تفریق، تقسیم اور اس کی مختلف قسمیں سکھائی جاتی ہیں، آج کل جس کا نام "میتھمیٹکس" ہے، ممکن ہی ان سارے مضامین کے لیے دس سال کی عمر آج ناکافی ہو، اور یہ بھی یہی بات کہ ابن سینا پر ہر بچہ کو قیاس کرنا بھی غلط ہی، اب بجائے اس کے وہی سولہ سال کی عمر رکھ لیجیے، جو آج میٹرک پاس کرنے کی ابتدائی عمر ہی یعنی اس عمر سے کم سن بچوں کو میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا جاتا۔

ابتدائی تعلیم کا اجمالی نقشہ

کیا سولہ سال کی اس مدت میں ابتدائی تین سالوں تک بچوں کو ناظرہ قرآن، اُردو اور حساب و تختی نویسی میں لگائے رکھا جائے اور اس کے بعد اُردو کی جگہ فارسی کی چند کتابیں اُردو ہی کو قوی کرنے کے لیے سال دو سال پڑھائی جائے، اور اس کے بعد بجائے فارسی کے عربی زبان کی تعلیم قرآنی پاروں اور حدیث کے مختصر متن (مثلاً منہیات عسقلانی بلوغ المرام وغیرہ) کسی فقہی متن (مثلاً قدوری) کے ساتھ دی جائے اور اس کو ایک سلسلہ فرض کیا جائے۔ دوسرا سلسلہ حساب کا بدستور باقی رکھا جائے۔ اور تیسرا سلسلہ انگریزی ادب کا شروع کر دیا جائے۔ اگر سات سال سے بھی فرض کیا جائے کہ بچے نے ابجد شروع کی ہے، تو سولہ سال تک پہنچنے کے لیے نو سال کی مدت ملتی ہے، کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس کافی طویل مدت میں حساب اور انگریزی کی قابلیت میٹرک والوں کے برابر نہ پیدا ہو جائیگی۔ اور اسی کے ساتھ قرآن ناظرہ بھی ختم ہو جاتا ہے، چونکہ اُردو فارسی، عربی تینوں زبانوں کی یکے بعد دیگرے تعلیم ہوگی، اور تجربہ شاہد ہے کہ اُردو میں مسلسل اُردو ہی کی کتابوں کے پڑھتے چلے جانے سے چنداں کوئی نفع نہیں ہوتا، پانی میں گویا پانی کو ملانا ہے جس سے کسی نئے مزے اور رنگ کی توقع نہیں ہو سکتی، لیکن اُردو ہی میں قوت پہنچانے کے لیے آپ اُردو کی چند ریڈروں کے بعد بجائے اُردو کی کتابوں کے فارسی کی چند ریڈروں کی تعلیم دیجیے، اور فارسی کو قوی کرنے کے لیے اسی کے بعد فوراً عربی شروع کرا دیجیے، عربی میں بلی چوہے کے قصوں کی جگہ مسلمانوں کے دینی معلومات والی کتابیں یعنی قرآنی پارے فقہی متون میں سے کوئی متن، حدیث کے مجموعوں میں سے کوئی مختصر مجموعہ ان ہی کو عربی ادب سکھانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ نو سال کی اس طویل مدت میں ان کاموں کی گنجائش

کیوں نہ نکل آئیگی۔

یہ صحیح ہو کہ اسلامی عربی (یعنی جس میں مسلمانوں کے دینی علوم ہیں) اس کے لیے بھی نحو وصرف کے قواعد و مسائل کا جاننا ضرور ہو لیکن کسی معمولی مختصر رسالے سے یہ کام لیا جا سکتا ہے، (حال میں علم عربی کے نام سے ایک اچھی جامع کتاب اُردو میں شائع ہو چکی ہے) جو کافی ہو، اس کے لیے شرح جامی و عبدالغفور تحریر سنبٹ والی منطقی نحو اور اشتقاق کبیر یا فیلالوجی والے وہ طویل صرفی مباحث جو بچوں کو اس وقت سکھائے جاتے ہیں جب صغیر صرف کا بھی سمجھنا اور اس کے قاعدوں پر حاوی ہونا ان کے لیے آسان نہیں ہوتا، قطعاً غیر ضروری ہو، خلاصہ یہ ہو کہ ابتدائی مکتبی تعلیم کے نصاب میں اگر حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھ لیا جائے۔

(۱) صرف وہی چیزیں پڑھائی جائیں جو اُستادوں سے پڑھے بغیر نہیں سیکھی جا سکتیں

(۲) اُردو میں ترقی کرنے کے لیے اُردو ہی کتابوں کا مسلسل سالہا سال تک پڑھایا جانا کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کرتا، بلکہ اُردو میں قوت پیدا کرنے کے لیے فارسی اور فارسی میں بچوں کو قوی کرنے کے لیے عربی کا سکھانا ضروری قرار دیا جائے۔

(۳) عربی زبان کے صرف اُسی حصہ کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھا جائے جس میں ان کے دینی معلومات ہیں، باقی عربی کے دوسرے حصہ کو اعلیٰ تعلیم میں بطور اختیاری مضامین کے چاہا جائے تو رکھا جا سکتا ہو، بلکہ اس کے اختصاصی علما بھی اختصاصی درجوں میں اگر پیدا کیے جائیں تو وہ ایک دوسری ضرورت ہو، لیکن ہر پڑھے لکھے مسلمان کو جس عربی کی حاجت ہو، وہ صرف اسلامی ادبیات ہی والی عربی ہو۔

(۴) اس عربی کو قصہ کہانی کی کتابوں کے ذریعہ سکھانے کی جگہ خود قرآنی پاروں اور فقہی و حدیثی متون کے ذریعہ سے سکھانا زیادہ مفید اور ضروری ہو کہ یہ یک کرشمہ دو کار ہے

(۵) اسلامی ادبیات والی عربی کے لیے نحوی و صرفی قواعد کے ان طول طویل سلسلوں

کی حاجت نہیں، جو کسی زمانہ میں دماغی تمرین اور ذہنی تشحیذ کے لیے پڑھائے جاتے تھے۔

ان پنجگانہ اصول کو پیش نظر رکھ کر اگر نصاب بنایا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ نو سال میں میٹرک تک کی انگریزی و حساب کے ساتھ بچوں کے اندر اس کی صلاحیت کیوں نہ پیدا ہو جائیگی کہ آئندہ کلیاتی تعلیم کے نصاب میں قرآن و حدیث و فقہ کی ان تین کتابوں کو بی اے تک کے چار سال میں دوسرے اختیاری و متناسب مضامین کے ساتھ پڑھ کر ختم کر دیں جو قدیم درس نظامیہ میں دینیات کی آخری درسی کتابیں ہیں۔ تجربہ بتائیگا کہ انگریزی ادب اور جدید علوم میں سے تناسب علوم کا کوئی گروپ (طائفہ) درس نظامیہ کے ان تین دینیاتی کتابوں کے ساتھ بخوشی جمع ہو سکتے ہیں، پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا، بی اے کے بعد ایم اے کے اختصاصی درجہ میں اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے طلبہ جس فن میں خصوصیت پیدا کرنا چاہیں پیدا کر سکتے ہیں ان خصوصی فنون میں، جہاں جدید علوم و فنون میں سے کسی فن و علم یا زبان وغیرہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے وہیں بآسانی فقہ و حدیث، تفسیر، ادب عربی بلکہ جی چاہے تو کوئی قدیم معقولات (منطق کلام، فلسفہ، اصول) وغیرہ کے مضامین بھی اختیار کر سکتا ہے، یہ ایسا نصاب ہوگا جو طلبہ کے لیے قدیم و جدید علوم و السنہ میں سے ہر ایک کے اندر خصوصیت پیدا کرنے کا ذریعہ فراہم کرتا ہے، اور سب سے اہم اصولی نفع نظام تعلیم کی اس وحدت کا یہی ہے کہ ملا و مسٹر، علماء و لیڈر کی باہمی کشمکش کا سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے، اب جو بھی ملک میں پڑھا لکھا یا صاحب علم و فضل ہوگا، وہ پہلے ملا ہوگا اس کے بعد پھر جس مضمون کو اس نے اختیار کیا ہوگا اُس کا ماہر قرار پائیگا۔ انشاء اللہ اس کے بعد ملا ہی مسٹر ہونگے اور مسٹر ہی ملا ہونگے، علماء ہی لیڈر ہونگے اور لیڈر ہی علماء ہونگے، جیسا کہ بارہ سات بارہ سو سال تک یعنی نظام تعلیم کی ثنویت (دوئی) سے پہلے مسلمانوں میں عموماً یہی ہوتا رہا۔ ابن رشد ارسطو کی کتابوں کی شرح بھی کرتا تھا، اور اسی کے قلم کی علم فقہ میں وہ قیمتی یادگار ہے جس کا نام "بدایۃ المجتہد" ہے، فقہ کے ہر باب میں ائمہ امصار و مجتہدین امام ابو حنیفہ، شافعی، مالک، احمد وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کے مسالک پر قرآن و حدیث و آثار صحابہ کی روشنی میں اتنی اچھی بحثیں کی ہیں کہ مشکل سے

اس جوڑ کی کوئی کتاب فقہ جامع میں مل سکتی ہے، امام رازی ابن سینا کے فلسفہ کی تشریح بھی کرتے تھے اور وہی قرآن کی وہ معرکۃ الآرا تفسیر بھی کرتے ہیں جو تفسیر کبیر کے نام سے اُمت میں مشہور ہے نہ صرف علماء اہل سنت بلکہ شیعی علماء کا بھی یہی حال ہے، میر باقر داماد فلسفہ کے میدان کا یکہ تاز سمجھا جاتا ہے لیکن کوئی باور کر سکتا ہے کہ جس نے "الافق المبین" جیسی پیچیدہ الہیاتی کتاب لکھی ہو وہی شارع النجاۃ نامی کتاب فقہ شیعی کی بھی لکھ سکتا ہے، وہی شیعوں کی حدیث کی مشہور کتاب الکافی پر حاشیہ نگاری کا کام کر سکتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں دینی اور دنیوی علوم کے مرکب نصاب کو جاری کر کے تعلیمی نظام میں ایسی وحدت پیدا کر دی تھی کہ اسی ہندوستان میں ایک زمانہ وہ بھی گذرا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی بھی پڑھنا چاہتا تھا، تو اسے بھی اسی نصاب کی کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں، اس سے پیشتر حکیم کامراں، دستور، ہمہ بد وغیرہ کا ذکر گزر چکا ہے جنہوں نے اسلامی علماء سے درسی کتابیں پڑھی تھیں، حکیم کامراں ان کتابوں کا درس بھی دیتا تھا، ان کے سوا اس ملک کے ہندو بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عربی نصاب کو ختم کرتے تھے بداؤنی نے عہد سکندری کے ایک برہمن کا ذکر کیا ہے۔

(ج ا، ص ۳۲۳)

"یکے از شعراء عہد سکندر لودی برہمن بودمی گویند کہ باوجود کفر کتب علوم رسمی را درس می گفت"

حالانکہ گذر چکا کہ سکندری عہد میں گو دینیاتی کتابوں کے ساتھ معقولاتی عناصر کا اضافہ ہونا شروع ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اتنا اضافہ تو قطعاً نہ ہوا تھا جتنا کہ فتح اللہ شیرازی اور ان کے بعد ہوا، خیال کرنے کی بات ہے کہ اس زمانہ میں "علوم رسمی" کی کتابیں جو پڑھاتا ہو گا، کیا وہ بزدوی اور ہدایہ وغیرہ نہ پڑھاتا ہو گا، آخر جب حکیم کامراں سے مسلمان طلبہ تفسیر بیضاوی پڑھتے تھے تو کیا تعجب ہے کہ مسلمانوں کے علوم رسمیہ کا یہ پڑھانے والا برہمن ان کتابوں کو نہ پڑھاتا ہو، خلاصہ یہ ہے کہ بزرگوں سے دینیات کا جو کورس بطور متروکہ کے ہم تک پہنچا ہے وہ اتنا مختصر اور چند گنی چنی کتابوں پر مشتمل ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانہ کے تعلیمی نظام میں اس عہد کے مروجہ علوم و فنون کی کتابوں کو ہم ان کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں، اور ایک ہزار سے زیادہ مدت تک ہم نے ان کو غیر دینی علوم کے

ساتھ جوڑے رکھا، اسی بنیاد پر میرے نزدیک دین کی تعلیم کے لیے کسی مستقل جداگانہ نظام کو قائم کر کے مسلمانوں میں علمی انتشار اور دوعملی پیدا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے، دینیات کے اسی نصاب کے ساتھ جب مغلئی عہد کے درباری علوم و فنون منطق و فلسفہ، ریاضی، فارسی ادب کے نثر و نظم وغیرہ کی کتابوں کو جوڑ کر ہم نے تعلیمی نظام کی وحدت کو پوری قوت کے ساتھ باقی رکھا، کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ آج دینیات کے اسی مختصر کورس کو محور بنا کر عہد حاضر کے ٹکسالی علوم و فنون یا زبانوں کی تعلیم کو اس کے گرد ہم گردش نہیں دے سکتے، جوں ہی کہ زمانہ بدلا تھا، بزرگوں کے اسی نمونہ کو پیش نظر رکھ کر دینیات کے محور کو قائم رکھتے ہوئے ذیلی مضامین کو اگر بدل دیا جاتا یا یہ نہ بھی کیا جاتا، تو معقولات کو بھی اختیاری مضامین کا ایک گروپ قرار دے کر عصریاتی علوم کا بھی نصاب میں اضافہ کر دیا جاتا، کاش ایسا ہو جاتا تو آج بدتمیزی کے جس طوفان میں مسلمان ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، غالباً یہ صورت نہ پیش آتی، ولکن ما قدر اللہ فسوف یکون۔

لیکن وقت اب بھی اصلاح کا باقی ہے تعلیم کی اس ثنویت) اور دوعملی کو اب بھی توڑا جا سکتا ہے، اور توحیدی نظام کو اب بھی اس کی جگہ جاری کیا جا سکتا ہے[1] میں تو سمجھتا ہوں

---

[1] لوگ مصارف کے سوال کو درمیان میں لاتے ہیں، حالانکہ اولاً یہ حکومت ہی کا فرض تھا، جہاں دنیوی علوم و فنون پر وہ کروڑہا کروڑ صرف کر رہی ہے، ہر صوبہ میں تھوڑی رقم دینی علوم کے معلمین کی تنخواہوں کے لیے بھی منظور کر سکتی ہے، اور اب تو تقریباً تمام صوبوں میں مشرقی علوم کی تعلیم و امتحان کے نام سے سرکاری مصارف سے ادارے جاری ہو چکے ہیں۔ اور فرض کیجیے کہ حکومت اگر اس پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمان اسی رقم کو جو آج وہ ان تعلیم گاہوں پر صرف کر رہے ہیں جن میں ان کے دینیات کے ساتھ مغلئی عہد کے السنہ و علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، اسی رقم کو حکومت کے جامعات و یونیورسٹیوں کے حوالہ کر کے اپنی تعلیم میں وحدت پیدا کر سکتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہر ہر صوبہ میں مسلمانوں کے جو اوقاف ہیں، حکومت اگر چاہے یا مسلمان حکومت پر زور دے کر اس چاہنے پر اس کو مجبور کریں کہ اوقاف کی اسی مد سے وہ اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کے قدیم نصاب کو جاری کر کے ثنویت کی اس لعنت سے مسلمانوں کو نجات دے تو کیا یہ مطالبہ اس مطالبہ سے بھی زیادہ ناقابل سماعت ہے جو آج اسی حکومت کے سامنے پیش کیا گیا ہے یعنی ملک کی حکومت کا چارج ملک والوں کو سپرد کر کے خود بہ یک بینی و دو گوش جہاں سے (باقی بر صفحہ ۲۵۷)

کہ صرف اسلامی فرقے[۱] مثلاً شیعہ وغیرہ ہی نہیں، غیر مذہب کے لوگوں سے اس معاملہ میں مصالحت کی صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے، مطلب یہ ہے کہ صرف دینیات کی حد تک شیعہ اپنی کتابیں پڑھیں اور دنیوی علوم والسنہ میں ہمارے ان کے اشتراک ہو، جیسا کہ قدیم نصاب میں یہی تھا بھی، جس کا تجربہ ہوچکا ہے کہ بآسانی چل سکتا ہے، پھر کیا یہی طریقہ ہندو بھی نہیں اختیار کرسکتے ہیں کہ وہ بھی اپنا ایک مختصر سا مذہبی کورس بنالیں، اس میں ہم سے الگ رہیں، لیکن دوسرے علوم والسنہ میں ہمارے ساتھ پڑھیں۔ زیادہ سے زیادہ ہندو اگر ہٹ دھرمی ہی سے کام لینگے تو مکتبی اور اسکولی تعلیم میں بجائے اردو، فارسی کے بھاشا، اور بجائے عربی کے سنسکرت کو لے سکتے ہیں، لیکن یہ سارا نظم صرف ایک ہی نظام کے تحت یقیناً بغیر کسی دشواری کے چل سکتا ہے، خود ہندوؤں میں پنڈتوں اور تعلیم یافتوں میں وہی رنگ برپا ہے۔ اس جنگ کے مٹانے کے لیے خود ان کو بھی ضرورت ہے کہ اس دوعملی کے ختم کرنے میں ہمارا ساتھ دیں۔

اب رہا یہ سوال کہ محض یہ بات کہ دینیات کا یہ مختصر کورس (یعنی ہدایہ، وقایہ، جلالین

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۶) آئی بھی وہاں چلی جائے سمجھ میں نہیں آتا کہ کبھی تو اس مطالبہ کی تکمیل کی بھی امیدیں قائم کیجاتی ہیں اور کبھی اتنی نا امیدی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ تعلیمی نظام کی اصلاح بھی نہیں ہوسکتی ۱۲۔

[۱] چند عامۃ الورود مغالطوں میں ایک بڑا مغالطہ مسلمانوں کی فرقہ بندی کا بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ چالیس پچاس کروڑ مسلمانوں میں اہل السنت والجماعت کی اکثریت کبریٰ کے بعد بمشکل صرف ایک فرقہ شیعوں کا ایسا اسلام میں پایا جاتا ہے جس پر الگ فرقہ ہونے کا اطلاق صحیح ہوسکتا ہے، ورنہ اہل السنت عقائد و خیالات مسلمات میں باہم متفق ہیں حنفی، شافعی مکاتب خیال فقہی مکاتب ہیں، جن کی بنیاد پر فرقہ بندی پیدا نہیں ہوتی حنفی شافعی مالکی و حنبلی مسلمانوں کا سب سے بڑا روحانی پیشوا یعنی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جب حنبلی ہیں اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ان اختلافات کی کیا نوعیت ہے۔ واقعۃً خود حنفی مسلک میں ابو یوسف، امام محمد وغیرہما ائمہ کے اختلافات سے الگ فرقے پیدا نہیں ہوتے اسی طرح مالکیت شافعیت سے بھی الگ فرقے نہیں بنتے۔
اسلام کا میرے خیال میں یہ معجزہ ہے کہ پچاس ساٹھ کروڑ انسانوں کی برادری میں اس نے ایسی ہمرنگی پیدا کی ہے کہ شیعوں کو الگ کرنے کے بعد سب ایک ہوجاتے ہیں، اور شیعوں کی تعداد بمشکل سو میں ایک ہوگی، ایسی اقلیت کس حد تک قابل توجہ۔

مشکوٰۃ) والا نصاب چونکہ بزرگوں کا متروکہ ہے اور صدیوں کم از کم ہندوستان کی حد تک دینیات کے نصاب میں ان ہی کتابوں یا ان جیسی دوسری کتابوں کو دینیات کے درجہ ضروری کے لیے نہیں بلکہ درجہ فضل کے لیے کافی سمجھا گیا، کیا اس کی دلیل ہوسکتی ہے کہ صرف ان چند کتابوں کو پڑھا دینا اور پڑھ لینا آئندہ دینیاتی علوم میں مہارت و تبحر پیدا کرنے کے لیے کافی ہے؟ بلاشبہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے جواب میں دو باتیں پیش کی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ ہے کہ نتائج سے کفایت و عدم کفایت کا فیصلہ کیا جائے۔ یا یوں کہیے کہ پھل سے درخت کو پہچانا جائے قطع نظر اس سے کہ ہندوستان میں سو ڈیڑھ سو سال نہیں بلکہ تقریباً چھ سات سو سال تک دین کا سارا کاروبار دینیات کے اسی مختصر نصاب کے پڑھنے والوں نے انجام دیا ہے قضا و افتاء، صدارت جیسی تمام مذہبی خدمات کو یہی لوگ قطب الدین ایبک کے زمانہ سے بہادر شاہ کے زمانہ تک بلکہ جب تک انگریزی حکومت کے محکمے مسلمان قاضیوں اور صدور کے ہاتھوں میں رہے، اس وقت تک یہی لوگ انجام دیتے رہے۔ ہندوستان میں حدیث کا تفسیر کا، فقہ کا جتنا کام ہوا، اسی مختصر نصاب کے پڑھنے والوں کے ہاتھوں ہوا جس کی تھوڑی بہت تفصیل گذر چکی ہے لیکن ان گذرے ہوئے ہندی علماء کے متعلق تو شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں جب ان علماء کے مقابلہ میں کوئی دوسرا تھا ہی نہیں تو کیا کہا جاتا اپنے وقت کے رازی اور غزالی ان ہی کو سمجھا گیا، اس لیے اس بحث میں پڑنے کے بجائے مناسب معلوم ہوتا کہ اسی مختصر دینی نصاب کے پڑھنے والوں نے ہندوستان سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک جہاں کا ئنا جاتا ہے کہ دینی نصاب عریض بھی ہے اور طویل بھی ہے، ان ہی ممالک میں ان ہندی علماء نے مختلف قرون اور صدیوں میں اپنے آپ کو جو کچھ ثابت کیا ہے اس کی چند تاریخی شہادتیں پیش کردوں۔

یہاں میں پھر یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندی نظام تعلیم میں نصاب کی حد تک رد و بدل جو کچھ ہوا اور ہوتا رہا ہے اس کا زیادہ تر تعلق غیر دینی علوم سے ہے، ورنہ یہ تفصیل بتایا جاچکا ہے کہ دینیات

کی حد تک کتابوں کا معیار تقریباً ہر زمانہ میں مساوی رہا ہے، نصاب کے اس حصّہ میں کچھ تغیر اگر ہوا ہے تو صرف کتابوں کی حد تک محدود ہے، مثلاً فقہ میں پہلے ابن الساعاتی کی مجمع البحرین تھی، بعد کو بجائے مجمع البحرین کے شرح وقایہ شریک ہوئی، اسی طرح حدیث میں پہلے مشارق ومصابیح تھی ان ہی جگہ مشکوٰۃ نے لی، جاننے والے جانتے ہیں کہ مضامین کی حد تک معیار پر اس تبدیلی کا کوئی اثر نہیں پڑا، البتہ تفسیر میں پہلے درجہ فضل کی کتاب "کشاف" تھی، بعد کو "کشاف" عمومی نصاب سے خارج ہوگئی اور اس کی جگہ جلالین کامل وبیضاوی سورۂ بقرہ نے لے لی، جس کے یہ معنی ہوئے کہ پچھلے زمانہ کے اعتبار سے تفسیر کے درس کا معیار کچھ گھٹ گیا، لیکن نتائج کا جہاں تک تعلق ہے، قرآن کے باب میں ہندوستان کی پچھلی صدیوں کا کام اگلی صدیوں سے یقیناً بہتر ہے۔ رہا ہدایہ سواتوں سے آخر تک آج چھ ساڑھے چھ سو سال سے ایک حال میں قائم ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ دینیاتی حصّہ میں نصاب کا یہ تغیر کتنا معمولی تغیر ہے، قریب قریب کتابوں کی تعداد بھی دینیات میں برابر برابر ہی رہی، اور معیار بھی برابر ہی رہا ہے، اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب آپ کے سامنے ان چند ہندوستانی مولویوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ہندوستان سے باہر نکل کر اسلامی ممالک میں پہنچے ہیں، جس سے آپ کو اندازہ ہوگا، کہ دینیات کے اسی مختصر نصاب کے نتائج کتنے عجیب اور حیرت انگیز بلکہ شاید مدہش ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس موقعہ پر ان لوگوں کا تذکرہ تو بے محل ہی ہوگا جو نسلاً یا وطناً ہندوستانی تھے لیکن ان کی تعلیم بیرونی ممالک میں ہوئی، بلکہ ان لوگوں کا بھی تذکرہ نہ کرونگا جن کی تعلیم کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی تکمیل ہوئی، ہندوستان میں یا ہندوستان سے[1] باہر؟ بلکہ

---

[1] مثلاً سندھ کے علماء شیخ حیات سندھی شیخ عابد سندی، یا ہندوستان کے علماء جیسے علامہ مرتضیٰ زبیدی شارح قاموس وغیرہم اسی قسم کے حضرات ہیں، علی الخصوص علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی جو عموماً زبید کی طرف غلطی سے منسوب ہیں، گو ان کے متعلق عام کتابوں میں بھی لکھا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے باہر پڑھا جو کچھ پڑھا، لیکن بعض (بقیہ بر صفحہ ۲۶۰)

اس موقعہ پر صرف ان ہی بزرگوں کو شہادت میں پیش کرونگا، جن کے متعلق صحیح طور پر یہ معلوم ہو کہ اُنھوں نے جو کچھ پڑھا، ہندوستان ہی میں پڑھا۔ آئیے، اور تاریخ اس باب میں جو کچھ کہتی ہو اُس کا تماشہ کیجیے، ساتویں صدی کا زمانہ ہو، یہ مصر ہو، یہاں اسلام کی عمر چھ سات سو سال سے زیادہ گذر چکی ہو، کابرًا عن کابر نامی گرامی علماء اس ملک میں مسلسل پیدا ہوتے رہے ہیں، خصوصًا جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ وہ وقت ہو کہ سارے اسلامی ممالک کے مقابلہ میں مصر کے متعلق مشہور مورخ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

ولا اوفر الیوم فی الحضارۃ من	آج (یعنی ساتویں اور آٹھویں کے درمیانی زمانہ میں)
مصر فہی ام العالم وایوان الاسلام	مصر سے زیادہ حضارت (اسلامی کلچر) کا سرمایہ دار
وینبوع العلم والصنائع	کوئی نہیں ہو، مصر ہی اس زمانہ میں اور جہاں ہی وہی
(مقدمہ ص۴۷۹ مطبوعہ مصر)	اسلام کا ایوان ہو علم اور صنائع کا آج وہی سرچشمہ ہو۔

اور آخری بات یہ ہو کہ یہیں ازہر کا مشہور بین العالمی اسلامی جامعہ ہو، اسی قدیم اسلامی ملک میں ہندوستان کا ایک عالم پہنچتا ہو اس کا نام سراج ہندی ہو جس کی تعلیم اسی نو مسلم ملک ہندوستان میں پوری ہوئی ہو، علامہ طاش کبری زادہ مفتاح السعادہ میں لکھتے ہیں۔

تفقہ ببلادہ علی الوجیہ الرازی و	سراج ہندی نے خود اپنے وطن (ہندوستان) میں علم وجیہ
السراج الثقفی والرکن البدایونی	رازی اور سراج ثقفی رکن بداؤنی وغیرہ ہندی علماء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۹) کتابوں سے معلوم ہوتا ہو کہ علامہ مرتضیٰ الہ آباد کے مشہور عالم مولانا فاخر اور حضرت شاہ ولی اللہ سے پڑھنے کے بعد یمن وغیرہ گئے، مدت ہوئی ایک مستقل مقالہ مولانا کے متعلق معارف اعظم گڈھ میں فقیر نے لکھا تھا، مولانا کو جو علمی امتیاز آخر زمانہ میں ممالک اسلامیہ خصوصًا حجاز، یمن اور بالآخر مصر میں حاصل ہوا، خود ان ممالک کے علماء میں اس کی نظیر مشکل سے پیش ہو سکتی ہو، بڑے بڑے سلاطین حتیٰ کہ خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید خاں اناراللہ برہانہ اور ان کے وزیر صدر اعظم محمد پاشا نے تبرکًا ان سے حدیث کی سند حاصل کی، ان کی کتابوں کے نقول بڑے بڑے بادشاہوں نے منگوائے۔ مصر میں حدیث کا حلقہ ان کا خنبا بڑا ہوتا تھا، اور جس شان کے ساتھ ہوتا تھا کہتے ہیں کہ چشم فلک نے اس تماشے کو مصر میں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔۱۲

وغیرھم من علماء الھند (مفتاح ص۵۹) سے حاصل کیا۔

حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے۔

کان قدومہ بالقاھرۃ قبل الاربعین وھو متاھل للعلم (درر کامنہ)

قاہرہ میں ان کی تشریف آوری چالیس[1] سے پہلے اس وقت ہوئی جب وہ علم والے ہو چکے تھے،

جس کا یہی مطلب ہوا کہ "اہل علم" بن کر مصر پہنچے تھے۔ اب سنیے ہندوستان کے اس مختصر دینی نصاب کو پڑھ کر مصر پہنچنے والا ہندی عالم اپنے علمی کمال کی بدولت کہاں پہنچتا ہے حافظ ابن حجر ان کے عام عالمی مناصب کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں۔

ولی قضاء العسکر وناب فی القضاء عن جمال الدین ابن الترکمانی مدۃ طویلۃ

عسکر کے قاضی ہوئے اور جمال الدین بن ترکمانی کی طرف سے نائب قاضی کا کام ایک زمانہ تک انجام دیا

مگر بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی بلکہ

ثم ولی القضاء استقلالا فی شعبان سنہ ۷۶۹ بعد موت ابن الترکمانی

پھر سنہ ۷۶۹ھ شعبان میں قضا کے اس عہدہ پر مستقل طریقہ سے مقرر کیے گئے جب ترکمانی کا انتقال ہو گیا۔

یعنی حنفیوں کے مستقل قاضی القضاۃ ہو گئے، اور کیسے قاضی القضاۃ؟ مصر پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے شافعی علماء کا اقتدار قائم رہا اور بتدریج یہ اقتدار بڑھتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ ایک خاص قسم کا امتیازی نشان جس کا الطرحہ (غالباً ٹوپی یا دستار میں کوئی پھندنا ہوتا تھا) نام تھا، صرف شافعی قاضی کے لیے مختص تھا، اسی کے ساتھ یہ اختصاص بھی شافعیوں نے حاصل کر لیا تھا کہ پایۂ تخت قاہرہ تک تو حنفی قاضی القضاۃ بھی مقرر ہوتا تھا، لیکن اضلاع اور مفصلات میں قاضی القضاۃ کی طرف سے قاضیوں کا تقرر صرف شافعی قاضی القضاۃ شافعی علماء کو کر سکتا

---

[1] اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ آٹھویں صدی کے چالیسویں سال سے پہلے آئے لیکن طاش کبری زادہ نے مصر میں ان کے داخلہ کا سنہ ۷۴۰ھ لکھا ہے۔ اسی لیے میں حافظ کے کلام کا یہ مطلب لیتا ہوں کہ چالیس سال کی عمر سے پہلے وہ مصر پہنچے سراج ہندی کی ولادت ۷۰۴ھ میں ہوئی جس کا حاصل یہ نکلا کہ چھتیس سال کی عمر ہوگی جب وہ مصر میں داخل ہوئے ۱۲

تھا، حنفیوں کو اضلاع میں قاضیوں کے تقرر کرنے کا حق نہ تھا، نیز یتیموں کے مال کی نگرانی کا حق بھی صرف ان ہی شافعی قاضیوں کو حاصل تھا، خواہ وہ یتیم حنفی خاندان سے ہی تعلق کیوں نہ رکھتا ہو، صدیوں کا یہ قائم شدہ رواج ایسا تھا کہ شافعی قضاۃ کے ان مسلّمہ حقوق میں دست اندازی کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی تھی۔

لیکن پہلا حنفی عالم جس نے ان سارے ناواجب حقوق کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے حنفی علماء کو ان کے چھینے ہوئے حق تک پہنچایا، وہ ہندوستان کا یہی عالم تھا جس کے علمی رعب داب کے سامنے حکومت کو جھکنا پڑا، اور ملک کے اتنے قدیم رواج کو توڑنا پڑا، حافظ ابن حجر جو خود بھی شافعی اور اچھے خاصے متعصب شافعی ہیں اپنی کتاب دُرر کامنہ میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

وکان قد تکلم اهل الدولة واستنجز	سراج ہندی نے ارباب حکومت کو توجہ دلائی اور فرمان
توقیعاً ان یلبس الطرحة نظیر القاضی	حاصل کیا کہ شافعی قاضی کی طرح وہ بھی الطرحہ پہن سکتے
الشافعی وان یستنیب فی البلاد المصریة	ہیں، اور مصری بلاد میں اپنے نائب کا تقرر کر سکتے ہیں
ویجعل له مودع الایتام الحنفیة	اور حنفی خاندان کے یتیموں کی جائداد کی نگرانی بھی ان
(درر، ج ۳ ص ۱۵۵)	کے سپرد ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ اس حنفی عالم نے مصر میں ایک زلزلہ برپا کر دیا، حافظ نے لکھا ہے کہ اس شخص نے صرف ان ہی باتوں پر قناعت نہ کی بلکہ

وتکلم فی نظر جامع ابن طولون و	ابن طولون کی جامع کی نگرانی کے متعلق بھی حکام سے انہوں
استعاد الوقف الطرحی من نقیب	نے گفتگو کی، اور نقیب الاشراف سے وقف طرحی کی تولیت
الاشراف (ج ۳ ص ۱۵۵)	واپس کرائی۔

اسی قسم کے کتنے معرکۃ الآراء اقدامات سراج ہندی کی طرف سے عمل میں آئے ہیں، ان کی فہرست بہت

---

[1] الطرحہ غالباً ایک قسم کی چادر کا نام تھا جو عالمانہ لباس کا ایک جز تھا ۱۲۔

طویل ہے، حافظ نے ان کی علمی جلالت شان کا تذکرہ کرتے ہوئے باوجود اس دل گرفتگی کے جو طبعاً ہونی چاہیے اقرار کیا ہے۔

کان مستحضراً لفروع مذھبہ — اپنے مذہب کے جزئیات ان کو مستحضر تھے۔

یہ حال تو خیر اپنی فقہ حنفی کے متعلق تھا مصر جیسے ینبوع العلوم اور ایوان اسلام میں اسی مختصر دینیاتی نصاب کے تعلیم یافتہ عالم نے مصر کی مرکزی مسجد جامع ابن طولون میں مدتوں قرآن کا درس دیا، حافظ نے بھی تصریح کی ہے کہ۔

اضیف الیہ تدریس التفسیر بالجامع الطولونی لما مات البسطامی فی سنۃ ۷۱ھ — یعنی بسطامی کا جب ۷۱ھ میں انتقال ہوگیا تو جامع طولونی کے درس تفسیر کا بھی حکومت نے ان ہی سے تعلق کردیا۔

باوجود ہندی ہونے کے عربی زبان کی بول چال پر ایسی قدرت تھی کہ اس کا تذکرہ امتیازاً کیا گیا، حافظ نے سراج ہندی کی اخلاقی جرأت جو علمی کمال کا عموماً نتیجہ ہوتا ہے، ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

کان شہماً مقداماً فصیحاً لہ خطوۃ عند الامراء۔ — وہ بڑے جری آگے آگے رہنے والے فصیح بلیغ آدمی تھے، امراء دولت کی نگاہوں میں ان کی بڑی عزت تھی،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں کوئی زبردست حویلی یا کوٹھی بھی انہوں نے بنوائی تھی، کوئی معمولی مکان ہوتا تو اس کے ذکر کی کیا حاجت ہے، درر میں ہے۔

وعمر دارۃ التی برحبۃ العید — عیدگاہ کے میدان میں دار (محل) تیار کیا

سراج ہندی کے متعلق یہ شہادتیں تو خیر تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں، لیکن ان کے سوا بھی ان کی علمی رفعت شان، خصوصاً اسلامی علوم میں ان کا پایہ کتنا بلند تھا، اس کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہوسکتا ہے جن کے متعلق حافظ ہی نے لکھا ہے۔

صنف التصانیف المبسوطۃ — بڑی بڑی طویل کتابوں کے مصنف ہیں

خصوصاً ہدایہ کی شرح توشیح نامی ان کی طویل کتاب ہے، حافظ اس شرح کا تذکرہ فرماتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ

وھو مطول ولم یکمل — یہ بڑی طویل شرح اگرچہ مکمل نہ ہوسکی۔

طاش کبری زادہ نے اس شرح کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ

وھو علی طریق الجدل — اس میں جدل (بحث) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی استدلالی شرح ہے۔ اس کے سوا بھی ان کی بیسیوں کتابیں فقہ و اصول فقہ، خلافیات، جدلیات میں ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ امام محمد بن حسن الشیبانی کی زیادات نیز جامع صغیر و کبیر کی بھی انہوں نے شرحیں لکھی ہیں، حالانکہ قدماء کی ان کتابوں سے عام علماء کا کم تعلق رہ گیا ہے، ایک مستقل کتاب حنفی مکتب خیال کی تائید میں بھی انہوں نے لکھی ہے جس کا نام "العزۃ المنیفہ فی تائید مذہب ابی حنیفہ" ہے۔ بہ ظاہر میرا تو خیال ہے کہ آٹھویں صدی کا زمانہ مصر میں وہ زمانہ ہے جس میں ہم حنفی علماء میں ایک خاص انقلاب پاتے ہیں، اسی زمانہ میں وہاں سنن "الجوہر النقی" کے مصنف علاء الدین الترکمانی اٹھتے ہیں، اور اسی زمانہ سے بالکل متصل مصر ہی میں ابن ہمام پیدا ہوتے ہیں، جنہوں نے حنفیوں میں حدیث کا مذاق پیدا کیا، آج علماء احناف کا بڑا سرمایہ ابن ہمام کی شرح ہدایہ ہے، کاش! اس پر کام کرنے والے کام کرتے تو شاید اس کی سراغ یابی میں دشواری نہ ہوتی کہ مذاق کے اس انقلاب کے پیچھے کیا اسی ہندی عالم کا ہاتھ کام کر رہا ہے، صاحب جوہر النقی اور ان کے خاندان سے تو ان کا تعلق بالکل بدیہی ہے۔ اسی کے ساتھ ہندستان سے جو خاص تحفہ مصر سراج ہندی لے گئے ہیں، وہ تصوف کا مذاق خصوصاً وحدت الوجود کے نظریہ کی تشریح ہے، تصوف کے متعلق ان کی مستقل کتاب بھی ہے۔ طاش کبری زادہ نے سراج ہندی کے متعلق یہ لکھ کر

کان واسع العلم کثیر الاقدام و — ان کا علم بہت وسیع تھا پیش قدمی میں جری تھے،

المھابۃ — جلال و ہیبت والے تھے۔

ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ

كان يتعصب للصوفيه المو حدة | وحدت الوجود والے صوفیوں کی بڑی سخت حمایت کرتے تھے۔

بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ ابن حجلہ کوئی مصری عالم تھا، سراج ہندی نے

عزره لكلامه في ابن الفارض | اس کو سزا اس لیے دی کہ ابن الفارض کے کلام پر اس نے اعتراض کیا تھا۔

غالباً ابن فارض کے قصیدہ تائیہ کی شرح کا تعلق کچھ اسی واقعہ سے ہے، ملا علی قاری نے ان کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جس کا نام لوائح الانوار ہے۔ اس کتاب میں ان لوگوں کی شدت کے ساتھ تردید ہے جو صوفیہ پر منہ آتے ہیں ۷۷۳ھ میں مصر ہی میں وفات پائی، وہیں مدفون ہیں۔ بہرحال ہندوستانی نصاب میں دینیات کے جس حصہ کو قامت میں کہتر خیال کیا گیا ہے، اس کی قیمت کی ان بہتریوں کو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ امتحان تو اس نصاب کا ایوان الاسلام اور ینبوع العلم والصنائع میں ہوا۔

آئیے، اب چلیے، اسلامی علوم و فنون کا دوسرا گہوارہ ان ہی صدیوں میں دمشق ہے، تاتاریوں کے فتنہ سے ماوراء النہر توران ایران عراق کے علمی مراکز برباد ہو چکے ہیں، جن ممالک تک تاتاریوں کا اثر نہ پہنچا ہے، ان میں شام اور مصر بھی ہیں، اس زمانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ علامہ تقی الدین سبکی، شمس الدین الذہبی، ابن قیم جیسے کبار جہابذہ سے دمشق کا دار العلوم معمور ہے۔ ہر طرف علم ہی علم کا چرچا ہے، اسی دمشق میں دینیات کی وہی تین کتابوں کے نصاب کا پڑھنے والا ایک غریب الوطن ہندی داخل ہوتا ہے، ان کا نام شیخ صفی الدین ہے، ۶۴۴ھ میں پیدا ہوئے بالاتفاق علماء کا بیان ہے کہ ہندوستان ہی میں

اخذ عن جده لامه | اپنے نانا صاحب سے انھوں نے تعلیم پائی۔

۲۳ سال کی عمر تھی جب ہندوستان سے باہر نکلے، اور یمن پہنچے، اس وقت یمن میں الملک المظفر کی حکومت تھی، لیکن اس تئیس سالہ ہندی نوجوان عالم کے دل و دماغ علم و استعداد سے اتنا متاثر ہوا کہ

اکرمہ واعطاہ تسع مائۃ دینار	اس نے ان کا بڑا اکرام کیا، اور نو سو اشرفیاں پیش کیں۔

(الدرر)

طبیعت میں سیر و سیاحت کا شوق تھا، یمن سے مکہ پہنچے، مکہ میں کچھ دن قیام کر کے قاہرہ قاہرہ سے اناطولیہ کے شہروں مثلاً قونیہ، سیواس، قیصریہ وغیرہ میں گھومتے رہے، بالآخر اس طویل سیاحت اور ہر ملک کے علماء سے ملنے جلنے کے بعد جیسا کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے،

وقدم دمشق فاستوطنہا	دمشق آئے اور اسی کو وطن بنالیا۔

دمشق جن علماء سے اس وقت بھرا ہوا تھا، اس کا ذکر آپ سُن چکے، ان ہی علماء کے سامنے اسی مختصر دینیاتی نصاب کا عالم بیٹھتا ہے، اور

عقد حلقۃ الاشتغال بالجامع ودرس بالرواجیہ والاتابکیہ و الظاہریہ الجوانیہ وغیرھا (درر، ۳)	بنی امیہ کی جامع میں درس کا حلقہ قائم کیا اس کے سوا رواجیہ، اتابکیہ ظاہریہ جوانیہ وغیرہ مدارس میں بھی درس دیتے رہے۔

یعنی دمشق کی مشہور جامع اموی میں درس کا حلقہ قائم کر دیا، جو اس زمانہ کے لحاظ سے معمولی بات نہیں ہے، اور ایک جامع اموی ہی نہیں، اور بھی دمشق کے متعدد مدارس میں پڑھاتے رہے، تاج الدین سبکی نے طبقات میں ان کے متعلق یہ لکھ کر

اعلم الناس بمذہب ابی الحسن وادراھم باسرارہ متضلعًا بالاصلین	امام ابوالحسن اشعری کے مذہب کے (اس زمانہ میں) سب سے بڑے عالم تھے، اور دونوں اصول یعنی اصول فقہ و کلام سے سیراب تھے۔

یہ سبکی کی اپنی چشم دید گواہی ہے۔ بہر حال اس کے بعد لکھا ہے کہ دمشق میں اس شخص نے

شغل الناس بالعلم	لوگوں کو علم میں مشغول کر دیا۔

تدریس کے ساتھ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ سبکی ہی کا بیان ہے،

ومن تصانیفہ فی علم الکلام	ان کے تالیفات میں سے ایک کتاب زبدہ
الزبدۃ وفی اصول الفقہ النہایۃ	نامی علم کلام میں ہے، اور النہایہ وفائق اصول فقہ
والفائق والرسالۃ السبعیۃ و	میں ہے، رسالہ سبعیہ بھی ان کی ایک کتاب ہے
کل مصنفاتہ حسنۃ جامعۃ	بہر حال ان کی ساری کتابیں بہت اچھی اور
لاسیما النہایۃ	جامع ہیں، خصوصًا النہایہ

دمشق کے علماء اس ہندی کے علم کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے، اولًا تو اس کے لیے یہی بات کافی ہو سکتی ہے، جیسا کہ سبکی ہی نے لکھا ہے۔

روی عنہ شیخنا الذہبی	ہمارے استاد الذہبی ان سے روایت کرتے ہیں۔

یعنی ذہبی جیسے امام علامہ ان کے شاگرد ہیں، مگر میں نے جس مقصد کے لیے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، یعنی ہندی نظام تعلیم کے نتائج کو دکھانا چاہتا ہوں، کہ گھر کی مرغی خواہ جس نظر سے دیکھی جاتی ہو، دال اور دال سے بھی بدتر۔ لیکن اسی دمشق میں اسلامی تاریخ کا ایک اہم علمی واقعہ پیش آیا، اس وقت پتہ چلا، کہ ہندوستان کے نصاب میں کیا کرامت پوشیدہ ہے، اس واقعہ کا ذکر تقریبًا عام تاریخوں میں ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ان ہی دنوں میں جب یہ ہندی عالم دمشق میں مقیم تھا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اپنے تبحر اور علم کے غیر معمولی بحران میں ایک خاص قسم کا طوفان اٹھائے ہوئے تھے، گویا سمجھنا چاہیے کہ ان کے علمی ہنگاموں سے سارا عالم اسلام متزلزل تھا۔ بلکہ ایک حد تک تو اب تک ہے، ان کی چومکھی بے پناہ تلوار اس طرح چل رہی تھی کہ معاصر علماء چیخ اٹھے، بیسیوں نئے نئے

مسائل پیدا کرکے اہل علم کی محفلوں میں وہ ہلچل ڈالتے رہتے تھے، ان ہی مسائل میں ایک مسئلہ ہے جو مسئلہ حمویہ کے نام سے مشہور ہے۔ تنگ آکر دمشق کے علماء نے آخر حکومت کو دست اندازی پر مجبور کیا۔ لیکن کسی معمولی شخصیت کا سوال نہ تھا۔ ابن تیمیہ بہر حال ابن تیمیہ ہی تھے، مسلمانوں کے شیخ الاسلام تھے، اسلامی علوم و فنون خصوصاً حدیث و رجال و قرآن میں یہ واقعہ ہے کہ اسی زمانہ میں نہیں ان کے بعد بھی مشکل ہی سے کسی کو ان کا حریف قرار دیا جا سکتا ہے۔ دمشق کا امیر اس زمانہ میں امیر تنکر تھا۔ خاص دار الحکومت میں جس کا نام دار السعادت تھا، اس نے اپنے سامنے شیخ الاسلام سے مناظرہ کرنے کے لیے علماء کی ایک مجلس طلب کی، ابن تیمیہ بھی بلائے گئے۔ السبکی نے لکھا ہے کہ

جمعت العلماء واشاروا بان	علماء نے جمع ہو کر بالاتفاق فیصلہ کیا کہ شیخ
الشیخ الهندی یحضر فحضر	ہندی کو بلایا جائے۔

جس کا یہی مطلب ہوا کہ ابن تیمیہ کے مقابلہ میں دمشق کے جو علماء بلائے گئے تھے، کسی نے اپنے اندر ان سے گفتگو کرنے کی صلاحیت نہیں محسوس کی فیصلہ کیا گیا کہ "شیخ ہندی" کو بلایا جائے۔ امیر نے اسی بنیاد پر ان کو طلب کیا، سبکی نے یہ بھی لکھا ہے۔

وکان الامیر تنکر یعظم	امیر تنکر ہندی کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس
الهندی ویعتقد ہ	کا بڑا معتقد تھا۔

بہر حال "شیخ ہندی" بھی مجلس میں آکر شریک ہوئے لکھا ہے کہ مناظرہ کی اس تاریخی مجلس میں

کان الهندی شیخ الحاضرین	ہندی ہی ان تمام علماء شام کا شیخ اور سردار
کلهم (طبقات کبریٰ)	تھا، جو اس مجلس میں موجود تھے۔

---

[1] مثلاً طلاق ثلاثہ یعنی تین طلاق تین ہے۔ آئمہ اربعہ کے اس مسلک کے خلاف تین ایک ہے کا نظریہ قائم کیا۔ مدینہ منورہ اس نیت سے جانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کی زیارت کریں گے، حرام ہے۔ اسی طرح مسئلہ صفات میں بھی قریب قریب مجسمہ کی سی باتیں کرتے تھے یوں بھی ان کے متفردات کی ایک طویل فہرست ہے ۱۲

جس سے کلام کی جرأت کسی کو نہیں ہو رہی تھی، شیخ ہندی نے بے محابا، ان ہی شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو مخاطب کیا۔ غالباً السبکی بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ بہر حال ان کا بیان ہے۔ اس وقت شیخ ہندی کی جو حالت تھی گویا اس کی تصویر ہے۔

کان الهندی طویل النفس فی	تقریر میں ہندی بہت دراز نفس واقع ہوئے تھے
التقریر اذا شرع فی وجه یقرره	کسی پہلو پر جب تقریر شروع کرتے تو کچھ اس طرح
لایدع شبهة ولا اعتراضاً الا	اس کو بیان کرتے کہ جتنے شبہات یا اعتراضات
اشار الیه فی التقریر بحیث لا یتم	کا امکان ہو سکتا تھا اپنی تقریر ہی میں اس کی طرف
التقریر الا وقد بعد علی	اشارہ کر جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جب تقریر ختم ہوتی تھی تو
المعترض مقاومته	اعتراض کرنے والے کے لیے اس کا جواب سخت ہو جاتا تھا۔

یہ تو شیخ ہندی کا حال تھا، اس کے مقابلہ میں شیخ الاسلام پر شیخ ہندی کے اس طرز تقریر کا کیا اثر مرتب ہوا۔ السبکی ہی سے وہ بھی سُن لیجیے۔

اخذ ابن تیمیه یعجل علیه	ابن تیمیہ نے جلد بازی سے کام لینا شروع کیا
علی عادته وقد یخرج من شئ	جیسا کہ ان کی عادت ہے۔ اور ایک بات کو چھوڑ کر
الی شئ	دوسری کی طرف نکل گئے (یہ کیفیت ان پر طاری ہو گئی)

گویا اپنے معلومات کی وسعت، اور ذہنی انتقال کی قوت سے ہندی کو وہ مرعوب کرنا چاہتے تھے، اور کوئی شبہ نہیں ہے کہ ابن تیمیہ کے معلومات جو درحقیقت بحر ذخار ہیں، ان کو آج بھی ان کی کتابوں میں پڑھ کر آدمی کچھ مبہوت سا ہو جاتا ہے۔ بات میں بات ان کو یاد آتی چلی جاتی ہے۔ دماغ معلومات کا خزانہ ہے، ایک کے بعد ایک چیز گویا اُبلتی چلی جاتی ہے۔ مگر ہندی شیخ بھی ہندی تھا۔ ہندوستان کے اس درس کا اس کو تجربہ تھا، جس میں سارا زور اسی پر خرچ کیا جاتا ہے، کہ اصل حقیقت لفظوں کے گورکھ دھندوں میں نگاہ سے ہٹنے نہ پائے۔ ابن تیمیہ کے اس انداز کو دیکھ کر شیخ صفی الدین سے نہ رہا گیا۔ اور باوجود ان کی جلالت شان کے

شیخ کو کہنا پڑا

ما اراك یا ابن تیمیہ الا کالعصفور	ابن تیمیہ میں تمھیں نہیں پا رہا ہوں لیکن اس چڑیا کی
تنزط من ھنا الی ھنا۔	طرح جو اِدھر سے پھدک کر اُدھر جاتی ہو اور اُدھر سے اِدھر

ابن حجر نے دُرر میں شوکانی نے بدر میں، شیخ ہندی کی طرف ان ہی الفاظ کو منسوب کیا ہو۔ لیکن السبکی جن کا بیان سب سے زیادہ قابل وثوق ہو، اُنھوں نے لکھا کہ شیخ نے کہا۔

ما اراك یا ابن تیمیہ الا کالعصفور	ابن تیمیہ میں تمھیں چڑیا کے مانند پاتا ہوں جہاں
حیث اردت ان اقبضہ من	چاہتا ہوں کہ پکڑوں، تو وہاں سے بھاگ کر
مکان خر الی مکان آخر	دُوسری جگہ چلے جاتے ہو۔

جس سے معلوم ہوتا ہو کہ شیخ الاسلام پر پھُد کنے والی چڑیا کی کیفیت جو طاری ہوگئی تھی، وہ شیخ ہندی کی ان گرفتوں کا نتیجہ تھا، جس سے تڑپ کر وہ دوسری شاخ پر بیٹھنے کی کوشش کرتے تھے، شیخ وہاں بھی ان کو چین نہیں لینے دیتے، یوں ہی "کود" "پھاند" "اچھل" اور "پھدک" کا ایک سلسلہ تھا، جو جاری تھا۔

واللہ اعلم حاصل کیا نِکلا، شیخ الاسلام شیخ ہندی کے پنجوں میں گرفتار بھی ہوئے یا یوں ہی پھُدکتے ہی رہے تاہم امیر تنکر نے جو یہ فیصلہ کیا، جیسا کہ السبکی نے لکھا ہے،

نو دی علیہ فی البلاد	حافظ ابن تیمیہ اور ان کے شاگردوں کے متعلق
وعلی اصحابہ وعزلوا عن	سارے ملک میں اعلان کرا دیا گیا اور حکومت
وظائفھم	کے عہدوں سے سب معزول کر دیے گئے۔

یہ بھی لکھا ہو کہ

وحبس ابن تیمیہ بسبب	اس مسئلہ کی وجہ سے ابن تیمیہ کو جیل
تلك المسئلة	دے دیا گیا۔

اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہو، کہ شیخ ہندی نے آخر مضبوط پنجہ ڈالا، جس سے کم از کم امیر

تنکر اور مجلس والوں کا یہی فیصلہ ہوا کہ اس سے وہ نہ نکل سکے۔ واللہ اعلم۔

مجھے اس سے بحث نہیں کہ واقعی اس مسئلہ میں جس میں مناظرہ ہوا تھا، حق پر کون تھا، اور نہ اس غلط فہمی میں کسی کو مبتلا ہونا چاہیے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی علمی عظمت وجلالت سے مجھے انکار ہے، بلکہ اس وقت تو صرف یہ دکھانا تھا کہ ہمارے ملک کے اس چھوٹے موٹے نصاب نے اپنے نتائج کی قیمت کہاں جاکر حاصل کی۔ اتنا تو کم از کم سب ہی کو ماننا پڑے گا کہ اس مسئلہ یا بحث کی حد تک دمشق کے سارے علماء نے اس ہندوستانی عالم کے سامنے اپنی اپنی سپر ڈال دی۔

حالاں کہ لطف یہ ہے کہ سراج ہندی میں جو طلاقت لسانی تھی، بیچارے شیخ صفی الدین اس صفت سے محروم تھے، ابن حجر وغیرہ سبھوں نے لکھا ہے کہ

کانت فی لسانہ عجمۃ الھنود — صفی ہندی کی زبان میں ہندوستانی زبان کی خصوصیت

باقیۃ الی ان مات (ص ۱۵ ج ۴) — آخر وقت تک باقی تھی حتیٰ کہ وہ مرگئے۔

یعنی بیچارے کچھ بولنے میں سراج الہندی کے مانند طرار و فرار بھی نہ تھے، لیکن وہی بات جیسا کہ انشاء اللہ آئندہ معلوم ہوگی، ہندی طریقۂ درس کی جو خصوصیت ہے، گرفت کا ملکہ ان میں غیر معمولی تھا، دماغ اتنا مانجا اور تیز کیا ہوا تھا کہ نازک سی نازک بات بھی ان سے بچ کر نکل نہیں سکتی تھی، جیسا کہ سبکی کی زبانی آپ سن چکے، ایوان اسلام مصر، اور خطیرۃ الابدال شام میں ہندوستانی نظام تعلیم نے اپنے جن نتائج کا اظہار کیا، اس کا تماشا آپ دیکھ چکے۔ اب آئیے قبلۃ الاسلام وکعبۃ الایمان تشریف لائیے۔ یہ سرزمین عرب ہے، اور یہ اس کے دونوں مقدس شہر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہیں۔ مختلف قرون و اعصار میں مسلمانوں کے ان مرکزی شہروں میں ہندی فضل وکمال کو جو سراہا گیا ہے اس کی پوری تفصیل کے لیے یہ مبالغہ نہیں کہ ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ شیخ علی متقی، شیخ عبدالوہاب المتقی، ان دونوں حضرات کا ذکر تو شاید اپنے موقعوں پر آ بھی چکا ہے۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ جن کے حوالہ سے

علی المتقی رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کے لکھے ہوئے اس قرآن کا ذکر گزر چکا ہے، جو صرف ایک ورق پر لکھا ہوا تھا یہی عبد الوہاب شعرانی اپنی مشہور کتاب طبقات الصوفیہ الکبری میں اپنا یہ بیان شیخ علی متقی کے متعلق درج کرتے ہیں

ھو الشیخ الھندی نزیل مکۃ	شیخ ہندی جن کا قیام مکہ معظمہ میں ہے، ۹۴۷ھ
المشرفۃ اجتمعت بہ فی سنۃ سبع	میں ان سے میں مکہ ہی میں ملا۔ میں بھی شیخ کے
واربعین وتسعمائۃ وترددت	پاس آتا جاتا تھا اور وہ بھی میرے پاس آتے
الیہ وتردد الی۔	جاتے تھے۔

شعرانی نے اس کے بعد شیخ علی متقی کے علم وتقوی اور ان کے اصحاب و رفقاء مریدوں کی عجیب و غریب کیفیتیں درج کی ہیں۔ آخر میں دسویں صدی ہجری کا یہ مصری امام جو علوم ظاہری اور مقاماتِ باطنی کا جامع ہے اپنی یہ شہادت ایک ہندوستانی عالم کے متعلق قلم بند کرتا ہے

ما اعجبنی فی مکۃ	مکہ معظمہ میں اُن جیسا کوئی آدمی مری نگاہوں میں
مثلہ	نہیں جنچا۔

شیخ عبد اللہ بن ملا سعد اللہ، شیخ محمد بن محمد الہندی، شیخ محمد بن محمد الدمراجی، اور ازیں قبیل پچھلی صدیوں یعنی آٹھویں نویں میں ہندوستانی علماء کا ایک سلسلہ ہے، جو ان شہروں میں ہجرت کرکے قیام پذیر ہوا۔ اور اپنے علم و عمل کے گہرے نقوش وہاں کے باشندوں کے قلوب پر قائم کیے۔ آخر زمانہ میں شیخ ابوالحسن سندھی، شیخ حیات سندھی نے مدینہ منورہ میں درس حدیث کا جو حلقہ قائم کیا، خصوصاً شیخ حیات سندھی، جن سے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے حدیث کی سند حاصل کی ان کے متعلق تو مولانا آزاد نے یہ ارقام فرما کر کہ

"تمام عمر در خدمت حدیث شریف صرف ساخت، و تجرے عظیم دریں فن شریف اندا خت"

لکھا ہے اور لکھا گیا اسی حال میں خود دیکھا ہے کہ

"خواص حرمین مکرمین در مصر وشام وروم اعتقاد واخلاص داشتند وازذات ہمایوں کسب برکات فی نمودند" مآثر ص۱۶۴

یا سندھ ہی کے دوسرے مدنی حضرت شیخ عابد سندھی ہندوستان سے یمن پہنچے۔ وہاں کے وزیر کی لڑکی سے شادی کی، حکومت صنعاء نے ان کو سفیر بنا کر مصر بھیجا۔ الیانع الجنی میں علامہ محدث محسن البہاری لکھتے ہیں

وکان هو سبب المعرفة بينه وبين والى مصر ووقوفه على بعض فضله واشرافه على شئ من عظم شانه۔ ۷۰	یہی سفارت وجہ ہو گئی اس تعارف کی جو مولانا عابد سندھی اور خدیو مصر میں پیدا ہو گیا تھا۔ اسی ذریعہ سے خدیو کو مولانا کے علم وفضل کے جاننے کا موقعہ ملا۔ اور ان کی جلالت قدر کا وہ کچھ اندازہ کر سکا۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدیو مصر ان کے علم وفضل تقویٰ وورع سے اتنا متاثر ہوا کہ شاید مصر میں ایک دوسرا سراج ہندی کھڑا ہو جاتا اگر وہ مصر میں قیام فرما لیتے۔ لیکن جیسا کہ ملا محسن ہی نے لکھا ہے

وکان الشیخ رحمہ اللہ شدید التحنن الی ربوع طابۃ عظیم التشوق الی شذاها کثیر التسآول من ربه لمحیاه فيها ومماته بها والاستظلال بذرا رسول الله صلی الله علیه وسلم والانحیاز الی حماه الیانع ص ۷۰	شیخ عابد سندھی کو مدینہ منورہ کی سرزمین سے شدید عشقی تعلق تھا، اور مدینہ پاک کی نسیم روح پرور کے لیے انتہائی اشتیاق رکھتے تھے، خدا سے بکثرت اس کی التجا کرتے رہتے تھے کہ اسی پاک سرزمین میں زندہ رہیں اور اسی میں مریں۔ اور چاہتے تھے کہ رسول اللہ کے سایہ میں جئیں اور آپ ہی کے احاطہ میں مقیم رہیں۔

اسی لیے بجائے مصر کے وہ مدینہ منورہ ہی چلے آئے۔ اور

واقام بها فی غایۃ ما یکون من	انتہائی عزت کے ساتھ مدینہ میں ان کا قیام
العز وولی ریاسۃ علمائھا من	رہا بالآخر مدینہ کے علمار کی ریاست کے بھی مالک و والی
قبل والی مصر..... وکان احسن الناس	مصر کی طرف سے مقرر ہو گئے۔ چال ڈھلن طور طریقہ
سمتا فی زمانہ کثر ثناء الناس علیہ فی	میں بہترین آدمی تھے۔ لوگ ان کے مداح تھے، اور
حیاتہ وسمرھم بمفاخرہ بعد وفاتہ۔ ص۲۲	وفات کے بعد لوگ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حرمین شریفین میں وقتاً فوقتاً جن ہندی علمار کو امتیاز حاصل ہوتا رہا ہے اس کی فہرست بحمد اللہ بہت طویل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں کچھ حضرات تو ایسے ہیں، جنھوں نے ہندوستان میں پڑھا، اور یہاں سے نکلنے کے بعد بھی دوسرے اسلامی ممالک کے علمار سے استفادہ کیا۔ مثلاً شیخ عابد سندھی کا جو حال ہے کہ اپنے خاندان خصوصاً چچا سے پڑھنے کے بعد یمن کے مشہور تعلیمی شہر زبیدہ کے علمار سے بھی بہت کچھ حاصل کیا تھا، لیکن زیادہ تر ایسے لوگ ہیں، جنھوں نے جو کچھ پڑھا، ہندوستان ہی میں پڑھا، جو کچھ سیکھا اپنے وطن ہی میں سیکھا۔ حرمین پہنچ کر افادہ نہیں بلکہ استفادہ کی مجلسیں گرم کیں۔ خصوصاً اس مشہور فتنہ ہندیہ کے بعد علامہ محسن بہاری نے جس کی عجب تعبیر کی ہے لکھا ہے

وقعت الفتنۃ الھائلۃ فی الھند	واقع ہوا ہندوستان میں وہ ہائل فتنہ "القرطاس"
عام القرطاس وتسلط العلوج	والے سال میں، اور گنواروں نے دہلی پر قبضہ کر لیا
علی دھلی وتحکموا فی اھلھا	اور وہاں کے باشندوں پر زبردستی حکومت قائم کرلی۔[1]

[1] غالباً القرطاس سے مراد کارتج یا کارتوس ہے کیوں کہ ۱۸۵۷ء کا فتنہ جیسا کہ مشہور ہے کارتوس ہی کے دانت سے کاٹنے کے مسئلہ سے شروع ہوا۔ العلوج سے واللہ اعلم کیا مراد ہے۔ کیا کالی پلٹن کے فوجیوں کو "العلوج" کے نام سے موسوم کیا ہے یا کیا ارادہ ہے۔ میں نے اس لیے اس کو نقل کر دیا کہ "عام قرطاس" غدر کے مشہور لفظ کے مقابلہ میں بنا، اور اچھا ہے سال قرطاس اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔

بہرحال اس فتنہ کے بعد جو ہندوستان سے ایک قافلہ ہجرت کر کے حجاز چلا گیا، جن میں علماء بھی تھے اور مشائخ بھی۔ ان مشائخ میں حضرت شیخ الشیوخ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو عزت حاصل کی وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔ علماء میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے دلی سے اپنے حلقہ درس حدیث کو اسی فتنہ کے بعد جب مدینہ منورہ منتقل فرمایا، تو ان کے تلمیذ رشید صاحب کتاب الیانع الجنی یعنی وہی علامہ محسن بہاری فرماتے ہیں۔ اور یہ شہادت شاہ صاحب کی زندگی ہی میں مدینہ میں بیٹھ کر قلم بند فرماتے ہیں، یہ لکھ کر کہ

فھو علی ماعودہ من الخیر	جس چیز کا التزام اُنھوں نے فرمالیا تھا، اس
جاد فیہ لایفتر عما کان علیہ	کی نفع رسانیوں میں وہ مصروف ہیں، شب و
لیلاً ونھاراً مشتغل بالحدیث	روز بغیر کسی انقطاع اور ماندگی کے اسی میں مشغول ہیں
مشغوف بروایتہ	حدیث اور اس کی روایت میں انہماک اسی حال میں ہے

آخر وہی ہندوستان جس کا سرمایہ مشارق و مصابیح و مشکوٰۃ سے زیادہ حدیث میں نہیں ہے، اپنے ایک فرزند کو ہادی الاسلام میں اسی حدیث کی تدریس میں اس مقام پر پاتا ہے کہ علامہ محسن فرماتے ہیں

فھو الیوم غدیقھا المرجب	آج مدینہ کا سب سے باردار نخل آپ ہی کا وجود باجود
والمحدث بین لابتیھا[1]	ہے، اور وہی مدینہ کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان
ص ۵۹	کا "المحدث" ہے۔

اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ "المحدث بین لابتیھا" (مدینہ کے دو لابتیوں کے درمیان

---

[1] میں نے لابتیھا کا ترجمہ وہی کر دیا ہے جو عام طور پر بتایا جاتا ہے لیکن مجھے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ مدینہ کے دونوں طرف دو سنگستان پتھروں کا جو ہے جسے حرہ بھی کہتے ہیں۔ لابتین سے ان دو سنگستانوں کی طرف اشارہ ہے کیا یہ لایہ لاوہ کی معرب شکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے اسی رنگ کے ہوتے ہیں ۱۲

سب سے بڑا محدث وہی ہی) یہ الفاظ اس شخص کے متعلق لکھے گئے ہیں جس نے ہندوستان کے سوا کسی بیرونی ملک میں کچھ نہیں پڑھا ہی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اگر اس قصہ کو چھیڑا جائے گا۔ تو یہ مستقل داستان کی شکل اختیار کرلے گا۔ اب میں برسرِ مطلب آتا ہوں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں بدنام ہندوستان جسے خود اس کے کپوت فرزندوں نے خود بدنام کیا ہی، غیروں سے زیادہ اس رسوائی میں اپنوں کا ہاتھ افسوس کہ زیادہ اور بہت زیادہ ہی۔ اسی ہندوستان کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہی کہ یہاں کچھ نہ تھا، اور بارہویں صدی کے وسط میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو مقالہ خاکسار نے الفرقان کے لیے لکھا ہی، اس میں میں نے بھی اسی خیال کو ظاہر کیا ہی۔ لیکن اسی مضمون میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا تھا، کہ لفظی حد تک یا سند کے لحاظ سے صحیح ہی کہ حجاز سے حدیث کی سند لانے والوں میں شاہ صاحب اُن لوگوں میں ہیں جن کی وجہ سے اس علم کا بوجوہِ مختلفہ ہندوستان میں بہت چرچا پھیل گیا۔ لیکن لوگوں نے شاید اس پر غور نہیں کیا ہوگا۔ کہ اسی کے ساتھ میں نے اسی خاندان کے فیض یافتہ اور ولی اللہی خانوادہ کے عاشق شیفتہ مولانا محسن بہاری کے حوالہ سے یہ فقرہ ان کی مشہور اور مستند کتاب الیانع الجنی سے نقل کیا تھا کہ شاہ صاحب کے سب سے بڑے اُستاد فی الحدیث جن کے متعلق علامہ بہاری نے لکھا ہی

وھو عمدۃ ابی	ابو عبدالعزیز (یعنی شاہ ولی اللہ) کے اُستادوں میں
عبد العزیز من بیت	وہ (یعنی شیخ ابوطاہر بن ابراہیم الکردی المدنی) ستون
مشائخہ واکثر لہ	کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی سے شاہ صاحب
نفعا (۸۱)	کو سب سے زیادہ نفع پہنچا۔

لیکن اسی مدنی اُستاد نے اپنے ہندی شاگرد کو کیا کہا تھا۔ میں نے اپنے مقالہ میں بھی نقل کیا ہی، یعنی

انّہ کان یسند عنی اللفظ و	لفظ کی سند مجھ سے وہ (شاہ ولی اللہ) حاصل کرتے ہیں
کنت اصحح منہ المعنی۔ صلہ	اور میں ان کے ذریعہ سے حدیثوں کے معنی کی تصحیح کرتا ہوں۔

علامہ بہاری نے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے

و کتبہما فیما	شاہ صاحب کو جو سند لکھ کر (شیخ طاہر) نے
کتب۔	دی اس میں بھی یہ لکھا۔

جس کا یہی مطلب ہوا کہ شاہ صاحب کی سند میں بھی ان کے ان استاد نے اس عجیب و غریب اعتراف کو درج کیا تھا۔[1]

میرے عرض کرنے کی غرض یہ ہے، کہ اگر یہ اعتراف شیخ طاہر کا صحیح ہے، اور نہ صحیح ہونے کی کوئی وجہ نہیں، تو پھر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس درس کے نتائج نے مصر و شام میں میدان جیتا تھا۔ کیا حرمین میں اس نے اس اعتراف کے ذریعہ جو امتیاز حاصل کیا ہے۔ کیا کم ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جس زمانہ میں ہندی علمار کی سرزمین حجاز میں یہ قدر افزائیاں ہوئی ہیں۔ اس وقت حجاز وہ حجاز نہیں تھا، جو اب ہے، یہ وہ وقت تھا کہ سلطنت ترکی اور حکومت مصر دونوں کی طرف سے کرورہا کرور روپیہ ان دونوں شہروں پر صرف اس لیے خرچ ہوتے تھے کہ دُنیائے اسلام کے جس گوشہ سے بھی لوگ ان شہروں میں پناہ گیر ہوتے تھے ان کے معاش کا سامان کر دیا جاتا تھا۔ قسطنطنیہ، کا شہر، اس شہر کے تمام بازار دکانیں ایک ایک کرکے مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی دن سے وقف تھیں جس دن حضرت سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ میں پہلا قدم رکھتے ہوئے فرمایا تھا۔

---

[1] اسلامی علوم کی تاریخ میں اسی قسم کا ایک فقرہ امام بخاری کا امام ترمذی کے متعلق نقل کیا جاتا ہے کہ امام بخاری نے ترمذی سے فرمایا ما انتفعت بك اکثر مما انتفعت بی "(میں نے تم سے جتنا نفع اُٹھایا وہ اس سے زیادہ ہے جو تم نے مجھ سے فائدہ حاصل کیا) بلاشبہ کسی شاگرد کے فخر کے لیے یہ انتہائی الفاظ ہو سکتے ہیں جو اپنے اُستاذ سے اسے ملے ہوں۔

میں نے قیصر کے شہر کو پیغمبر کے شہر پر وقف کر دیا۔	وقفت مدینۃ قیصر علی مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اس وقف پر کمالی دَور سے پہلے بغیر کسی انقطاع کے عمل ہوتا رہا، یہی حال مصر کا تھا کہ جس سرزمین کی پیداوار کو دیکھ کر دماغوں میں فرعونیت پیدا ہوتی ہے اسی کا پانچواں حصّہ حرمین پر وقف تھا۔ اور اس کے سوا بھی ان دونوں حکومتوں کی جانب سے ساکنین حرمین کی جو خدمتیں ہوتی تھیں، ان سے کون ناواقف ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ دنیائے اسلام کے اہل فضل وکمال کا ان دونوں شہروں میں اجتماع رہتا تھا۔ گویا حجاز میں صرف حجاز کے علماء کے سامنے نہیں بلکہ سارے اسلامی ممالک کے علماء کے سامنے یہ امتحانات ہوئے ہیں، جن میں ہندی علماء نے تقریباً ہر زمانہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ جس اصول پر ان کی تعلیم ہوتی ہے اور اس تعلیم سے جس قسم کی ذہنی تمرین وتشمید ہوتی ہے، دوسرے علاقوں کے تعلیمی طریقے ایسے نتائج نہیں پیدا کر سکتے۔ شاہ ولی اللہ کے تعلیمی نصاب کا کچھ ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ انھوں نے جو کچھ پڑھا تھا، اپنے والد مرحوم سے پڑھا تھا، جو مشہور معقولی عالم میر زاہد کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ حدیث کا سرمایہ جو ہندوستان سے پڑھ کر گئے تھے وہ کل یہ تھا،

حدیث میں پوری مشکوۃ بجز چند ابواب یعنی کتاب البیع سے کتاب الآداب تک میں نے پڑھی تھی اور بخاری شریف کا ایک حصّہ یعنی صرف کتاب الطہارت تک	از علم حدیث مشکوۃ تمام ان خوانده شد الا قدرے یسیر از کتاب البیع تا کتاب الادب.... طرفے از صحیح بخاری تا کتاب الطہارت . (۱۹۴)

بخاری کا نام اس میں ضرور ہے لیکن "تا کتاب الطہارت" کے الفاظ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ تبرک سے زیادہ اس پڑھنے کی اور کوئی حیثیت نہ تھی۔ اگر اس "تا" میں کتاب الطہارت کو داخل بھی سمجھا جائے تو گن لیجیے، ابتداء سے یہاں تک چند اوراق سے کیا وہ زیادہ

ہی۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ پڑھنے کی حد تک واقعتہً اُنھوں نے بھی وہی مشکوٰۃ ہی پڑھی تھی لیکن باوجود اس کے جن کی عمریں درس حدیث ہی میں گزری تھیں، وہ کہتے ہیں کہ حدیث کے معانی وہی بتاتے تھے، ہیں تو صرف لفظ بتاتا تھا، اور یہی بھی یہی بات کہ شاہ صاحب نے حجاز میں اُستادوں سے حدیث جو پڑھی تھی، زیادہ تر وہ بطریقہ سرد ہی پڑھی تھی۔ اپنے اساتذہ حدیث کے طریقہ درس کا ذکر فرماتے ہوئے انفاس میں لکھتے ہیں

"مختار شیخ حسن عجمی، واحمد قطان، وشیخ ابوطاہر وغیر ایشاں طریقہ سرد بود"

اور گزر چکا کہ سرد کا مطلب فقط اس قدر ہی کہ

"شیخ سمع یا قاری وے تلاوت کند بے تعرض مباحث لغویہ وفقہیہ واسماء رجال وغیر آں" صہ۱۸۷

اس کے بعد کیا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہو کہ شاہ صاحب نے اپنی کتابوں (حجۃ اللہ، مسوّیٰ، ازالۃ الخفا، وغیرہ) میں حدیثوں کے جو معانی بیان کیے ہیں۔ جن پہلوؤں کی طرف ان کا دماغ گیا ہی، وہ طریقہ سرد کی اس تعلیم کا نتیجہ ہو سکتا ہی۔ بلاشبہ الفاظ اور سند کی حد تک حدیث وہ حجاز سے ضرور لائے، لیکن معانی کا انکشاف ان پر جو کچھ ہوا ظاہر ہی کہ اس میں زیادہ تر دخل تو اُن کی خداداد دل و دماغ ہی کو ہی۔ لیکن تعلیم تو نام ہی اس کا ہی کہ جس میں جتنی صلاحیت بالقوہ ہو، اسے بالفعل کردے۔ اور اسی لیے ہندوستانی نظام تعلیم کا حق ہی کہ شاہ ولی اللہ کی دماغی تربیت کے سلسلہ میں اس کا جو حصہ ہی اس سے اس کو محروم نہ کیا جائے۔

مصر و شام و حجاز کو ختم کر کے اب آئیے اس آخری شہر میں جہاں سب سے آخر میں ہماری تعلیم و تہذیب دفن ہوئی ہی۔ میری مراد اسلامبول یا مسلمانوں کے آخری دارالخلافت قسطنطنیہ سے ہی۔ کوئی کتابی شہادت تو اس وقت پیش نہیں کر سکتا، لیکن جس واقعہ کا ذکر کر رہا ہوں، کتابی واقعات سے بھی زیادہ بحمداللہ اس میں قوت ہی۔ قصّہ تو طویل ہی میں مختصراً عرض کرتا ہوں میں نے براہ راست اس قصّہ کو حضرت مولانا محمد علی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ مونگیری

خلیفہ ارشد حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن قدس اللہ سرہ ربانی ندوۃ العلماء سے سنا ہو، عام لوگوں کو شاید معلوم نہ ہو، لیکن خواص جانتے ہیں کہ ہندوستان پر انگریزی حکومت کا اقتدار جب قائم ہوا تو اس کے زیر سایہ شروع ہیں عیسائی مذہب پھیلانے کی پوری کوشش کی گئی اگرچہ بظاہر حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، اسی سلسلہ ہیں فنڈر نامی ایک عیسائی پادری یورپ سے ہندوستان پہنچا۔ جسے عربی وفارسی اور اسلامی علوم میں باضابطہ ماہر بنایا گیا تھا اس نے اسلام پر اعتراضات کا ایک لاتناہی سلسلہ چھیڑ دیا، ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائیت اور عیسائی مذہب سے ظاہر ہو کہ دور کا بھی تعلق نہ تھا، علماء بھی اس مذہب کے تفصیلات سے ناواقف تھے۔ شروع میں تھوڑی بہت پریشانی علماء میں ضرور پیدا ہوئی، لیکن انا لہ لحافظون کے وعدہ کی تکمیل جیسا کہ ہمیشہ ہوتی رہی ہو اسی کا ظہور بایں شکل ہوا کہ بہار کے ایک ڈاکٹر وزیر خاں نامی مرشد آباد سے یورپ چلے گئے تھے، وہاں انگریزی زبان تو خیر انھوں نے سیکھی ہی تھی، عیسائی مذہب کی کتابیں، شروح وتفاسیر کا ایک طومار اپنے ساتھ یوروپ سے لائے تھے۔ غالباً آگرہ یا کسی شہر میں وہ سرکاری طور پر ڈاکٹر بھی تھے۔ ان ہی ڈاکٹر وزیر صاحب اور کیرانہ کے ایک عالم مولانا رحمۃ اللہ صاحب سے تعلقات ہو گئے۔ اب یہ ہندی نظام تعلیم کا اثر تھا کہ باوجود انگریزی نہ جاننے کے مولانا رحمۃ اللہ صاحب ڈاکٹر وزیر خاں کی چند صحبتوں میں اتنے تیار ہو گئے کہ فنڈر سے ان کا مناظرہ غالباً کسی حاکم کی ثالثی میں بمقام آگرہ جو ہوا تو فنڈر کو فاش شکست اٹھانی پڑی[۱]۔ اسی عرصہ میں وہی فتنہ

---

[۱] حضرت مولانا رحمۃ اللہ الھندی اور پادری فنڈر کے اس تاریخی مناظرہ کی کیفیت اب تو خود ہندوستان کے مسلمان عموماً بھلا چکے ہیں۔ حالانکہ جس زمانہ میں یہ مناظرہ آگرہ میں ہوا تھا فارسی اور اردو میں اس کے متعلق اس زمانہ کے اخباروں کے سوا مختلف رسالے خود ان لوگوں نے تصنیف کر کر کے شائع کیے تھے جو اس مجلس میں موجود تھے باوجود تلاش کے مجھے نہ فارسی کے یہ رسالے مل سکے نہ اردو کے۔ خدا کی شان ہو کہ عربی زبان میں ایک اردو اور ایک فارسی رسالہ کا ترجمہ مصر کا مطبوعہ مل گیا۔ مترجم کا نام الشیخ علی الطیبی الشافعی ہو۔ انھوں نے لکھا ہو کہ قسطنطنیہ میں بعض امراء الدولہ کے کتب خانے میں یہ رسالے مجھے ملے۔ یہ بھی لکھا ہو کہ قد سمعت فی مکۃ المعظمۃ (باقی برصفحہ ۲۸۱)

"عام قرطاس"، کے ہنگامہ میں جہاں سینکڑوں علماء و مشائخ اِدھر اُدھر بکھرے ان میں مولانا رحمۃ اللہ بھی تھے، یہ بھی حجاز ہجرت کر کے چلے گئے۔ اور اب تک ان کی یادگار مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ وہاں موجود ہے۔

فنڈر ہندوستان سے رسوا و ذلیل ہو کر قسطنطنیہ پہنچا، اور وہاں بھی علماء استنبول کو چیلنج پر چیلنج دینا شروع کیا، غالباً سلطان عبدالمجید مرحوم کا وقت تھا۔ خلیفہ تک خبر پہنچی اور یہ بھی کہ قسطنطنیہ کے علماء میں کوئی اس پادری سے پنجہ آزمائی پر تیار نہیں ہے سلطان نے فوراً حجاز کے گورنر کو لکھا کہ حرمین میں اگر کوئی عالم عیسائیوں سے مقابلہ و مناظرہ کی مشق رکھتا ہو تو اسے بھیج دیا جائے۔ حرم مکہ کے شیخ اس زمانہ میں زینی دحلان مشہور

(بقیہ صفحہ ۲۸۰) حال هذه المناظرة من افواه رجال غير المحصورين الذين جاؤا للحج بعد ۱۵ سنة (یعنی مکہ معظمہ میں بے شمار آدمیوں سے اس مناظرہ کا حال معلوم ہوا جو ہندوستان سے حج کے لیے مناظرہ کے بعد آئے تھے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا حج ایک ایسا ذریعہ تھا جس کے ذریعہ سے مختلف مسلمانوں کا حال ایک دوسرے تک پہنچتا تھا۔ بہرحال اصل رسالہ اردو کے مصنف سید عبداللہ الہندی ہیں جو آگرہ میں برٹش حکومت کے ملازم تھے۔ پہلے تو ان تمام خطوط کو مصنف نے نقل کیا ہے جو مولانا رحمۃ اللہ اور پادری فنڈر میں مناظرہ کے متعلق لکھے گئے ۱۸۵۴ء مطابق ۱۲۷۰ھ ماہ رجب میں مناظرہ کی یہ مجلس آگرہ میں منعقد ہوئی۔ ہندوستان کے ارباب عزت و جاہ علم و فضل کے سوا لکھا ہے کہ آگرہ کے بڑے بڑے یورپین افیسر بھی جلسہ میں شریک رہے جن میں مسٹر اسمٹ حاکم صدر دیوانی غالباً کمشنر اور مسٹر کرسٹن سکرٹری رینیو بورڈ مسٹر ولیم حاکم علاقہ فوجی مسٹر لیٹلی مترجم اول برٹش گورنمنٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں عیسائیوں کی طرف سے لکھا ہے کہ القسیس فنڈر مناظر اول و قسیس فرنچ مناظر دوم کی حیثیت سے تھے اور اسلام کی طرف سے مولانا رحمۃ اللہ الہندی مناظر اول اور ان کے معاون ڈاکٹر وزیر خاں تھے لکھا ہے کہ جلسہ جو کئی دن ہوا۔ ہزاروں ہندو مسلمان تماش بینوں کی حیثیت سے شریک تھے پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی وہ انجیل و تورات کی تحریف کا تھا۔ علانیہ سب کے سامنے فنڈر کو اعلان کرنا پڑا کہ ہماری کتابیں محرف ہو چکی ہیں لیکن صرف مسئلہ تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی ہے؛ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جس کتاب کو خود مشکوک مان رہا ہے اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ الغرض فاش شکست کے ساتھ فنڈر کو مجلس سے اٹھنا پڑا تفصیل مقصود ہو تو عربی کے ان رسالوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ان ہی رسالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر خاں نے بھی فارسی میں ایک کتاب بحث میں لکھی تھی اور بہادر شاہ مرحوم بادشاہ کے ولی عہد مرزا فخرو نے اپنے خرچ سے چھپوا کر اسے شائع کیا تھا۔ اس مناظرہ کے کل تین سال بعد غدر کا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ہوا جو کچھ ہوا ۱۲

محدث تھے، والی مکہ نے سلطان کے اس فرمان سے شیخ دحلان کو مطلع کیا۔ انھوں نے درس حدیث کے حلقہ میں اس کا ذکر کیا، مولانا رحمت اللہ بھی اس حلقہ میں بیٹھا کرتے تھے آگے بڑھ کر اُنھوں نے عرض کیا کہ اس فن سے بندہ بخوبی واقف ہے۔ مولانا رحمت اللہ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ قسطنطنیہ میں فنڈر ہی نے فتنہ برپا کیا ہے، بلکہ اُنھوں نے خیال کیا کہ کوئی پادری آگیا ہوگا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا رحمت اللہ حسب منشاء سلطان قسطنطنیہ روانہ کیے گئے۔ مولانا رحمت اللہ کا قسطنطنیہ پہنچنا تھا اور فنڈر کو خبر ملی کہ وہی آگرہ والا ہندی عالم یہاں بھی سر پر مسلط ہو گیا ہے بغیر کسی اطلاع کے وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہو گیا، پھر اس کا کیا انجام ہوا، معلوم نہیں۔ لیکن مولانا کے اس اثر کی خبر جب سلطان کو پہنچی تو ظاہر ہے مولانا کی وقعت ان کے دل میں کتنی پیدا ہو سکتی تھی، کہاں یہ حال تھا کہ "علماء دولت عثمانیہ" ششدر و حیران تھے، اور کہاں یہ صورت پیش آئی کہ ہندی عالم آیا اور مناظرہ کی ہمت تو کیا ہوتی، چیلنج دینے والا خود ہی لاپتہ ہو گیا۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب کے پاس مولانا رحمت اللہ کا گرامی نامہ محفوظ تھا۔ جس میں انھوں نے سلطانی قدر افزائیوں کا تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ یہاں تک لکھا تھا کہ خلیفہ کی مجلس سے جب اُٹھتا ہوں تو میری جوتیاں سیدھی کر کے مجھے پہناتے ہیں، اسی زمانہ میں مولانا رحمۃ اللہ کی مشہور کتاب ردّ عیسائیت میں "اظہار الحق" نامی جو فارسی میں تھی، عربی میں ترجمہ ہوئی، اور آج تک اسلامی ممالک کے بعض مدارس حتیٰ کہ ازہر کے نصاب میں بھی ایک مدت تک شریک تھی (اب ادھر کا حال معلوم نہیں) کہتے ہیں کہ قسطنطنیہ کے قیام پر سلطان نے بہت اصرار کیا، لیکن مولانا نے ہجرت کی نیت کا عذر کر کے پھر اپنے کو حجاز پہنچایا۔ حکومت سے وظیفہ ماہوار جس کی تعداد اس وقت محفوظ نہیں رہی، مولانا کے نام جاری ہوا جو مکہ معظمہ میں ان کو ملتا رہا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

میری غرض اس واقعہ کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ گو مناظرہ کا سواد انگریزی زبان سے ڈاکٹر وزیر نے مولانا کے لیے مہیا کیا، لیکن اگر مولانا کا دماغ تربیت یافتہ نہ ہوتا، تو کیا

اس آسانی سے وہ اس مسئلہ پر اتنا قابو پاسکتے تھے۔ اور یہی میں پوچھتا ہوں کہ تعلیم کے جس "شجرہ طیبہ" نے ایسے پھل مسلسل پیدا کیے، کیا وہی تعلیم کا طریقہ قابل ملامت و نفرت ہوسکتا ہے۔

آج بھی ہندوستان میں قریب قریب اکثر تعلیم گاہوں میں وہی قدیم نصاب جاری ہے، اضافہ جو کچھ ہوا ہے، وہ صرف بطریقہ سرد حدیث کے درس کا۔ لیکن بحمد اللہ اس وقت بھی ہندوستان کے اسی قدیم نصاب سے جو لوگ پیدا ہو رہے ہیں، ہندوستان ہی نہیں، ہندوستان کے باہر بھی، اسی علم میں جس میں ہندوستان کی بضاعت سب سے زیادہ "مزجاۃ" سمجھی جاتی ہے یعنی فن حدیث[1]، اسی کے متعلق قسطنطنیہ کے فاضل جلیل جو کمالی عہد سے پہلے غالباً کسی ممتاز دینی منصب سے سرفراز تھے، اور انقلاب حکومت کے بعد ان دنوں نزیل مصر ہیں، ان کا نام علامہ زاہد بن الحسن الکوثری ہے، خاکسار نے ان کے چند رسائل مختصرہ دیکھے ہیں، جن سے ان کے تبحر اور علمی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے، اس وقت ان کا شمار

---

[1] ہندوستان کی علمی منزلت خصوصاً فن حدیث میں جس وجہ سے پچھلے دنوں میں کم کی گئی اور باور کرایا جارہا ہے کہ جن لوگوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام آیا وہ اسلامی احکام سے ناواقف تھے۔ میں نے دیباچہ میں مثالاً چند فقرے بھی نقل کئے ہیں۔ سچ پوچھیے تو غریب ہندوستان کے شش صد سالہ علمی تاریخ محض ایک صاحب کو بڑھانے کے لئے گھٹائی گئی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی جن کا تعلق تنگ نظر مسجد کے ملانوں سے نہیں بلکہ مغربی جامعات کے طلسانیوں اور اردو زبان کے مشہور انشا پردازوں سے ہے۔ اسی کے ساتھ اسلامیات میں بھی ان کا علمی سرمایہ اچھے خاصے مولویوں سے کم نہیں ہے۔ اپنے سفرنامہ حجاز میں "جدہ" کے ایک عالم رئیس شیخ نصیف کا تذکرہ درج کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے مکان میں "ایک صاحب سے یہ کہہ کر ملایا گیا کہ وہ شیخ محمد بن عبدالوہاب (نجدی) کے پوتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا کہ نجد کے مشاہیر علماء میں ہیں" اس کے بعد مولانا عبدالماجد نے اسی ہندوستان کے ایک غریب مولوی کا ذکر کیا ہے جو خود ادر جس کے اسلاف اسلام کے احکام و نقلیات سے ناآشنا اور عربی زبان سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ اسی ہندی ملا نے مولانا فرماتے ہیں کہ ان سے (یعنی محمد بن عبدالوہاب صاحب کے عالم و فاضل ہیکے از مشاہیر نجد) سے کچھ سوالات کیے جوابات اس معیار پر نہ ملے جس کی توقع ایک صاحب نظر عالم سے ہوسکتی ہے۔" سفر حجاز صفحہ ۲۲

اسلامی ممالک خصوصًا حنفی دائرہ کے ممتاز ترین علماء میں ہے۔ اس استنبولی اور مصری فاضل نے حضرت الاستاذ العلامۃ الامام مولانا شبیر احمد صاحب صدر دائرۃ الاہتمام دارالعلوم دیوبند کی شرح مسلم جب دیکھی تو مولانا کو ایک خط لکھا جو شرح مسلم کی جلد ثالث کے آخر میں چھاپ بھی دیا گیا ہے۔ اس خط میں علامہ کوثری مولانا کو مخاطب کر کے اعتراف کرتے ہیں۔

فانتم یا مولٰنا فخر الحنفیۃ فی ‏ ‏ مولانا آپ کی ذات اس عصر میں تمام دُنیا کے
ھٰذا العصر حقا ‏ ‏ ۱۳۵۹ھ ‏ ‏ حنفیوں کے لیے فخر ہے۔

چودھویں صدی میں سارے حنفی ممالک کا فخر ایک ہندی عالم کو بیرون ہند کا ایک جلیل و مسلم الثبوت فاضل قرار دیتا ہے لیکن خود ہند کے باشندوں کی نگاہ میں ہندی علماء کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ع والدھر آت بالاعاجیب

یہ تو ایک تحریری اعتراف ہے۔ مصر ہی کے مشہور صاحب قلم و کمال، علامہ رشید رضا مصری مرحوم جب ہندوستان تشریف لائے۔ اور ان کے سامنے ہندی نظام تعلیم کا ایک نمونہ پیش ہوا، تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مرحوم رشید رضا کرسی سے اُٹھ اُٹھ جاتے تھے اور جب ہندوستانی عالم اپنی تقریر جو عربی میں ہو رہی تھی ختم کر چکا، علامہ رشید رضا اُٹھے، خدا جانے کیا کیا کہا مگر یہ جملہ بار بار ان کی زبان پر بے ساختہ آتا تھا،

ما رائت مثل ھذا الاستاذ الجلیل قط ‏ ‏ اتنا بڑا اُستاذ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

یہ حضرت الامام الاستاذ مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات تھی، اور اسی ٹوٹے پھوٹے بوریائی طریقہ تعلیم کے ادارہ کو دیکھ کر ان کو اعلان کرنا پڑا

لولا رأیتہا لرجعت من الھند ‏ ‏ اگر دیوبند کے دارالعلوم کو میں نہ دیکھتا تو ہندوستان
حزینا ‏ ‏ سے غمگین واپس ہوتا

اور یہ شہادتیں تو اپنوں کی ہیں۔ عام اسلامی ممالک میں ہندوستانی نظام تعلیم نے اپنی جو قیمت پائی ہے اس کے چند نمونے تھے، لیکن غیروں نے جب کبھی انصاف سے کام لیا ہے تو ان کے

اعترافات بھی اس سلسلہ میں کیا کچھ کم اہم ہیں میکالے صاحب کی تعلیمی رپورٹ[1]، اور برنیر کے خود تراشیدہ افسانہ کا تو سب ذکر کرتے ہیں۔ مگر ہمیں اس قسم کی گواہیوں کو بھی تو نہ بھلانا چاہیے

---

[1] میرا اشارہ اس مشہور تعلیمی رپورٹ کی طرف ہے جو مسٹر میکالے نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق کی تھی جس کے بعد قدیم نظام تعلیم کی جگہ جدید جامعاتی طریقہ تعلیم کا ہند میں رواج ہوا، اسی رپورٹ کے چند خاص فقروں میں ایک فقرہ یہ بھی ہے "یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں ہندوستان و عرب کے سارے علم ادب کے برابر ہیں" اس کے بعد یہ بھی ارشاد ہوا تھا "ایک انگریز نیم حکیم عطائی کے لیے (ہندوستانی علم طب) موجب ننگ و عار ہیں"، ہیئت و نجوم کے متعلق فرمایا گیا تھا "جسے پڑھ کر انگلستان کے زنانہ مدرسہ کی لڑکیوں کی ہنسی رک نہیں سکتی" (ماخوذ از ترجمہ ہاشمی فرید آبادی مندرجہ رسالہ اُردو) مگر ظاہر ہے کہ "خود مجھے عربی یا سنسکرت نہیں آتی" کے چراغ کو ہاتھ میں لے کر اس قسم کی لاادریوں کا جواب خاموشی کے سوا اور کیا دیا جاسکتا ہے، دنیائے سوفسطائیت میں مسٹر میکالے کی یہ ایک مثالی رپورٹ ہے۔ اسی طرح برنیر ایک فرانسیسی تھا جو مغلوں کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا تھا۔ واپسی پر اس نے اپنا ایک سفرنامہ مرتب کیا، جس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے، اسی سفرنامہ میں اس نے حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی طرف ایک عجیب و غریب تقریر منسوب کی ہے جسے اپنے ایک حریص الطبع لئیم الفطرت استاد کو مخاطب کرکے بادشاہ نے کی تھی۔ قدیم نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے عموماً برنیر کے اس افسانہ کو دہرایا جاتا ہے۔ مجھے تعجب شیخ محمد اکرم صاحب سے ہے جنھوں نے حال میں علاوہ غالب نامہ کے دو دلچسپ کتابیں لکھی ہیں۔ باوجودیکہ شیخ صاحب نو عمر نوجوانوں میں ہیں، اور بالکلیہ ان کی تعلیم جہاں تک میں خیال کرتا ہوں جدید تعلیمی مرکزوں میں ہوئی ہے وہیں سے انھوں نے انگریزی میں ایم اے کامیاب کیا ہے، اور آئی سی۔ ایس کے امتحان میں کامیاب ہوکر برطانوی حکومت میں کسی معزز عہدہ پر ممتاز ہیں۔ بہرحال باوجود ان امور کے میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب اتفاق سے ان کی ان دو کتابوں (آب کوثر) اور (موج کوثر) کو دیکھنے کا موقع ملا۔ خلاف دستور ابنائے عصر کی روش سے ہٹ کر ان میں وہ جستجو پیدا ہوئی جس کا پیدا ہونا ہر انسان میں تو ضروری ہے لیکن جدید تعلیم کے فیض یافتہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں اس فطری جستجو کا جذبہ مختلف ترکیبوں سے بجھا دیا گیا ہے یہ سوالات کہ ہم کون ہیں؟ کن لوگوں سے گزر کر ہم نے دنیا میں قدم رکھا ہے۔ ہم سے نکلنے والی آئندہ نسلوں کا انجام کیا ہوگا، یا اس کو کیا ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے جانوروں ہی کا دماغ ان سوالوں سے خالی ہوسکتا ہے لیکن شیخ اکرام صاحب ان صالح نوجوانوں میں ہیں جن کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی کہ اپنے بزرگوں اور پچھلی نسلوں کے متعلق معلومات فراہم کریں، اور اس سلسلہ میں حقیقت یہ ہے کہ ابتداء سے اس وقت تک ہندوستان میں علم و دین کے لحاظ سے بزرگوں کے جو طبقات گزرے ہیں مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ شیخ صاحب نے ان بزرگوں اور ان بزرگوں کے مقامات و خصوصیات کے جاننے میں اتنی کامیابی حاصل کی ہے کہ اس زمانہ کے مولویوں کی اکثریت بھی اس سے قطعاً ناواقف ہے، بہ ہر حال باوجود اس کے (باقی بر صفحہ ۲۸۶)

"دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہو جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا متصدی ہوتا ہو، وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دیتا ہو جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔"

یہ جنرل سلیمن کی رائے ہو، شیخ محمد اکرام صاحب جن کی کتاب غالب نامہ کے دیباچہ سے میں نے مذکورہ بالا فقرہ نقل کیا ہو وہ جنرل موصوف کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں کہ

"ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں، اور جنھیں ہندستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یورپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہا ہو۔"

اسی ملنے جلنے اور قرب سے دیکھنے کا یہ اثر ہو کہ تعلیمی ذوق میں بیس روپیہ ماہوار پانے والا ہندوستانی مسلمان ان کو انگلستان کے وزیر اعظم کا ہم رتبہ نظر آتا ہو، جنرل مذکور نے اس

(بقیہ صفحہ ۲۸۵) شیخ صاحب نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ قصہ تراشیوں اور دروغ بافیوں میں یوروپ کے یہ پرانے سیاح اپنی آپ نظیر ہیں خود ان ہی نے اسی کتاب کے حصہ آب کوثر کے صفحہ ۷ پر محمود بیگڑہ گجرات کے مشہور مسلمان بادشاہ وفاتح کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہو جو لوگ مغربی سیاحوں کی قصہ تراشیوں اور دروغ بافیوں کی مثالیں دیکھنا چاہتے ہیں وہ سلطان بیگڑہ کے متعلق ان کی روایات پڑھیں۔ اس کے بعد خود فرماتے ہیں یہ معتبر راوی کہتے ہیں کہ سلطان کی مونچھیں اتنی لمبی تھیں کہ وہ انھیں سر کے اوپر لپیٹ کر گرہ دیتا تھا اور زہر کھانے کا اتنا عادی تھا کہ جو مکھی اس کے جسم پر بیٹھتی تھی وہ مرجاتی۔ شیخ صاحب نے اس واقفیت کے باوجود برنیر کے قصہ کو اس طریقہ سے نقل کیا ہو کہ گویا واقعی وہ کوئی حقیقت ہو۔ ابن تیمیہ بعض حدیثوں کے متعلق لکھتے ہیں تلوح علیہ امارات الوضع یعنی جعلی ہونے کی علامات خود اس کے اندر چمک رہے ہیں، یہی حال اس قصہ کا ہو، ایسا معلوم ہوتا ہو کہ عالمگیر ہندوستان کا مغل اعظم بادشاہ نہیں ہو بلکہ آج زمانہ کا کوئی اسکولی لڑکا ہو جو شہر کے اسکول میں کچھ پڑھ لکھ چکنے کے بعد اپنے گاؤں کے میانجی سے باتیں کر رہا ہو کہ واہ واہ میاں صاحب آپ نے تو مجھے جغرافیہ پڑھایا نہ تاریخ، آپ نے کچھ نہیں بتایا کہ دُنیا کے مختلف ملکوں کی کیا کیا پیداواریں ہیں اور نہ بتایا کہ دُنیا کے مختلف حصوں کے بادشاہوں کے نام کیا ہیں الخ

میرے نزدیک تو نہ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ عالمگیر جیسے بادشاہ کی تقریر ہوسکتی ہو اور نہ تاریخوں سے عالمگیر کے کسی ایسے اُستاد کا پتہ چلا ہو جو پیٹ پکڑے بادشاہ کے سامنے باربار نوکری کے لیے دوڑتے پھرتے تھے۔"

کے بعد لکھا ہے،

"جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں، وہی یہ لوگ (ہندوستانی مسلمانوں کے بچے) عربی اور فارسی میں سیکھتے ہیں۔"

بیان ان ہی الفاظ پر ختم نہیں ہو جاتا ہے، آگے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، میں نہیں جانتا کہ ایک انگریز مبصر کے ان الفاظ کو سن کر ان بیچاروں کا کیا حال ہوگا۔ جنھوں نے ہزارہا ہزار روپے، خرچ کر کے اپنے ناموں کے پیچھے آج ہندوستان میں آکسن اور کینٹب کے لاحقوں کے استعمال کا حق حاصل کیا ہے، جنرل سلیمن لکھتے ہیں،

"سات سال کے درس (یعنی درجہ فضل) کے بعد ایک (ہندوستانی) طالب العلم اپنے سر پر جو اکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے، دستار فضیلت باندھتا ہے، اور اسی طرح روانی سے سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بو علی سینا پر گفتگو کر سکتا ہے، جس طرح آکسفورڈ کا کامیاب طالب العلم۔" دیباچہ غالب نامہ صلا

شیخ صاحب نے اسی جنرل کی کتاب کی دوسری جگہ سے یہ فقرے بھی نقل کیے ہیں،

"ایک تعلیم یافتہ مسلمان (یعنی وہی جس کا نام اب ملا مولوی وغیرہ ہے) فلسفہ اور ادبیات اور دوسرے علوم و فنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے۔"

آخر میں بالکل صحیح حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

"اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانہ میں جو ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں سمجھنے کا بہت خواہشمند ہوتا ہے۔"

یہ واقعہ ہے کہ اگر دینی تعلیم کے نظام کو دنیوی تعلیم کے اداروں سے الگ نہ کر دیا جاتا، تعلیم کی دنیا میں یہ ثنویت نہ پیدا ہوتی، بلکہ دینی عناصر کو باقی رکھتے ہوئے وہی فقہ، حدیث و تفسیر کی تین کتابوں کو قائم رکھتے ہوئے بتدریج عقلی، اور ذہنی علوم میں اسی قسم کی تبدیلیوں سے کام لیا جاتا، جس طرح مسلمان ہزار بارہ سو سال سے کام لے رہے تھے، تو کوئی د

نہیں تھی کہ تعلیم کا جو نظام ہندوستان میں جاری تھا، وہ تمام عصری ترمیموں کو علم کی تمام شاخوں میں جذب نہ کرلیتا، جنرل موصوف نے بالکل تجربہ کی بات لکھی ہے کہ

"موجودہ زمانہ میں جو ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں سمجھنے کا بہت خواہش مند ہوتا ہے۔"

لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ مغرب کے جدید نظریات سے ہندوستان جب شروع شروع میں روشناس ہوا ہے، اس وقت اس کے چرچوں سے مسلمانوں کے مدارس جس طرح گونج رہے تھے، شاید یہ کیفیت ان تعلیم گاہوں میں بھی اب تک پیدا نہیں ہوئی ہے، جہاں ان کی مستقل تعلیم دی جاتی ہے[1] زمین کی گردش، آسمانوں کے جرمی وجود سے انکار، بطلیموسی نظام کی جگہ شمسی نظام پر علم ہیئت کی بنیاد، آج تو ان کے تذکرے کبھی کبھی سننے میں آتے ہیں۔ لیکن پرانے مدرسوں میں بحث و مباحثوں کے جو سلسلے ان مسائل کے متعلق جاری تھے اس کا اندازہ کچھ ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے اس زمانہ کو دیکھا تھا مختلف کتابیں ریاضی کی جو اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں، جن میں سب سے ضخیم کتاب فارسی زبان میں جامع بہادر خانی ہے، جو تین فنون (ہیئت، حساب، علم المرایا والمناظر) پر مشتمل ہے، آپ کو جگہ جگہ اس کتاب میں ان جدید نظریات کا ذکر تفصیل سے ملے گا جو اس وقت تک یورپ میں مختلف مسائل کے متعلق پیدا ہو چکے تھے۔ عربی زبان میں علامہ تفضل حسین خاں نے مختلف کتابیں علوم ہندسیہ کے متعلق لکھیں جن میں حکمائے یورپ کے خیالات کا تذکرہ تائید کے ساتھ

---

[1] جدید و قدیم نسلوں میں علمی مذاق کے اعتبار سے کتنا فرق پیدا ہو چکا ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس ایک واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کے حوالہ سے سید سلیمان صاحب نے معارف کے شذرات میں لکھا تھا کہ مولانا بیان کرتے تھے میری کتاب "المامون" جس وقت پریس سے نکلی، تو کل تین مہینوں میں اس کا پہلا اڈیشن ختم ہو گیا۔ لیکن آخر عمر میں جب انھوں نے شعر العجم لکھی تو یہ خیال کر کے کہ بہ نسبت تاریخ کے ہندوستانی مسلمانوں کو فارسی ادب کا مذاق چوں کہ زیادہ ہے اس لیے یہ کتاب اس سے بھی زیادہ جلد ہاتھوں ہاتھ نکل جائیگی۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ پانچ سال کی طویل مدت میں شعر العجم کے پانسو نسخے ختم ہوئے۔ صرف بیس تیس سال میں ملک کا علمی مذاق کس سطح سے اتر کر کہاں پہنچ گیا، لیکن جز رسی کا نام مدرکھ دیا گیا ہے اور لوگ ترقی تعلیم کے الفاظ پر خوش ہیں ۱۲

کیا گیا تھا، ان ہی پُرانے طرز کے مولویوں کو دلّی کے عربی کالج کے زیر اثر جدید علوم وفنون سے روشناسی کے جو مواقع ملے تھے کاش ان میں تھوڑی سی وسعت برتی جاتی، تو ہندوستان کے علم کی دُنیا اور ہوتی، حیدرآباد میں جس شاندار طریقہ سے علوم جدیدہ کا استقبال قدیم مذاق کے امرار اور علمار نے کیا تھا، اس کا اندازہ آپ کو شمس الامرار بہادر کی دارالاشاعت کی کتابوں اور ان کے مدرسہ فخریہ کے نصاب سے ہوسکتا ہو۔ ایک صدی پہلے طبعیات وریاضیات میں شمس الامرار مرحوم اول وثانی نے اُردو زبان میں مختلف کتابیں تصنیف کرائیں خود پریس قائم کرکے ان کو شائع کیا۔ بہرحال ہندوستان میں کام کی ابتدا ہوچکی تھی، کہ بعض فاسد اغراض کے تحت حکومت کو غلط مشورہ دیا گیا، اور اس کے بعد جو ہونا تھا سو ہوا؟

غریب مولویوں کو بدنام کیا گیا، ان پر جھوٹے الزام تراشے گئے، جن میں سب سے بڑا افترائی الزام انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کا فتویٰ تھا[1]۔ اور لُطف یہ ہو کہ پھیلانے والوں نے ایک بات پھیلادی، تقریبًا ایک صدی سے وہی رٹایا ہوا سبق رٹا جارہا ہو، اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ بغیر کسی شرم وحیا کے علانیہ کوچہ وبازار میں اسی سبق کو دہراتے چلے جارہے ہیں، اور کوئی نہیں پوچھتا کہ آخر یہ فتویٰ کس کتاب میں ہو، کس مولوی نے کب کہاں

---

[1] حالاں کہ معاملہ بالعکس ہو، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو خیر سرسید احمد خاں وغیرہ نے نقل کیا ہو کہ انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا تھا، لیکن جہاں تک میرا خیال ہو فتاوی عزیزیہ میں ایسا کوئی فتویٰ نفیًا یا اثباتًا نہیں ہو مگر شاہ صاحب کے سوا دوسرے علمار مثلاً حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے فتاوی میں دیکھیے ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں آپ کو جواز کا فتویٰ ملیگا، ایک موقع پر ارقام فرماتے ہیں:۔

"فی الواقع نفس تعلیم انگریزی کا شرعًا ممنوع نہیں ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو زبان یہودی سیکھنے کا حکم کیا، جیساکہ جامع ترمذی وغیرہ میں مروی ہو۔ ملاعلی قاری مکی کی شرح مشکوٰۃ میں ہو لا یعرف فی الشرع تحریم علم لغۃ من اللغات سریانیۃ کانت او عبرانیۃ، ھندیۃ کانت او ترکیۃ او فارسیۃ کانت او غیرھا۔

(یعنی شریعت میں کسی لغت کے سیکھنے کو حرام قرار دیا گیا ہو، ایسی بات کسی دلیل سے معلوم نہیں ہوتی، خواہ لغت سریانی ہو یا عبرانی، ہندی ہو یا ترکی یا فارسی وغیرہ کوئی ہو)

مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی مرحوم صفحہ ج ۱

کس بنیاد پر کس کو یہ فتویٰ دیا تھا۔ انیسویں صدی کے علماء کے فتووں کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں ان میں ڈھونڈھا جاتا، لیکن اتنی فرصت کس کو ہے "دیوانہ گفت و ابلہ باور کرد" کی مثال اس سے زیادہ شاید ہی کسی چیز پر کبھی صادق آئی ہو۔ مولویوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ہماری تعلیم کے نظام کو نہ توڑا جائے، اس کی قدر و قیمت نہ گھٹائی جائے، لیکن جو چیز دین نہیں تھی اس میں بھی وہ کسی ترمیم کے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے یہ کس نے کہا؟ جس قوم نے اسی یورپ کے ایک حصہ یونان کے سارے علوم پر قبضہ اور ایسا قبضہ کر لیا کہ آئندہ دُنیا کو یونانیوں کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوا مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوا

کیا اسی یورپ کے علوم و فنون کے سیکھنے سکھانے سے وہ محض اس لیے انکار کر سکتے تھے کہ وہ یورپ کے علوم و فنون ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو فانی کر کے محض دوسروں کے ساتھ باقی رہنے سے ان کو انکار تھا۔ خود ہی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ انکار ان کا کس حد تک بیجا تھا۔

آج لوگوں کو کیسے باور کرائیے کہ شاہ عبدالعزیز جیسی ہستی جن پر آج ہندوستان کے علم حدیث کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اپنے وقت میں ان ہی کا فعل سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے خواص و عوام کے لیے نمونہ تھا، ملفوظات عزیزیہ میں حضرت کی زبانی منقول ہے کہ

"سکندر (الکزینڈر) و فریزر از جملہ انگریزاں با من صحبت داشتہ اند"

ان میں سے فریزر کے متعلق شاہ صاحب کا ارشاد تھا کہ

"قابل و قابلیت دوست است از من چیزے خوانده" صا!

اور سکندر جو بظاہر کوئی فوجی افسر معلوم ہوتا ہے وہ تو شاہ صاحب کا اتنا گرویدہ تھا کہ شاہ صاحب سے اس نے تعویذ لیا تھا، اس کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی، ملفوظات میں شاہ صاحب کی زبانی نقل کیا ہے کہ

"از جہت مردن بچ کو دکان گو کہ ایشان راچنداں اعتقاد از تعویذ و طومار نیست لیکن باضطرار رجوع

کر داین چنیں اتفاق افتاد کہ چہار فرزندان ہستند" ص۱۱۱

سٹیفن نامی ایک انگریز کا بھی ذکر اسی کتاب میں ہے وہ اتنا معتقد تھا کہ پرانی دلی میں حضرت شاہ صاحب جہاں پیدا ہوئے تھے بطور یادگار کے

"دو بنائے (مکانے) تیار کند چنانچہ بنا کردہ بود مگر درست نہ شد"

بہر حال میری غرض یہ ہے کہ بیچارے مولویوں کو بدنام کرنا کہ انھوں نے تنگ نظری سے کام لے کر مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے سے روکا، اس حیثیت سے قطعاً غلط ہے کہ وہ انگریزی پڑھنے کو حرام[1] سمجھتے تھے۔ ہاں انھوں نے مقاومت ضرور کی۔ لیکن صرف اس کی کہ دین سے جاہل رکھ کر محض ذہنی علوم و فنون سے مسلمانوں کے عقول کو بیدار کرنا، غلط نتائج پیدا کریگا۔ ان کا تو فقط یہ اندازہ تھا، اور ہم تو اسی اندازہ کو واقعہ کی شکل میں دیکھ رہے ہیں، اور اب بھی علاج وہی اور صرف وہی ہے جو ان علمار نے سوچا تھا۔

خیر میں گفتگو اس پر کر رہا تھا کہ ہمارے ہندی نظام تعلیم اور اس کے نتائج کو اپنوں کے سوا غیروں نے بھی کس نظر سے دیکھا تھا۔ اب اس سے زیادہ اور کیا چاہا جاتا ہے جس کی شہادت

---

[1] اپنی تاریخ سے جو قوم جاہل کر دی گئی ہو اسے سب ہی طرح کا دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ ائمہ اربعہ میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حافظ ابن حجر نے ان کی سوانح عمری میں نقل کیا ہے کہ طب و نجوم میں ان کو کمال حاصل تھا۔ بقراط کی کتاب غیر اقوام کے لوگ امام شافعی سے پڑھنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے ایک امام یعنی امام شافعی ہی سے یہ روایت حافظ ہی نے درج کی ہے کہ ان کے شاگرد حرملہ کہتے تھے کان الشافعی یتاسف ما ضیع المسلمون من الطب ویقول ضیعوا ثلث العلم و وکلوہ الی الیھود والنصاریٰ یعنی حضرت امام شافعی اس پر بہت افسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں نے علم طب کو کھو دیا۔ فرماتے کہ علم کا ثلث حصہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا انھوں نے اس فن کو یہود و نصاریٰ کے سپرد کر دیا۔ دیکھو توالی التاسیس ص۶۲۔ امام شافعی دوسری صدی کے فقہ و حدیث علوم قرآنیہ کے امام ہیں۔ یہود و نصاریٰ سے آپ کا اشارہ عباسی دربار کے عیسائی اور یہودی اطبار کی طرف تھا۔ مسلمانوں کی رواداری کی انتہا ہے کہ یونانی طب میں انھوں نے خدا جانے کتنا اضافہ کیا، لیکن نام تک نہ بدلا۔ اور آج تک یونانی طب کے نام سے مسلمانوں کی طب موسوم ہے ۱۲

جنرل سلمن نے اداکی، شیخ محمد اکرم صاحب (مد اللہ عمرہ و بارک فیہ) نے سچ لکھا ہے کہ

"ان سطور (یعنی سلمن کے گزشتہ بالا بیانات) سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان کا نظام تعلیم اس زمانہ میں انگریزی نظام تعلیم سے یا اکسفورڈ کے موجودہ کلاسیکل کورس کے مقبول عام نصاب سے کسی طرح پست نہ تھا" ص۵۱

شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جن انگریزوں کو علمی اور دینی عقیدت تھی آخر یہ ان کے فضل وکمال کا اعتراف نہ تھا تو اور کیا تھا، یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ شاہ صاحب سے دینی یا مشرقی زبانوں ہی کے متعلق استفادہ ان کے یہ انگریز شاگرد اور معتقد کرتے تھے اسی ملفوظات عزیزیہ میں ہے کہ ان ہی انگریزوں میں سے ایک انگریز نے ایک دن شاہ صاحب سے پوچھا کہ شہر کے بعض کھاری کنووں کا پانی میٹھا کیوں ہوجاتا ہے؟ شاہ صاحب نے اس کا علمی جواب دیا، جو ذرا مبسوط ہے، اس لیے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ان غریب ہندی ملانوں کے متعلق مسٹر ناس کول برک کی وہ یادداشت بھی قابل ذکر ہے، جس میں حکومت کو ان بےکسوں کی صحیح قدر وقیمت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ برک صاحب نے لکھا تھا:

"اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندوستان کے علم وادب کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا تھا نہ صرف علما کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے، بلکہ وہ جماعت بھی جس میں جوہر قابل پیدا ہوتا تھا، محدود ہوتی جاتی ہے، علوم نظری کا مطالعہ لوگ چھوڑتے جاتے ہیں...... اگر گورنمنٹ نے سرپرستی نہ کی تو اندیشہ ہے کہ صرف کتابیں ہی نہ مفقود ہوجائینگی، بلکہ ان کے پڑھانے والے بھی مفقود ہوجائیں گے۔"

آخر میں بیچارے نے بڑے دردناک لہجہ میں لکھا ہے:

"ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا، اور جہاں دُور دُور سے طالب علم پڑھنے آتے تھے آج وہ علم کا بازار ٹھنڈا پڑگیا ہے۔"

منقول از رسالہ اُردو اپریل ۱۹۲۳ء

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں چاہتا ہوں کہ جنرل سلمن نے مسلمانوں کی جن خصوصیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہی یعنی ہندوستانی مسلمانوں میں

"جو کوئی بیس روپے کا متصدی ہوتا ہی، وہ اپنے لڑکوں کو اسی طرح تعلیم دلاتا ہی جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو"

افسوس ہی کہ ہماری جن خصوصیتوں پر غیروں کی نظر پڑتی ہی، قرب و نزدیک کی وجہ سے خود ہماری نگاہوں سے وہ کبھی کبھی اوجھل ہو جاتی ہیں، آج ہندوستان کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جہالت کا ایک عام رونا ہی، لیکن جن قوموں کو بتا بتا کر عار دلایا جاتا ہی ایک تو ان کی تعداد نیز اس پر بھی نظر نہیں کی جاتی کہ اب تک ان میں تعلیم جو کچھ بھی پھیلی ہی وہ اس مخصوص طبقہ تک محدود ہی جس کا کام ہی لکھنا پڑھنا ہی مثلاً برہمن اور کائیست لیکن عوام کا جو حال ہی اس کو لوگ نہیں دیکھتے اس کے سوا مسلمان موجودہ نظام تعلیم سے جو دل برداشتہ ہیں اس کی اصلی وجہ وہی تعلیم کی ثنویت ہی، جہاں دین کی تعلیم ہوتی ہی وہاں دنیا نہیں ملتی، اور جہاں دُنیا ملتی ہی وہاں کھلم کھلا دیکھا جا رہا ہی کہ دین کو کھو کر لوگ دنیا حاصل کر رہے ہیں، یہ ایسی سخت کش کش ہی جس نے مسلمانوں کے عام طبقات سے اس تعلیمی جوش کو دھیما کر دیا ہی جس کا نظارہ مسٹر سلمن نے اس وقت کیا تھا جب مسلمانوں کا جوش باوجود حکومت کھو دینے کے کم نہیں ہوا تھا،

قاری عبد الرحمٰن محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہی کہ ان کے والد کا نوعمری میں انتقال ہو گیا، سرپرست صرف والدہ صاحبہ رہ گئی تھیں، قدرتاً ایسی حالت میں بچوں میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہی، قاری صاحب پر سیر و شکار کا شوق غالب آگیا، پڑھنا لکھنا چھوڑ بیٹھے، اب سنیے ان ہی کی زبانی ان کی سوانح عمری میں یہ قصہ نقل کیا گیا ہی:

"ان کی والدہ بیچاری یہ حالت دیکھ دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوتیں، فرط محبت سے بار بار سمجھاتیں مگر آپ ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے...... ایک روز والدہ نے پاس بُلایا اور نہایت درد و محبت کے ساتھ سمجھانے لگیں، سمجھاتے سمجھاتے ان کی طبیعت بھر آئی، رونے لگیں، انھیں روتا دیکھ کر

آپ رونے لگے، اس واقعہ کا دل پر اتنا اثر ہوا کہ اسی وقت تمام نکمے مشغلوں سے طبیعت کو نفرت ہوگئی اور تحصیل علم کا شوق موجزن ہوگیا" تذکرہ رحمانیہ صـ۱۳

یہ تیرھویں صدی کی ایک بیوہ مسلمان خاتون کی کیفیت ہے۔ حضرت سلطان المشائخ کے حال میں بھی لکھا ہے آپ کو بھی بچپن ہی میں داغ یتیمی اُٹھانا پڑا، آپ کی تعلیم بھی والدہ ہی کے شوق تعلیم کی رہین منت ہے کسی موقع پر ذکر آئے گا کہ بسا اوقات گھر میں فاقہ ہوتا تھا لیکن تعلیم بہرحال جاری تھی جب متوسطات آپ کی ختم ہوئی ہے اور اُستاد نے بداؤں میں چاہا کہ دستار باندھیں تو کرمانی نے لکھا ہے:

"ایں حکایت پیش والدہ خود گفت اں مخدومہ جہاں .... خود ریسمانے برشت و دستارے ازاں بافانیدہ چوں سلطان المشائخ آں کتاب تمام کرد، والدہ بزرگوار بتقریب طعامے کرد"

سیر الاولیا صـ۹۵

بہرحال تعلیم کا جو نظام ہندوستانی بزرگوں نے قائم کیا تھا، اس کی نفع بخشی کے متعلق یہ تو وہ بات تھی جسے آپ چاہے تو منطق کی اصطلاح میں برہان انّی قرار دے سکتے ہیں۔ میں نے نمونے کے چند پھل پیش کر دیے ہیں، اس کے بعد بھی درخت کی بے ثمری کا کسی کو شکوہ باقی رہ جائے تو ایسوں کے لیے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

النجم تستصغر الابصار صورته ۔۔۔ والذنب للطرف لا للنجم فی الصغر

تارے نگاہوں کو چھوٹے نظر آتے ہیں ۔۔۔ اس میں گناہ نگاہ کا ہے نہ کہ تارے کا

بلکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ان نتائج کو دیکھ کر ہم ٹھنڈے دل سے تمام عصری مشاغلوں سے جُدا ہو کر سوچتے کہ جس نصاب میں "دینیات" کا حصّہ اتنا قلیل ہے، اسی سے ایسے عظیم نتائج کیوں پیدا ہوتے رہے، اگرچہ ضمناً اس کی طرف اشارہ کرتا چلا آیا ہوں، لیکن شاید میرے یہ اشارے کافی نہ ہوں، نیز میں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ خود اس نصاب کی خصوصیتوں کی طرف بھی آخر میں توجہ دلاؤں گا۔ گویا اس "انّی برہان" کے مقابلہ میں اب جو کچھ کہا جائیگا،

اس کی حیثیت برہان لمی کی ہوگی۔

بات یہ ہو کہ تعلیم ہی پر نوع انسانی کے ارتقار کی بنیاد قائم ہو، یہ ایک ایسا مسلمہ مسئلہ ہو، جس میں شک کرنے کی گنجائش باقی نہیں ہو۔ آخری پیغام میں صلّ (نماز پڑھ) صم (روزہ رکھ) وغیرہ احکام کی جگہ پہلا خطاب جس سے نوع انسانی کو اس کے آخری پیغام پر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حق تعالیٰ نے مخاطب فرمایا وہ اقرأ (پڑھ) کا لفظ تھا، جس رب نے قلم سے سکھایا، اس کی یاد دلاتے ہوئے

علم الانسان مالم یعلم — سکھایا اس رب نے "الانسان" کو جسے وہ نہیں جانتا

پر اپنے اس "خطاب اول" کو ختم فرمایا گیا ہو، خود یہ دلیل ہو کہ اپنی آخری نشأت اور اُٹھان میں انسانیت کا بنیادی کام "تعلیم" ہی ہو، اور یہی واقعہ کہ جیتے جی آخر وقت تک جس کسی کو جو کچھ کرنا ہو الانسان کے سوا سب ہی اس کا علم لے کر پیدا ہوتے ہیں جو نہیں معلوم تھا، اس کا علم نہیں حاصل کرتے، بلکہ جو کچھ معلوم تھا صرف اسی پر عمل کرکے اپنی آخری سانس پوری کرتے ہیں شناوری کا علم بط کا بچہ انڈے کے اندر سے لاتا ہو، لیکن بوڑھا ہو کر یہی بچہ جب مرتا ہو تو جو علم لے کر پیدا ہوا تھا، مرنے کے وقت بھی اس علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا سب کا یہی حال ہو، لیکن ان میں صرف ایک آدمی زادہ ہو کہ پیدا ہوتا ہو ہوش وتمیز عقل و خرد سے خالی ہو کر، لیکن مرتا ہو حکیم وعلامہ فاضل وطبیب مہندس بن کر، مالم یعلم (جو کچھ نہیں جانتا) یہ انسان کی خصوصیت ہو کہ زندگی بھر اسی کو جانتا رہتا ہو، اس کے رب نے اس کی فطرت یوں ہی بنائی ہو، یہی مطلب ہو ان لوگوں کا جو پہلی وحی کے خطاب اول کے آخری انفاظ علم الانسان مالم یعلم (سکھائی انسان کو وہ باتیں جنھیں وہ نہیں جانتا) کی تاویل میں کہتے ہیں کہ الانسان ایک تعلیمی حقیقت ہو یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی صلاحیت صرف اسی میں ہو، ورنہ اس کے سوا دل و دماغ لے کر جتنے پیدا ہونے والے پیدا ہوئے ہیں، وہی جانتے ہیں، جس کا جبلی اور فطری علم لے کر وہ پیدا ہوئے، اس کے سواوہ

اور کچھ جان ہی نہیں سکتے خواہ جینے کا موقعہ اس دنیا میں ان کو جتنا بھی دیا جائے ان کی عمر گدھ ہی کی عمر کیوں نہ ہو۔ الانسان کی یہی صلاحیت ہے، جس کا ظہور قراۃ (خواندگی) اور تعلیم بالقلم (نوشت) سے ہوتا ہے اسی کی طرف خطاب اول میں ایما فرمایا گیا ہے[۱]۔ خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ علم الانسان مالم یعلم (الانسان جو نہیں جانتا ہے، اسے جاننے کی انسانی فطرت میں جو قدرتی صلاحیت ہے، اسی صلاحیت کو جہاں تک ممکن ہو بر روئے کار لانے کے لیے چمکایا جائے، ابھارا جائے، دھویا جائے، صاف کیا جائے۔ اور قدیم تعلیم ہو یا جدید، سب کا حقیقی نصب العین یہی رہا ہے، اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ جدید تعلیم آدمی میں ریل دموٹر بنانے گراموفون اور ریڈیو کے ایجاد کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اور غریب عوام اس سے

[۱] اصل یہ ہے کہ جن لوگوں سے پیغمبر کا وطنی یا نسلی تعلق ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ پیغمبر جن لوگوں میں پیدا ہوتا ہے، پیغام کی زبان تو پیغمبر کی وہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ بھیجا بھی جاتا ہے ان ہی لوگوں کی طرف جن میں وہ پیدا ہوتا ہے یا جن سے اس کا وطنی یا نسلی تعلق ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ غیر ضروری ہے۔ ایسا پیغمبر جو صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہو اس کے ساتھ تو اتفاقاً یہ صورت پیش آجاتی ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجا جاتا ہے، ان ہی لوگوں کی زبان اس کے پیغام کی زبان ہوتی ہے۔ لیکن جو "الناس جمیعًا" اور کافۃ للناس" کی طرف مبعوث ہو، دنیا کی ساری قومیں ساری امتیں اس کی مخاطب ہوں، ایسے پیغمبر کے لیے کیا کیا جاتا، کیا دنیا کی ساری قوموں کی ہر ہر زبان میں اس کو پیغام دیا جاتا، عملی دشواریوں کے ساتھ لاکھ لاکھ زبانوں میں، اس پیغام کی تعبیر اس کی کیا حالت بنا دیتی، جب ایک ہی زبان والے پیغام کی تاویلوں اور تفسیروں میں لوگوں نے اتنے اختلافات پیدا کر دیے۔ آسان صورت یہی تھی اور یہی کیا بھی گیا کہ جن لوگوں میں وہ پیدا ہوا تھا۔ ان ہی کی زبان اس کے پیغام کی زبان رکھی گئی، وہ کلیۃ بھی باقی رہا کہ پیغمبر اپنی قوم کی زبان کے ساتھ بھیجا گیا لیکن جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا، ان میں سے خود اس کی قوم تو اس کی زبان سے واقف ہی تھی ان کے سوا دنیا کی دوسری قوموں کے لیے ابتدائی خطاب ہی میں اشارہ کیا گیا۔ وہ سب کے سب انسان ہیں۔ بیل اور گھوڑے نہیں ہیں، اور الانسان کی تو خاصیت ہی یہ ہے کہ جس چیز کو نہیں جانتا ہے اس کے جاننے کی جس زبان سے ناواقف ہے اس کے سیکھنے کی اس میں قدرتی صلاحیت ہوتی ہے یہی صلاحیت پیغام کو عام بنانے کے لیے کافی ہے ۱۲

یہ سمجھ جاتے ہیں کہ واقعی دُنیا کی عصری جامعات تعلیمی ادارے نہیں، بلکہ دستکاریوں کے کرگہ (کارگاہ) یا کارخانے ہیں، لیکن ان کو پھر تعجب ہوتا ہی کہ تاریخ اور فلسفہ معاشیات ونفسیات السنہ ولنگویجز ہی کے اساتذہ نہیں، جو فنون کے معلّم ہیں، بلکہ کیمیا اور طبعیات (سائنس و حکمت) کے معلمین کی بھی موٹر جب خراب ہوتی ہی تو بنانا تو بڑی بات ہی، معمولی کل پُرزوں کی اصلاح بھی نہیں کر سکتے، عالم پروفیسر کھڑا تاکتا رہتا ہی، اور جاہل شوفر اپنی فنی مہارت کا اظہار کرتا ہی، بجلی کا کوئی تار ٹوٹا، اور برقیات ہی کا اُستاد کیوں نہ ہو، مستری کی چیخ سے آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہی۔ ظاہر ہی کہ یہ مغالطہ اصل حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہی تعلیم گاہوں میں جو کچھ بھی تعلیم دی جاتی ہی، ان کا بالکلیہ تعلق علمی نظریات اور کلیات سے ہوتا ہی، ایسے نظریات اور کلیات جن کی روشنی میں فطرت کے نوامیس (قوانین) واضح ہوتے ہیں، اب یہ ہوسکتا ہی کہ ان ہی قوانین ونوامیس کے علم سے آدمی کسی ایسی چیز کو ایجاد کرلے، جس کا علم پہلے سے اسے حاصل نہ تھا، مطلب یہ ہی کہ جامعاتی تعلیم ایجادات واختراعات کے لیے مقدمہ کا کام دے سکتی ہی[۲] لیکن یہ باور کرنا کہ ان جامعات میں بھی چیزوں کے بنانے اور ڈھالنے کا کام طلبہ سے کرایا جاتا ہی۔ نہ یہ واقعہ ہی اور نہ مدارس کے قیام کی یہ غرض ہی۔ تعلیم کی غرض جو ہمیشہ سے تھی، وہی مقصد اب بھی ہی۔ پہلے بھی وہی مالم یعلم (جسے نہیں جانتا) کے متعلق یعلم (انھیں جانے) کی صلاحیتوں کی نشوونما میں کوشش کی جاتی تھی، اور اب بھی جبلت

---

[۲] میں نے سکنے کا لفظ قصداً استعمال کیا ہی جس کی وجہ یہ ہی کہ عصر حاضر کے محیر العقول درحقیقت محیر العقول ایجادات کے متعلق اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عموماً ان کے ایجاد کرنے والے زیادہ تر ایسے افراد ہیں جو جامعاتی تعلیم سے محروم تھے، تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہی مثلاً انیسویں صدی کے سب سے بڑے موجد اڈیسن صاحب گراموفون وغیرہ کی سوانح عمری بتاتی ہی کہ ان کی تعلیم اسکول کے ابتدائی درجوں سے زیادہ نہ تھی۔ حالاں کہ اس صدی کی بیش تر ایجادات اسی شخص کی فکر ونظر کی مرہون منت ہیں اور ایک اڈیسن کیا آپ کو موجدین کے گروہ میں زیادہ تر وہی لوگ نظر آئیں گے جنھوں نے نہ سائنس پڑھی تھی نہ کیمیا سیکھا تھا والقصۃ بطولہا ۱۲

بشری کی اسی عجیب وغریب قدرتی ودیعت کو اُبھارنے اور اُجاگر کرنے میں سارا زور صرف کیا جاتا ہے، خواہ وہ فنون کا شعبہ ہو یا سائنس (حکمت) کا۔

میرے سامنے اس وقت دوسرے علوم وفنون اور ان کی تعلیم وتعلم کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ بحث کا دائرہ صرف اسلامی علوم کی حد تک محدود ہے، یعنی قرآن و حدیث وفقہ و عقاید کی تعلیم کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یا کیا ہونا چاہیے۔ بلاشبہ اگر ان علوم کی تعلیم کا مقصد معلومات کی گرداوری ہو، تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے نصاب قدیم میں دینیات اور خالص اسلامی علوم کی تعلیم میں غفلت بلکہ مجرمانہ غفلت برتی گئی، ظاہر ہے کہ پورے نصاب میں چند مختصر فقہی متون کے علاوہ جیساکہ عرض کرچکا ہوں، جلالین جیسی تفسیر اور مشکوٰۃ جیسے مجموعہ حدیث، اور ہدایہ وشرح وقایہ جیسی کتابوں سے ان علوم کے متعلق کیا معلومات فراہم ہوسکتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ان علوم میں سے ہر علم کی حالت یہ ہے کہ بیس بیس تیس تیس جلدوں میں اس کی ایک ایک کتاب پائی جاتی ہے، تفسیر کا فن جس میں جریر طبری، درمنثور، روح المعانی، تفسیر کبیر جیسی ضخیم کتابیں ہوں، اسی فن میں صرف بیچاری جلالین طلبہ کو کیا معلومات عطا کرسکتی ہے، جس کے الفاظ کہا جاتا ہے کہ قرانی الفاظ کے مساوی ہیں اور حدیث ومتعلقات حدیث رجال، علل، سیرت اصول حدیث کے طول وعرض کا کیا ٹھکانہ ہے۔ کتب خانوں کے کتب خانے صرف ایک حدیث ومتعلقات حدیث کی کتابوں سے بھر دیے جاسکتے ہیں، یہی حال فقہ کا ہے، خود ہدایہ ہی کے متعلق لکھتے ہیں کہ علامہ برہان الدین مرغینانی نے

شرحہا شرحًا فی نحو ثمانین مجلدات — اسّی جلدوں میں شرح لکھی ہے اور اس کا نام
وسماہ کفایۃ المنتہی — مفتاح ص۲۲۱ — کفایۃ المنتہی ہے۔

اور اسی کا خلاصہ ہدایہ ہے، اور اس علم کے فتاوی محیطوں اور حاویات (انسائکلوپیڈیاز) اور وہ بھی ہر ہر مذہب کی کتابیں کیا حصر وشمار میں آسکتی ہیں، ظاہر ہے کہ اسی حدیث و

فقہ میں مشکوٰۃ اور ہدایہ و وقایہ کی معلومات کے اعتبار سے کیا حیثیت ہے؟

پس اگر تعلیم معلومات کی گرداوری کا نام ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ ان فنون میں سے کسی ایک فن کے لیے بھی طالب علم کی پوری عمر وفا کر سکتی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کسی ایک فن کی دو تین کتابوں کو درسًا درسًا پڑھتے ہوئے لحد تک پہنچ جائے گا، بشرطیکہ مہد ہی سے اُس نے پڑھنا شروع کیا ہو۔ لیکن اگر تعلیم کا وہی مقصد ہے جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا، یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کو جاننے کی انسان میں جو قدرتی صلاحیت ہے اس صلاحیت کو اُبھارا جائے۔ طلبہ میں ایک ایسی استعداد اور اس کا راسخ ملکہ پیدا کیا جائے کہ تعلیمی زندگی سے الگ ہونے کے بعد اپنے متعلقہ فنون کے حقائق و مسائل تک اُستاد کی اعانت کے بغیر اس کی رسائی ہونے لگے، خود سوچنے کی اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی خواہ وہ کسی قسم کی پیچیدہ اور دقیق تعبیر میں پیش کی گئی ہوں، تنقید یا صحیح کو غلط سے جدا کرنے کی صلاحیتوں کو مدرسہ سے لے کر باہر نکلے، اگر پڑھنے پڑھانے کا یہی مطلب ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ چیزوں کو دکھانے پر زیادہ زور دینا مقصود نہ ہو، بلکہ دیکھنے کی قوت بڑھائی جائے، جہاں تک بڑھ سکتی ہو، تعلیم صرف اس کا نام ہو، اور دیکھنے سیر کرنے کا کام تعلیم کے بعد کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بزرگوں نے اسلامی علوم کی تعلیم کی جو راہ بنائی تھی، اس سے بہتر راہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے جیسا کہ آپ سُن چکے کہ عربی تعلیم مدارج کے لحاظ سے دو درجوں میں تقسیم تھی، ایک ضرورت کا درجہ تھا دوسرا فضل کا، ضرورت کے درجہ تک مذہب کی تعلیم حاصل کر کے جو تعلیم کو ختم کر دینا چاہتے تھے، ان کی غرض فقط یہ ہوتی تھی کہ اپنی شخصی زندگی میں معمولی مذہبی اور دینی ضرورتیں جو ان کو پیش آئینگی، ان ضرورتوں کی حد تک دین کے سمجھنے کی ان میں لیاقت پیدا ہو جائے: گزر چکا کہ اس کے لیے صرف و نحو کی معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد قدوری وغیرہ جیسی فقہی متن کی کوئی کتاب پڑھا دی جاتی تھی اور یہ اتنا مختصر

نصاب ہوتا تھا کہ کوشش کرنے والے چاہتے تو چھ مہینوں میں اسے ختم کر سکتے تھے، حضرت سراج عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں مولانا فخر الدین زرادی کا وہ قول نقل کر چکا ہوں کہ انھوں نے ذمہ داری لی تھی کہ چھ مہینہ میں قدر ضروری والے علم تک پہنچا دوں گا، اور جو انھوں نے وعدہ کیا تھا پورا کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ذاتی ضرورتوں کے لیے مذہب کی اتنی تعلیم کافی نہ تھی، خدا جانے اس زمانہ میں لوگ کس طرح سوچتے ہیں، میں بار بار کہتا چلا آرہا ہوں، جن زبانوں کو مسلمان بولتے ہیں، عربی کے سوا اور جتنی اسلامی زبانیں ہیں، سب میں قرآن و حدیث کے الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، جسے مادری زبان کے الفاظ کی حیثیت سے لوگ یونہی جانتے ہیں، آئندہ غیر عربی زبان والوں کو جو کچھ دشواری رہ جاتی ہے وہ کچھ عربی صیغوں کے مختلف اشکال کی اور کچھ عربی جملوں کی ترکیبوں کی، صرف و نحو کی معمولی تعلیم کے بعد خواہ قرآن سبقاً سبقاً پڑھایا جائے یا نہ پڑھایا جائے بجز معدودے چند الفاظ کے جنھیں لغت کی معمولی کتابوں یا کسی فارسی اردو کے ترجمہ یا تفسیر سے بآسانی حل کر لیا جا سکتا ہے، اپنے سادہ سیدھے معنی کے حساب سے یقیناً بہ سہولت تمام سمجھا جا سکتا ہے، اور ہمیشہ یونہی وہ سمجھا گیا ہے، قرآن کے بعد اب رہ گئی قرآن کی عملی تشکیل، بلاشبہ اس کا ذخیرہ دراصل حدیث ہی کی کتابوں میں ہے۔ لیکن اس ذخیرے سے صحیح نتیجہ نکالنا، کیا ہر معمولی آدمی کا کام ہو سکتا ہے۔ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ فقہ آخر ہے نام کس چیز کا؟

احادیث و آثار کا وہی ذخیرہ جس سے ہر معمولی آدمی استفادہ نہیں کر سکتا، اسی خام مواد سے بحث و تنقیح، توفیق و ترجیح، جرح و تعدیل کے بعد آئمہ مجتہدین نے جن پختہ نتائج کو پیدا کر کے امت کے حوالہ کیا ہے، کیا فقہ اس کے سوا بھی کچھ اور ہے؟ وہ امام ابو حنیفہ کی فقہ ہو یا امام شافعی کی، حال تو یہ ہے کہ فقہ کے سینکڑوں ابواب سے بلا مبالغہ ہزارہا ہزار مسائل اور ان کے متعلقہ مباحث کو عوام کیا طے کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں پچھلے دنوں کل

چار مسئلوں کو لے کر یعنی رفع الیدین، قراۃ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر والخفاء تین تو یہ ہوئے اور ایک شاید سینے پر ہاتھ نماز میں باندھا جائے یا زیر ناف، نماز کے ان چار مسئلوں پر پچاس برس سے حدیث کی کتابیں اُلٹی پلٹی جا رہی ہیں۔ رسالوں پر رسالے نکل رہے ہیں، مناظرے ہو رہے ہیں، مقدمے چل رہے ہیں، لیکن قطعی فیصلہ ہنوز روز اول کی حالت میں ہے، خیال تو کیجیے کہ الزکوۃ، الصوم، الحج، البیوع، الاجارات، الوصایا، الوقف وغیرہ وغیرہ بیسیوں ابواب میں سے صرف تین چار مسئلوں میں جب لوگوں کا یہ حال ہے تو کیا ان ہی لوگوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں حدیث و آثار کی کتابوں سے یہ اپنے لیے صحیح نتائج پیدا کر سکتے ہیں، مختلف آثار و روایات میں سنداً و متناً جو دقیق علمی مباحث پیدا ہوتے ہیں کیا اس خام ذخیرے سے پختہ نتائج کا پیدا کرنا ہر شخص کا کام ہو سکتا ہے، اور بالفرض کوئی اس کی ہمت کر بھی گزرے تو دوسروں سے نہیں خود اسی کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ جو وزن امام ابو حنیفہ، مالک و شافعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ آئمہ کے فیصلوں کا ہے وہی وزن وثوق و اعتماد کی وہی کیفیت کیا وہ اپنے فیصلوں میں پا سکتا ہے؟

کچھ بھی ہو قدوری اور کنز کا لفظ بولنے میں تو نہایت سبک اور ہلکا سا معلوم ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک تو یہ کتابیں اسلام کے بہترین دل و دماغ کی انتہائی عرق ریزیوں کے آخری منقح نتائج ہیں، خدا جزاء خیر دے ان بزرگوں کو جنھوں نے دین کی دشواریوں کو حل کر کے مذہبی زندگی گزارنے والوں کے لیے راہ آسان کر دی۔

بزرگوں نے انتہائی احتیاط سے کام لے کر سیکڑوں تصنیفات سے ان چند متون کا انتخاب اس لیے کر دیا ہے کہ ان کے مصنفین کا شمار ان لوگوں میں ہے جن کے بیان پر بھروسہ کیا جاتا ہے، یہی قدوری ہے، عوام کو شاید معلوم نہ ہو لیکن خواص تو جانتے ہیں کہ تقریباً ایک ہزار سال کا یہ قدیم مستند متن متین ہے۔ مشہور امام ابو الحسین بن ابی بکر القدوری البغدادی المتوفی ۳۶۲ھ نے بیسیوں کتابوں سے کہا جاتا ہے کہ بارہ ہزار ضروری

مسائل کا انتخاب فرمایا۔[1] عہد تصنیف سے آج تک یہ کتاب پڑھائی جا رہی ہے، قطع نظر دوسری باتوں کے اس قسم کی کتابوں کا ایک بڑا نفع یہ بھی تھا کہ ایک ایک کتاب سے تین تین چار نسلیں درسی فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ آج جدید مدارس و کلیات میں نصابی کتابوں کی تبدیلی کا جو ایک عارضہ ہے، اس کا یہ نتیجہ ہو رہا ہے کہ جن کتابوں کو پڑھ کر بڑے بھائی نے امتحان میں کامیابی حاصل کی، چند ہی سال کے بعد چھوٹا بھائی جب اسکول میں آتا ہے تو ان ساری کتابوں کو بے کار پاتا ہے جن سے اس کا گھر بھرا رہتا ہے، لیکن اس کا نصاب بدل چکا ہے، بڑے بھائی کی پڑھی ہوئی کتابیں سب بے قیمت ہو چکی ہیں، اور لطف یہ ہے، جن کتابوں کو نکال کر ان کی جگہ دوسری کتابیں رکھی جاتی ہیں، مضامین و مسائل کا طریقۂ بیان کسی لحاظ سے بھی عموماً وہ گزشتہ کتابوں سے بہتر نہیں ہوتا، اور اب تو حال یہ ہے کہ جس کا جی چاہتا ہے ادھر اُدھر سے چند انتخابات کا مجموعہ مرتب کر کے نصاب کی کمیٹیوں میں پیش کر دیتا ہے۔ پھر اندرونی اور بیرونی کوششوں سے نصاب میں شریک کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، اس طریقہ سے کتاب بیچنے والے تو لاکھوں لاکھ کا سرمایہ سمیٹ لیتے ہیں اور بدقسمتی سے جن غریبوں کو چند بچوں کے باپ ہونے کا شرف حاصل ہوا، ہر سال ہر بچہ کی نئی کتابوں کے لئے ایک کافی رقم خرچ کرنے پر مجبور ہوتا ہے، خیر جس زمانہ میں تعلیم گاہوں کو بھی تجارت گاہوں سے بدل دیا گیا ہو، اس زمانہ میں جو کچھ بھی نہ کیا جائے کم ہے لیکن ہمارا جو نظام تعلیم تھا، ہمیشہ اس کی سخت نگرانی کی جاتی تھی کہ جب تک کوئی بہتر کتاب ظہور میں نہ آ جائے، نصاب کی مروجہ کتابوں کو بدلنے کی ضرورت نہیں، آپ سن چکے کہ ہزار سال تک کی کتاب (قدوری) ہمارے

---

[1] قدرت نے اس کتاب کی عظمت حنفی مسلمانوں میں اتنی بڑھادی ہے کہ طاش کبری زادہ نے لکھا ہے: ان ھذا المختصر تبرک بہ العلماء حتی جربوا قرائتہ اوقات الشدائد وایام الطاعون (علماء اس کتاب سے برکت حاصل کرتے ہیں مصائب اور طاعون میں اس کو آزمایا گیا ہے) کشف الظنون وغیرہ میں اور چیزیں اس سلسلہ میں نقل کی گئی ہیں کم از کم اتنا تو ہمیں بھی ماننا چاہیے کہ مصنف کے تقوی اور تقدس کا اثر پڑھنے والوں کی طرف منتقل ہوتا ہے ۱۲

درس میں اب تک موجود ہی، یہی حال مثلاً ہدایہ کا ہی، علامہ مرغینانیؒ[1] صاحب ہدایہ کی وفات پر ساڑھے سات سو سے زیادہ زمانہ گزر چکا، جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یہ کتاب نصاب میں شریک کی گئی ہی، چوں کہ فقہ حنفی کی کوئی دوسری کتاب اب تک ایسی تصنیف نہیں ہوئی کہ اس کی قائم مقامی کر سکے[2] بزرگوں نے اسی کو اب تک باقی رکھا ہی، اور میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بزرگوں کے اس طرز عمل پر عہد حاضر کے تجارتی کاروبار کو کس بنیاد پر ترجیح دی جاسکتی ہی۔

خیر میں کس مسئلہ میں اُلجھ گیا، برساتی کیڑوں کی طرح نصابی کتابوں کی پیدائش کا مسئلہ نہ صرف اپنی بے حالی کی وجہ سے قابل بحث ہی، بلکہ غریب ہندوستان کے غریب باشندوں کے لیے ایک مستقل معاشی اور اقتصادی سوال بنا ہوا ہی۔ کاش جہاں اور مسائل پر توجہ مبذول ہو رہی ہی ملک کے بہی خواہوں کی نگاہ اس علانیہ لوٹ پر بھی پڑتی، جو علم کے طلبہ پر تاجران کتب کی طرف سے مسلسل جاری ہی، محکمۂ تعلیمات ان کا پشتیبان ہی، اور محکمہ کو زور حکومت کی بندوق اور توپ سے حاصل ہی، ان کتابوں کا نہ خریدنے والا یا روزی۔ سے محروم ہو یا بغاوت کا مجرم ٹھیرایا جائے۔ بالفعل ان چند ضمنی اشاروں پر بحث کو ختم کر کے پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میں یہ کہہ رہا تھا، کہ ضروری نصاب کا تو یہ حال تھا، مذہب کی تعلیم ذاتی

---

[1] عام طور پر کتابوں میں صاحب ہدایہ کا وطن مرغینان ہی بتایا جاتا ہی، جو مراغہ کا ایک قصبہ ہی۔ لیکن صاحب ہدایہ کے ہم وطن بادشاہ بابر نے تزک میں صاحب ہدایہ کے گاؤں کا نام "رشدان" بتایا ہی جو مرغینان کے تعلقہ میں تھا ۱۲

[2] مصر سے زیلعی کی کتاب نصب الرایہ مجلس علمی ڈابھیل کے مصارف سے چھپ کر آئی ہی۔ اس کے شروع میں مولانا یوسف بنوری کا ایک مختصر سا پیش نامہ بھی ہی مولانا نے حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا قول براہ راست ان ہی سے سُن کر نقل کیا ہی کہ فتح القدیر ابن ہمام کی جیسی کتاب لکھنے کے لیے اگر مجھ سے کہا جائے تو اس کام کو میں کر سکتا ہوں لیکن ہدایہ جیسی کتاب لکھنے کا مطالبہ کیا جائے تو ہرگز نہیں کے سوا اس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہی۔ علامہ کشمیری کی جلالت شان سے جو واقف ہیں وہ ان کے اس قول کے وزن کو محسوس کر سکتے ہیں۔ غالباً خاکسار سے بھی حضرت شاہ صاحب نے یہ فرمایا تھا ۱۲

ضرورت کے لیے اس حد تک کافی ہے، مدت تک ضرورت کے اس نصاب میں فارسی کے سوا تھوڑی بہت عربی یعنی وہی معمولی صرف ونحو، اور کچھ فقہی مسائل کی تعلیم مذہب کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی، آج جس طرح میٹرک تک انگریزی زبان اور معمولی حساب وکتاب کی واقفیت کے بعد لوگ سرکاری محکموں میں داخل ہو جاتے ہیں، اس وقت بھی حکومت کی زبان جو بجائے انگریزی کے فارسی تھی اور نوشت وخواند حساب وکتاب وسیاق وتحریر کے ڈھنگ سے واقف ہو جانے کے بعد دفتری ملازمتوں میں شریک ہو جاتے تھے، فرق صرف یہ تھا کہ آج کل مذہب کی تعلیم بحث سے خارج ہے اور اس وقت لکھے پڑھے لوگوں کے لیے مذہب اور مذہب کے لیے وہی تھوڑی سی بقدر ضرورت عربی بھی ضروری تھی، انتہا یہ ہے کہ انگریزی عہد تک میں پُرانے علمی خاندانوں کے بچے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود گھر میں فارسی اور ابتدائی عربی ضرور سیکھ لیتے تھے۔ مسٹر ہمایوں مرزا جو پٹنہ کے ایک عالم رئیس کے لڑکے تھے، ان کے والد مرشد آباد کی نوابی کی طرف سے کلکتہ میں سفیر تھے، حالانکہ ہمایوں مرزا کی تعلیم بالکلیہ انگریزی ہے، ہندوستان ہی نہیں، بلکہ یورپ تک اسی تعلیم کی تکمیل کے لیے گئے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بچپن کے حالات میں اپنے مکتبی مولوی[1] صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فارسی کے ساتھ ساتھ

"انھوں نے میزان الصرف ختم کرائی اور منشعب وتصریف وغیرہ پڑھائی۔ ص۳۳"

قدیم فارسی خوانوں کی کتابوں اور خطوط ومکاتیب میں اشعار، عربی زبان کے فقرے، قرآنی

---

[1] یہ مکتبی مولوی جس کی تنخواہ بمشکل دس پندرہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی، محلہ یا گاؤں کے رئیس اپنے بچوں کے لیے ان کو رکھتے تھے۔ لیکن محلہ اور گاؤں کے بچے ان ہی مولوی صاحب سے مفت یا ۲، ۴ دے کر اس سے زیادہ فارسی سیکھ لیتے تھے جتنی کہ اسکولوں میں انگریزی بھی سکھائی نہیں جاتی، اور فارسی تو ان ہی مکتب خانوں میں وہی دو دو آنے چار چار آنے دے کر اتنی پڑھا دی جاتی تھی کہ کالجوں میں بھی اتنی فارسی طلبہ کو نہیں آتی حالانکہ پڑھانے والے اساتذہ پانچ اور دس نہیں پانچ سو اور دس سو اسی فارسی کے پڑھانے کے لیے پاتے ہیں ۱۲

آیتیں وغیرہ جو پائی جاتی ہیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا، شاید آخر زمانہ میں جب دلی کی حکومت کمزور ہوئی، عربی کا لزوم جاتا رہا، اور جہاں تک میرا خیال ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فارسی میں اپنی فقہی کتاب "مالابد منہ" اسی رنگ کو دیکھ کر لکھی، فارسی مکاتیب میں بجائے قدوری کے پچھلے دنوں قاضی صاحب کی مالابد منہ نصاب کی جزء تھی۔

خیر یہ تو ضروری تعلیم کا نصاب تھا۔ لیکن فضل کے درجہ کی تعلیم میں جو بات قدیم بزرگوں کے سامنے تھی، جیسا کہ میں نے عرض کیا، معلومات کی فراہمی نہ تھی، بلکہ اس ملکہ اور صلاحیت کا پیدا کرنا مقصود تھا، جس کے ذریعہ سے آدمی عمر بھر اپنے معلومات میں اضافہ کرسکتا تھا۔ اسی نقطۂ نظر کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے اتفاقاً نہیں بلکہ قصداً درجۂ فضل کی تعلیم کی بنیاد ان چند اساسی امور پر قائم کی گئی تھی، ہر ایک پر میں الگ الگ مختصر الفاظ میں بحث کرتا ہوں:

(۱) مقصود بالذات علوم سے پہلے اور نسبتاً زیادہ وقت ان علوم پر طلبہ کا صرف کرایا جاتا تھا، جنھیں ہم چاہیں تو ورزشی علوم کہہ سکتے ہیں، اپنی اصطلاح میں ان لوگوں نے اس کا نام علوم آلیہ رکھا تھا، یعنی ایسے علوم جن کے مسائل اور دعاوی واضح اور صاف نہ ہوں، بلکہ ان میں ابہام لچک، پیچیدگی زیادہ ہو، جس کا ہر دعویٰ آسانی سے ثابت نہ ہوسکتا ہو، بلکہ جو کلیہ بھی بنایا جائے وہ ٹوٹ سکتا ہو، اعتراض اور جواب کے سلسلہ کی اپنے اندر کافی گنجائش رکھتا ہو۔ مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں خود سوچنے اور تنقید کرنے، مسائل کے دقیق پہلوؤں تک پہنچنے کی مشق پیدا ہو۔

(۲) اسی طرح تلاش کر کر کے ایسی کتابیں ان فنون کی رکھی جاتی تھیں جو نسبتاً بجائے تفصیل کے مجمل زیادہ ہوں، عبارت اتنی سلیس نہ ہو کہ بآسانی مطلب سمجھ میں آجائے جس طرح پہلی بات سے یہ غرض تھی کہ طلبہ میں خود فکری اور خود سوچنے کی صلاحیت کی پرورش کی جائے۔ اسی طرح ان مشکل اور پیچیدہ کتابوں کے رکھنے کی غرض یہ بھی تھی کہ دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ کو دشواری نہ ہو۔

اور غور کیا جائے تو تعلیم کی غرض یہی دو باتیں ہوسکتی ہیں۔ یعنی آدمی خود سوچنے لگے اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کو سمجھنے لگے، میں جیسا کہ پہلے بیان کر آیا ہوں کہ ابتدائی صدیوں میں ہمارے نصاب میں مذکورہ بالا دو مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے اگرچہ منطق کا بھی عنصر شریک تھا، لیکن زیادہ تر اس زمانہ میں علم کی حیثیت سے جس علم سے یہ کام لیا جاتا تھا وہ خود مسلمانوں کا ایجاد کیا ہوا علم اصول فقہ تھا، اور کتابوں کے لحاظ سے خود اصول فقہ کی مشہور کتاب بزدوی تھی، نیز فقہ کی کتاب ہدایہ، اور تفسیر کی کشاف درس میں ان ہی دونوں اغراض کے لیے رکھی گئی تھیں۔ بزدوی کی یہ کتاب "اصول فخر الاسلام" کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے مصنف پانچویں صدی کے مشہور اصولی عالم فخر الاسلام علامہ علی ابوالحسن البزدوی ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، اصول فقہ کا ایک ایسا متن قصداً اُنھوں نے تیار کیا تھا جس کی عبارتوں کا سمجھنا گویا لوہے کے چنے چبانا ہے، لیکن اگر اس لوہے کے چبانے کی قدرت کسی میں پیدا ہوگئی تو پھر اس کے لیے واقعی جو چبانے کی چیزیں ہیں وہ کچھ بھی باقی نہیں رہتیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے لیے تو فخر الاسلام نے یہ کتاب لکھی، لیکن واقعی اصول فقہ کے مسائل کے سمجھنے اور ان پر حاوی ہونے کے لیے شاید ان ہی کے مشورہ سے نہایت سلیس صاف و واضح عبارت میں ان کے حقیقی بھائی جن کا نام محمد تھا، اس فن اور اس کے علاوہ دوسرے فنون میں ایسی کتابیں لکھیں کہ ایک طرف فخر الاسلام کو لوگوں نے ابوالعسر (مشکل عبارتوں کا باپ) اور ان کے بھائی کا نام ابوالیسر (یعنی آسانی و سہولت کا باپ) رکھ دیا، مفتاح السعادۃ میں طاش کبری زادہ نے لکھا ہے،

وللامام فخر الاسلام البزدوی اخ مشھور بابی الیسر لیسر تصنیفاتہ کما ان فخر الاسلام مشھور بابی العسر لعسر تصنیفاتہ۔ ص ۵۵ ج ۲	فخر الاسلام بزدوی کے ایک بھائی مشہور ہیں جن کا نام ابوالیسر تھا۔ یہ نام ان کی کتابوں کی آسانی و سہولت کے مدنظر رکھا گیا تھا جس طرح فخر الاسلام ابوالعسر کے نام سے موسوم ہیں کہ ان کے تصنیفات عسیر اور دشوار ہیں۔

بزدوی کے متن کی کیا کیفیت ہی حضرت مولانا عبد العلی بحر العلوم رحمۃ اللہ علیہ شرحِ مسلم الثبوت کے دیباچہ میں فخر الاسلام اور ان کی اسی کتاب کا تذکرہ فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

وتلك العبارات كانها صخور كنزة فيها	فخر الاسلام کی عبارتوں کی مثال ایسی ہی جیسے
الجواهر واوراق مسنونة فيها الزواهر	چٹانوں میں کسی نے جواہر جڑ دیے ہوں یا ایسے پتے ہیں
تحيرت اصحاب الاذهان اشما قبه في	جن میں پھول چھپے ہوئے ہیں ذہن وذکاوت والے
اخذ معانيها وقنع الغائصون في بحارها	ان عبارتوں سے معانی حاصل کرنے میں متحیر ہیں اور ان
بالاصداف عن لآليها واما استحي من الحق	عبارتوں کے دریاؤں میں غوطے لگانے والے بجائے موتی
واقول قول الصدق ان جل كلامه العظيم	کے صرف سیپوں پر قناعت کرتے ہیں میں حق کے اظہار میں
لا يقدر على حله الا من نال فضله	شرماتا نہیں اور سچی بات کہتا ہوں کہ ان کی باتیں جو عظیم اور
تعالى الجسم واتى الله وله قلب	بڑی ہیں ان کو وہی حل کر سکتا ہی جس نے خدا کے فضل عظیم سے
سليم۔ ص۵ مطبوعہ مصر	حصہ پایا ہو، اور خدا کے پاس سے قلب سلیم لیکر دنیا میں آیا ہو

یہی حال اس زمانہ کے درجہ فضل کی دوسری کتابیں ہدایہ اور کشاف کا ہی۔ ہدایہ کے متعلق کہہ چکا ہوں کہ سات ساڑھے سات سو کا زمانہ گزر چکا ہی، لیکن اس شعر کو شاعرانہ اغراق اگر قرار دیا جائے، جیسا کہ مشہور ہی

ان الهداية كالقرآن قد نسخت	ما صنفوا قبلها في الشرع من كتب
ہدایہ گویا اس باب میں قرآن سے مشابہ ہی	جس نے گزشتہ شرائع کی کتابوں کو منسوخ کر دیا

لیکن اسی قطعہ کا دوسرا شعر

فاحفظ قراتها والزم تلاوتها	يسلم مقالك من زيغ ومن كذب
پس اس کتاب کو پڑھتے رہو اور اسکی خواندگی کو لازم کرلو	تم اگر ایسا کروگے تو تمھاری گفتگو کی اور غلطیوں سے پاک ہو جائیگی

کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کتاب کی یہ خوبی نہیں ہی کہ اس میں فقہ کے تمام مسائل آگئے ہیں اور ان مختصر جلدوں میں فقہ جیسے بحر ذخار علم کا سمانا مشکل کیا ناممکن ہی، لیکن دماغ کی جتنی

ورزش اس کی عجیب وغریب سہل ممتنع عبارتوں سے ہو جاتی ہے، میں نہیں جانتا کہ اس مقصد کے لیے ہدایہ سے بہتر کتاب مسلمانوں کے پاس موجود ہے، اسی لیے شاعر کا بیان مبالغہ نہیں ہے کہ ہدایہ کے پڑھنے والے کجراہی اور غلط روی کے شکار نہیں ہو سکتے، خود صحیح سوچنے اور دوسرے کے کلام کے صحیح مطلب کے سمجھنے کا جتنا اچھا سلیقہ یہ کتاب پیدا کر سکتی ہے، عام کتابوں میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے وہی قدیم ہندی نصاب فضل کی تیسری معرکۃ الآرا تمرینی کتاب کشاف سو اس کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ مصنف کتاب جار اللہ زمخشری مسلمانوں اور علمار کی جماعت میں صرف اعتزالی عقائد ہی نہیں بلکہ ان عقائد میں شدت اور غلو کی وجہ سے سخت بدنام ہیں۔ لوگوں کی سوءظنی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ گویا شکر میں لپیٹ کر کونین کھلانے کی مہارت سمجھا جاتا ہے کہ اس شخص کو خاص طور پر حاصل ہے، اپنی کتاب میں چھپا چھپا کر اپنے عقائد خاص کی سمت جذب کرتے چلے گئے ہیں۔ زین الدین بن المنیر الاسکندانی العلامہ نے اس راز کو فاش بھی کیا ہے۔ بیرون ہند ہی میں نہیں، بلکہ ابتدار سے ہندوستان میں بھی ان کی بدنامی اچھے خاصے پیمانہ پر پھیلی ہوئی تھی، شاید کسی موقعہ پر حضرت سلطان المشائخ کے حوالہ سے اس خواب کا ذکر گزر چکا ہے جس میں شیخ الاسلام زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے کو دکھایا گیا کہ جار اللہ صاحب مفصل کو فرشتے پا بزنجیر جہنم کی طرف گھسیٹے لئے جا رہے ہیں۔ کول (علیگڈھ) کے مولانا صدر الدین کا بیان بھی بحوالہ سلطان المشائخ غالباً اسی موقعہ پر گزرا ہے جو مولانا نجم الدین سنامی سے انھوں نے اسی کشاف کے متعلق نقل کیا تھا۔

لیکن ان بدنامیوں اور برسر بازار رسوائیوں کے باوجود اس مقصد کے لیے یعنی ایک ایک فقرہ کے مختلف پہلوؤں پر ادبی نقطہ نظر سے ذہن کو منتقل کرانے کی مشق اگر کوئی بہم پہونچانا چاہے، تو کشاف سے بہتر اس مشق کے لیے یہ واقعہ ہے کہ اسلامی ادبیات کے ذخیرہ میں مشکل کوئی دوسری کتاب مل سکتی تھی، خصوصاً اس وقت تک جب تک کہ قاضی بیضاوی نے رازی اور کشاف کا خلاصہ[1]

[1] پچھلے زمانہ میں قاضی بیضاوی کی یہ کتاب تفسیر بیضاوی کے نام سے مشہور ہوئی، ورنہ عموماً کتابوں میں (باقی بر صفحہ ۳۰۹)

تیار نہ کیا تھا، صاحب مفتاح السعادۃ نے بھی کشاف کے متعلق لکھا ہے

لم یصنف مثلہ قبلہ۔ ص ۴۳۲ ج ۱ اس جیسی کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی

مگر جوں جوں ہمارے نصاب میں معقولات کی کتابوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا، ان تمرینی کتابوں کی ضرورت کم ہوتی چلی گئی۔ بزدوی تو بالکلیہ خارج ہو گئی، کشاف کی جگہ کچھ دن بیضاوی کی گرم بازاری رہی شاہجہاں و عالمگیرؒ کے عہد تک تو یہ حال رہا کہ قرآن کے ساتھ بعض لوگ پوری بیضاوی کو بھی زبانی یاد کر لیتے تھے، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جن کا بیضاوی پر مشہور حاشیہ ہے قسطنطنیہ میں بھی طبع ہو گیا ہے، ان کے ایک شاگرد مولانا محمد معظم ساکن بنہ تھے، تذکرہ علماء ہند کے مصنف نے لکھا ہے کہ

"قرآن مجید مع تفسیر بیضاوی حفظ گرفتہ[1]" ص ۲۱۳

مگر جب عقلی اور ذہنی کتابوں کا بوجھ جیسا کہ گزر چکا، پچھلے زمانہ میں بہت زیادہ بڑھ گیا، تو بیضاوی کے عام مدارس میں صرف ڈھائی پارے رہ گئے حتیٰ کہ معقولی درس کا مشہور خانوادہ جو علمی حلقوں میں خیرآبادی خاندان کے نام سے مشہور ہے، اس میں تو بیضاوی کے صرف سوا پارے ہی کو کافی سمجھا گیا، اور لے دے کر خالص دینیات کی وہی تین کتابیں (جلالین قرآن کے لیے، مشکوۃ

(بقیہ صفحہ ۳۰۸) قاضی بیضاوی کے تصنیفات کی فہرست میں ہم اس کتاب کا نام مختصر الکشاف ہی پاتے ہیں۔ دلاسنوی کی طبقات سے طاش کبری زادہ نے تفسیر بیضاوی کا بھی نام نقل کیا ہے، دیکھو مفتاح ص ۴۳۶ ج ۱ لیکن صحیح یہ ہے کہ کشاف کے سوا بیضاوی نے رازی کی تفسیر سے بھی چیزیں چنی ہیں اسی لئے میں نے ان کی کتاب کو رازی و کشاف کا خلاصہ قرار دیا ہے پچھلے زمانہ میں کشاف کو چھوڑ کر لوگوں نے بیضاوی ہی کو نصاب میں شریک کر لیا۔

[1] مولانا محمد معظم نے ایک تفسیر بھی لکھی تھی، لیکن تذکرہ علماء ہند ہی میں ہے کہ

"از تصانیف او تفسیر قرآن بود کہ در استیلائے سکھاں سوختہ شد"

مولانا کی عمر کافی ہوئی تھی، طالب علمی کا زمانہ تو عالمگیری عہد میں گزرا، بہادر شاہ کے زمانہ میں بنہ کی قضا کا عہدہ بھی ان کو ملا تھا۔ اسی زمانہ میں سکھوں نے سر اٹھایا بنہ جو پنجاب کا کوئی قصبہ ہے۔ مسلمانوں کے گھروں کو جلایا گیا۔ اسی میں ان کی تفسیر بھی سوختہ ہو گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۱۲۔

حدیث کے لیے ہدایہ و شرح وقایہ فقہ کے لیے) ہمارے نصاب میں باقی رہ گئیں، اور یہی میں اب بھی کہتا ہوں کہ درس نظامیہ کی معقولاتی کتابیں جن کا مقصد وہی دماغی تمرین اور ذہنی تشحیذ تھا، یہ ورزشی نصب العین اس زمانہ میں بآسانی ان علوم و فنون سے حاصل ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے، جو عصری جامعات میں پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، ایسی صورت میں بآسانی خالص دینیات کی ان تین کتابوں کو نصاب کا لازمی جز بنا کر ہم تعلیمی نظام کی ثنویت کو توڑ سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مغربی طرز کی یونیورسٹیوں میں بعض ایسے فنون کی بھی تعلیم ہوتی ہے جن کے متعلق بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے طلبہ کی دماغی تربیت میں زیادہ مدد نہیں مل سکتی، مثلاً تاریخ ہی کا مضمون ہے کہ اس کی نوعیت قریب قریب افسانے کی ہے۔ لیکن ہمیں انصاف سے ہٹنا نہ چاہیے۔ تاریخ کسی زمانہ میں افسانہ کی حیثیت رکھتی ہو تو رکھتی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب سے یورپ نے اس کو درسی فن بنا دیا ہے اس وقت سے اب اس کی حالت دوسری ہو گئی ہے۔ اصل حقیقت کا پتہ چلے یا نہ چلے، لیکن تاریخ کے اساتذہ حقیقت کی سراغ رسانی میں، جن دقیقہ سنجیوں، موشگافیوں سے اس زمانہ میں کام لے رہے ہیں، اور طلبہ کو تحقیقات کے اس خاص طریقہ کا عادی بناتے ہیں۔ غلط بیانی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ اس کا تمرینی اثر طلبہ کے دل و دماغ پر نہیں پڑتا، یقیناً کالجوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے، وہ اب صرف افسانہ یا گزرے ہوئے واقعات کا فقط دہرانا نہیں ہے، بلکہ باضابطہ اب وہ ایک عقلی فن ہے، اور جب تاریخ جیسے سادہ سبجکٹ کو مدرسہ میں پہنچا کر قال اقول کی بھول بھلیوں میں ڈال دیا گیا ہے تو یقیناً اب اس کے مباحث سے بھی وہی کام لیا جا سکتا ہے، جو کسی زمانہ میں میر زاہد رسالہ اور حمد اللہ قاضی مبارک شرح مواقف کے امور عامہ سے لیا جاتا تھا، اور جب تاریخ کا یہ حال ہے تو پھر جو فنون (آرٹس) واقعی عقلی فنون ہیں مثلاً منطق، فلسفہ، معاشیات، عمرانیات و سیاسیات وغیرہ یا حکمیات (سائنسز) سے دماغی صلاحیتوں کے نشو و نما میں جتنی امداد مل سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

بے وقوفوں کا ایک گروہ ہمارے اسلامی نصاب پر بھی معترض تھا کہ سارے عقلی

علوم و فنون جو اس میں پڑھائے جاتے تھے، ان کا کوئی حاصل نہیں تھا، مطلب یہ تھا کہ کسی فیصلہ کن آخری بات کا پتہ ان علوم میں نہیں چلتا، معمولی معمولی باتیں مثلاً یہی کہ علم یا جاننے کی عام صفت ہر شخص میں پائی جاتی ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، آدمی جانتا تو ضرور ہے، لیکن یہ جاننا کیا چیز ہے اور اس صفت کا حصول ہم میں کیسے ہوتا ہے۔ مباحث کا ایک طومار سوال و جواب کا ایک طوفان ہے، جو کتابوں میں موج مار رہا ہے، لیکن پھر بھی اس وقت تک یہ طے نہ ہو سکا کہ علم ہے کیا چیز؟ یہی حال وجود کا ہے، وحدت و کثرت کا ہے، بلکہ ہر اس مسئلہ کا ہے، جو معقولات کے نام سے پڑھائے جاتے ہیں۔ بجنسہ یہی اعتراض ان علوم و فنون پر کیا جا رہا ہے جو عصری جامعات کے نصاب میں داخل ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس معیار پر قدیم ہوں یا جدید ہماری اکثر و بیشتر عقلی پیداواروں کا یہی حال ہے، عقل نہ پچھلے زمانہ میں کسی مسئلہ کے متعلق آخری فیصلہ تک پہنچ سکتی ہے، اور نہ اس زمانہ میں اس بیچاری کو اس راہ میں کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا ہے، بلکہ جیسے جیسے یہ مباحث بڑھتے جاتے ہیں، اسی نسبت سے شکوک و شبہات کے میدان بھی وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور تو اور یہ بیچاری تاریخ جب سے درسی مباحث کے چکروں میں پھنسی ہے، حال یہ ہو رہا ہے کہ بدیہی مسلمات بھی اب نظری بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے مسائل کہ شکسپیر نامی شاعر واقع میں کوئی شاعر تھا بھی یا نہیں۔ حضرت اورنگ زیب جیسے عادل بادشاہ واقع میں عادل تھے یا نہیں، اکبر کا الحاد کوئی واقعہ تھا یا صرف افسانہ ہے، محمد تغلق کے جنون کے قصے واقعی جنون کے قصے ہیں یا بیان کرنے والوں ہی کا یہ جنون ہے، جو باتیں آنکھوں کے سامنے گزر چکی ہیں، جب درسی سوال و جواب انہیں شک کی تاریکیوں میں دھکیل دیتے ہیں، تو جن امور کا تجربہ نہیں ہوا ہے، صرف تخمینوں سے جن کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے، مثلاً معاشیات، نفسیات اور الٰہیات و مابعد الطبیعیات کے مسائل کا جو حال ہے، ان علوم میں کسی آخری فیصلہ کن بات کا چلانا، کیا آسان ہے؟ حتیٰ کہ سائنس اور کیمیا جیسے علوم جن کا تعلق صرف محسوسات اور تجربیات سے ہے لیکن جن مسلمات

کو تسلیم کر کے ان علوم میں دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں۔ آنے والے آتے ہیں، اور شک و ارتیاب کی کلہاڑیوں سے ایسی ضرب ان کی جڑوں پر لگاتے ہیں کہ اچانک سارا کیا کرایا برباد ہو جاتا ہے، اور نئے سرے سے ابجد شروع ہوتی ہے، علم ہیئت کا تعلق تو ریاضیات جیسے یقینی علم سے تھا لیکن مدت تک اس کے مسائل کی تشریح زمین کی مرکزیت کو مان کر لوگ کر رہے تھے۔ آنے والے آئے اور زمین سے اٹھا کر اسے آفتاب کے کرہ پر لے گئے۔ بطلیموسی نظام کے مقابلہ میں شمسی نظام قائم کیا گیا۔ اب کچھ دنوں سے جھلکنے والے جھانک رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سے بھی مرکزیت کا یہ فخر چھننے والا ہے۔ سائنس کے تجربات سب مادہ پر مبنی تھے، لیکن خود یہ مادہ سرے سے کوئی حقیقت ہے بھی یا نہیں۔ اب کیا انیسویں صدی کے آغاز ہی سے مدرسوں میں اس پر تنقید شروع ہو گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عقلی علوم و فنون کی ان ہی درماندگیوں کو دیکھ کر سطحیوں کا ایک گروہ ہمیشہ غل مچاتا رہا ہے کہ جب کسی چیز کا تم لوگوں کو اپنی ان ناکام کوششوں میں پتہ نہیں چلتا تمہارے فیصلے کسی زمانہ میں بھی آخری فیصلوں کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ تو پھر ان لایعنی ہرزہ درائیوں اور یاوہ خوانیوں کا نفع ہی کیا ہے، بہ ظاہر ان کی بات دل کو لگتی بھی ہے۔

لیکن اوروں سے تو مجھے بحث نہیں، اسلام کے خالص علوم یعنی قرآن و حدیث و فقہ کی تعلیم میں اگر اس کی ضرورت ہے کہ پڑھنے والوں کی نظر میں گہرائی پیدا کی جائے، دماغی صلاحیتوں کو کافی طور پر ابھار کر ان علوم کے مطالعہ کا موقعہ طلبہ کے لیے فراہم کیا جائے۔ تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ دماغوں کو ان ورزشی علوم کے اکھاڑوں میں کچھ دن خوب اچھی طرح کھیلنے کا موقعہ دیا جائے۔ یہ سوال کہ ان علوم کی تعلیم سے طلبہ کو کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی، یہ اسی قسم کا سوال ہے کہ اکھاڑے کی کشتیوں اور مشقی کرتبوں کی قیمت خود اکھاڑے میں تلاش کی جائے۔ چاند ماری میں ہزارہا ہزار روپیہ کی گولہ بارود کے ذخیرہ میں آگ لگا دی جاتی ہے یہ پوچھنے والا کہ ان گولیوں اور دوسری چیزوں کو کیوں برباد کیا گیا، اگر دیوانہ ہے تو پھر

جن ورزشوں سے دماغی صلاحیتوں کو اُبھارا جاتا ہے، تحقیق و تدقیق، تنقید و تنقیر کی قوتوں کی بیداری کا کام جن ذہنی مشقوں سے لیا جاتا ہے اُن کے متعلق بھی یہ پوچھنا کہ ورزش کرنے والوں کو ان ورزش گاہوں میں کیا ملتا ہے. خود ہی سوچیے کہ یہ کتنا بے معنی مطالبہ ہے۔

چاندماری میں بلاشبہ بندوقوں سے جو گولیاں چھوڑی جاتی ہیں وہ کسی مصنوعی دیوار یا فرضی نشانہ میں گم ہو جاتی ہیں، لیکن ان ہی گم شدہ گولیوں سے نشانہ بازی کی جو صحیح مشق ہمارے اندر واپس آتی ہے کیا اس کی قیمت کا کوئی اندازہ کرسکتا ہے۔

بجنسہ یہی حال ان علوم کا ہے جن کے مسائل خواہ بذات خود جتنے بھی مشکوک، بے معنی، مبہم اور لایعنی ہوں، لیکن ان مسائل کی بحث و تحقیق سے غور و فکر کا جو ملکہ پڑھنے والوں میں پیدا ہوتا ہے، یقین کیجیے کہ صرف معلومات دینے والی کتاب کے پڑھانے سے یہ بات کبھی نہیں حاصل ہوسکتی خواہ وہ معلومات جتنے بھی قیمتی اور یقینی ہوں، بلکہ سچ یہ ہے کہ ان معلومات کی صحیح قیمت اور ان کی یقین آفرینیوں کا صحیح اندازہ ان لوگوں کو شاید ہو بھی نہیں سکتا جنھوں نے کسی ذہنی تربیت سے پہلے ان کا مطالعہ شروع کر دیا ہو، الا ماشاء اللہ و قلیل ما ھم۔

اور یہی وہ راز ہے کہ اسلامی علوم کی تعلیم کا جب سے باضابطہ نظام ہمارے بزرگوں نے قائم کیا، جن فنون کو وہ فنون دانش مندی کہتے تھے، علوم مقصودہ سے پہلے اور ان کے ساتھ ساتھ ان فنون کی تعلیم کسی نہ کسی شکل میں دیتے چلے آئے، جیسا کہ میں نے عرض کیا پہلے یہ کام اصول فقہ اور بعض خاص کتابوں مثلاً کشاف وہدایہ سے لیا جاتا تھا پھر یہی ضرورت معقولات کی کتابوں سے پوری ہوتی رہی، اور آج ہم جن حالات میں گرفتار ہیں، تعلیمی نظام کی ثنویت نے گوناگوں فتنوں کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں، ہر دن نت نئے فتنے ان ہی دو مستقل تعلیمی اداروں کی بدولت پیدا ہو ہو کر سر اُٹھا رہے ہیں، ایسی صورت میں بآسانی عقلیات کے پُرانے ورزشی علوم کی جگہ ہم جدید علوم و فنون کو مختلف گروپوں میں تقسیم کرکے اپنے نصاب میں اس طریقہ سے شریک کرسکتے ہیں کہ دینیات کی حد تک وہی

درس نظامیہ کی تین کتابوں کو نصاب کا لازمی جزء رکھا جائے، اور ذہنی و دماغی تربیت کے لئے جدید علوم و فنون کے کسی گروپ کو کافی سمجھا جائے۔ البتہ ایک نقص جامعاتی تعلیم کے نصاب میں باقی رہ جاتا ہے یعنی جو علوم و فنون اس نصاب میں پڑھائے جاتے ہیں، ان سے تو دماغی تربیت پر اچھا اثر پڑتا ہے، اور خود فکری کی استعداد طلبہ میں اپنی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق کافی طور پر بڑھ جاتی ہے، بلکہ شاید پرانے عقلیات سے کچھ زیادہ ہی، اس لیے گو نتیجہ کے لحاظ سے کسی واقعی حقیقت کی یافت میں تو دونوں ہی عموماً ناکام ہیں، لیکن اتنا فرق ضرور ہے کہ قدیم عقلیات کا تعلق زیادہ تر ذہنی امور سے تھا، اور جدید عقلیات میں چوں کہ بحث کرنے کے لیے زیادہ تر واقعی حقائق کو موضوع بنایا گیا ہے اس لیے عقلی پرواز ان علوم میں اتنی بے لگام نہیں ہوتی۔ جتنی کہ پرانے عقلیات میں ہو جاتی تھی، اور یہی مطلق العنانی قدیم عقلیات کے پڑھنے والوں میں گو نہ ایک قسم کی کج بحثی کی کیفیت پیدا کر دیتی تھی، ان کے تدقیقات حدود سے کچھ اتنا زیادہ تجاوز کر جاتے ہیں کہ بعض دفعہ اس پر ہنسی آجاتی ہے بخلاف جدید عقلیات کے کہ ان کا موضوعِ بحث خود ان کو روکے تھامے چلتا ہے، اس لیے وہ زیادہ بھٹکنے نہیں پاتے

بہر حال جیسا کہ میں نے عرض کیا خود فکری کی صلاحیتوں کی نشو و نما کی حد تک جدید علوم و فنون کی تعلیم کافی بلکہ قدیم علوم سے بہتر ہے لیکن تعلیم کا مقصد کہہ چکا ہوں کہ صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی میں خود سوچنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے اور اس کو ہونا چاہیے کہ ہم سے پہلے سوچنے والے جو کچھ سوچ چکے ہیں، ان کی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت بھی ہم میں پیدا ہو، اسی ضرورت کے لیے ہمارے قدیم نصاب میں ایسی کتابیں قصداً رکھی جاتی تھیں جن کی عبارت نسبتاً زیادہ سلیس و واضح نہ ہوتی تھی، مقصد یہی تھا کہ اس مشق کے بعد گزرے ہوئے مصنفوں کی کتاب خواہ کتنی ہی اُلجھی ہوئی کیوں نہ ہو، ان کی پیچیدگیوں پر قابو حاصل کر کے ان کے افکار تک بآسانی رسائی حاصل ہو سکے۔

مگر خدا جانے اس زمانے میں درسی کتابوں کی اس خصوصیت کو زیادہ اہمیت کیوں

نہیں دی گئی۔ نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ آج سے پہلے لوگوں نے جو کچھ سوچا ہے، اگر کسی سلیس شستہ عبارت والی کتاب سے ان تک رسائی حاصل ہو سکتی ہو، تو لوگ اس کو تو پڑھ لیتے ہیں، لیکن کسی مصنف کے بیان میں کچھ تھوڑی بہت اُلجھن اور ژولیدگی و تعقید ہوئی اس زمانہ کا تعلیم یافتہ آدمی اس کے مطالعہ سے گھبراتا ہے، وہ علم میں بھی ادب کی چاشنی ڈھونڈنے کا عادی ہو گیا ہے، حالانکہ تعلیم کے دوسرے مقصد یعنی دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت اس میں اس طریقہ کار سے بڑی رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے، تاہم یہ تو کتابوں کا مسئلہ ہے اور اس زمانہ میں جب ہر سال ہر چھ مہینے پر نصاب کی کتابیں بدل جاتی ہیں، تو بآسانی اس نقص کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

میں درجۂ فضل کی ان خصوصیتوں پر بحث کر رہا تھا جنھیں ان غیر معمولی صلاحیتوں کے پیدا کرنے میں دخل تھا، جو ہندوستان کے پچھلے زمانہ کے علماء میں پائی جاتی تھیں حقیقی اسباب و موثرات تو اس کے نصابی علوم اور نصابی کتابوں کی یہی خصوصیتیں تھیں، جن کا میں نے ذکر کیا لیکن اسی کے ساتھ بعض اور ضمنی باتیں بھی تھیں، اب کچھ تھوڑی بہت گفتگو ان پر بھی کرنا چاہتا ہوں

(۳) چوں کہ گزشتہ بالا دو خصوصیتوں کے حساب سے یہ تیسری بات ہے اس لیے نمبر میں بھی میں نے اس کو تیسرے درجہ پر رکھا ہے، مطلب یہ ہے کہ شاید بیچ بیچ میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ پرانے زمانہ میں اس مفہوم کو ادا کرتے ہوئے کہ میں نے فلاں شخص سے پڑھا، عموماً ایسے موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ "فلاں کتاب را تر د فلاں بحث کردم تحقیق کردم" میں نے شاید سلطان المشائخ کے متعلق یہ الفاظ کہیں سیر الاولیاء سے نقل کیے ہیں، کہ اُنھوں نے شمس الملک صدر جہاں (عہد بلبن) سے) ادب عربی بحث کرد و چہل مقالہ حریری یاد گرفت ملتا اور آپ کو بکثرت اس زمانہ میں یہ محاورہ ملے گا، اس بحث کی نوعیت کیا ہوتی تھی۔ سیر الاولیاء میں مشہور استاذ جن کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے یعنی شمس الدین بن یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک موقعہ پر ان کا ایک

بیان نقل کیا ہے، جس میں اپنے پڑھنے کے طریقہ کو حضرت نے ظاہر فرماتے ہوئے ان علوم کا نام لے کر جو ان کے زمانہ میں مروج تھے بیان کیا ہے،

انچہ لوازم آں سبقہا بودے از شبہات و قیود مستحضر کردیم ص۲۲۶ — ان اسباق کے متعلق جن شبہات اور قیود کو سامنے لانے کی ضرورت ہوتی تھی ہم ان کو مستحضر کرتے تھے۔

فرماتے ہیں کہ ان ہی "شبہات و قیود" کو "تحقیق می کردیم" اگرچہ یہ چند الفاظ کا مختصر فقرہ ہے لیکن درس کا جو "طریقہ بحث" تھا اس کی گویا پوری تفصیل اس میں مندرج ہو گئی ہے۔

جامعاتی طریقہ تعلیم جس کا نام میں نے "گونگا درس" رکھا ہے، اس نظام کے تحت تعلیم پانے والوں کو تو شاید اب سمجھایا بھی نہیں جاسکتا کہ یہ "شبہات و قیود" کیا چیزیں ہیں، اور ان کے استحضار کی کیا صورت ہوتی تھی، پھر ان کی تحقیق استاد سے کیسے کی جاتی تھی؟ لیکن ہمارے درس قدیم کی یہ ناگزیر صورت تھی، طالب العلم اس طریقہ کار پر عمل پیرا ہوئے بغیر طالب العلم بن ہی نہیں سکتا تھا، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ،

اس زمانہ میں عام طور سے اگرچہ یہ مشہور کر دیا گیا ہے، کہ "امتحان" کا طریقہ اس ملک میں بالکل جدید چیز ہے، ورنہ ہمارا تعلیمی نظام امتحان سے ناآشنا تھا۔ اس لحاظ سے کہ آج کل "امتحان" کا جو مطلب ہے اور جن خاص ضوابط و اصول کے تحت لیا جاتا ہے، کوئی شبہ نہیں اس کا رواج اس ملک میں نہیں تھا[1]، لیکن پڑھانے کے بعد یہ جانچنے کے لیے کہ پڑھنے والوں کو کچھ آیا بھی یا نہیں، کیا ہماری پرانی تعلیم میں اس کا پتہ چلانے کا کوئی صحیح ذریعہ نہ تھا۔

بچوں کا مکتبی امتحان یا آموختہ | ابھی تو مکتب خانوں کے اس قدیم طریقہ کے دیکھنے والے دنیا میں

[1] مخدومی نواب ضیا یار جنگ بہادر سے میں نے روایت سنی کہ سالار جنگ کے عہد میں جب دار العلوم کا مدرسہ قائم ہوا۔ اور بر طریقہ نو امتحان کی بنیاد اس میں قائم کی گئی۔ تو پہلے امتحان میں سوالات کے مطبوعہ پرچوں کی تقسیم کرنے کے لئے امتحان گاہ میں خود سر سالار جنگ تشریف لائے۔ سونے کے طشت میں زرد اطلس کے خوان پوش کے نیچے سوالات کے پرچے تھے اور سالار جنگ اپنے ہاتھ سے طلبہ کو تقسیم کر رہے تھے، چونکہ ایک نئی چیز تھی اس ذریعہ سے عوام کو مانوس بنانا مقصود تھا ۱۲

موجود ہوں گے، کہ چھوٹے بچوں کو مکتب خانوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، روزانہ اُستاد اُن سے پڑھی چیزوں کا آموختہ بالالتزام سُنتا تھا، اور جوں جوں بچے تعلیم میں آگے بڑھتے جاتے تھے بجائے روزانہ کے ہفتہ میں دوبار اور آخر میں ہفتہ میں ایک دن صرف آموختہ پڑھنے اور سُننے کے لیے مقرر تھا، عمومًا یہ دن یوم تعطیل (جمعہ) سے پہلے کا ہوتا تھا، لوگوں نے غور نہیں کیا، کہ آخر یہ کیا چیز تھی؟ اس میں شک نہیں کہ ایک طرف اس "آموختہ" کے اصول کا ایک فائدہ اگر یہ تھا کہ جو کچھ بچوں نے پڑھا ہے وہ دن بہ دن پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے۔ اسی کے ساتھ اُستادوں کو اس کا بھی تو اندازہ ہوتا تھا کہ کس بچہ نے کس حد تک اپنے اسباق اور بتائی ہوئی باتوں کو یاد رکھا ہے۔ خود ہی بتائیے کہ امتحان کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے۔ یہ آموختہ کے ذریعہ سے "جانچ" کا طریقہ تو اس وقت تک اختیار کیا جاتا تھا جب تک بچوں میں سمجھنے کی پوری قوت شگفتہ نہیں ہوتی تھی زیادہ تر کام ان کے حافظہ سے لیا جاتا تھا۔

لیکن مکتبی تعلیم سے آگے بڑھ کر جب اعلیٰ تعلیم (درجۂ فضل) میں طلبہ قدم رکھتے تھے، اس وقت بجائے حافظہ کے مقصود اس چیز کا دیکھنا ہوتا تھا کہ طالب العلم میں خود سوچنے کی اور دوسرے مفکرین کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی صلاحیت کس حد تک بڑھ رہی ہے، ظاہر ہے کہ اس کے لیے "آموختہ" والا قاعدہ قطعًا غیر مفید تھا، یہی ضرورت تھی جس کے لیے ہمارے یہاں ایک دوسرا قاعدہ مقرر تھا، جس کا رواج افسوس ہے کہ نئے نظام تعلیم کے گونگے درس سے تقریبًا اُٹھ چکا ہے، امتحان کے نام سے طلبہ کے جانچنے کا جو طریقہ اب جاری کیا گیا ہے، مکتب خانے والے "آموختہ" سے زیادہ وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ امتحان کے مسرفانہ مصارف جن پر ہر سال ہزارہا ہزار روپے حکومت صرف کرتی ہے، اور تعلیم پانے والوں کے لیے دماغی کوفت کے سوا ہر سال امتحان کا مسئلہ ایک مستقل مالی سوال بنا ہوا ہے، اور ملکوں کا تو میں نہیں کہتا، لیکن ہندستان جیسے غریب مُلک میں یہ واقعہ ہے کہ امتحان کی اس فیس کے لیے طلبہ ہر سال باضابطہ دست سوال دراز کرنے پر عمومًا مجبور ہوتے ہیں یا پھر باپ کو مقروض ہونا پڑتا

ہے، یا ماں بہن کے زیوروں کو گرو رکھ کر امتحان کی فیسیں یونیورسٹیوں میں جمع کی جاتی ہیں، اور اس کے بعد بھی اس امتحان سے اگر کسی چیز کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، تو صرف اس کا کہ جواب دینے والوں کے دماغ میں اپنی پڑھی چیزوں کا کتنا حصہ محفوظ ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ "آموختہ" کتنا یاد ہے، اس سے زیادہ امتحان کے اس طریقہ سے طلبہ کے متعلق نہ کچھ معلوم ہوتا ہے، نہ معلوم ہو سکتا ہے، دس سوالوں میں سے پانچ سوالوں کے متعلق اگر (۳۳ فیصدی) چیزیں بھی امتحان دینے والے کے دماغ میں کسی طرح محفوظ رہ گئی ہیں، پاس کرنے کے لیے اتنی بات کافی ہے، لیکن خود سوچنے یا دوسروں کی باتوں کے سمجھنے کی قابلیت میں اس نے کس حد تک ترقی کی ہے، عام طور پر امتحان کے اس مسرفانہ غریبوں کو تباہ کرنے والے طریقوں سے اس کا پتہ چلنا سخت دشوار ہے، اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اختیاری سوالات میں سے ۳۳ فیصدی نمبروں سے پاس ہونے کے بھروسہ پر طلبہ کی اکثریت اپنے اسباق سے درس کے کمروں سے باہر کوئی تعلق اس وقت تک پیدا کرنا نہیں چاہتی، جب تک کہ امتحان کا موسم سر پر نہ آجائے، اُستاد کے لکچروں میں وہ ایک ایسا دماغ لے کر آتے ہیں جس میں ہونے والے سبق کے متعلق قطعاً کسی قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی، جب تک اُستاد کچھ کہتا رہتا ہے، بُرے بھلے طریقہ سے اس کو یادداشت کی کاپیوں پر نوٹ کرتے جاتے ہیں۔ سبق ختم ہوا، اور ان کا تعلق بھی اس سبق سے اس وقت تک کے لیے ختم ہو گیا، جب تک کہ امتحان کی مصیبت ان کو آکر نہ جھنجھوڑے۔ تیاری امتحان کے نام سے ان کو جو فرصت دی جاتی ہے، فرصت کے ان ہی چند دنوں میں کسی نہ کسی طرح کچے پکے لقمہ کی طرح حافظہ میں اپنے متعلقہ مضامین کے متعلق معلومات بھرتے چلے جاتے ہیں اور ٹھیک اسی طریقہ سے جیسے کسی کو قے ہوتی ہو، جوابی کاپیوں پر جلدی جلدی یہ نگلے ہوئے لقمے اُگل دیے جاتے ہیں، جہاں تک میرا تجربہ ہے اُگلنے کے اس عمل کے ساتھ ہی پھر وہ ان مضامین سے اس طرح کورے اور خالی ہو جاتے ہیں جس طرح پہلے تھے، دماغ میں اس کے بعد اگر کوئی چیز رہ جاتی ہے تو وہ صرف اس نتیجہ کا انتظار جس کی توقع اندھیرے میں چلائے

ہوئے اس تیز کے بعد ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔

آج ملک میں جس امتحان پر مجموعی حیثیت سے اگر کروڑوں نہیں تو لاکھوں روپے جو خرچ ہو رہے ہیں لے دے کر اس کی کل حقیقت عام حالات میں صرف اسی قدر ہے۔ اب سنیے تعلیم کے جس نظام کو آج بدنام کیا جا رہا ہے، کہ امتحان کا کوئی طریقہ اس میں اختیار نہیں کیا جاتا تھا، اس میں کیا ہوتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ دماغوں کو بوکھلا دینے والے لفظ امتحان کے نام سے تو کوئی چیز ہمارے یہاں نہیں مروج تھی، اسی قدر بوکھلا دینے والا لفظ کہ کمزور اعصاب والے کتنے بچے ایسے ہیں جو ہر سال اسی لفظ کے دباؤ سے مضطرب ہو کر اپنی صحت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں ہے کہ مدقوقوں اور مسلولوں کے گروہ میں ایک بڑی تعداد ان بدقسمت طالب العلموں کی ہوتی ہے جن کے لیے امتحان اور اس میں ناکامی کی دہشت بسا اوقات کسی عویص مرض کا مقدمہ بن جاتی ہے۔

مگر درس کے جس طریقہ کی تعبیر بحث و تحقیق کے لفظ سے کی جاتی تھی، آپ نے سمجھا اس کا کیا مطلب تھا، شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں بجائے خود بیان کرنے کے ایک تاریخی واقعہ کو پیش کر دیتا ہوں، یہی واقعہ آپ کو بتائے گا کہ جس عہد کے متعلق باور کرایا جا رہا ہے کہ کچھ نہ ہوتا تھا اس وقت کیا کچھ نہ ہوتا تھا۔ یہ عہد شاہجہاں کے مشہور عالم ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے درس کا واقعہ ہے۔ مولانا آزاد نے ماثر الکرام میں اسے نقل فرمایا ہے۔

قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بلگرام کے رہنے والے ایک سید میر اسمٰعیل مختلف حلقہائے درس سے استفادہ کرنے کے بعد آخر میں وہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے حلقہ میں پہنچے، ملا صاحب سے میر صاحب نے عرض کیا کہ مجھے کوئی وقت دیا جائے تاکہ جو کتابیں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں، پڑھ سکوں، ملا عبد الحکیم نے اپنے وقت نامہ کو دیکھ کر کہا کہ

"از ہجوم طلبہ گنجائش وقت علیحدہ نیست مگر آں کہ ساعت سبق فلاں شخص اختیار افتد"

مطلب یہ تھا کہ علیحدہ سبق پڑھانا تو تنگی وقت کی وجہ سے دشوار ہے۔ البتہ فلاں طالب العلم کی جماعت میں شریک ہو کر تم سن سکتے ہو۔ میر صاحب آ چکے تھے اس پر راضی ہو گئے، سننے

کی بات اب یہیں سے شروع ہوتی ہے، اس زمانہ کے لیے تو شاید یہ کوئی نئی بات نہ ہو لیکن اس وقت یہ بات تھی کہ چند ہفتے گزر گئے اور میر اسمٰعیل نے کسی قسم کی پوچھ گچھ، اعتراض وسوال ملا صاحب سے اس عرصہ میں نہیں کیا، وہ عصر حاضر کا گونگا درس تو تھا نہیں کہ سالہا سال گزر جاتے ہیں، اور شاگردوں کی زبان سے اُستاد کے کان میں کوئی لفظ نہیں پہنچتا۔ اُستاد ڈائس پر، تلامذہ کرسیوں پر کھڑے ہو کر اُستاد نے تقریر کی بیٹھے بیٹھے چپ چاپ شاگردوں نے ان کی تقریر سُن لی، یا کم از کم سُننے والوں کی صورت بنالی، درس ختم ہوگیا۔ حاضری دے کر طلبہ درس کے کمرے سے باہر نکل گئے۔

یہ تو اس وقت ہو رہا ہے لیکن جس عہد کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ شاگردوں کی قابلیت کے جانچنے کا کوئی طریقہ اساتذہ کے پاس نہ تھا، یہ اسی زمانہ کی بات ہے، کہ کسی قدیم نہیں، بلکہ ایک نو وارد طالب علم کا یہ رویہ کہ اس نے کوئی بات نہیں پوچھی اُستاد کے لیے ناقابل برداشت بن گیا، حالانکہ احتمال تھا کہ ابھی نئے ہیں، آہستہ آہستہ مانوس ہوں گے، ابھی پوچھنے میں ہوسکتا ہے کہ حجاب مانع ہو، لیکن ملا عبدالحکیم سے نہ رہا گیا۔ میر صاحب کو مخاطب کر کے دریافت کیا،

"مدتہا گزشت گاہے حرفے از شما سر بر نہ زد"

اب میر صاحب کی یہ طالب العلمانہ ادا تھی، ملا صاحب نے مستقل وقت دینے سے انکار کرتے ہوئے یہ جو کہا تھا کہ "فلاں کا سبق سُن سکتے ہو" اس "سن سکنے" کے لفظ کو اُنھوں نے گویا پکڑ لیا تھا، جو ملا صاحب کے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں بولے، کہ مجھے تو صرف سننے (سماعت) کی اجازت ہے اس لیے بولنا اپنے لیے مناسب نہ خیال کیا۔ ملا صاحب کی تازہ توجہ کو دیکھ کر میر صاحب نے پھر عرض کیا کہ اگر فقیر کے لیے کوئی مستقل وقت دیا جاتا تو میری بڑی آرزو پوری ہوتی۔ بلگرام سے ایک شخص صرف علم کی خاطر سیالکوٹ آیا تھا۔ ملا صاحب کو ان کی غریب الوطنی اور طلب صادق کے جذبہ پر رحم آگیا۔ اور بولے کہ

"دراں ایام بین العصر والمغرب فرصتے ست برائے سبق شما مقرر کردیم"

اس زمانہ کے اساتذہ جو سنتے ہیں کہ ہفتہ میں دس گھنٹے اور پندرہ گھنٹے پڑھانا بھی اپنے لیے بار سمجھتے ہیں، کیا وہ سن رہے ہیں، وقت عصر اور مغرب کے درمیان دیا گیا۔ طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب کا یہ وقت اتفاق سے اس زمانہ میں خالی ہوگیا تھا۔ ورنہ عموماً اس میں بھی کچھ نہ کچھ مشغلہ پڑھنے پڑھانے کا جاری رہتا تھا۔[1] خیر یہی وقت سید میر صاحب کے لیے مقرر ہو گیا۔ سبق شروع ہوا، اور وہی بحث "کے طریقہ سے شروع ہوا۔ مولانا غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ

"سید روز دیگر درس متقل شروع کرد و بحث وگفتگو را بجائے رسانید کہ وقت نماز شام رسانید"

مطلب یہ ہے کہ سید صاحب نے ملا صاحب سے اپنے کسی شبہ کا اظہار کیا۔ ملا صاحب نے جواب دیا سید نے اس پر پھر کوئی سوال کیا۔ سوال وجواب کا یہ سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا، نماز کے لیے درس ملتوی ہوا۔

"مولوی (عبدالحکیم) نماز ادا کردہ باز متوجہ درس شد"

بحث پھر چھڑی، اور جاری رہی تاآنکہ

"تا نماز عشا گفتگو بحال بود"

عصر سے مغرب اور مغرب سے عشا کی نوبت آئی، ملا صاحب نے اپنے عزیز اور ہونہار شاگرد سے اب معذرت کی اور فرمایا کہ

"فردا اول روز باید آمد درس ہائے دیگر راموقوف کردہ اول تحقیق ایں مبحث می پردازیم"

---

[1] اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، کچھ زیادہ دن نہیں گزرے ہیں، خود اپنے استاد حضرت مولانا برکات احمد بہاری ولمناٹونکی نزیلا کو مدتوں دیکھتا رہا اور میرے رفقاء درس جو ہندوستان کے طول وعرض میں موجود ہوں گے وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ حضرت علاوہ مقررہ اوقات (یعنی آٹھ سے بارہ تک اور دو سے چار تک) کے سوا عصر کے بعد بھی عموماً ایسی کتابیں مثلاً مثنوی مولانا روم مکتوبات مجدد الف ثانی یا طب کی کسی کتاب کا درس دیا کرتے تھے، اور یہ تو اس زمانہ کی بات ہے جب حضرت کی عمر زیادہ ہوگئی تھی، ورنہ اپنے ایام شباب میں سُنا ہے کہ رات کے دس دس گیارہ بجے تک سبق پڑھانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا آج بھی حضرت مولانا حسین احمد مدنی کبھی کبھی رات کے گیارہ بارہ تک بخاری پڑھاتے ہیں ۱۲

یعنی کل پر بات رہی، اور یہ میر صاحب کے ساتھ خاص رعایت کی گئی کہ کل دوسروں کے اسباق کو ملتوی کر کے تمھاری اس بحث کو طے کروں گا۔ حسب وعدہ دوسرے دن پھر بحث کا بازار گرم ہوا

«سید حاضر شد و طلبار دیگر نیز حاضر شدند و از چاشت تا استوار (دوپہر) بحث قائم بود»

مگر بات ختم نہ ہوئی، مولانا غلام علی آزاد کا بیان ہے کہ

«سہ روز متواتر بریں منوال گزشت و سلسلہ بحث انقطاع نہ پذیرفت» ص۲۳۴

تھک کر ملا صاحب نے سید سے کہا کہ آخر اس مسئلہ میں تمھاری بھی کوئی خاص رائے ہے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ سید صاحب ایک مضمون اُٹھا کر لائے، جو ان ہی کا لکھا ہوا تھا، لیکن انھوں نے اپنے نام کا اظہار نہیں کیا، اُستاد کے سامنے وہ تحریر پیش کی کہ اس میں تو اس مقام کی تحقیق یوں کی گئی ہے، ملا صاحب نے دیکھا اور پسند کیا۔ البتہ اتنا نقص بتایا کہ "عبارت از اطناب (طوالت بیجا) خالی نیست" ماثر ص۲۳۴۔ ظاہر ہے کہ بحث و تحقیق کا یہ ایک خصوصی واقعہ ہے۔ اسی لیے تاریخوں میں اس کا تذکرہ بھی کیا گیا۔ میری غرض اس کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ قدیم طریقہ تعلیم میں "بحث و تحقیق" سے جو چیز مراد تھی، اس کا ایک مثالی نمونہ لوگوں کے سامنے آجائے۔

مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس امتحان کی لوگوں کو تلاش ہے، اس زمانہ میں اس کا طریقہ یہی تھا، طلبہ کو کتابوں سے الگ کر کے امتحان گاہوں میں سادہ کاپی دے کر اس لیے بٹھایا تو نہیں جاتا تھا کہ خام و نیم پخت غیر منہضم معلومات کا جو ذخیرہ کسی نہ کسی طرح دماغوں میں بھر لیا گیا ہے، اسی کو اگلوا لیا جائے۔ بلکہ طلبہ کا فرض تھا کہ سبق پڑھنے سے پہلے ہر سبق کے متعلق وہی طریقہ کار اختیار کریں، جس کی طرف حضرت شمس الدین یحییٰ بن یحییٰ کے بیان میں اشارہ کیا گیا ہے، یعنی

«شبہات تحقیق می کردیم، و آنچہ لوازم ان سبقہا بودے از شبہات و قیود مستحضر می کردیم» ص۲۳۶

اسی کا نام "مطالعہ" تھا۔ مسئلہ کے بیان کرنے میں مصنفِ کتاب نے جو طریقۂ بیان اختیار کیا ہے، اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا، اس پر جو اعتراضات ہوسکتے ہوں ان کو پیدا کرنا اسی کا

نام "شبہات" تھا۔ بیان میں کس حد تک جامعیت اور مانعیت ہے اس کو جانچنا۔ اس کے لیے جن قیود اور شرائط کے الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے ان کو پرکھنا، کتاب کی عبارت کے سوا خود مسئلہ میں جو پیچیدگیاں ہوں، ان کو خود سلجھانا، جو نہ سلجھ سکتے ہوں تو ان کو اُستاد پر پیش کرنا الغرض خود مسئلہ پر اور جس عبارت کے ذریعہ سے مسئلہ ادا کیا گیا ہے، اس پر اپنی اپنی حد تک حادی ہونے کی کوشش کرنا، اس کوشش میں جو نقص رہ جائے استاذ سے روزانہ اس کے متعلق دریافت کرنا، یہ کام تھا، جو پُرانے طریقۂ درس کا ایک لازمی جُز تھا۔ کتاب مطلع الانوار جو اُستاذ السلطان حضرت مولانا انوار اللہ خاں حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مختصر سی سوانح عمری ہے۔ اسی میں مولانا کے حقیقی بھانجے مفتی رکن الدین مرحوم نے یہ لکھتے ہوئے کہ ہنگام طالب العلمی میں مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کے مطالعہ کا کیا طریقہ تھا۔ بجنسہ ان کے الفاظ میں یہ نقل کیا ہے:

"ہم کوشش کرتے تھے کہ مضمون کسی صورت سے مطالعہ میں حل ہو جائے۔ طریقہ یہ تھا کہ پہلے عبارت و ترجمہ کی جانب توجہ کی جاتی تھی جو نئے الفاظ آتے تھے ان کو لغت کی مدد سے حل کیا جاتا، پھر مطلب کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی۔ اگر ایک دفعہ مضمون حل نہ ہوتا تو دوبارہ سہ بارہ سعی کی جاتی۔ اگر کوئی ایسا ہی مشکل مضمون ہوتا جو سعی پیہم کے باوجود سمجھ میں نہ آتا تو دل میں ایک خلش رہتی۔ جب اُستاذ مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ) کے سامنے سبق شروع ہوتا تو بجز شبہات کے جو مطالعہ میں حل نہ ہو سکے ہوں اور کوئی بات دریافت طلب نہ رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ روزانہ کئی صفحہ درس ہوتا تھا۔" صلہ مطلع الانوار

اسی کے بعد لکھا ہے کہ

"استاذ کی قدر و منزلت معلوم ہوتی تھی کہ جو مضمون گھنٹوں میں حل نہ ہو سکا تھا استاذ نے ذرا سی دیر میں حل کر دیا۔"

یہ بھی مولانا انوار اللہ خاں ہی کا بیان ہے اور اس سے میرے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ درس کے اس طریقہ میں استاذ کا بھی امتحان ہوتا رہتا تھا۔ آخر میں مولانا کے الفاظ اس فقرہ پر ختم ہوئے ہیں کہ

"جب اُستاذ سے مطلب معلوم ہوتا تھا تو فرط مسرت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں سے بیش قیمت خزانہ مل گیا۔"

اور یہ تھا وہ علمی ذوق جو طلبہ میں درس کا یہ عجیب و غریب ماحول قدرتاً پیدا کر دیتا تھا۔ اس طریقہ سے پڑھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ خاکسار مولانا انوار اللہ خاں مرحوم کے اس حلقہ میں بطور استفادہ کے جب کچھ دن کے لیے شریک ہوا جس میں مولانا مرحوم فتوحات مکیہ جیسی سخت و کرخت کتاب کا درس دیا کرتے تھے تو حیرت ہوتی تھی کہ کتنی آسانی کے ساتھ اس عجیب و غریب پیچیدہ کتاب کے مشکلات کو باتوں باتوں میں وہ پانی بنا کر سمجھا دیتے تھے رحمۃ اللہ علیہ و تغمدہ بغفرانہ۔

بہرحال طلبہ مطالعہ کرتے ہیں یا نہیں، اساتذہ اس کی پوری نگرانی کرتے تھے کہ وہ اس کام کو کرتے ہیں یا نہیں۔ اور اس کا پتہ "طریقہ بحث" سے چل جاتا تھا، یعنی سوال و جواب جو اُستادوں سے اور شاگردوں سے ہوتا تھا، اسی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ کون طالب العلم تیار ہو کر آتے ہیں، اور کون بغیر کسی تیاری کے بیٹھ گئے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ میرا اسماعیل نے جب کوئی بات نہیں پوچھی تو فوراً ملا صاحب نے ٹوکا، اور یہ کوئی خاص بات نہ تھی طالب العلم اگر چند دن بھی چپ رہا فوراً اساتذہ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے، اور مجبور کرتے کہ رد و قدح سوال و جواب میں وہ حصہ لے۔ اس کا ایک فائدہ وہی تھا کہ خود فکری کے ساتھ ساتھ دوسرے مصنفین و مفکرین کی باتوں کے سمجھنے کا سلیقہ دن بہ دن بہتر ہوتا جاتا تھا۔ اسی لیے طلبہ پر سخت تاکید کی جاتی تھی کہ مطالعہ کے وقت وہ کسی تشریحی نوٹ یا حواشی وغیرہ سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ کسی طالب العلم کے متعلق اگر استادوں کو محسوس ہو جاتا کہ یہ مطالعہ کے وقت حاشیہ وغیرہ دیکھنے کا عادی ہے، تو اس سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا جاتا۔ بقیۃ السلف حضرت قاری عبد الرحمٰن پانی پتی جو مولانا حالی کے اُستاد تھے ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اپنا قصہ خود یہ بیان فرماتے تھے

"بچپن کا زمانہ تھا عربی کی ابتدائی کتابیں والدین سے پڑھتے تھے۔ ایک دن مطالعہ اچھی طرح نہیں کیا تھا اس پر والد صاحب نے سبق نہیں پڑھایا مجھے اتنا غم ہوا کہ رات کو کھانا نہیں کھایا" تذکرہ رحمانیہ ص

بچوں کی اتنی نگرانی مطالعہ کے معاملہ میں کی جاتی تھی اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بڑوں کے ساتھ اساتذہ کا کیا رنگ ہو سکتا تھا۔

اور دوسرا اہم فائدہ "بحث وتحقیق" کے اس طریقۂ درس کا یہ تھا کہ اُستادوں کو اپنے شاگردوں کی قابلیت کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ سوالات میں گہرائی، شکوک وشبہات میں قوت جتنی زیادہ بڑھتی جاتی تھی، سمجھا جاتا تھا کہ اسی حد تک وہ علم میں ترقی کر رہا ہے۔ میرے نزدیک طلبہ کا اس ذریعہ سے امتحان بھی ہوتا رہتا تھا۔ مگر یہ ایسا امتحان تھا جس میں طلبہ کو علم کے امتحان گاہوں میں اس نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا جس نظر سے چوروں اور ڈاکوؤں کو پولیس والے دیکھتے ہیں۔ اس امتحان کے لیے قطعاً کارڈ کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ نہ اس میں سوالات کے فاش ہوجانے کا خطرہ ارباب جا کو لگا رہتا تھا، نہ اس امتحان میں سالانہ لاکھوں روپیہ کے وہ مصارف عائد ہوتے تھے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، نہ امتحان کی دہشت میں طلبہ اور ان کے والدین مبتلا ہوتے تھے گویا نتیجہ کا دن نہیں بلکہ طالب العلم اور اس کے ماں باپ بلکہ شاید سارے خاندان کے لیے وہ قیامت کا دن ہوتا ہے، نہ طالب العلموں سے کتابیں چھینی جاتی تھیں، نہ ان کو اس پر مجبور کیا جاتا تھا کہ جیسے بندر جلدی جلدی کرکے اپنے کلوں میں چنے کے دانے دباتے ہیں اسی طرح ٹھیک وہ امتحانی معلومات کو جلدی جلدی دماغوں میں کسی طرح ٹھونس لیں اور امتحان گاہوں میں جاکر اُگل دیں اور اس کے بعد بھی بسا اوقات ہوتا یہی ہے کہ اکثر نااہل اور جاہل لڑکے جنھوں نے معلومات کے نگلنے کے اس خاص طریقہ میں مہارت حاصل کی ہے، وہ تو کامیاب اور عموماً اچھے نمبروں سے کامیاب ہوجاتے ہیں، لیکن اچھے اچھے ذہین طباع سوچنے والے جو امتحانی کرتبوں اور اس کے خاص تدبیروں سے ناواقف ہیں باوجود قابل و لائق ہونے کے بسا اوقات بُری طرح ناکامیوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ بہتوں کی صحت دل ودماغ پر اپنی اس غیر متوقع ناکامی کا نہایت خراب اثر پڑتا ہے۔ خصوصاً جب ان کی آنکھوں کے سامنے

ابلہاں را ہمہ شربت زگلاب وقند ست　　قوت دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں　　طوق زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

کا نظارہ پیش ہوتا ہے۔ اور یہ ساری خرابی امتحان کے اس "آموختائی" طریقہ کا نتیجہ ہے، جو زیادہ سے زیادہ ان بچوں کی حد تک مفید ہو سکتا ہے، جن کا دماغ بجائے سوچنے اور سمجھنے کے صرف یاد کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے، کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ امتحان لیا جاتا ہے، قابلیت کا ذہنی لچک اور فکری گہرائیوں کا، اور پوچھا جاتا ہے کہ تم کو اپنی آموختہ اور سیکھی ہوئی باتوں میں سے کتنی باتیں یاد ہیں۔ بہر حال اب تو جو کچھ ہو، حکومت جب تک اپنے رویّہ کو نہ بدلے گی مجبوراً ملک میں "فضیلت" اور بلندی کا معیار امتحان کا یہی آموختائی طریقہ رہے گا۔ اس کی وجہ سے خونِ جگر کو قوت بنانے پر اگر کوئی مجبور ہو اور "پالان" کے نیچے تازی گھوڑوں کو مجروح ہونا پڑے تو ہونے دیجیے۔

جس زمانہ کا ذکر میں کر رہا ہوں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُستاد کے سامنے "بحث و تحقیق" کی صلاحیت کو ظاہر کرنے کے لئے طلبہ کو مطالعہ میں کافی محنت کرنی پڑتی تھی۔ کہ اپنی جماعت میں امتیاز کا سارا دارومدار ہی اسی پر تھا۔ شیخ محدث اپنی طالب علمی کا حال درج کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ

"دراثنائے مطالعہ کہ وقت از نیم شب در می گزشت والدم قدس سرہ مرا فریاد میزدہ باباچہ می کنی"

یعنی آپ کے والد کو رحم آجاتا اور کہتے کہ کب تک جاگو گے۔ شیخ فرماتے کہ والد کی آواز سُن کر فی الحال "دراز می کشیدم" یعنی لیٹ جاتے لیکن کیا ہوگا اس کی فکر سونے کب دیتی تھی، فرماتے ہیں کہ

"تا دروغ نہ شود می گفتم کہ خفتہ ام چہ می فرمایند"

مگر پھر

"باز بر می نشستم و مشغول می شدم"

شیخ ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"چند بار دستار و موی سر آتش چراغ در گرفتہ باشد و مرا تا رسیدن حرارت آں بجرم دماغ خبر نہ"

بلاشبہ یہ انہماک شیخ کا غیر معمولی تھا، اگرچہ اس زمانہ میں یہ مثالیں چنداں غیر معمولی نہ تھیں۔

لیکن محنت کا یہ بار صرف امتحان ہی کے چند دنوں میں اکٹھا ہو کر نہیں پڑتا تھا بلکہ سال کی ساری راتوں پر یہ بار بٹا ہوا رہتا تھا۔ کیوں کہ امتحان کا یہ سلسلہ تو روزانہ جاری تھا۔ اس لئے ظاہر ہی کہ طلبہ کے دل و دماغ پر اچانک امتحان کا بوجھ چند محدود دنوں میں جو پڑ جاتا ہی اور اس کی وجہ سے صحت و تندرستی کو جو نقصان پہنچتا ہی یا پہنچ سکتا ہی یقیناً اس سے وہ محفوظ رہتے تھے۔ اب آپ "بحث و تحقیق" کے اس طریقہ کو چاہیں امتحان تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن اس زمانہ میں طلبہ کی قابلیتوں میں باہمی تفاوت کا اندازہ اسی سے ہوتا تھا۔ مولانا غلام علی آزاد نے اپنے استاد میر طفیل محمد کے تذکرہ میں لکھا ہے

"در طلبہ علم بہ جودت طبع، و قوت مطالعہ و مباحثہ اشتہار داشتند"

"مباحثہ" سے وہی "بحث و تحقیق" کی طرف اشارہ ہی جس میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے مطالعہ ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ حضرت سلطان المشائخ کے تذکرہ میں عموماً یہ لکھا جاتا ہی کہ طالب العلمی کے زمانہ میں

"بخطاب بحاث و محفل شکن مخاطب گشت" ص۱۰۱ تذکرۃ الاولیاء

یعنی اُستادوں سے رد و قدح سوال و جواب کرنے، اور شبہات و خدشات پیش کرنے میں آپ کو خاص امتیاز حاصل تھا، اسی لیے آپ کا نام ہی طالب العلموں میں مولوی نظام الدین "بحاث" ہو گیا تھا، "محفل شکن" سے شاید مراد یہ ہی کہ درس کی محفل میں اساتذہ کو اپنی طرف متوجہ فرما لیتے تھے۔ لکھا ہی، کہ ان ہی وجوہ سے

"میان متعلمان (طلبہ) تیز طبع و دانش مندان کامل مشہور گشت"

گویا اسی "بحاثی اور محفل شکنی" کے ان امتیازات نے آپ کو نہ صرف طلبا و رفقاء درس ہی میں بلکہ "دانش مندان کامل" یعنی اس زمانہ کے اساتذہ اور اہل علم میں مشہور کر دیا تھا کہ امتحان اور طلبہ کی اندرونی لیاقت و قابلیت کے جانچنے کا اس وقت یہی طریقہ تھا۔ اور اب بھی اگر

سوچا جائے تو اس سے بہتر طریقہ اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کے امتحان کا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

اور سچ پوچھیے تو اُستادوں کی قابلیت کے جانچنے کا بھی یہ ایک کارگر طریقہ ہوسکتا ہی، طلبہ چُپ چاپ ردّ و قدح کے بغیر سنتے رہیں اور اُستاد کے جو جی میں آئے ان کے سامنے تقریرًا کچھ بول کر یا تحریرًا کچھ لکھوا کر چلا جائے یہ خود ہی سوچیے کہ اس سے کیا اندازہ ہوسکتا ہی کہ پڑھانے والے کا مطالعہ کتنا وسیع ہی، اس فن کے اندر جسے وہ پڑھا رہا ہی کتنی حذاقت استاذ کو حاصل ہی، یہی وجہ ہی کہ عہد حاضر کے گونگے درس میں بسا اوقات اساتذہ کوشش و پیروی کرکے تعلیم گاہوں میں گھس جاتے ہیں۔ چونکہ عمر بھر ایسے شاگردوں سے معاملہ پڑتا ہی جن کا فرض صرف سُننا ہی، اس لیے ان کی اصل حقیقت چھپی رہتی ہی بخلاف اس زمانہ کے جس میں "مطالعہ اور مباحثہ" طالب علم کا ضروری جُز تھا۔ خام اور کچے اُستادوں کا زیادہ دن تک تعلیمی عہدہ پر باقی رہنا مشکل ہوتا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد جتنے پانی میں وہ ہوتے اس کا لوگوں کو پتہ چل جاتا تھا۔ ملّا عبدالقادر بداؤنی نے شیخ عزیز اللہ کے ذکر میں لکھا ہی کہ طلبہ

"بارہا امتحان پیش آمدہ اسولۂ لا ممنع لہامی آوردند شیخ مشار الیہ در وقت افادہ حل ساختہ" ص ۳۲ بداؤنی	شیخ کا امتحان لینے کے لیے ایسے سوالات کرتے جن کا (اپنے نزدیک سمجھتے کہ) جواب نہیں ہوسکتا لیکن شیخ موصوف درس کے وقت ہی ان سوالوں کو اسی وقت حل فرما دیتے۔

آپ خیال کرسکتے ہیں جس طریقہ درس میں سوال و جواب کا حق طلبہ کو اتنی فیاضی سے دیا جاسکتا ہو کہ تین تین دن تک ایک ہی مسئلہ میں اُستاد و شاگرد اُلجھے ہوئے ہیں، جیسا کہ ملّا عبدالحکیم اور میر اسمٰعیل کے قصہ میں آپ سُن چکے۔ اگرچہ ایسا ہوتا تو بہت کم تھا لیکن اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہی کہ "مباحثہ" کے اس طریقہ کو ہمارے نظام تعلیم میں کتنی اہمیت حاصل تھی۔ اس زمانہ میں خام کاروں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ مجازی ڈگریوں یا اسناد کو لے کر تنخواہ کی لالچ میں تعلیم جیسے اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لیں بالفرض تہور سے کام لے کر کوئی ہمت کر ہی لیتا تھا تو طلبہ اس کو زیادہ دن تک ٹھیرنے نہیں دیتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ طلبہ اور اساتذہ دونوں ہی کے امتحان کا بھی اور علمی جد وجہد کو تیز سے تیز تر کرنے کا بھی یہ واحد طریقہ تھا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں اسلام کے مغربی ممالک (یعنی اندلس، مراکش وغیرہ) میں تعلیمی انحطاط کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے

فتجد طالب العلم منھم بعد ذھاب	تم (اس ملک کے) طالب علم کو پاؤ گے کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ
الکثیر من اعمارھم فی ملازمۃ المجالس	مجلسوں (یعنی تعلیمی مجلسوں) میں صرف سکوت اور خاموشی کے
العلمیۃ سکوتا لاینطقون ولا یفاوضون	ساتھ گزر گیا۔ اس طور پر کہ وہ ان مجلسوں میں کچھ نہیں بولتے۔
وعنایتھم بالحفظ اکثر من الحاجۃ	مفاوضہ یعنی سوال وجواب نہیں کرتے۔ ان کی توجہ زیادہ تر
فلا یحصلون علی طائل من ملکۃ	غیر ضروری طور پر یاد کرنے اور حفظ میں صرف ہوتی ہے اس سے
التصرف فی العلم والتعلیم۔	کوئی نفع ان کو حاصل نہیں ہوتا یعنی علم اور تعلیم میں خود سمجھنے
(مقدمہ صفحہ ۳۶۶)	سمجھنے اور تصرف کی قابلیت اور ملکہ ان میں پیدا نہیں ہوتا۔

اسی بنیاد پر اس نے اپنی رائے یہ قلم بند کی ہے کہ

وایسر طرق ھذہ الملکۃ فتق	اس ملکہ اور قابلیت کے حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ
اللسان بالمحاورۃ والمناظرۃ فی	زبان سوال وجواب اور مناظرہ کے لیے علمی مسائل میں کھولی
المسائل العلمیۃ فھو الذی یقرب	جائے اور یہی چیز اس ملکہ اور قابلیت سے آدمی کو قریب کرتی
شانھا ویحصل مرامھا۔ صفحہ ۳۶۶	ہے اور جو مقصد ہے وہ حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ وہی زمانہ ہے جب عام مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان کی تعلیم میں "مفاوضہ اور محاورہ" یعنی وہی "مباحثہ" کا طریقہ درسوں میں جاری تھا۔ ابن خلدون کی شہادت ہے کہ مشرقی ممالک کے اہل علم کی اعلیٰ قابلیتوں اور علمی ملکات کو دیکھ کر

فیظن کثیر من رحالۃ اھل المغرب	طلب علم کے لیے جو لوگ مغرب سے مشرقی ممالک کی طرف
الی المشرق فی طلب العلم ان عقولھم	جاتے ہیں ان میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مشرق کے باشندوں

على الجملة اكمل من عقول اهل المغرب وانهم اشد نباهة واعظم كيسا بفطرتهم الاولى وان نفوسهم الناطقة اكمل بفطرتها من نفوس اهل المغرب ويعتقدون التفاوت بيننا وبينهم في حقيقة الانسانية. ص۳۶۱

کے عقول مغرب والوں کی عقلوں سے زیادہ کامل ہیں اور یہ کہ وہ لوگ عظمت دانش میں مغرب والوں سے زیادہ بہتر ہیں سمجھتے ہیں کہ مشرق والوں کے نفوس ناطقہ ہی مغرب والوں سے زیادہ کامل ہیں اور ان دونوں میں نقص و کمال کا تفاوت اس پر مبنی ہے کہ دونوں کی حقیقت میں کمال و نقص کا اختلاف ہے۔

جیسا کہ چاہیئے تھا ابن خلدون نے اس خوش اعتقادی کی تو تغلیط کی ہے۔ اور وجہ وہی بتائی ہے کہ مشرق والوں کی تعلیم کا طریقہ بہتر ہے (طلبہ وہاں گونگے بنا کر نہیں رکھے جاتے) اسی لیے علمی ملکہ ان میں زیادہ راسخ اور استعداد ان کی زیادہ بالغ ہو جاتی ہے، اور مغرب والوں میں اس کی کمی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تعلیم کا یہ نکتہ مسلمانوں کے سامنے شروع سے تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عباس کے قرب کا تذکرہ کسی موقعہ پر کیا گیا تھا۔ منجملہ اور باتوں کے ابن عباس کو دوسرے صحابہ کی نوجوان اولاد پر حضرت عمر جو ترجیح دیتے تھے اس کی ایک وجہ آپ نے یہ بھی بیان فرمائی تھی، جیسا کہ بخاری کے حاشیہ میں مصنف عبد الرزاق سے یہ اضافہ نقل کیا گیا ہے:۔

ان له لسانا مسئولا و قلبا عقولا۔ ص۲۷

(ابن عباس میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے) کہ ان کے پاس ایک پوچھنے والی زبان اور سوچنے والا دل ہے۔

یقیناً اس رواج کا فقدان عصر حاضر کی جامعاتی تعلیم کا بڑا نقص ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی نقص کے احساس کا یہ نتیجہ ہے کہ کچھ دنوں سے ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ٹیوٹوریل کلاسوں کو مروج کیا گیا ہے، لیکن اس میں جو طریقہ عمل اختیار کیا گیا ہے میں نہیں سمجھتا کہ اس سے "مباحثہ اور مطالعہ" کے فوائد کی تلافی ہو سکتی ہے۔

اعادہ یا تکرار "مطالعہ" اور "مباحثہ" کے سوا تیسری خصوصیت ہمارے قدیم درس کی وہ چیز تھی، جس کی تعبیر پچھلے زمانہ میں "اعادہ" کے لفظ سے کرتے تھے، ادھر کچھ دنوں سے اب اس کا نام "تکرار" ہوگیا ہے۔ شیخ محدث دہلوی نے اپنے تعلیمی مشاغل کا ذکر فرماتے ہوئے جو یہ لکھا ہے

"احاطہ اوقات، وشمول ساعات بہ مطالعہ وتذکار وبحث وتکرار ہرچہ ازکتب خواندہ باشد" ص ۳۱۲ اخبار

اس میں "بحث وتکرار" سے ان کا اشارہ درس کی اسی خصوصیت کی طرف ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب الغزالی میں درس قدیم کے اس طریقہ عمل کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں نامور علماء کے ہاں معمول تھا کہ جب وہ درس دے چکتے تھے تو شاگردوں میں جو سب سے زیادہ لائق ہوتا تھا وہ باقی طالب علموں کو دوبارہ درس دیتا تھا، اور اُستاد کے بتائے ہوئے مضامین کو اچھی طرح ذہن نشین کراتا تھا یہ منصب جس کو حاصل ہوتا تھا اس کو معید کہتے تھے" صلا الغزالی

ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامہ میں بغداد کے ایک مدرسہ کا ذکر ان الفاظ میں کرنے کے بعد

المدرسة المستنصرية ونسبتها الى امير المومنين المستنصر بالله الى جعفر بن امير المومنين الظاهر بن امير المومنين الناصر وبها المذاهب الاربعة لكل مذهب ايوان فى المسجد وموضع التدريس وجلوس المدرس فى قبة خشب على كرسى عليه البسط ويقعد المدرس عليه بالسكينة والوقار لابسا ثياب السواد معتما	مدرسہ مستنصریہ کی امیر المومنین المستنصر باللہ ابو جعفر بن امیر المومنین الظاہر بن امیر المومنین کی طرف ہے، اس مدرسہ میں چاروں فقہی مکاتب کی تعلیم ہوتی تھی، ہر مذہب کے درس کے لیے ایک خاص ایوان مسجد میں ہے، جو درس کی جگہ مدرس کی جگہ ہے، جو لکڑی کے ایک قبہ میں ایک کرسی پر بیٹھتے ہیں، جس پر فرش بچھا رہتا ہے، اسی پر سکون و وقار سے بیٹھتا ہے، سیاہ کپڑے اور عمامہ باندھ کر مدرس جلوس فرما ہوتا ہے

اعادہ اور تکرار کے اس دستور کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے

وعلى يمينه ويساره معيدان يعيدان كل ما يملى عليه . رحلہ ابن بطوطہ ص۱۲۶ ج ۱	اور اس کے دائیں اور بائیں جانب دو معید بیٹھتے ہیں جو ان ٹکڑوں کو دہراتے ہیں جسے استاذ شاگردوں کو دیتا ہے۔

میر سید شریف جرجانی کے متعلق اسی اعادہ و تکرار کے سلسلہ میں ایک قصہ مشہور ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ اس زمانہ میں اعادہ اسباق کی کیا صورت تھی کہتے ہیں کہ میر صاحب پڑھنے کے لیے قطبی کے مصنف علامہ قطب الدین رازی کے پاس اس وقت پہنچے جب وہ پیر فرتوت ہو چکے تھے۔ علامہ نے بڑھاپے کا عذر کیا، اور اپنے ایک شاگرد مبارک شاہ کے پاس مصر بھیج دیا

انہ کان لہ عبد ربّاہ من صغرہ علمہ حتی کان مدرسا وفاضلا فی کل العلوم وکان یدعی بمبارك شاہ المنطقی[1]۔ مفتاح ص۲۴۲ ج ۱

یہ مبارک شاہ علامہ قطب الدین کے غلام تھے، بچپن سے انھوں نے مبارک شاہ کو پالا پوسا اور پڑھایا، تا ایں کہ مبارک شاہ مدرس ہوگئے، اور ہر علم میں فاضل، عام طور سے ان کو لوگ مبارک شاہ منطقی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

لیکن خدا جانے کیا صورت پیش آئی کہ مبارک شاہ نے میر صاحب کو اپنے حلقہ درس میں صرف بیٹھنے اور سُننے کی اجازت دی۔ پوچھنے اور قراۃ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایک دن مبارک شاہ رات کو یہ دیکھنے کے لیے کہ طلبہ کیا کر رہے ہیں، چُپ چاپ نکلے، میر صاحب جس حجرہ میں رہتے تھے وہاں سے آواز اعادہ کی آرہی تھی۔ بیان کیا جاتا ہی کہ میر صاحب کہہ رہے تھے، کتاب کے مصنف نے تو اس مسئلہ کی یہ تقریر کی، اور اُستاد نے اسی کو یوں بیان کیا۔ اور میں اس مسئلہ کی

---

[1] مسلمانوں کا اپنے غلاموں کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اس کی مثال یہ واقعہ بھی ہی۔ علامہ قطب الدین کے بیٹوں میں کوئی عالم مشہور نہیں ہوا لیکن غلام کو اپنے انھوں نے پڑھایا اور اس توجہ سے پڑھایا کہ اپنے وقت کے فاضلوں میں اسی غلام کا شمار ہوا حضرت سلطان جی کے حوالہ سے میں نے ہندوستان کا قصہ بھی نقل کیا ہی کہ لاہور کے ایک قاری صاحب نے اپنے ہندو (نسلاً) غلام شادی نامی کو قرآن کا ایسا قاری بنا دیا کہ وہ شادی مقری کہلاتے تھے۔ سلطان جی نے بھی بچپن میں ان سے پڑھا تھا۔ اور یہ تو معمولی واقعات ہیں۔ ابن عباس کے غلام عکرمہ ابن عمر کے غلام نافع حدیث کے اساطین میں ہیں۔ اور سچ تو یہ ہی کہ مسلمانوں نے موالی کو جب سلطنت وحکومت تک پہنچایا۔ فقہ و حدیث تفسیر کے آئمہ میں غلاموں کا ایک سلسلہ ہی۔ ایسی صورت میں ان کے غلاموں کو غلام کون کہہ سکتا ہی بلکہ مسلمانوں میں علماء کو "مولانا" کے لفظ سے خطاب کرنے کا جو عام دستور ہی اس کی ابتدا میرے خیال میں اس وقت ہوئی جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے ایک مسئلہ پوچھا۔ بجائے خود جواب دینے کے حضرت نے خواجہ حسن بصری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے "سلوا مولینا الحسن" (یعنی حسن بصری سے پوچھو) فرمایا۔ اور کون نہیں جانتا کہ حسن بصری کا تعلق بھی موالی سے تھا۔ دیکھو مناقب ابی حنیفہ للموفق ص۵۲۰

تقریر یوں کرتا ہوں، مبارک شاہ ٹھیر گئے، اور کان لگا کر غور سے سننے لگے، میر صاحب کی تقریر کا انداز اتنا دل چسپ تھا کہ لکھا ہے

لحقہ البھجۃ والسرور بحیث رقص فی الفناء المدرسۃ، مفتاح ص۲۴۷ ج ۱ — ایسی مسرت اور خوشی ان کو ہوئی کہ مدرسہ کے صحن میں ناچنے لگے۔

طالب العلمی کے زمانہ میں درس و تدریس کا مشغلہ

ہمارے نظام تعلیم کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت جو بہ ظاہر معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر سوچا جائے تو کتنے دور رس منافع کی وہ حامل تھی، مطلب یہ ہے کہ منجملہ اور دستوروں کے ایک دستور اس زمانہ میں یہ بھی تھا کہ عموماً بڑی جماعت کے طلبہ یعنی اوپر کی کتابیں پڑھنے والے فارغ ہونے سے پہلے، طالب العلمی ہی کے دنوں میں اس کی کوشش کرتے تھے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابیں نچلی جماعت کے طلبہ کو پڑھاتے رہیں، خصوصاً جو لوگ آگے چل کر مدرسی اور پڑھنے پڑھانے میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے رہتے، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھا ہے،

وکلما فرغت من تحصیل کتاب شرعت فی تدریسہ نفع المفتی والسائل ص۲۵ — جس کتاب کے پڑھنے سے میں فارغ ہوتا، اسی کو پڑھانا بھی شروع کر دیتا۔

کلما کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی صورت ایک دو کتابوں کے ساتھ پیش نہیں آئی تھی، بلکہ ہر کتاب کے ساتھ آپ کا یہی دستور تھا جس کا پہلا فائدہ تو یہی تھا جیسا کہ مولانا ہی فرماتے ہیں۔

فحصل لی الاستعداد التام فی جمیع العلوم بعون اللہ الحی القیوم — تمام علوم میں میری لیاقت پختہ ہوتی چلی گئی، اللہ حی و قیوم کی اعانت سے۔

اور یہ واقعہ بھی ہے، کہ علم کو جو یوں مسلسل تازہ بتازہ نو بنو حالت میں رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس کی قابلیت جتنی بھی بڑھتی چلی جائے کم ہے، خصوصاً تجربہ کی بات ہے کہ کسی چیز کے سمجھنے میں آدمی پڑھنے کے وقت اتنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا جتنی ذمہ داری پڑھانے کے وقت

خود بخود اس پر عائد ہو جاتی ہی۔ خود سمجھ لینا، اور سمجھ کر دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کرنا دونوں میں بڑا فرق ہی، مولانا نے لکھا ہی کہ اس طریقہ کار کا یہ نتیجہ تھا کہ

لم یبق تعسرٌ فی ای کتاب کان من ای فن کان حتی انی درست مالم اقرء حضرۃ الاستاذ کشرح الاشارات للطوسی والافق المبین وقانون الطب ورسائل العروض۔	مجھے کسی کتاب کے سمجھنے سمجھانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی، خواہ کونسی بھی کتاب ہو اور کسی فن کی ہو حتیٰ کہ اس مشق کی بنیاد پر ایسی کتابوں کو میں نے پڑھا دیا جنھیں اُستاذ کے سامنے میں نے نہیں پڑھی تھی، مثلاً طوسی کی شرح اشارات اور افق المبین طب میں قانون شیخ، عروض کا رسالہ

مولانا مرحوم نے بے پڑھے جن کتابوں کے پڑھانے کا ذکر کیا ہی، جو ان کتابوں کی خصوصیتوں سے ناواقف ہیں، وہ کیا اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں "الافق المبین" میر باقر کے ادبی اور ذہنی زور کا شہ کار ہی، پڑھانے والے کو آسمان کے قلابے زمین سے اور زمین کے قلابے آسمانوں سے ملانے پڑتے ہیں، یا طوسی کی شرح اشارات توازن دماغی کا جتنا اچھا نمونہ ہی، ابن سینا اور امام رازی کی بحثوں کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ چکانے میں یہ شخص جتنا کامیاب ہوا ہی، اسی لیے اس کتاب کے پڑھانے میں پڑھانے والوں کو بھی ضرورت پڑتی ہی کہ اپنے احساسات کو جادہ اعتدال سے ہٹنے نہ دیں، ورنہ بات ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہی، اسی طرح قانون گو طب کی کتاب ہی نسبتًا اسے زیادہ مشکل نہ ہونا چاہیے، لیکن قلم تو ابن سینا کا ہی، جن حقائق و نکات کی طرف مختصر لفظوں میں اشارہ کرتا ہی، ان کا انہی الفاظ سے اخذ کرنا طلبہ کو سمجھانا، یہ ساری باتیں آسان نہیں ہیں، لیکن یہ اس زمانہ کے طرز تعلیم کا ثمرہ تھا کہ معلومات کی گرداوری کے لحاظ سے خواہ آپ اس طریقہ پر جس قدر چاہیے اعتراض کیجیے، لیکن جس قوت کے ذریعہ سے معلومات فراہم کیے جاتے ہیں، اس قوت کی پرورش و پرداخت نشو و نما کے لیے درس و تدریس کا یہ طریقہ جتنا مفید تھا۔ مشکل ہی سے یہ فوائد کسی اور ذریعہ سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

غور تو کیجیے مطالعہ، مباحثہ، اعادہ اور فراغت سے پہلے مدارسہ یعنی پڑھنے کے

ساتھ ہی پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھاتے چلے جانے ان تمام ذرائع سے دماغوں کو جب مانجا جائے ان میں جلا پیدا کی جائے تو ایسے دماغوں کی صلاحیتوں میں جتنا بھی اضافہ ہو، غور و فکر کا مادہ جتنا بھی بڑھتا چلا جائے۔ احساسات میں نزاکت، شعور کی بیداری میں جتنا بھی اضافہ ہوتا چلا جائے وہ غیر متوقع نہیں ہو سکتا۔ میں نے جیسا کہ عرض کیا کہ جن لوگوں کا آئندہ بھی ارادہ ہوتا کہ ہم زندگی تعلیم و تدریس میں بسر کریں گے۔ وہ اس چوتھی بات کی خاص طور پر کوشش کرتے تھے، چند ٹکوں کے لیے ٹیوشن کے نام سے دربدر اس زمانہ میں سائکلوں پر عصری جامعات کے طلبا جو مارے مارے پھرتے ہیں، ان کے سامنے یہ دلی جذبہ نہ تھا۔ بلکہ نچلی جماعت کے طلبہ کی خوشامد کر کے کچھ اپنی طرف سے پڑھنے والوں کی امداد کر کے پڑھانے کے اس مغتنم موقعہ کو پیدا کرنا چاہتے تھے، چوں کہ خود شوق سے پڑھاتے تھے۔ اس لیے ان کا حال ٹیوشن والے پیشہ ور طلبہ کا نہ تھا کہ صرف تنخواہ واجب کرنے کے لیے وقت پر حاضری دے دی، کچھ ادھر اُدھر سے بچوں کو اُلٹ پلٹ کرتا دیا، وقت گزر گیا، سائکل لی، اور اس دروازہ سے اُٹھ کر دوسری ڈیوڑھی پر پہنچے، علم کی خاطر نہ سہی، پیسوں ہی کی خاطر، رضاً نہ سہی جبراً ہی سہی مگر یہ واقعہ ہی کہ جن طلبہ کو ان غیر ذمہ دارانہ ٹیوشنوں کا موقعہ طالب العلمی کی زندگی میں مل جاتا ہی۔ بایں ہمہ لاپروائی ان کی قابلیت اور علمی مشق ان طلبہ سے عموماً بہتر ہوتی ہی، جو اس قسم کی ٹیوشن پر مجبور نہیں ہوتے ہیں، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہی کہ جس زمانہ میں اوپر کی جماعت والے طلبہ خود اپنے شوق سے نچلی جماعتوں کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، اس طرز عمل سے ان کی لیاقتوں میں کتنا اضافہ ہوتا ہوگا۔

طالب العلمی ہی کے زمانہ سے درس دینے کا ذوق بعضوں پر تو اتنا غالب ہوتا تھا کہ بعض اوقات اسی کتاب کو جسے وہ ابھی پڑھ ہی رہے ہیں، لیکن اس کی جو جلد یا جو حصہ ختم ہو چکا ہی، دوسرے طلبہ کو وہی پڑھی ہوئی جلد یا پڑھا ہوا حصہ پڑھانا بھی شروع کر دیتے تھے مولانا غلام علی آزاد نے اپنے اُستاد میر طفیل محمد کے ترجمہ میں لکھا ہی کہ

"اکثراں بود کہ ہر کتابے کہ خود می خواندند بہ تلامذہ خود درس می گفتند" صفحہ ماثر الکرام

خیال کرنے کی بات ہو کہ جس کتاب کو ابھی ایک شخص پڑھ ہی رہا ہو اسی کو اس نے پڑھانا شروع کر دیا ہو۔ جو تعلیم اس استعداد کو طلبہ میں پیدا کرتی تھی، آج اسی کو مورد صد طعن اور محل ہزار شناعت ٹھیرایا جارہا ہو مولانا آزاد نے اسی واقعہ کے بعد بالکل سچ لکھا ہو کہ

"قوت طبع اقدس ازیں جا فہم تواں کرد"

بلاشبہ یہ معمولی استعداد کا نتیجہ نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ نچلی جماعت ہی کے طلبہ سہی، لیکن اس زمانہ کا جیسا کہ دستور تھا مطالعہ اور مباحثہ کے بغیر تو کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا تھا، یقیناً خود پڑھنے والے طلبہ سے جو لوگ پڑھا کرتے تھے، وہ ان سے رد و قدح میں کمی کیا کرتے ہوں گے لیکن ان کو راضی رکھتے ہوئے پڑھاتے چلا جانا کوئی آسان بات نہیں ہوسکتی، مولانا عبد الحی مرحوم نے تو اس کا ذکر بھی کیا ہو کہ اس طریقہ سے جس زمانہ میں طلبہ کو میں پڑھایا کرتا تھا

رضیت بدرسی طلبۃ العلوم۔ نفع المفتی صفحہ ۲۵ اپنے درس سے میں طلبہ کو خوش رکھتا تھا۔

مولانا عبد الحی مرحوم کے مشہور شاگرد رشید مولانا محمد حسین الہ آبادی جن کا ذکر ابتداء کتاب میں بھی کہیں آچکا ہو ان کے حالات میں بھی لکھا ہو کہ مولانا عبد الحی صاحب نے تمام اسباق آپ کے سپرد کر دیئے تھے سوا ر آخری کتابوں کے باقی سب آپ (یعنی شاگرد) پڑھاتے تھے۔ صلا

اس عجیب و غریب دستور سے طلبہ کی استعداد کے بڑھانے اور چمکانے میں جو مدد ملتی تھی، وہ تو خیر بجائے خود تھی، اگر غور کیا جائے تو اس ذریعہ سے تعلیمی مصارف کا بار کتنا ہلکا ہوتا تھا۔ خواہ اس بار کو حکومت اٹھاتی ہو، یا عام پبلک، میرا مطلب یہ ہو کہ کسی شہر اور قصبہ میں دس بیس مدرسین مختلف علوم و فنون کے ماہرین جمع ہو جاتے تھے، اور درس دینا شروع کرتے تھے۔ ان مدرسین کے ضروریات زندگی کی کفالت عموماً حکومت ہی کرتی تھی۔ حکومت کے بعد عام مسلمان ان مدرسین کی امداد مختلف

صورتوں سے کرتے تھے لیکن بسا اوقات ان تعلیمی شہروں اور قصبوں میں طلبہ کی تعداد صد سے زیادہ متجاوز ہو جاتی تھی۔ بسا اوقات رام پور، لکھنؤ، دلّی، مراد آباد وغیرہ میں ہزار ہزار دو دو ہزار تک ان کی تعداد پہنچ جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ طلبہ کی اتنی بڑی تعداد کے لیے گنتی کے یہ دس بیس مدرسین کافی ہوسکتے تھے؟ پھر کیا ہوتا تھا؟ اسی پر غور نہیں کیا گیا۔ واقعہ وہی تھا کہ علاوہ ان مدرسین کے تدریسی کاروبار کا ایک بڑا حصہ ان طلبہ پر تقسیم ہو جاتا تھا جو پڑھنے کے ساتھ ساتھ نچلی جماعتوں کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ گویا ہر فن اور ہر علم کے سلسلہ میں ایک یا دو اُستادوں کی حیثیت تو صدر کی ہوتی تھی، حکومت یا پبلک کی جانب سے ان کی معاشی سہولتیں خواہ بشکل تنخواہ و وظائف یا بشکل جاگیر بہم پہنچادی جاتی تھیں[۱] لیکن ہر مضمون کے صدر کے ساتھ بیسیوں مددگار یا اسسٹنٹ مدرسین ان ہی طلبہ کے گروہ سے مُفت پڑھانے والے پیدا ہو جاتے تھے۔

ہمارے زمانہ میں تعلیم کا جو نظم اسکولوں اور کالجوں کی شکل میں قائم کیا گیا ہے جن میں اوپر سے نیچے تک ہر جماعت کے پڑھانے والے تنخواہ دار مدرسین ہیں۔ عموماً بیس بیس پچیس پچیس روپیہ سے کم جن کی تنخواہیں نہیں ہوتیں۔ اگر اس کو پیش نظر رکھ کر اس بچت کا حساب لگایا جائے جو مذکورہ بالا طریقہ کار اور سسٹم سے قدرتاً پیدا ہوتی تھی، تو یہ مبالغہ نہیں ہے کہ اس بچت کا تخمینہ

---

[۱] مقصد یہ ہے کہ چندہ کا رواج تو حال سے ہوا، ورنہ حکومت کی بربادی کے بعد عموماً قوم کے ارباب ثروت و دولت اپنا فریضہ سمجھتے تھے کہ ان اساتذہ کے مصارف کی پابجائی کا سامان کریں۔ حضرت مولانا لطف اللہ (علیگڑھ) رحمۃ اللہ علیہ جو اپنی کثرت درس سے پچھلے زمانہ میں واقعۃً استاذ العلماء ہو گئے تھے، مدت تک جیسا کہ میں نے سُنا آپ کی گزر بسر کا دار و مدار علیگڑھ و نواح علیگڈھ کے رؤسا کی خدمات پر تھا۔ عموماً ان رئیسوں نے اپنے اپنے اسٹیٹ سے حضرت کے لیے کچھ ماہوار جاری کردیا۔ مسٹر ناس کول برک نے مغل حکومت کے زوال کی وجہ سے ہندوستانی نظام تعلیم کو نقصان عظیم پہنچا ہے اس کی طرف برطانوی حکومت کو متوجہ کرتے ہوئے ایک مشہور یادداشت لکھی تھی جس میں اُنھوں نے بھی اس کی توثیق کی ہے کہ سلطنت کے مٹ جانے کے بعد ہندوستان کے لاوارث طبقہ اہل علم کی سرپرستی یہی مسلمان امراء کر رہے ہیں۔ لکھا ہے "اب یہی شاہزادے نواب اور زمیندار جنھیں اپنے باپ دادا سے علم کا شوق پہنچا ہے تھوڑی بہت مدد کرتے رہتے ہیں۔" رسالہ اُردو سہ ماہی اپریل ۱۹۲۲ء

لاکھوں لاکھ تک پہنچ سکتا ہے،

پڑھی ہوئی کتابوں کو پڑھنے کے ساتھ ہی پڑھاتے چلے جانے سے جو تعلیمی منافع پڑھانے والے طلبہ کو پہنچتے تھے مزید برآں ایک بڑا عظیم معاشی فائدہ اس دستور کا یہ بھی تھا۔

پرانی تاریخوں میں ہندوستان کے متعلق مشرقی اور مغربی مولفین کی جو اس قسم کی رپورٹیں پائی جاتی ہیں مثلاً صبح الاعشیٰ میں قشقلندی نے دلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

فیھا الف مدرسۃ واحدۃ للشافعیۃ — ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں اس وقت ایک ہزار مدرسے تھے

وباقیھا الحنفیۃ — جن میں شافعیوں کا ایک اور باقی سب حنفیوں کے تھے۔ ج ۵ ص ۶۹

یا اورنگ زیب کے زمانہ کے مشہور مغربی سیاح ہملٹن کا بیان ہے کہ

"شہر ٹھٹھہ میں مختلف علم وفن کے چار سو مدرسے تھے" (ہندوستان عالمگیر کے عہد میں ۔ نواب مرزا یار جنگ)

میں نہیں سمجھتا کہ لوگ ان عبارتوں کو پڑھ کر اپنے ذہن میں کیا نقشہ قائم کرتے ہیں، میرے خیال میں یہ غلط بیانی اور شاید دوسروں کو دھوکہ دینا ہوگا اگر "مدارس" کے لفظ کو پاکر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اسلامی عہد میں بھی ان مدارس کی نوعیت وہی تھی، جو آج عصری جامعات و کلیات، مدارس اور اسکولوں کی ہے جن کے لیے الگ الگ چھوٹی بڑی عمارتیں بنائی جاتی ہیں، میل دو دو میل کے رقبے گھیرے جاتے ہیں، اور ان میں درسگاہوں اور قیام گاہوں، بازی گاہوں وغیرہ کے نام سے ہال (قاعات) کمرے حجرات اور میدان کورٹس وغیرہ لاکھوں بلکہ کروروں روپے کے مصارف سے تیار کیے جاتے ہیں، نیچے سے لے کر اوپر تک ہر چھوٹی بڑی کتابوں کے پڑھانے کے لیے باضابطہ سرکاری تنخواہ پانے والے مدرسین نوکر ہیں۔ اور تدریس ہی نہیں، امتحان، امتحان کے سوالات، امتحانات کی نگرانی، جوابی بیاضوں کی جانچ، سوالی پرچوں کے تبصرے تصحیح، الغرض جو قدم بھی اٹھایا جاتا ہے، روپیہ کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سالانہ حکومت بھی تعلیم کی مد پر کروروں روپے صرف کرتی ہے، لیکن اس کے بعد بھی جب تک بیس پچیس روپے ماہوار خرچ کرنے کی صلاحیت کسی میں نہ ہو، عام حالات میں

وہ عصری تعلیم سے نفع نہیں اُٹھا سکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا لفظ "مدرسہ" کا ناجائز نفع ہوگا اگر ان پچھلے دنوں میں بھی تعلیم کا یہی نقشہ بنا کر پیش کیا جائے۔ علم و دین کی خدمت پر حکومتیں اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد میں بھی اپنے خزانوں سے بیش قرار رقم صرف کرتی تھیں، فیروز تغلق کے عہد میں لکھا ہے کہ

وکانت الوظائف فی عہدہ للعلماء	فیروز کے زمانہ میں علماء و مشائخ کی تنخواہوں اور
والمشائخ ثلثۃ ملاین وستمائۃ الف	وظائف پر تین ملین اور چھ لاکھ یعنی چھتیس لاکھ تنکے
تنکہ۔ ص۱۱ نزہۃ الخواطر	خرچ ہوتے تھے"

فیروز تغلق کا زمانہ اور (چھتیس لاکھ تنکہ)، روپے کی گرانی اور چیزوں کی ارزانی کے اس زمانہ میں خیال تو کیجیے کہ موجودہ زمانہ کے حساب سے یہ رقم کتنی ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم و فن کی قدر دانیاں جو مغلوں کے زمانہ میں بہت نمایاں معلوم ہوتی ہیں، یہ کچھ مغلوں ہی کے عہد کی خصوصیت نہ تھی بلکہ ابتدار سے اسلامی سلاطین کو علم و معرفت کے ساتھ یہی شغف رہا ہے، اور آخر وقت تک یہ ذوق ان کا باقی رہا۔ حکومت آصفیہ کا وہ زمانہ جب اورنگ آصفی پر نواب ناصر الدولہ بہادر مرحوم و مغفور جلوہ فرما تھے، چندو لعل جیسے وزرا کی وزارت تھی، ہر طرف مُلک میں ابتری پھیلی ہوئی تھی خزانہ خالی تھا، لیکن اسی زمانہ کے مورخ صاحب گلزار آصفیہ راوی ہیں

"دربلدہ حیدر آباد از قدر دانی حضور پُر نور (نواب ناصر الدولہ مرحوم) قریب یکصد علمار و فضلاو ارباب علوم عقلی و نقلی بدر ماہاے بیش قرار بقدر تقدیر ملازم ہستند۔" ص۲۳۵ گلزار آصفیہ۔

اول و آخر کی یہ دو مثالیں میں نے صرف اس لیے پیش کر دیں تاکہ معلوم ہو کہ علم کی سرپرستی شاہان اسلام کا ہندوستان میں ایک قدیم وطیرہ تھا، تفصیل اگر دیکھنا منظور ہو تو ہمارے مرحوم دوست مولانا ابوالحسنات ندوی بہاری کی کتاب "ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں" نامی میں دیکھ سکتے ہیں، جس میں انھوں نے دار الخلافہ دہلی کے سوا ہر ہر صوبہ کے مدارس اور تعلیم گاہوں کو جہاں تک ان کے امکان میں تھا جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ اضافہ

کی اس میں بہت کچھ گنجائش ہی، ڈھونڈھنے سے تو یہاں تک سراغ ملتا ہی کہ ہندوستان میں ایسے مدرسے بھی قائم کئے گئے تھے جن میں طلبہ کے قیام و طعام کا بھی نظم تھا، باضابطہ سرکاری امتحانات بھی ہوتے تھے، اور ان ہی مدارس کے طلبہ کو سرکاری ملازمتیں بھی دی جاتی تھیں، بیجاپور کی مشہور تاریخ بستان السلاطین میں محمد عادل شاہ کے تذکرہ میں لکھا ہی کہ

"در آثار شریف دو مدرس تعین نمودہ کہ درس حدیث و فقہ و علم ایمان بر یاد آرند"

اسی کے بعد اس مدرسہ کے "طعام خانہ" کا ذکر صاحب کتاب ابراہیم زبیری نے جو کیا ہی اس کے سننے کے بعد تو شاید اس زمانہ کے فردوسی اقامت خانوں کے وارڈنس کے منھ میں بھی پانی بھر آئے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

"شاگرداں را از سفرہ آثار آش و نان بوقت صبح بریانی و مزعفر و بوقت شام نان گندم و کھچڑی"

کبھی کبھی نہیں روزانہ دن کے کھانے میں طلبہ کو بریانی و مزعفر کی پلیٹیں بغیر کسی معاوضہ کے آج بھی دُنیا کے کسی بورڈنگ ہوس میں میسر آتی ہیں، اور کھانے پینے ہی کی حد تک نہیں مزید یہ تھا

"و فی اسم یک ہون[1] و بدوں ایں (ماسوا اس کے) کتابہائے فارسی و عربی مدد می نمائند"

---

[1] ہون سلاطین دکن کا ایک مشہور طلائی سکہ تھا جسے اس زمانہ کے انگریزی روپیے کے چار ساڑھے چار روپیہ کے مساوی سمجھا جاتا ہی ہندوستان میں "ہُن برستا ہی" کی ضرب المثل میں اسی ہون کی طرف اشارہ ہی۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہی کہ یہ جنوبی ہند کا ہی لفظ ہی لیکن السیوطی نے اپنی کتاب حسن المحاضرہ میں احمد بن طولون کے بیٹے خماردیہ کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ اس نے خلیفہ بغداد معتضد کے پاس جب اپنی لڑکی قطر الندی کو رخصت کیا تو منجملہ اور چیزوں کے مائۃ ھن ذھب (سو ہُن سونا بھی تھا) اس سے معلوم ہوتا ہی کہ مصر میں بھی اس لفظ کا رواج تھا، کیا تعجب ہی کہ دکن میں یہ لفظ مصر سے آیا ہو۔ میرے خیال میں تو دکن کے قدیم باشندے ایسا معلوم ہوتا ہی کہ مصر سے کوئی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ پانی کو آج تک یہ لوگ نیلو (نیلو) کہتے ہیں، سامری قوم کے باشندے بھی یہاں پائے جاتے ہیں، ملا عبد النبی نے دستور العلماء میں لکھا ہی کہ وجیا نگر کے راجہ رام راج کی کھوپڑی احمد نگر میں سامری قوم نے لی تھی۔ ہر سال اس کا جلوس بھی نکالتی تھی۔ ہُن کے متعلق السیوطی کی جس عبارت کا میں نے حوالہ دیا ہی وہ پوری عبارت یہ ہی و فی سنۃ اثنتین و مائتین (۲۰۲ھ) زفت قطر الندی بنت خمارویہ بن احمد بن طولون من مصر الی الخلیفۃ المعتضد ونقل ابوھا فی جھازھا مالم یر مثلہ کان من جملتہ الف تکۃ الجوھر وعشر صنادیق جوھر ومائۃ ھون ذھب حسن المحاضرہ ص ۱۴۱ ج ۲۔ (باقی بر صفحہ ۳۴۱)

کھانے اور کتابوں کے سوا ایک ہون (جو تقریبًا ساڑھے چار روپیہ انگریزی کے مساوی تھا) بھی غالبًا کپڑوں جوتوں و دیگر ضروریات کے لیے طلبہ کو ملتا تھا اور یہ تو صرف ایک آثار شریف کے مدرسہ کا ذکر تھا، غالبًا کوئی عمارت تھی، جس میں تبرکات رکھے جاتے ہوں گے، اسی عمارت میں یہ مدرسہ تھا۔ زبیری نے لکھا ہی کہ جامع مسجد میں بھی چند مکاتب قائم تھے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

"در مسجد جامع دو ملا مکتب دار اطفال، و دو مکتب تحصیل علوم عربی و یک مکتب علم فارسی مقرر داشتہ"

ان سب مدارس و مکاتب میں بھی ان کا بیان ہی کہ طلبہ کو بریانی و مزعفر کھچڑی و نان گندم اور ہون ملا کرتے تھے اور غالبًا ہندوستان میں بیجاپور ہی کے مدارس ایسے تھے جن کے متعلق الزبیری نے لکھا ہی کہ

"امتحان بتاریخ سلخ ذیحج می شد"

یعنی ہجری سال کے اختتام پر سالانہ امتحان بھی طلبہ کا ہوتا تھا، دوسری جگہ تصریح بھی کی ہی۔

"ہر سال امتحان می شد"

امتحان کے تذکرہ میں اس کی تفصیل نہیں بتائی ہی کہ تحریری ہوتا تھا یا تقریری لیکن یہ لکھتے ہیں کہ

"و از انعام ہون سرفرازی فرمودند"

غالبًا پاس والے طلبہ کو انعام دیا جاتا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، یہ بھی ان ہی کا بیان ہی کہ

"و کسے کہ دراں (طلبہ) ہوشیار از علم می شد بعہدہ عمدہ و بہتر نوکر و ملازم می درشتند" بستان السلاطین ص ۳۵۱

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الزبیری صاحب بستان السلاطین کا یہ بیان اگر صحیح ہی تو تعلیم کے

(بقیہ صفحہ ۳۴۰) "یعنی ۲۸۲ھ میں خمارویہ بن احمد بن طولون نے اپنی لڑکی قطر الندی کو خلیفہ معتضد کے پاس رخصت کیا لڑکی کے باپ نے جہیز میں اتنی چیزیں دی تھیں جن کی نظیر نہیں دیکھی گئی جو چیزیں بھیجی گئی تھیں ان میں ہزار گھنڈیاں جواہرات کی تھیں علاوہ اس کے دس صندوقوں میں بھی جواہرات تھے اور دس ہن سونا بھی تھا" واللہ اعلم ہن سے یہاں سکہ مراد ہی یا کوئی اور چیز لیکن اتنا معلوم ہوتا ہی کہ سونے کے ساتھ ہن کا تعلق تھا۔ یہ بھی کون کہہ سکتا ہی کہ مصری ہن کا وزن کیا ہوتا تھا۔ یہ تیسری صدی ہجری کا قصہ ہی جس سے معلوم ہوا کہ مصر میں ہن کے لفظ کا رواج بہت قدیم زمانہ سے ہے، بہ ظاہر اسلام سے پہلے ۱۲

عصری نظام کی گونہ جھلک اس میں ضرور محسوس ہوتی ہے اور اس زمانہ میں جزئیات سے کلیات کے پیدا کرنے کا جو تحقیقاتی قاعدہ ہے چلنے والا چاہیے، تو اس کی بنیاد بنا کر ایک بڑی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔ کہ سکتا ہے کہ ہندوستان کے نظام تعلیم میں لاجنگ بورڈنگ، امتحان کا باضابطہ نظم حکومت کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ اور موجودہ زمانہ کے تعلیمی اداروں کو حکومت نے "آج نوکر سازی یا کلرک بافی" کی جو مشین بنا رکھا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔[1]

[1] جیسا کہ میں نے عرض کیا بیجاپور کے ان مدرسوں کو موجودہ زمانہ کے کلیات و جامعات کا قائم مقام قرار دینا، موجودہ زمانہ کی تحقیقاتی (ریسرچ) والی شاعری تو ہوسکتی ہے، لیکن حقیقت سے یہ بات بہت بعید ہے اگرچہ بیجاپور کی حکومت کا مغربی باشندوں سے جو تعلق ہوگیا تھا، خصوصاً پرتگیزنے گوا بندر پر قبضہ کر کے بیجاپور کی حکومت پر اپنے جو اثرات قائم کرلیے تھے اور اس کی وجہ سے مغربی اقوام سے میل جول کی ایک راہ کھل گئی تھی، اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ یورپ کی سُنی سنائی باتوں کو بھی دخل ہو، ابراہیم زبیری ہی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بیجاپوری دربار میں ابراہیم عادل شاہ ہی کے زمانہ سے یورپین ڈاکٹر سرجن ہونے کی حیثیت سے گھس گئے تھے۔ فرلوب نامی ڈاکٹر کا تو ایک دلچسپ لطیفہ بھی نقل کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم عادل شاہ کو بھگندر دالا پھوڑا امبرز میں ہوگیا۔ غالباً جسے فن جولا اور دواسیر کہتے ہیں۔ فرلوب حالانکہ اس زخم کے اپریشن سے واقف نہ تھا لیکن بادشاہ پر عمل جراحی کیا۔ نتیجہ بالعکس نکلا، حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ مگر رحم دل ابراہیم نے فرلوب کو بلا کر سمجھایا کہ میرے مرنے سے پہلے بیجاپور چھوڑ دو، ورنہ میرے بعد تجھے لوگ مار ڈالیں گے ابراہیم کا انتقال ہوگیا۔ فرلوب نہ جاسکا۔ خواص خاں نے ناک اور نچلا لب اس کا غصہ میں کاٹ دیا۔ مگر فرلوب نے گھر پہنچ کر اپنے ایک غلام کی ناک اور لب کو کاٹ کر پھر اپنے چہرہ پر چسپاں کرلیا، اور اس کا یہ عمل کامیاب ہوا۔ زبیری نے لکھا ہے کہ "وبہتر شد" فرلوب اچھا ہوگیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جراحی کے فن میں ان لوگوں کو اسی زمانہ سے کمال حاصل تھا، لکھا ہے کہ "تا زمانے در شہر بیجاپور بہ حکمت و معالجت گذرانید حکیم بے بدل بود" صفحہ ۲۸ بادشاہ کے قتل کرنے والے عیسائی ڈاکٹر کا زندہ رہ جانا صرف بینی ولب تراشی پر قناعت کرنا، اور غلام کے ساتھ اس بے دردی کے ساتھ فرلوب کا پیش آنا، اس پر بھی حکومت بیجاپور کی خاموشی بلاوجہ نہ تھی، آپ کو اسی کتاب سے معلوم ہوگا کہ بیجاپور کی حکومت گوا کی مغربی قوت سے ڈرتی تھی، علانیہ حاجیوں کے جہاز لوٹ کر گوا بندر میں قید کیا جاتا تھا اور حکومت منت سماجت کے سوا ان ڈاکوؤں کا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ حضرت سلطان عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے بیجاپور کی حکومت کو کیوں ختم کیا؟ بلکہ دکن کی ساری کمزور چھوٹی چھوٹی راج دھانیوں پر حملہ کا کیا مقصد تھا، ایک گروہ ہے جو اورنگ زیبؒ پر زبان طعن دراز کر رہا ہے حالاں کہ سچ یہ ہے کہ سمندر کی طرف مغربی لٹیرے اور خشکی میں مرہٹے ان ہی حکومتوں کی کمزوریوں سے نفع اٹھا کر اپنے آپ کو آگے بڑھا رہے تھے۔ بوجہ شیعہ ہونے کے دکن کے عام مسلمانوں کو جو عموماً سنی تھے، حکومت نہیں پوچھتی تھی بلکہ مسلسل ایرانیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، عہدوں پر وہی قابض تھے۔ رفیع الدین شیرازی کے حوالہ سے جو بیجاپور حکومت میں (باقی بر صفحہ ۳۴۳)

لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ آثار شریف کے مدرسہ میں کل دو مدرس تھے۔ اسی طرح جامع مسجد کے مدرسوں میں بھی ایک دو اُستادوں سے زیادہ ایسے آدمی نظر نہیں آتے ہیں جو حکومت سے تنخواہ پاتے ہوں، نیز طعام وقیام کا نظم ان مدرسوں میں بھی حکومت کی جانب سے تھا پڑھنے والوں پر فیس کا وہ بار نہیں ڈالا جاتا تھا، جس کے بوجھ سے آج ہندوستان کی کمر ٹوٹی چلی جا رہی ہے، تعلیمی حلقوں میں چیخ پکار برپا ہے۔ امتحان اگر لیا بھی جاتا تھا، تو اس کی فیس نہیں لی جاتی تھی، بلکہ اگر الزبیری کے بیان میں اپنی طرف سے یہ الفاظ نہ بڑھائے جائیں کہ کامیاب ہونے والوں کو انعام ملتا تھا تو جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے، وہ صرف یہ ہے :-

---

(بقیہ صفحہ ۳۴۲) منصب جلیل پر سرفراز تھا، نقل کیا ہے:

"بندہ آنچہ می داند از اہل شیراز کہ مولد ومنشار ماست دہ ہزار اہل استحقاق آمدہ باجمیت واسباب وتجمل بازگشت" ص۱۱

سوچنے کی بات ہے کہ ایک شیراز شہر ہے دس ہزار اگر رفیع الدین کے زمانہ میں واپس گئے اسی سے خیال کیجئے کہ دکن کی ان حکومتوں کے یہاں ایران کے مختلف شہروں سے کتنے آتے تھے جن میں بڑی تعداد تو نوکر ہو جاتی تھی اور بہت سے لے دے کر واپس ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں ان چھوٹی چھوٹی حکومتوں سے خود یہاں کے دکنی سنی مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہوگا، ظاہر ہے۔ الزبیری نے اورنگ زیبؒ کا وہ فرمان بھی نقل کیا ہے۔ جب بیجاپور کی حکومت نے کہلا بھیجا کہ ہم تو مسلمان ہیں ہم پر حملہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اورنگ زیبؒ نے جواب میں لکھا تھا۔

"آنچہ شما گفتند درست وراست ہست مارا از شہر شما وملک شما سروکارے نیست وقصد جنگ وقتال نداریم مگر ایں کافر فاجر حربی شقی کہ در شان او صادق است سہ حرم میں چھپے بھی تو ہے کشتنی، دربغل شما جا گرفتہ ودر پناہ شما آمدہ فسادات وخرابیہا کند اسلامیاں بلاد وغربا ملک ودیار ازیں جا تا دھلی از اندائش رنج کش"

ظاہر ہے کہ اس سے سیواجی مراد ہے، آخر میں عالمگیر کے الفاظ ہیں:-

"اماطت (مٹانا) واستیصال بیخ فساد برما کہ شعر ملوکیم واجب ومتحتم" مطلب یہ ہے کہ بحیثیت اقتدار اعلیٰ ہند ہونے کے مسلمانوں کو اس کس مپرسی میں چھوڑ دینا میرے لیے کسی حیثیت سے جائز نہیں ہے حتی سے دکن اورنگ زیبؒ کی روانگی کس نصب العین کے تحت تھی۔ اسی فرمان میں صراحۃً اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:-

"از سقط الراس (وطن مالوف) آمدن جزایں نیست کہ آں حربی (سیواجی) را بدست آریم وجہانیاں را از اذیتش رہانیم چوں کہ او در پناہ شماست او را از شما می طلبیم"

آخر کے یہ الفاظ قابل غور ہیں ـــــ "ہیں کہ بدست آمد ہمیں ساعت بردیم در راہ خویش گیریم" بستان السلاطین ص۴۳۵ لیکن اس معمولی شرط کی تکمیل پر بھی جو حکومتیں آمادہ نہ تھیں اگر ان کو اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنا پڑا تو اس میں قصور کس کا ہے۔

"از انعام ہون سرفراز می فرمودند"

جو ایک عام بیان ہی، کامیاب اور ناکام پر امتحان دینے والے کی طرف اس انعام کو منسوب کیا گیا ہی، خلاصہ یہ ہی کہ اس قسم کے مدارس بھی ہندوستان میں ضرور تھے، لیکن ان ہی چند سرکاری مدرسوں پر تعلیم کا دار مدار تھا، یہ قطعاً غلط ہی۔

اور میرا ذاتی خیال تو ہی کہ ہندوستان میں بعض بادشاہوں یا امیروں کی طرف مدرسہ کی تعمیر کا انتساب جو تاریخوں میں کیا جاتا ہی، عموماً ان مدارس کی زیادہ تر غرض تعمیری ذوق کی تسکین تھی۔ جہاں اس ذوق کے تقاضے کو لوگ محل سراؤں، کوشکوں، قلعوں وغیرہ کی تعمیر سے مطمئن کرتے تھے وہیں کسی مقام کی دل کشی چاہتی تھی کہ یہاں عمارت ہو، عمارت بنا دی جاتی تھی، بن جانے کے بعد اگر تعلیم و تدریس کے لیے کسی کو اس میں بٹھا دیا گیا، تو وہی عمارت "مدرسہ" کے نام سے مشہور ہو جاتی تھی۔ مثلاً دلی میں ہم دیکھتے ہیں سیری کے بند اب پر یا حوض (تالاب) علائی پر جو مدارس تھے، ان کے متعلق میرا بھی گمان ہی، کسی ندی کو روک کر بند بنانے کا عام رواج ہندوستان میں تھا، سامنے ایسا معلوم ہوتا ہی کہ سمندر چھلک رہا ہی، عہد عثمانی کے عثمان ساگر اور حمایت ساگر اور نظام ساگر کا جن لوگوں نے معائنہ کیا ہی وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے بند (دکشہ) پر بیساختہ دل چاہتا ہی کہ کوئی عمارت ہوتی۔ دل کی اسی خواہش کی تکمیل کی جاتی تھی، جو اس تکمیل کی قدرت رکھتے تھے، ورنہ آپ ہی بتائیے کہ جن مدرسوں میں ایک دو مدرس سے زیادہ کسی زمانہ میں نہ ہوں۔ کیا موجودہ زمانہ کے لحاظ سے مدرسہ کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور دلی کے ان مدرسوں کا یہی حال تھا۔

"ہندوستان کے اسلامی مدارس" کے مصنف جو اس میں شک نہیں ہی، اس موضوع کے محقق ہیں وہ اسلامی عہد کے ایک مدرسہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"تمام ہندوستان میں اس سے زیادہ عظیم الشان اور وسیع سلسلہ عمارت درسگاہ کے لیے کبھی کسی دور میں نہیں بنا" کتاب مذکور صلا

ذرا عظیم الشان وسیع کبھی او کسی بے کے الفاظ کو پیش نظر رکھیے اور سُنیے، جس مدرسہ سے زیادہ عظیم الشان وسیع کبھی کسی زمانہ میں اس ملک میں مدرسہ نہیں بنا، اس کا طول وعرض کتنا تھا۔ یہ الفاظ اُنھوں نے بیدر کی اسلامی حکومت کے مشہور وزیر خواجہ عماد الدین محمود گیلانی المعروف بہ "محمود گاواں" کے متعلق لکھے ہیں، گو اس مدرسہ کی عمارت کا ایک حصہ منہدم ہو چکا ہے، خصوصاً ایک بڑا مینار اس کا گر چکا ہے لیکن باوجود اس کے دوسرا مینار اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، اور مدرسہ کی عام حالت بھی دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہے۔ خاکسار جب اس مشہور مدرسہ میں تماشائی کی حیثیت سے داخل ہوا، تو دیر تک متحیر تھا کہ کیا یہی ہندوستان کا سب سے بڑا وسیع مدرسہ تھا۔ خیال گذرا، اور شاید اپنے ساتھیوں سے بولا بھی کہ غالباً مدرسہ کا صرف دروازہ اور دروازہ کی عمارت رہ گئی ہے، لیکن غالباً جو اصل مدرسہ تھا، وہ ویران ہو کر شہر کے دوسرے مکانوں میں شریک ہو گیا۔ لیکن بعد کو تاریخوں میں جب پڑھا کہ شرقاً غرباً پچھتر اور شمالاً جنوباً پچپن گز میں اصل عمارت ہی تیار ہوئی تھی، تب مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اور یہی توجیہ سمجھ میں آئی کہ اصل مقصود تو خواجہ جہاں کا ایرانی طرز کے ان دو میناروں کا بنانا تھا، جو اس میں شک نہیں اپنے حسن وخوبی بلندی رنگ[1] ہر اعتبار سے ہندوستان کے میناروں میں اپنی آپ نظیر ہیں میلوں دور سے بیدر کی طرف آنے والوں کی جب ان میناروں پر نظر پڑتی ہوگی، اس کوہستانی صحرا میں اچانک اس کے سامنے آجانا یقیناً عجب کیف وسرور کو پیدا کرتا ہوگا، اور اسی زمانہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان عمارتوں کی تعمیر میں تعلیمی اغراض سے زیادہ وہی ذوقِ تعمیر کی تسکین بخشی متصور تھی

---

[1] اب تو مینار کا رنگ بہت کچھ اُڑ گیا ہے تاہم جہاں جہاں باقی ہے یہ چمکدار نیلا رنگ ہے، معلوم ہوا کہ بیدر کے اطراف میں لوہے کے ذرات میں ملی ہوئی مٹی جو پائی جاتی ہے اور لوہے کے زنگ نے مٹی کو سُرخ رنگ دے دیا ہے، اسی رنگ کو دوسرے رنگوں سے مرکب کر کے نیلگوں رنگ پیدا کیا جاتا تھا اور سیپ کو کاٹ کاٹ کر اس کے ٹکڑوں کو جو دو دو انچ کے ہونگے اسی رنگ سے رنگا جاتا تھا اور پھر سیپی کے انہی رنگین ٹکڑوں کو نیچے سے اوپر تک میناروں کے چاروں طرف چسپاں کر دیا گیا تھا، چمک اس میں انہی صدفی ٹکڑوں کی تھی۔ کیا اولوالعزمیاں تھیں؟ بیدر میں اس قسم کی رنگین عمارتوں کے بنانے کا عام رواج تھا۔ قلعہ میں بھی "رنگین محل" اسی صنعت کا نمونہ ہے۔

ورنہ انصاف کی بات یہی ہے کہ اُس زمانہ کے بڑے سے بڑے مدرسہ کی عمارت طول وعرض میں شاید عہد حاضر کے معمولی اسکولوں کی عمارتوں کے بھی برابر نہ تھی اگران بیچاروں کی غرض بھی مدرسہ کی تعمیر سے کسی تعلیم گاہ کی تعمیر مقصود ہوتی تو ان کے پاس کیا زمین کی کمی تھی یا سامانِ تعمیر کی قلت تھی۔ مگر سچ وہی ہے کہ علم کو جس زمانہ میں سنگ وخشت کی چار دیواریوں میں مقید کر دیا گیا ہے، پرائمری اور الف بار کی تعلیم بھی اس وقت تک ناقابل تصور ہے جب تک کہ ایک مستقل عمارت کے ذریعہ سے اس کی تعلیم گاہ کو ظاہر نہ کیا جائے۔ اس زمانہ کو اُن گذرے دنوں پر قیاس ہی کرنا غلط ہے، جب علم آزاد تھا۔ اس انمیل بے جوڑ ضرورت کی زنجیریں اس کے پاؤں میں نہ ڈالی گئی تھیں۔

خود مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم نے اپنی اس کتاب میں "مدرسہ" کا لفظ جس میں استعمال کیا ہے وہ اس معنی سے بالکل جُدا ہے جس کی طرف ہمارا عادی ذہن مدرسہ کے لفظ کے سُننے کے ساتھ ہی منتقل ہو جاتا ہے۔ جس کی ایک اچھی مثال ان کا یہ بیان ہو سکتا ہے۔ انہوں نے صوبۂ بہار کے مدارس کے عنوان کے نیچے منجملہ دیگر مقامات کے ایک تعلیمگاہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"گیلانی مولوی احسن صاحب منطقی کا مولد و مسکن (کتاب اسلامی درسگاہیں)

یہ گیلانی وہی گیلانی ہے جس کی طرف خاکسار اپنے نام کی اضافت کرتا ہے۔ فقیر کا مولد و منشا بہار کا یہی گاؤں ہے جس کی آبادی بمشکل پانچ چھ سو سے زیادہ ہوگی۔ ممتاز آبادی واسطی زیدی سادات کی ہے جو چند صدیوں سے اس گاؤں میں آباد ہیں۔ مولانا محمد احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ خاکسار کے جدِ امجد ہیں چونکہ یہ میرے گھر کی بات ہے اس لیے "صاحبُ البیت ادری بما فیہ" کے رو سے میں بتا سکتا ہوں کہ اس کی اصل حقیقت کیا تھی، یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم نے اس گاؤں میں تقریبًا تیس چالیس سال تک درس و تدریس کا بازار گرم رکھا۔ نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ سرحد و کابل تک کے طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد مولانا سے پڑھنے کے لیے اس گاؤں

میں آئی۔ ہزارہ ضلع کے ایک بزرگ مولانا عبداللہ[1] پنجابی وطناً، گیلانی نزیلاً تو پڑھنے کے لیے آئے اور اسی گاؤں میں متوطن ہو کر اپنے وعظ و تلقین ارشاد و ہدایت، درس و تدریس، افتا و تصنیف کا سلسلہ نصف صدی کے قریب برابر جاری رکھا۔ وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے اور ایک یہی کیا بہار کے بعض جلیل القدر علماء مثلاً مولانا رفیع الدین[2] مرحوم رئیس شکرانواں، مولانا عبدالغفور[3]

---

[1] مولانا عبداللہ نے بہار کے اضلاع پٹنہ و مونگیر خصوصاً ضلع مونگیر میں جو کام انجام دیا وہ یادگار رہیگا، خدا جانے کتنے مسلمانوں کے گھر سے بت نکلوائے اور شراب و تاڑی سے لوگوں کو تائب کیا۔ آخر میں تو آپ کے دست حق پرست پر ضلع مونگیر کے ایک راجہ آف مرجا مسلمان بھی ہو گئے، جن کا خاندان جموی سب ڈویژن کے مسلمان رئیسوں میں بحمداللہ اس وقت امتیاز رکھتا ہے۔ عقیدۂ محمدیہ عربی میں آپ کی اچھی کتاب ہے۔ اس کے سوا اُردو میں بھی چند رسالے ہیں۔

[2] شکرانواں ضلع پٹنہ کا مشہور گاؤں ہے، مولانا اس اطراف کے سب سے بڑے مسلمان رئیس تھے، لاکھوں روپے کی جائداد کے مالک تھے، لیکن علم کا نشہ آخر وقت تک سوار رہا۔ نادر مخطوطات کا ایک قیمتی کتب خانہ آپ نے شکرانواں میں مہیا کیا، تفسیر جریر طبری کا کامل نسخہ تیس جلدوں میں آپ کے پاس موجود تھا۔ اب چھپ جانے کے بعد تو اس کی اہمیت نہ رہی، لیکن طباعت سے پہلے اس کتاب کے کُل تین نسخے ساری دنیا میں پائے جاتے تھے، جن میں ایک نسخہ شکرانواں کا تھا۔ ہزارہا ہزار روپے خرچ کر کے آپ نے اس کی نقل مدینہ منورہ کے کتب خانہ سے حاصل کی تھی۔ آپ کے کتب خانہ میں حافظ ابن قیم اور ابن تیمیہ کی تصنیفات کا قلمی ذخیرہ جتنا بڑا جمع ہو گیا ہے، شاید ہندوستان میں تو کہیں اتنا بڑا سرمایہ نہ ہوگا۔ حافظ ابن عبدالبر محدث کی کتابیں استذکار اور تمہید آپ کے یہاں موجود ہیں۔ محلّی ابن حزم جیسی نایاب کتاب کی چودہ جلدیں آپ کے یہاں میں نے دیکھی تھیں۔ طباعت سے پہلے ان کا دیکھنا ہی میرے لیے باعث فخر تھا۔ پٹنہ کا مشہور مشرقی کتب خانہ خدابخش لائبریری کے متعلق مولانا کے صاحبزادے برادر محترم مولانا عبدالمتین نے مجھ سے بیان کیا کہ مولوی خدابخش خاں اور مولانا رفیع الدین ان کے والد کے درمیان گھرے تعلقات تھے، نادر کتابوں کے ذوق میں اضافہ اور ان کی نشان دہی وغیرہ میں بہت زیادہ مشورہ ان کے والد ہی نے خدابخش خاں کو دیا ورنہ ظاہر ہے کہ خاں صاحب تو ایک وکیل آدمی تھے۔ اس لائبریری کی تاریخ میں اس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہیے کہ اس کی نادر مخطوطات کے پیچھے ایک مُلّا کا علمی مشورہ بھی چھپا ہوا تھا۔ واللہ اعلم یہ کہاں تک صحیح ہے کہ شرح عون المعبود جو غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے مولانا شمس الحق ڈیانوی نے اس کی تالیف میں مولانا رفیع شکرانوی کی شرح ابو داؤد سے بہت نفع اُٹھایا، لیکن افسوس کہ خود مولانا شکرانوی کی شرح ضائع کرا دی گئی یا ہو گئی۔ مولانا رفیع نے شکرانواں میں ایک عربی پریس بھی قائم کیا تھا اور ابن قتیبہ کی تاویل الحدیث کے کچھ اجزا اس میں طبع بھی ہوئے، لیکن یہ پریس چل نہ سکا۔ ایک تو مسلم عالم کو مولانا نے ہبہ کر دیا جو گیلانی ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۴۸)

رمضان پوری، مولانا حکیم عبد السلام[1] بھاگلپوری، مولانا حکیم دائم علی[2] ٹونکی، مولانا اسمٰعیل رمضان پوری وغیرہم بیسیوں مشاہیر گیلانی کی اس درس گاہ سے اُٹھے۔

لیکن تعلیم و تدریس کا یہ سارا کاروبار جہاں انجام دیا گیا وہ صرف برگد کا ایک طویل عریض درخت تھا جس کی ایک طرف متوسط درجہ کی ایک مسجد اور ایک طرف مولانا مرحوم کا ایک خام چھوٹا سا چند حجروں کا ایک مکان تھا، اسی مکان کے سامنے کویلو کا ایک چھپر اینٹ کے دو پایوں پر پڑا ہوا تھا۔ برگد کے درخت کے نیچے چند تخت وہ بھی کھلے ہوئے بغیر کسی فرش و فروش کے پڑے رہتے تھے، مولانا درخت کی چھاؤں میں طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، برسات یا سردی کے موسم میں یہ مدرسہ کویلو کے اسی سائبان میں منتقل ہوتا تھا۔ جس کا کُل فرنیچر لے دے کر دو چوکیاں تھیں۔ طلبہ کچھ تو اسی خام مکان کے حجروں میں رہتے یا مسجد میں اور زیادہ تر گاؤں کے اربابِ ثروت کے مکانوں میں ان کو جگہ بھی مل جاتی تھی اور کھانے کا نظم بھی ہو جاتا تھا۔ بس اس مدرسہ کی کل کائنات برگد کی چھاؤں اور مولانا کا وہی خام مکان تھا۔ اسی کو مدرسہ خیال کیجیے، یا مولانا کا مطب اس کو قرار دیجیے، یا دیوانخانہ یا طلبہ کا اقامت خانہ۔ کیونکہ وہی سب[3] کچھ تھا۔ سنگ و خشت سے آپ نے دیکھا اس لفظ "مدرسہ" کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٣٤٧) رمضان پور بہار میں رئیسوں کی مشہور بستی ہے، انہی رئیسوں میں آپ بھی تھے۔ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً الامعاف، مفید الاحناف، مرغوب القلوب وغیرہ۔ آخری کتاب طب یونانی کے نقطۂ نظر سے اغذیہ یا ماکولات و مشروبات کی بہترین کتاب ہے۔ آپ کا تذکرہ تذکرۂ علماءِ حال کے ص٩٢ میں بھی ہے۔

(حاشیہ صفحۂ ہذا) [1] حضرت الاستاذ مولانا برکات احمد ٹونکی کے والد ماجد بہار کے رہنے والے تھے، ٹونک میں نواب کے طبیب خاص تھے، بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ ستر بہتر سال کی عمر میں وفات ہوئی، آخر عمر تک سَو رکعتوں نفلی نمازوں کا یومیہ التزام باقی رہا یہ تہجد، اشراق، چاشت کے سوا تھی۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت بھی ملی تھی۔

[2] بہار کے مشہور مدرسہ عزیزیہ اور صغریٰ وقف اسٹیٹ آپ ہی کی کوششوں کا کارنامہ ہے۔

[3] اب فقیر کا مسکن یہی مکان ہے اگرچہ اس کی صورت بدل گئی ہے، بجائے خام کے پختہ دو منزلہ ہو گیا ہے، ناصیہ پر "محراب الہدایت والارشاد گیلانی" اس کا تاریخی نام لکھا ہوا ملیگا۔ کچھ مالی خولیا تی تصورات تھے (باقی بر صفحہ ٣٤٩)

کوئی تعلق ہی؛ لیکن اس سے ہٹ کر اگر دیکھیے تو کوئی شبہ نہیں کہ اُس زمانہ میں جو کچھ پڑھا یا جاتا تھا برگد ہی کی چھاؤں میں ان سب کی گنجائش تھی، اسی کے نیچے شمس بازغہ، شرح چغمنی حتیٰ کہ الافق المبین، شفا، اشارات کے اسباق بھی ہوتے تھے اور ہدایہ، بیضاوی، تلویح، مسلم کے لیے بھی گاؤں کی اتنی زمین کافی تھی۔ اور برگد کے اسی درخت کے سایہ میں اگر کوئی دیکھنا چاہے تو مرحا کے اسلامی اسٹیٹ صغریٰ وقف[1] اسٹیٹ اس کے مدرسہ عزیزیہ اور شکرانواں کے اس قیمتی کتب خانہ کو بھی دیکھ سکتا ہی، جس کی بعض نادر کتابوں کی نظیر شاید اس وقت بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۸) جس کے تحت یہ نام رکھا گیا تھا، قرآن میں مسجد، صوامع، بیع کے ساتھ "محراب" کا ذکر بھی چند مقامات پر کیا گیا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ شاید مذہبی عمارتوں کی ایک قسم خاص یہ بھی تھی، کیا شیطان اور کفر سے حرب و مقابلہ کی تجویزیں اس میں سوچی جاتی تھیں۔ ماد کچھ اسی طرف ایما کرتا ہی۔ ہدایت جن تک نہیں پہنچی ان کے لیے ہدایت اور ہدایت کے بعد جنہیں ارشاد و رہنمائی کی ضرورت ہی ان کے لیے ارشاد ان ہی تجویزوں کی طرف منسوب کر کے کچھ ارادہ تھا جو شاید ارادہ سے آگے نہ بڑھے کہ وقت گذر گیا قبر جھانک رہی ہی، عزرائیل کی پیشانی طلوع ہو رہی ہی۔ غرتکم الامانی (آرزوؤں نے تم کو دھوکے میں ڈال دیا) جس حسرت نصیب کا یہ انجام ہی، اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہی کہ شاید دوسروں کو کفرستانِ ہند کے اس طول و عرض میں "محاریب" بنانے کی توفیق ہو کہ اسلام اس ملک میں نرغہ میں ہی۔ ان تپا دریوں سے عبرت گیر ہونا چاہیے جو نہ اس ملک کی زبان سے، معاشرت سے واقف ہیں نہ یہاں کا موسم ان کے موافق ہی لیکن جس قوم کے بزرگوں نے اس کو اس ملک کے چپہ چپہ پر آباد کر دیا تھا اب اسی قوم کے فرزندوں کا کیا فرض ہی؟ جو ہدایت یافتہ ہیں ان کے ارشاد کی ضرورت بھی یقیناً ضرورت ہی لیکن کروروں کی تعداد جو ان لوگوں کی ہی جنھیں ہدایت کی کوئی کرن بھی ہاتھ نہیں آئی ہی کیا وہ مستحق توجہ نہ تھے۔ لفظ "محراب" کاش جذبات میں تلاطم پیدا کرے ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ایک لاولد مسلمان خاتون بی بی صغریٰ مرحومہ نے بیس سے پچیس لاکھ روپے کی قیمتی جائداد جو وقف کی ہی یہ اس کی طرف اشارہ ہی۔ مولانا اسمٰعیل رمضان پوری مرحوم جو مسماۃ کے اس اسٹیٹ کے منیجر تھے اُن ہی کے ایما سے اس نیک دل خاتون نے اس وقف کے بہت بڑے حصہ کو ایک اسلامی تعلیم گاہ کے لیے مختص کر دیا جو اب مدرسہ عزیزیہ کے نام سے بہار میں قائم ہی، بہار کی حکومت نے "جامعہ عربیہ" کا ایک نظام اس صوبہ میں جو قائم کیا ہی جس کے تحت تحتانی، وسطانی فوقانی مکاتب (اسکول) کے سوا کلیات متوسطہ (انٹرمیڈیٹ کالج) ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں، اور مدرسہ شمس الہدیٰ و مدرسہ عزیزیہ غالباً یہی دونوں مدرسے کلیۂ عالیہ (اعلیٰ کالج) کی حیثیت رکھتے ہیں، عالی جناب سید عبدالعزیز صاحب صدر المہام عدالت و امور مذہبی سرکارِ آصفیہ جب حکومتِ بہار کے وزیر تعلیم تھے تو ایک کمیٹی سے اس "جامعہ عربیہ" کا نصاب بنوایا تھا جس کا ایک رکن یہ خاکسار بھی تھا، مولانا سید سلیمان ندوی اس کمیٹی کے صدر تھے ۱۲

سارے ہندوستان میں نہیں مِل سکتی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ خدابخش خاں کی مشہورِ عالم مشرقی لائبریری کی ترتیب میں بھی دیکھنے والوں کو اس دماغ کی راہنمائی محسوس ہوسکتی ہے جو بڑ کے اسی درخت کے نیچے سنوارا گیا تھا، فٹ نوٹ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اگر وہ صحیح ہے تو ان نتائج کا کیا انکار کیا جا سکتا ہے جو یقیناً اسی تعلیم گاہ کے نتائج تھے جس کے لیے نہ کبھی اینٹ پر اینٹ رکھی گئی، اور نہ اس کی بلڈنگ کے لیے بھیک کا ہاتھ پبلک کے سامنے دراز کیا گیا۔

مولوی ابوالحسنات مرحوم نے گیلانی کی جس درسگاہ کا تذکرہ کیا ہے اُس میں تو براہ راست تعلیم پانے کا موقع مجھے نہ مل سکا، لیکن دارالعلوم دیوبند کی حاضری سے پہلے سات آٹھ سال تک خود اس فقیر کو جس مدرسہ میں پڑھنے کا ذاتی تجربہ حاصل ہوا ہے علم حدیث کے سوا شُدبُد کی جو کیفیت بھی اپنے اندر پاتا ہوں وہ زیادہ تر اسی مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ ہے، میری مراد سیدی الاستاذ حضرت مولانا سید برکات احمد ٹونکی نزیلاً و بہاری وطناً رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم گاہ سے ہے، جس سے صرف ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں پنجاب، یوپی، بہار، بنگال، دکن وغیرہ ہی کے طلبہ کی ایک معقول تعداد فارغ ہو کر ملک کے مختلف گوشوں میں علم دین کی خدمت میں معروف ہی نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں بیرونِ ہند مثلاً افغانستان، بخارا، تاشقند کوقند، سمرقند، ہرات، ترمذ کے طلبہ بھی تحصیل علم میں مصروف رہتے تھے اور فاتحۂ فراغ پڑھ کر اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہوئے کم و بیش چالیس سال تک تعلیم و تعلم کا یہ سلسلہ ان ہی خصوصیتوں کے ساتھ جاری رہا۔ مگر مکانی حیثیت سے اس تعلیم گاہ کی نوعیت کیا تھی! مولانا برکات احمد مرحوم کا شمار یوں تو ٹونک کے امراء میں تھا، والی ملک کے طبیب خاص تھے، معقول تنخواہ کے علاوہ گاؤں بھی جاگیر میں تھا، فیس اور دوا کی بھی آمدنیاں تھیں۔ بڑے صاحبِ ثروت، باپ حکیم دائم علی خاں کے صاحبزادے تھے، اس لیے ان کا ذاتی مکان کیا سارا محلہ تھا جس میں ان کے کنبے کے لوگ بھرے ہوئے تھے، لیکن بایں ہمہ اللہ کا یہ بندہ علم کے اس دریا کو جس جگہ بیٹھ کر ہند و بیرون ہند میں جاری کیے ہوئے تھا، میں اُس کا چشم دید گواہ ہوں کہ وہ صرف خام دیوار وں

اور کولہو کے چھپر کا ایک سہ درہ دالان تھا جس کا طول شاید بارہ ہاتھ اور عرض غالباً پانچ ہاتھ سے زیادہ نہ تھا۔ جاجم کا ایک فرش بچھا رہتا، چھوٹے چھوٹے پائے کی ایک میز استاذ مرحوم کے سامنے رہتی جس پر طالب علم کتاب رکھ کر ان کے سامنے پڑھتے اور طلبہ کے لیے بھی معمولی لکڑی کی دستی تپائیاں تھیں جن پر وہ اپنی کتابیں رکھ کر سبق سنا کرتے تھے، یہ حیثیت تھی اس دارالعلوم کی اور اس کے فرنیچر ساز و سامان کی جہاں سے پڑھ پڑھ کر ایک طرف لوگ ہندوستان کے شہروں میں پھیل رہے تھے، اور دوسری طرف بخارا کابل سمرقند اپنے اپنے اوطان کی طرف جا رہے تھے۔ مٹی کے اسی دالان میں بخاری ترمذی ہدایہ تلویح کے اسباق بھی ہوتے تھے اور حمداللہ قاضی مبارک شمس بازغہ صدرا جیسی معقولات کی عام درسی کتابوں کے سوا شرح تجرید قوشجی مع حواشی دوانی و صدر معاصر شفاء و اشارات، الافق المبین جیسی کتابیں جنہیں وہاں کی اصطلاح میں قدما کی کتابیں کہتے تھے، ان کا درس بھی اس خصوصیت کے ساتھ جاری تھا کہ اب دنیا کے طول و عرض میں ان کتابوں کے پڑھنے والے اس علمی خاندان کے سوا اور کہیں پڑھ نہیں سکتے تھے، بلکہ بسا اوقات اسی دالان میں نفیسی و شرح اسباب قانونِ شیخ طب کی کتابوں کا درس دن کو ہوتا تھا اور رات کو حضرت استاذ اسی میں بیٹھ کر طبی طلبہ کو مطب کے نسخے بھی لکھواتے تھے، کبھی کبھی اس میں تصوف کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں، اور جب درس کا کام ختم ہو جاتا تھا، تو چند طلبہ کی خواب گاہ کا بھی کام اسی دالان سے لیا جاتا تھا۔ یہ کانوں کی سنی ہوئی نہیں، برسوں آنکھوں کی دیکھی ہوئی بات ہے۔

میں شاید دور نکل گیا، یہ کہنا چاہتا تھا کہ "مدرسہ" کا لفظ جب ہماری کتابوں میں بولا جاتا ہے تو خواہ مخواہ اس کے متعلق یہی فرض کر لینا کہ وہ کوئی عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کی مانند اینٹوں اور پتھروں کا مجموعہ ہوگا، خود بھی دھوکہ کھانا ہے اور دوسروں کو بھی دھوکہ دینا ہے۔ اب وہ غلط تعلیمی نظریہ تھا یا صحیح، لیکن تعلیم و تعلم کے لیے بجائے قید و بند کے حتی الوسع ہمارے بزرگوں کے سامنے اشاعتِ تعلیم جیسی اہم ضرورت کے لیے اطلاق اور عمومیت ہی سے

اصول کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا، صاحبِ ہدایہ نے مسئلہ ربوا پر بحث کرتے ہوئے ایک موقع پر لکھا ہے کہ جن چیزوں میں منافع کے وجوہ اور پہلو زیادہ ہونگے، یہ اسلام کا اصول ہے کہ

السبیل فی مثلہا الاطلاق بابلغ الوجوہ لشدۃ الاحتیاج الیہ دون التضئیق فیہ

ایسی چیزوں میں جہاں تک ممکن ہو، اطلاق اور عمومیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کیونکہ آدمی ان کا شدت سے محتاج ہو نہ کہ ان میں تنگی پیدا کی جائے۔

یہ اپنا اپنا مذاق ہے کہ ضرورت بھی کسی چیز کی شدت سے محسوس کی جائے اور کرائی جائے لیکن باوجود اس کے کوئی اس میں "تضئیق" اور تنگی کے اصول کو پسند کرتا ہے اور کوئی اطلاق کو جب تک ڈائرکٹر کا محکمہ قائم نہ ہولے، جب تک اس محکمہ کے مصارف کے لیے سالانہ لاکھوں روپے کی منظوری نہ صادر ہولے، جب تک عمارت نہ تیار ہولے، جب تک اتنی رقم کا نہ بندوبست ہولے کہ باضابطہ معقول تنخواہوں کے مدرسین کے تقرر کا امکان پیدا ہو جائے۔ جب تک پڑھنے والے بچوں کے باپ کی اتنی آمدنی نہ ہولے جس سے ہر سال بدل جانے والی نصابی کتابوں قیمتی کاپیوں، کھیل کود کے قیمتی آلات (بیٹ، رکیٹ، فٹ بال) قیمتی یونیفارم، نیز ماہوار قیام و طعام کے مصارف، اور اسکول و کالج کے مطالبات وغیرہ وغیرہ کی تکمیل کے لیے کافی نہ ہو اس وقت تک "تعلیم" کا لفظ کوئی زبان پر نہیں لا سکتا۔

اشاعتِ تعلیم کے حامیوں کا ایک اصول یہ ہے، اور اسی کے مقابلہ میں تعلیم ہی کا ایک دستور وہ بھی تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی کسی گھنے درخت کی چھاؤں اور مٹی کی کچی دیوار کا احاطہ کافی سمجھا جاتا تھا، مدرسے بھی بنتے تھے تو جہاں ہم محمود گاواں کے رنگین میناروں والے اور بالائے بندیسری اور حوضِ علائی کی شاہانہ عمارتوں کو دیکھتے ہیں اسی کے ساتھ ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ

ملا علاء الدین لاری بہ آگرہ آمدہ بدرس مشغول شدند و مدرسہ از خس ساختند (بداؤنی ص ۱۳۲ ج ۳)

؎ ملا علاء الدین لاری وہی ہیں، جن کا شرح عقائد نسفی پر مشہور حاشیہ ہے آگرہ میں ان کا

مدرسہ" مدرسۂ خس کے نام سے مشہور رہا لیکن خس سے کیا وہ خس مراد ہے جس سے "خس خانہ و برفاب" والی لذت گرمیوں میں حاصل کی جاتی ہے، اور غالب جس کے بغیر روزہ رکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ خس کو آج جس معنی میں ہم استعمال کر رہے ہیں، یہ ہندوستان کی ایک جدید اصطلاح ہے، جس کی ابتدا اکبری عہد سے ہوئی[1]، ورنہ خس کے وہی عام مشہور معنی گھاس پھوس کے ہیں "فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے" کے مصرعہ میں غالب ہی نے جس معنی میں اس کو استعمال کیا ہے "مدرسۂ خس" یعنی گھاس پھوس کا مدرسہ آگرہ میں مولانا نے بنایا تھا، الغرض وہی اصول کہ جس چیز کی ضرورت جتنی زیادہ ہوگی اسی حد تک اس کو قیود و شرائط کی پابندیوں سے آزاد رکھنا چاہیے[2]۔ اصل کام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کے غیر ضروری لوازم کی پابندیوں کو

---

[1] آئینِ اکبری میں ابوالفضل نے ہندوستان کی مداحی کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے: "از کمی آب سرد، وافزونی گرمی، و کیابی انگور و خربزہ وگستردنی ونشتر طنزگاہ کار آگاہاں بود" کار آگاہاں سے غالباً بابر کی طرف اشارہ ہے جس نے تزک میں "جز بزہ نے انگور نے برف نے" کے الفاظ سے ہندوستان کو طنز گاہ بنایا تھا، ابوالفضل نے لکھا ہے کہ اس طنز کے ازالہ کے لیے بھی اور ترکستانی امراء کے لئے ہندوستان کی گرمی ناقابلِ برداشت بنی چلی جارہی تھی "گیتی خداوند (اکبر) ہمہ را چارہ گر آمد" ابوالفضل کے گیتی خداوند کی چارہ گری ہی کا یہ ثمرہ ہے کہ پانی کو "بشورہ سرد کردن روائی گرفت واز شمالی کوہ (ہمالہ) برف آوردن کہ ومہ دانست" گویا ہندوستان کے "کہ ومہ" چھوٹوں بڑوں کی رسائی عہد اکبری ہی سے برف تک ہونے لگی، اسی کے بعد "خس" کا قصہ بھی لکھا ہے کہ "بیخے بود بویا بس خنک آں را خس گویند بفرمائش گیتی خدیو (اکبر) ازاں نے بست خانہا ساختن رواج یافت وچوں آب افشانند زمستانے دیگر در تابستان پدید آمد" جس سے معلوم ہوا کہ خس اور خس کی ٹٹیوں کا رواج اکبر کے زمانہ سے اس ملک میں شروع ہوا۔ کیا شبہ ہے اکبر کی ذہانت اور طباعی میں اور سچ پوچھیے کہ بگاڑنے والوں پر طبیعت اسی لیے تو زیادہ بگڑتی ہے کہ اسلام کے ایسے قیمتی سرمایہ کو چند ذاتی عداوتوں کے بت پر نثار کر دیا گیا۔ اور ہندی اسلام کے جگر پر ایسا کاری زخم لگایا گیا کہ بااین ہمہ چارہ گری آج تک اس کی کسک محسوس ہو رہی ہے۔ خس کی ایجاد پر خیال آیا کہ حجاج بن یوسف جب بنی امیہ کی طرف سے کوفہ کا گورنر ہو کر آیا، تو طائف جو حجاج کا وطن تھا اس کے سرد موسم کی عادت نے کوفہ کو حجاج کے لیے جہنم بنا دیا۔ لکھا ہے کہ قریب قریب خس خانہ کے حجاج نے بھی سبز بید کی شاخوں سے ایک چیز بنائی تھی۔ ابن عساکر میں ہے کہ حجاج گرمیوں میں فی قبہ من خلاف ای صفصاف سقفها بالثلج وهو يقطر عليه۔ بید کی شاخوں سے بنائے ہوئے ایک قبہ میں رہتا تھا ان شاخوں کو پھاڑ پھاڑ کر بیچ میں برف بھری جاتی تھی وہی ٹپک ٹپک کر حجاج پر پڑتی رہتی تھی۔

[2] (در صفحہ ۳۵۳)

مسلمانوں نے اپنے لیے کبھی ضروری قرار نہیں دیا۔ ایک ایک شہر میں ہزار ہزار اور پان پان سو سات سات سو مدرسوں کی گنجائش کیا ان پابندیوں سے نکلے بغیر پیدا ہو سکتی ہے۔

آج جب تعلیم و تعلم کی دنیا کو بھی ساہوکارہ کا بازار بنا دیا گیا ہے نئی نئی شکلوں کے قلم بیچنے والوں، بھانت بھانت، طرح طرح کی دواتوں کے بنانے والوں، کتابوں کے فروخت کرنے والوں، الغرض انسانوں کا ایک ہجوم ہے جو مختلف بھیسوں میں علم کے طالبوں اور علم کے خادموں کو نشانہ بنا کر ان پر ٹوٹ پڑا ہے۔ حکومت کی پشت پناہی میں لوٹ مچی ہوئی ہے کچھ فریب سے کچھ بچوں کی خام عقلی اور کچھ حکومتی جبر سے کام لے کر طالب العلموں سے روپے وصول کرنے کی نت نئی پیچیدہ ترکیبیں بنائی گئی ہیں۔ علم کے دائرہ میں قدم رکھنا شرط ہے کہ ڈاکوؤں کا جو گروہ بھیس بدلے مختلف موڑوں پر بیٹھا ہوا ہے کچھ اس طرح لپٹ پڑتا ہے کہ ان سے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ صبح ہوئی اور سائیکلوں کے پیچھے کتابوں، کاپیوں سلیٹوں اور خدا جانے کن کن چیزوں کا پشتارہ باندھے غریب طالب العلم اسکول کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے یہ وہ نقشہ ہے جو اس نظامِ تعلیم نے پیش کیا ہے جو آپ کے سامنے ہے لیکن یہی ہندوستان تھا، یہی ملک اس کا یہی آسمان، یہی زمین تھی جس میں تعلیمی فرائض کو مفت انجام دینے والے جہاں اوپر کی جماعتوں کے وہ طلبہ نظر آتے تھے جو آج ٹیوشن زدگی کے عارضہ میں مبتلا ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں کہ علم ان سے روپیہ مانگتا ہے، اتنا روپیہ مانگتا ہے جو ماں باپ فراہم نہیں کر سکتے اور ساری رسوائیاں وہ اسی مطالبہ کے ہاتھوں آج برداشت کر رہے ہیں۔

لیکن خیر اگر طلبہ مفت پڑھاتے تھے تو یہ تعلیم و تعلم کی دنیا کے آدمی ہی تھے نیز پڑھانے

(حاشیہ صفحہ ۳۵۳) ۵ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کا تو دعویٰ تھا کہ تشریعی قوانین ہی کی حد تک نہیں بلکہ تکوینی قوانین میں بھی قدرت کی کارفرمائیاں اسی اصول کے تحت ظاہر ہوتی ہیں، انہوں نے مثال دی ہے کہ ہوا پانی کا چونکہ ہر شخص محتاج ہے اس لیے ہر جگہ یہ چیزیں میسر آتی ہیں لیکن الماس، یاقوت، لعل، وزمرد کی کوئی حقیقی ضرورت آدمی کو نہیں ہے نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اتنا نایاب کر دیا گیا کہ بادشاہوں اور نوابوں کے سوا عام لوگوں کو ان کا دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا ۱۲۔

کی اس مشق سے ان کا علم تازہ ہوتا تھا۔ اسی ذریعہ سے بتدریج ان کی شہرت وعظمت کا آوازہ بلندی حاصل کرتا تھا مگر تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ اتفاقاً اِکّے دُکّے نہیں تقریباً ہر معتد بہ آبادی والے شہر اور قصبات بلکہ دیہاتوں میں مفت بالکل مفت پڑھانے والوں کا ایک بڑا طبقہ آخر وقت تک اس ملک میں ان لوگوں کا پایا جاتا تھا جن کا معاشی مشغلہ درس و تدریس نہ تھا۔ وہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوتے تھے، یا تجارت کرتے تھے، زراعت کرتے تھے، لیکن سب کچھ کرنے کے ساتھ روزانہ بالالتزام پڑھانے کا کام بھی آخر دم تک انجام دیتے رہتے تھے، عہد بلبن کے مستوفی الممالک اور صدر کل شمس الملک جن کے متعلق تاج ریزہ کے قصیدہ کا مشہور مطلع ہے۔

صدرا! کنوں بہ کام دل دوستاں شدی مستوفی ممالک ہندوستاں شدی

لیکن سُنتے ہیں کہ "مستوفی ممالک ہندوستان کے منصب عالی پر جو سرفراز تھا، اُس کا سب سے بڑا امتیازی وصف کیا تھا۔

"اکثر علمائے شہر شاگرد او بودہ" ص اخبار الاخیار۔

جن میں ایک حضرت سلطان المشائخ نظام الاولیا، قدس سرہ العزیز بھی ہیں، حریری کے چالیس مقالے جو سلطان جی نے زبانی یاد کیے تھے یہ اُسی زمانہ کی بات ہے جب شمس الملک سے آپ پڑھتے تھے۔

دربار اکبری کے حکیم و عالم ملا فتح اللہ شیرازی کے متعلق تو پہلے بھی گذر چکا ہے کہ ایک طرف وہ مغل امپائر کا بجٹ (موازنہ) تیار کرکے بادشاہ سے خوشنودی حاصل کرتے تھے ٹوڈرمل کی وزارت کے شریک غالب تھے۔ اور اسی کے ساتھ صرف اعلیٰ جماعت کے ہی طلبہ کو نہیں بلکہ ملا بداؤنی کا بیان گذر چکا کہ پانچ پانچ چھ چھ برس تک کے بچوں کو قاعدہ اور ہجا نویسی بھی سکھاتے تھے اور تعلیم و تدریس کے اس مشغلہ کے ساتھ اپنے آپ کو مقید کر رکھا تھا۔

ان ہی باتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ خواہ بہ ظاہر معاشی پیشہ کسی کا کچھ بھی ہو لیکن اپنے پاس جو

جو بھی کسی قسم کا علمی کمال رکھتا تھا عموماً بغیر کسی معاوضہ کے اس علم کو دوسروں تک پہنچانا گویا اپنا ایک انسانی بلکہ اگر دینی علم ہوا تو مذہبی فرض خیال کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے قاضی (جج) و مفتی، صدرالصدور وغیرہ کے عہدوں پر جو لوگ سرفراز ہوتے تھے، چونکہ علما ہی کے ساتھ یہ عہدے مخصوص تھے، اس لیے علاوہ اپنے سرکاری فرائض کے عموماً سرکاری حکام کے اس طبقہ کا مکان یا دیوان خانہ یا محلہ کی مسجد وغیرہ ایک مستقل درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتی تھی، بلکہ جہاں تک میں خیال کرتا ہوں تاریخوں کی پڑھنے سے بھی اثر دل پر پڑتا ہے کہ کوئی قاضی ہو، مفتی ہو، صدرالصدور یا صدرِ جہاں ہو، اور معلمی کا کام نہ کرتا ہو، قریب قریب یہ بات ناقابلِ فہم تھی، اسی طرح ناقابلِ فہم جیسے اس زمانہ میں کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ضلع کا کوئی جج بھی ہو، اور بچوں کو اپنے مکان پر مفت پڑھاتا بھی ہو سرکاری اوقات میں ہائی کورٹ کی ججی کا کام بھی انجام دیتا ہو، اور گھر پہنچ کر طلبہ کے حلقہ میں بیٹھ کر کتابیں پڑھاتا ہو۔ دراصل ایک رواج تھا جو قرنہا قرن سے مسلمانوں میں جاری تھا، اور یہ رواج اس وقت تک باقی رہا جب تک کہ عدالتوں اور سرکاری محکموں پر بجائے بی اے اور ایم اے۔ ایل ایل بی۔ سول سروس وغیرہ کی ڈگری داروں کے بیچارے مولویوں کا قبضہ تھا، اور مکالے کی تعلیمی رپورٹ کے انقلابی نتائج سے پہلے سب جانتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا چراغ اگرچہ بجھ چکا تھا، لیکن سرکاری عہدوں پر مولویوں ہی کا تقرر ہوتا تھا، موروثی روایات ہی کا یہ اثر تھا کہ انگریزی حکومت کے زمانہ میں بھی ان غریب مولویوں نے سلف کے اس طریقہ کو حتی الوسع باقی رکھنے کی کوشش کی، کلکتہ کو دارالسلطنت بنا کر انگریزوں نے کاکوری سے مولانا نجم الدین کاکوروی کو طلب کیا اور "اقضی القضاۃ" کا عہدہ یعنی کلکتہ کے چیف جسٹس کا عہدہ آپ کو دیا گیا، مگر باوجود اس کے ان کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

بمنصب اقضی القضاۃ کلکتہ ممتاز بود معہذا بہ تدریس و افادہ طلبہ علوم بغایت می کوشید

(تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۲۳)

اسی کلکتہ میں اودھ کی آنجہانی حکومت کی طرف سے مشہور شیعی فاضل خان علامہ تفضل حسین خاں[1] انگریزی دربار میں سفیر تھے لیکن اس سفارت کے ساتھ ساتھ

بمطالعہ کتب وافادہ طلبہ علوم می گذرانید

حکومت مرشد آباد کے سفیر اور نائب السلطنت کلکتہ میں شاہ اُلفت حسین فریاد عظیم آبادی تھے ان کا کام یہ تھا کہ "نظامت" (حکومت مرشد آباد) کے پولیٹکل امور کا تصفیہ گورنر جنرل کلکتہ سے کرائیں۔ تین گورنر جنرلوں لارڈ ایلینبرا، لارڈ ہارڈنگ اول، لارڈ منٹو اول کے زمانہ تک مسلسل اس عہدہ پر ممتاز رہے، تنخواہ کئی ہزار ماہوار ملتی تھی نوابوں کی شان وشوکت، تزک و احتشام سے کلکتہ میں زندگی گذارتے تھے ان کے بیٹے مسٹر ہمایوں مرزا مرحوم اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں "اس زمانہ کے امرا کی جو تعلیمی شان تھی چونکہ اس کی یہ ایک چشم دید تصویر ہے میں اُنہی الفاظ میں نقل کرتا ہوں:-

"آفتاب ادھر نکلا گاڑی پر سوار ہو جاتے پھر گاڑی تیز گھر تک آئی، گاڑی سے اتر کر لینگ کے کمرہ میں جا کر پوشاک بدلتے اور نشست کے کمرہ میں آکر اپنی مسند پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے، آدمی پیچوان حقہ لا کر لگا تا تھا اتنے میں لوگ آنا شروع ہوتے"

یہ لوگ کون ہیں، کیا مصاحبوں اور احباب کا مجمع مراد ہے؟ ہمایوں مرزا لکھتے ہیں:-

والد مرحوم کو پڑھانے کا بہت شوق تھا اور لوگ بہت اصرار سے ان کے حلقۂ درس میں شریک

---

[1] تفضل حسین خاں اُس زمانہ کے ان مولویوں میں ہیں جنہوں نے علوم عربیہ کی تکمیل ملا حسن فرنگی محلی، مولوی وجیہ، مولوی محمد علی مہندس وغیرہ سے کر کے "زبان انگریزی و یونانی و لاطینی نیکومی دانست" لکھا ہے کہ کلکتہ میں انہوں نے یورپ کے فاضلوں سے یونانی اور لاطینی زبان سیکھی اور ان زبانوں پر ان کو اتنی قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ بے تکلف ان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، انہوں نے مغربی زبان کی معلومات کو پیش نظر رکھ کر متعدد کتابیں فن ہیئت اور جبر و مقابلہ میں لکھی ہیں جو افسوس کہ اب نہیں ملتیں، واللہ اعلم طبع بھی ہوئی ہیں یا نہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے ایک استاذ مولوی عثمان جعفری بیان کرتے ہیں کہ ان کے وطن مچھلی شہر ضلع جونپور میں تفضل حسین خاں کی کتابوں کے قلمی نسخے موجود ہیں لیکن جن صاحب کے پاس ہیں وہ دوسروں کو نہیں دکھاتے۔

ہوتے ...... دس بجے تک ڈیڑھ ڈھائی گھنٹے درس وتدریس کی صحبت رہتی، اس کے بعد برخاست کا حکم ہوتا طلبہ سب سلام کرکے رخصت ہو جاتے۔ (ص ۲۵)

یہ چلی ہوئی رسی کی آخری اینٹھن تھی جو ابتدائے عہد انگریزی تک باقی تھی۔

تذکرۂ علمائے ہند کے مصنف رحمٰن علی[1] نے اپنے استاد مولانا عبد الشکور مچھلی شہری کے حال میں لکھا ہے کہ "ہموارہ بہ مناصب جلیلہ از سرکار انگریزی عزّ امتیاز داشتند" لیکن اسی کے ساتھ "تمام عمر بدرس علوم صرف فرمودند" (ص ۱۹۲) جہاں جہاں تبادلہ ہوتا، طلبہ کا مجمع بھی ان کے ساتھ جاتا، مولوی رحمان علی بھی اس سلسلہ میں ان کے ساتھ فتح پور ہسوہ، غازی پور اور خدا جانے کہاں کہاں رہے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ بغیر کسی معاوضہ کے پڑھایا کرتے تھے، بلکہ بسا اوقات اپنی وسعت وگنجائش کی حد تک طلبہ کے قیام وطعام کا نظم بھی ان کی ذاتی آمدنی سے کیا جاتا تھا، مفتی صدرالدین دہلوی جو اپنے تخلص آزردہ کی وجہ سے مفتی آزردہ کے نام سے مشہور ہیں ان کے متعلق لکھا ہے:-

"از سرکار انگریزی بعہدہ صدر الصدوری وافتاء دہلی سربلندی داشت"

مگر باوجود اس جلیل عہدہ کے

"مردم از بلاد وامصار بعیدہ اذو مستفیدمی شدند بوجہ کثرتِ درس بہ تصانیف کم توجہ داشت"

اس "کثرتِ درس" کے ساتھ حال یہ تھا کہ

اکثر طلبہ مدرسہ دار البقاء کہ زیر جامع مسجد دہلی بود طعام ولباس می داد (ص ۹۳)

اور میں دوسروں کی کیا کہوں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، خود ہمارے استاذ حضرت مولانا سید

---

[1] مولوی رحمان علی کے نام کا عجب لطیفہ ہے۔ اس نام کی وجہ سے ہمیشہ ان کی کتاب تذکرۂ علماء ہند کے دیکھنے سے گریز کرتا رہا، سمجھتا تھا کہ کسی غیر عالم آدمی کی کتاب ہے لیکن اتفاقاً ایک دن نظر پڑ گئی، پڑھنے سے معلوم ہوا کہ آدمی تو عالم ہیں، پھر ان کا یہ نام ایسا کیوں تھا اس کا خطرہ برابر دل میں لگا رہتا، اسی کتاب سے معلوم ہوا کہ ان کا اصلی نام عبد الشکور تھا، لیکن ریواں کی ہندو ریاست میں جب ملازم ہوئے تو دلی عہد ریاست نے کہا کہ عبد الشکور کا لفظ میری زبان پر نہ چڑھیگا اس نے ان کا نام رحمان علی رکھ دیا، مجبوراً مولوی صاحب نے قبول کرلیا۔

برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ والیِ ملک کے طبیب خاص تھے۔ دولت و ثروت عزت وعظمت کے لحاظ سے آپ کا شمار امیروں میں تھا، لیکن ساری عمران کی طلبہ کے پڑھنے پڑھانے میں گذری جس کا صلہ تو کسی سے کیا لیتے شاید ہی کوئی زمانہ ایسا گذرتا تھا کہ آپ کے یہاں سے پندرہ بیس طالب العلموں کو کھانا نہیں ملتا تھا، جب ان سے پڑھا کرتا تھا کم سنی کا زمانہ تھا اس وقت اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن جب عملی زندگی میں قدم رکھا اور اب ان کی اس عجیب و غریب مخلصانہ قربانیوں کا خیال آتا ہے تو گھنٹوں سوچتا ہوں کہ یا الٰہی یہ کیا تماشا تھا آج یہ کیا حال ہے کہ اساتذہ کو تنخواہیں دیجاتی ہیں، الاؤنس ملتے ہیں، امتحانی آمدنیاں ہوتی ہیں، سب کچھ ہو رہا ہے لیکن عموماً اس کے بعد بھی اجیر معلموں کا عام طبقہ صبح و شام اسی فکر میں رہتا ہے کہ جہاں تک علم سے دور رہ سکتے ہیں دور رہیں، پڑھانے سے جتنا بھاگ سکتے ہوں بھاگیں۔ عربی مدارس کے قلیل المعاش اساتذہ کو تو شاید ایک حد تک معذور بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی قلیل تنخواہوں میں عصر حاضر کی گراں زندگی سے اندر اس کی توقع بیجا ہوگی کہ طلبہ کی وہ امداد کیوں نہیں کرتے جیسے ان کے اسلاف کا حال تھا، لیکن مغربی طرز کی درس گاہوں کے معلموں کو تو معقول مشاہرے ملتے ہیں۔ ہزار ہزار، بارہ بارہ سو ماہوار تک یہ کالجوں سے اٹھا رہے ہیں لیکن ان کے دسترخوانوں یا میزوں پر بھی کبھی کسی طالب العلم کو دیکھا گیا ہے؟

تعلیم کا پیشہ ہے، معاش کا وہی واحد ذریعہ ہے لیکن اس پر بھی امکانی حد تک علم سے گریز، فرصت کے اوقات زیادہ تر کلبوں اور نزہت گاہوں کی گلچینیوں میں گزرتے ہیں یہ ہے عام حال اس دور میں اُن لوگوں کا جن کا کاروبار ہی پڑھنا پڑھانا ہے۔

بلاشبہ چوبیس گھنٹوں میں ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ کچھ تفریحی مشغلوں میں وقت گذارے جسمانی صحت کے لیے بھی اس کی ضرورت ہے اور دماغی سکون کے لیے بھی۔ ہم جن بزرگوں کا ذکر کر رہے ہیں ان کی زندگی بھی تفریحی و انبساطی مشاغل سے خالی نہ تھی لیکن کس شان کے ساتھ حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی مرحوم فتنۃ الہند کے ہنگامہ میں انگریزوں نے

بالزام غدر جنہیں عبور دریائے شور کی سزا دی اور اسی اسر و قید کی حالت میں آپ کا انتقال جزیرۂ انڈمان میں ہوا، ابتداءً میں انگریزی حکومت کے ملازم بھی تھے لیکن جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا ملازمت کے ساتھ بھی درس تدریس کا قصہ جاری رہتا تھا، مولانا بھی اپنے وقت کے مشاہیر ارباب درس میں سے تھے۔ بلکہ عربی تعلیم کے حلقوں میں خیرآبادی خاندان کے نام سے جو تعلیمی اسکول موسوم ہے سچ پوچھیے تو اس اسکول کو فروغ دے کر ایک خاص طرز تعلیم کا اس کو نمائندہ بنا دینا اس میں سب سے زیادہ موثر حصہ آپ ہی کا ہے گو آپ کے پدر بزرگوار مولانا فضل امام صاحبِ مرقاۃ المنطق جو دلی میں صدر الصدور تھے اور حسب دستور درس بھی دیتے تھے، اسی طرح مولانا فضل حق کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی ان حضرات کو بھی خیرآبادی طریقۂ تعلیم کی ترویج میں خصوصی دخل ہے، لیکن اس سلسلہ میں جیسا کہ میں نے عرض کیا واسطۃ العقد اور درۃ التاج کا مقام مولانا فضل حق ہی کو حاصل ہے، معقولات کی تعلیم اپنے والد مولانا فضل امام سے پائی تھی اور حدیث کی سند حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حاصل کی تھی، اسیری فرنگ سے پہلے باوجود امارت و دولت کے زندگی بھر درس دیتے رہے، چونکہ امیر آدمی تھے، ایک وقت خاص تفریح کا بھی مقرر تھا مولانا کو شطرنج کا شوق تھا[1]، بساط بچھتی تھی اور شطرنج کی بازی ہوتی تھی، لیکن تفریح کے اس وقت میں بھی سنتے ہیں، اور سنتے کیا ہیں، دیکھیے تذکرۂ علماء ہند کے مصنف مولوی رحمان علی خود اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی شطرنج کی اس مجلس کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-

> بسال دوازدہ صد و شصت و چہار ہجری مؤلف ہیچمداں بہ مقام لکھنؤ بخدمتش رسیدہ، دیدکہ دریں حلقہ کشتی و شطرنجبازی تلمیذے را سبق افق المبین میداد و مطالب کتب را باحسن بیانے دل نشین

---

[1] شطرنج بازی کے متعلق اس میں شک نہیں کہ حنفی مذہب کی رو سے اسے جو کچھ بھی آپ چاہیں قرار دیجیے، لیکن بہرحال اگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جیسے امام متقی نے اس حنفی فتوے سے اختلاف کیا ہے اور یقیناً کیا ہے تو کیا اس کی شناعت وہی باقی رہتی ہے جو متفقہ جرائم کی ہے حنفی عالم کو بھی حکم لگاتے ہوئے امام شافعی جیسے امام کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے، اور مولانا کے فعل کی توجیہ کے لیے شاید یہ عذر نا قابل استماع نہیں قرار پا سکتا۔

می نمود۔ (تذکرہ علماء ہند، ص ۱۶۵)

دیکھ رہے ہیں تفریح بھی ہوتی ہے تو کس شان کے ساتھ ہو رہی ہے، واہی تباہی ہفوات وخرافات کی جگہ اس وقت بھی کچھ نہیں تو افق المبین کا درس ہی جاری ہے، قطع نظر اس سے کہ افق المبین جیسی صبر آزما ژولیدہ و پیچیدہ کتاب کا حسن بیان کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے پڑھانا مولانا کے اس غیر معمولی کمال کی دلیل ہے جو فن معقولات میں آپ کو حاصل تھا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی تفریح کا سامان بھی پڑھنا پڑھانا ہی بن گیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز کو چوبیس گھنٹوں میں تھوڑی دیر کے لیے اختلاج کا دورہ آخر میں ہونے لگا تھا اور بینائی تو مدت سے جا چکی تھی کہ اختلاج کا دورہ جوں ہی شروع ہوتا تھا شاہ صاحب قبلہ مکان سے باہر نکل کر جامع مسجد تک ٹہلتے تھے لیکن اس ٹہلنے کے زمانہ میں بھی ثقاۃ سے سنا گیا ہے کہ ادب کی مشہور کتاب مقامات حریری کا درس بحالت مشی جاری رہتا تھا۔ حریری کے پڑھنے کا وقت ہی یہ مقرر تھا۔ خم خانوں کو جن پینے والوں نے خالی کیا یہ وہ لوگ تھے۔ آہ!

اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخ زیبا لے کر

واقعات کہاں تک بیان کروں نظائر واشباہ کی حد بھی ہو، میں یہ بیان کر رہا تھا کہ علاوہ ان لوگوں کے جن کا کام ہی تعلیم و تدریس تھا اور جن کی امداد حکومت یا پبلک کی طرف سے ہوتی تھی، تعلیمی کاروبار کے ان چلانے والوں کے سوا جو ایک حد تک معاوضہ کے ساتھ کام کرتے تھے ملک میں ایک بڑا گروہ ان لوگوں کا تھا جو لے کر نہیں بلکہ بسا اوقات خود اپنی طرف سے کچھ دے کر لوگوں کو پڑھایا کرتا تھا اور یہ طبقہ ان طلبہ کے سوا تھا، جو خود تو بڑی کتابیں اپنے استادوں سے پڑھا کرتے تھے، اور چھوٹی پڑھی ہوئی کتابیں دوسروں کو پڑھاتے تھے، اور یوں تعلیم کا ایک بڑا حصہ بغیر کسی خرچ اور معاوضہ کے مفت انجام پاتا رہتا تھا لیکن آج جب پیسے کے بغیر کوئی ایک قدم بھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں کیا اس نقشے کو پھر کوئی قائم کر سکتا ہے

ایک بات تھی جو چل پڑی تھی، ورنہ زرطلبی کا جذبہ انسان میں کب نہیں رہا ہے، یہ زر، زمین ہی کا تو قصہ تھا جس نے پہلی صدی ہجری میں واقعہ حرّہ اور دشتِ کربلا کے فاجعات کو تاریخ کے اوراق پر خونیں حرفوں میں ثبت کیا ہے، خود درس و تدریس، تعلیم و تعلّم کے دائروں میں بھی ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو اسی ذریعہ سے دولت پیدا کر رہا تھا، مگر تعجب تو اسی پر ہوتا ہے کہ جن علوم و فنون کی قیمت اس زمانہ میں بایں شکل مل رہی تھی مولانا آزاد بلگرامی نے شیخ ابوالمعالی نامی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہ خوش الحان قاری تھے، دلی پہنچے، شاہجہاں کا عہد تھا امراءِ دربار سے کسی نے قاری صاحب کا ذکر کیا، طلبی کا حکم ہوا، حاضر ہوئے، رمضان کا مہینہ تھا شاہجہاں نے فرمائش کی کہ رمضان کے متعلق جو آیتیں ہیں ان ہی کی تلاوت کیجیے مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالمعالی نے۔

"شھر رمضان الذی انزل فیہ القرآن شروع کرد نوعے بآواز دل فریب خواند کہ بادشاہ را رقتے دست داد، استدعا اعادہ نمود نوبت ثانی در قرأت دیگر خواند (یعنی دوسری قرأت میں وہی آیتیں سنائیں) بادشاہ خیلے محظوظ گشت"

پھر کیا ہوا، صرف شمس القراء کا خطاب دے کر بادشاہ نے قاری صاحب کو گھر روانہ کر دیا، یا کوئی چھڑی یا سگریٹ کی ڈبیہ تحفہ میں دے کر قصہ ختم کر دیا گیا۔ اللہ اللہ کیا دن تھے، چند آیتیں پڑھ کر سنانے والے نے سنائی ہیں، اسی ہندوستان کا واقعہ ہے جہاں آپ ہم بھی موجود ہیں کہ

"قریہ سیر حاصل از توابع بلگرام کرد می نام حسب الاستدعا شیخ بر طریق مدد معاش مرحمت فرمود" (مآثر الکرام ص ۶۷)

اودھ کا ایک سیر حاصل گاؤں جاگیر میں مل گیا، چند آیتوں کے سنانے کا یہ صلہ تھا، آج قطبی و میر مختصر المعانی و مطول کے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کا جو حال بھی ہو، لیکن اس سرزمین میں ان ہی کتابوں کے مدرسین کے متعلق کوئی باور کر سکتا ہے کہ

"بزر سنجیدہ شد"

یہ فقرہ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے لکھا ہے، دلّی شاہ جہاں کی دلّی تھی، مولانا ارقام فرماتے ہیں کہ

"ہرگاہ وارد حضور (شاہ جہاں) می گردید بہ رعایت نقود نامعدود مخصوص گشت و
دوبار بزر سنجیدہ شد و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت"

ایک دفعہ نہیں دو دو دفعہ ملّا صاحب زر کے ساتھ تولے گئے اور اپنے ہموزن رقم لے کر گھر روانہ ہوئے، یہی نہیں بلکہ

چند قریہ برسم سیورغال (جاگیر) انعام شد۔ (ص ۲۰۵)

جمع کیا جائے تو اس قسم کے واقعات سے دفتر تیار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے پھر بھی ایک طبقہ علما، فضلا، و طلبا، کا اسی ہندوستان میں ان ہی زرخیز دربار، زر سنج دنوں میں تھا جس کے استغنا اور تعفف کا کنگرہ اتنا بلند تھا کہ مغل میائر کے سلاطین کی بھی وہاں رسائی نہ تھی، مناظرہ کی مشہور درسی کتاب رشیدیہ کے مصنف شیخ عبدالرشید جونپوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ملا محمود صاحب شمس بازغہ کے رفیق درس ہیں، زمانہ ان کا بھی وہی ہے، جب تخت تیموری پر شاہ جہاں جیسا دین پرور معارف پژوہ بادشاہ جلوہ فرما ہے، قدردانیوں کا شہرہ سن کر اقطار ارض سے علما، فضلا، شاہی دربار کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے پنجاب سے ملّا عبدالحکیم آتے ہیں اور بزر سنجیدہ ہو کر روانہ ہوتے ہیں، پورب سے ملّا محمود جونپوری آتے ہیں اور بادشاہ کے مقربین خاص میں داخل ہو جاتے ہیں انہی مولویوں میں ایک

ملا صاحب کے ایک ہموطن عالم حدائق الحنفیہ کے مصنف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔
جہانگیر، شاہجہاں بادشاہ کے دربار میں آپ کی بڑی عزت و توقیر تھی اور آپ شہزادگان کے استاد تھے چنانچہ شاہجہاں بادشاہ نے دو دفعہ میزان میں تلوایا اور ہر دفعہ چھ چھ ہزار روپیہ دیا، آپ کو سیالکوٹ میں سوا لاکھ روپے کی جاگیر ملی ہوئی تھی جو آپ کی اولاد کے پاس نسلاً بعد نسل موجود رہی۔ آخر میں گھٹتے گھٹتے اب سرکار انگلشیہ کے عہد میں بسبب انقطاع خاندان کے بالکل ضبط ہو گئی۔ (حدائق، ص ۴۱۵)

مولوی ملّا سعد اللہ نامی جو چنیوٹ پنجاب کے رہنے والے تھے، بالآخر اسی زمانہ میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

اسی بادشاہ تک شیخ عبدالرشید جونپوری کے علم و فضل، تقویٰ و زہد کا چرچا پہنچتا ہے۔ مولانا آزاد ارقام فرماتے ہیں:-

"صاحب قرآن شاہ جہاں بہ استماع اوصاف قدسیہ خواہش ملاقات کرد"

خود نہیں جاتے ہیں بلکہ بادشاہ خود خواہش ملاقات کرتا ہے، بلا بھیجتا ہے کس شان کے ساتھ؟

"منشور طلب مصحوب یکے از ملازمان ادب داں فرستاد"

"ادب داں ملازم" جو علم دین کی قدر و قیمت کا جوہری تھا، فرمانِ شاہی اسی کے حوالے ہوتا ہے مگر سنتے ہیں کہ شیخ عبدالرشید نے کیا کہا۔

"شیخ اباکرد (انکار کیا) و قدم از کنج عزلت بیروں نہ گذاشت (ص ۲۴۰)

جس دربار میں ایک ایک آیت کی تلاوت کے صلہ میں مسلّم مسلّم سیر حاصل گاؤں جاگیریں مل رہی تھیں، جب وہ خود بلا رہا تھا کیا کیا توقعات اُس کی ذات سے قائم کیے جا سکتے تھے، لیکن "کنج عزلت" کی حلاوت سے جس کا ایمانی ذوق چاشنی گیر ہو چکا تھا اُس نے دکھا دیا کہ شاہجہاں جیسے دراز کمند والے بادشاہوں کی رسائی بھی ان بلند آشیانوں تک نہیں ہے جنھوں نے ہر قسم کی غیر اللٰہی شاخوں کو کاٹ کر اللہ کی بلند ترین شاخ پر اپنا ٹھکانہ بنا لیا ہے حالانکہ اسی ہندوستان میں علم اور دین کی خدمت کو باشندوں کی ایک بڑی اکثریت دان پن، بھکشا کے استحقاق کا ایک قدرتی ذریعہ یقین کر رہی تھی، اس ملک میں جیسا کہ کہا جاتا ہے صحرائی اور جنگلی آشرموں[1] یا دوسرے الفاظ میں تعلیم گاہوں کے اساتذہ اور طلبہ دونوں کی

[1] یہاں اس کا ذکر شاید نامناسب نہ ہو، کہ ہندستان کے متعلق عام طریقہ سے جو یہ مشہور ہے کہ رشی منی لوگ جنگلوں میں آشرم بنا کر رہتے تھے، اور وہیں تعلیم و تعلم، درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، ان آشرموں کا جو نقشہ کتابوں میں کھینچا جاتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ بظاہر بہت دلآویز معلوم ہوتا ہے، مہابھارت کے قصص جن کے متعلق ملا عبدالقادر بدائونی نے ملا شیری جو اس کتاب کے ترجمہ کے لیے اکبر کی طرف سے مامور تھے (بقیہ بر صفحہ ۱۶۵)

گذربسر کا ذریعہ صرف بھیک، اور لقمۂ گدائی بنا ہوا تھا، اگر واقعی ہندی اسلام نے ہندی تمدن و تہذیب کے عناصر جذب کیے تھے۔ جیسا کہ کہنے والوں کا ایک گروہ کہہ رہا ہے، تو جس چیز کو ہزارہا سال سے اس ملک میں بجائے ذلت و اہانت کے عزو شرف کا ذریعہ ٹھہرایا جا چکا تھا۔ اسی کے اختیار کرنے میں ان بزرگوں کو کونسی چیز روک سکتی تھی، لیکن کسی موقعہ پر شیخ مبارک محدث رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر گذر چکا ہے، فاقہ کی شدت نے جکڑا کر زمین پر گرا دیا ہے، شاگرد حال سے مطلع ہوتا ہے، گھر سے مرغوب کھانا تیار کر کے لاتا ہے لیکن بھوک کی شدت سے جو زمین پر گرا ہوا تھا، وہ یہ کہہ کر کھانے کو سامنے سے اُٹھوا دیتا ہے کہ اشراف نفس والے کھانے کا کھانا اوروں کے لیے جائز ہو تو ہو، لیکن دین اور علم کے خادموں کے لیے اس کا کھانا جائز نہیں ہو سکتا۔

اُستاذ کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ جب میر مبارک کے یہی شاگرد یعنی میر طفیل محمد بلگرامی نے مسند درس و تدریس، افادہ و استفادہ پر قدم رکھا تو مولانا غلام علی آزاد کو جو میر طفیل محمد کے شاگردوں میں ہیں ان کے تعفف و استغناء کے جو تجربات ہوئے تھے ان میں سے ایک تجربہ کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ جن دنوں میں میر طفیل محمد بلگرام میں پڑھایا کرتے تھے، طرح طرح کے طلبہ مختلف علاقوں سے ان کے پاس آکر پڑھا کرتے تھے ان ہی طالب العلموں میں سے ایک طالب العلم کے متعلق بلگرام کے سناروں نے میر صاحب تک مختلف طور پر یہ اطلاعیں پہنچائیں کہ آپ کا فلاں طالب العلم ہمارے یہاں عموماً چاندی فروخت کرنے کے لیے لایا کرتا ہے، میر صاحب کا بیان ہے کہ یہ خبریں گو مجھے ملتی رہتی تھیں، لیکن میں نے اس طالب العلم سے کبھی نہیں پوچھا کہ قصہ کیا ہے، کچھ دن بعد جب وہ طالب العلم رخصت ہونے لگا تو دست بستہ مجھ سے کہنے لگا۔

"من کیمیا سازم استاذ من در کوہ سوالک می باشد، عمل قمری (چاندی بنانے کا طریقہ) مرا تعلیم کردہ است و فرمود کہ بعد ہفت سال دیگر عمل شمسی (سونا بنانے کا طریقہ) ہم تعلیم می کنم"

طالب العلم نے کہا یہ سات سال کی مدت میں نے آپ کی خدمت میں گذاری اور اب میں پھر اپنے استاذ کے پاس عمل شمسی سیکھنے کے لیے جا رہا ہوں اُس نے کہا:۔

"حق استاذی شما خیلے ثابت شدہ خدمت من ہمیں کہ این عمل را یادمی دہم"

یعنی تعلیم کے صلہ میں اس نے خواہش ظاہر کی کہ چاندی بنانے کا یہ طریقہ مجھ سے سیکھ لیجیے، میر صاحب کہتے ہیں" ہر چند مراتب مبالغہ طے کردآستیں افشاندم" اُس نے شدید اصرار کے ساتھ چاہا کہ میر صاحب یہ چیز اس سے سیکھ لیں لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے، میر صاحب کا بیان ہے کہ اس کو شاید شبہ ہوا کہ اس کے قول پر مجھے اعتماد نہیں ہے اسی لیے انکار کر رہا ہوں، یہ خیال کر کے "خاکسترے از کاغذ پیچیدہ برآوردہ" خاک کی ایک چٹکی اُس نے پگھلی ہوئی رانگ پر میر صاحب کے سامنے ڈالی "فی الفور نقرہ بربست" مگر "جو آستین جھاڑی جا چکی تھی" وہ پھر اس نسخہ کے لینے کے لیے نہیں چڑھائی گئی، مایوس ہوا اور "رخصت شد باز نیامد" (ص ۱۵۴)

اور دوسروں کو کیوں دیکھیے خود مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کا کیا حال تھا، میر طفیل محمد نے میر مبارک محدث سے اگر اس اثر کو اپنے اندر منتقل کیا تھا، تو کوئی وجہ تھی کہ میر طفیل محمد سے "یہ جوہر نایاب" ان کے شاگردوں تک منتقل نہ ہوتا؟ مولانا غلام علی مآثر الکرام میں اپنے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ازاں روزے کہ ناصیۂ اخلاص بآستانِ بیت اللہ آشنا شد بے گانگی از رسوم ابنائے روزگار بہم رسید"

حج سے لوٹنے کے بعد کہتے ہیں کہ جو چیز اندر چھپی ہوئی رہتی تھی حجرِ اسود کے مس نے اس کو باہر کر دیا، حجاز سے واپسی کے بعد اورنگ آباد دکن میں قیام اختیار کر لیا تھا۔ یہ آصف جاہ اول کے صاحبزادے نواب ناصر جنگ شہید کا عہد تھا، الحمد للہ سلطنت آصفیہ یوں تو اس وقت بھی ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے لیکن ناصر جنگ شہید کے زمانہ میں تو آصفی پرچم کے نیچے جنوبی ہند کا اکثر حصہ ساحلِ سمندر تک محروسۂ آصفیہ میں داخل تھا، مولانا غلام علی ہی نے حضرت آصف جاہ اول کے تذکرہ میں ان کے مقبوضات کے متعلق لکھا ہے۔

"از کنار دریائے نربدا تا اتصالِ بندر رامیشر در قبضہ تصرف داشت (ص ۴۲ روضۃ الاولیا)

جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ موجودہ وسعت کے لحاظ سے حکومت آصفیہ کا رقبہ تقریباً دونا تھا، اتنی

عظیم حکومت کے مطلق العنان بادشاہ نواب ناصر جنگ شہید اپنے والد مرحوم کے بعد ہوئے تھے، مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ

"با نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید خلف آصف جاہ (بانی سلطنت آصفیہ) ربط عجیبے اتفاق افتاد"

اس "عجیب ربط" کی نوعیت کیا تھی خود ان کا محتاط قلم اس کی تفسیر کرتا ہے۔

"موافقتے کہ بالاتر ازاں متصور نہ باشد دست بہم داد"

ایک مستقل والی ملک کبیر سے ایسی موافقت میسر آتی ہے جس سے زیادہ موافقت ناقابلِ تصور ہے لیکن اس موافقت سے ہندوستان کے اس مولوی نے کیا نفع اٹھایا خود ہی لکھتے ہیں،

"چوں نواب نظام الدولہ (ناصر جنگ) بعد پدر (آصف جاہ اول) بر مسند ایالت دکن نشست بعض یارانِ دلالت کردند کہ حالا ہر مرتبہ کہ خواہید میسر است اختیار باید کرد وقت را غنیمت باید شمرد"

ہر مرتبہ میں یقیناً "وزارت عظمیٰ" بھی داخل ہے چاہتے تو ممالک آصفیہ کی مدار المہامی مل سکتی تھی، اور جن گوناگوں قابلیتوں کے سرمایہ دار تھے بحسن وخوبی وہ اس منصب جلیل کے فرائض بھی انجام دے سکتے تھے، مگر دلالت کرنے والوں کو اپنی دلالت اور راہنمائی میں سخت مایوسی ہوئی جب وہی مولوی جو آج دنیا کی حقیر ترین ہستی ہے اسی کی زبان سے سُن رہے تھے۔

"آزاد شدہ ام، بندہ مخلوق نمی توانم شد"

حالانکہ موروثی جائداد جو بلگرام میں تھی جیسا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی حکومت اس سے دوسرے ارباب استحقاق کے ساتھ ان کے خاندان کو بھی محروم کر چکی تھی، جس کا مفصل قصہ گذر چکا، تلافی مافات کی بہترین صورت سامنے آگئی تھی، عمر بھی ساری ناز و نعمت میں گذری تھی، عالمگیری امیر میر عبد الجلیل نے (جو ان کے حقیقی نانا تھے) اُن ہی کے آغوش میں پرورش پائی تھی لیکن بایں ہمہ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے کہا:۔

"دنیا نہر طالوت است می نمائد غرفہ ازاں حلال بست زیادہ" دُنیا کی حالت طالوت کی نہر جیسی ہے کہ چلّو تو اس کا

حرام وایں شعر فرمودہ خود خواند ؎ حلال ہے، اس سے زیادہ حرام۔ اور اپنا کہا ہوا شعر سنایا جس کا

دراں دیار کہ شاہی بہر گدا بخشند — مطلب یہ ہے کہ جس دنیا میں ہر بھیک منگے کو بادشاہی تک عطا

غنیمت ست کہ ما را ہمیں بما بخشند — ہو رہی ہے اس میں یہی غنیمت ہے کہ میں اپنے آپ کو دے دیا جا رہا ہوں

اللہ اللہ سوچنے کی بات ہے کہ امیر گھرانے کے آدمی ہیں، نانا کے ساتھ بھکر سندھ میں وقائع نگاری جیسی اہم خدمت خود بھی انجام دے چکے تھے، دولت و ثروت سب لٹ چکی ہے۔ اور اسی لیے بجائے بلگرام (وطن اصلی) کے حجاز سے لوٹ کر بندر سورت سے سیدھے اورنگ آباد چلے آئے خود فرماتے ہیں۔ "ازانجا (سورت بندر سے) سرے بہ دیار دکن کشید وار خجستہ بنیاد اورنگ آباد گردید در مکتبہ شاہ بابا مسافر نقشبندی قدس سرہ گوشۂ انزوا گرفت (ص ۱۶۳ مآثر)

جہاں تک مجھے علم ہے اسی خانقاہ کے "گوشۂ انزوا" سے آپ کا جنازہ خلد آباد کی پہاڑی تک پہنچایا گیا، جہاں اس وقت تک آسودہ ہیں۔

اور ان قصوں کو کوئی کہاں تک بیان کر سکتا ہے، حضرت مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک دفعہ یہ صورت پیش آئی کہ نواب مرحوم کی چہیتی بیگم اور ان میں ان بن ہو گئی، بیگم نے جواہرات کا ایک صندوقچہ مولانا کے حوالہ کیا کہ آپ اس کو لے کر اپنے وطن بہار چلے جائیے اور اس سے چند گاؤں خرید لیجیے میں اپنی زندگی آپ ہی کے ساتھ گذار کر مر جاؤنگی، بیگم اس وقت جلال میں تھیں، مولانا نے شدید اصرار کے بعد صندوقچہ لینے کو تو لے لیا، لیکن بیگم کا غصہ جب کچھ دھیما ہوا

۱؎ آج کل اب یہ خانقاہ پن چکی کے نام سے مشہور ہے، اب اس گدی کا کوئی وارث باقی نہیں رہا، حکومت نظام کے محکمہ امور مذہبی کی نگرانی میں ہے، عجیب پُرفضا مقام ہے ایک بہتے ہوئے نالے کے اوپر خانقاہ کی عمارت بنی ہوئی ہے میلوں سے ایک نہر نکال کر خانقاہ تک لائی گئی ہے جو ایک بلند دیوار سے چادر بن کر خانقاہ کے حوض میں مسلسل گرتی رہتی ہے، دیکھنے کا سماں ہوتا ہے۔ اس خانقاہ میں کہتے ہیں کہ ایک بڑا عظیم الشان کتب خانہ تھا، لیکن دستبرد زمانہ نے اس کو تباہ کر دیا۔ کچھ کتابیں باقی رہ گئی ہیں، خانقاہ کے ساتھ ایک جاگیر بھی ہے۔ امور مذہبی کا محکمہ جاگیر کی آمدنی سے تعلیمی سلسلہ کو جاری کرنا چاہتا ہے۔ واللہ یوفقہ لما یحب ویرضی۔ مولانا آزاد مرحوم کا قیام اس خانقاہ میں زیادہ تر ان کتابوں ہی کی وجہ سے تھا، میں نے سنا ہے کہ کتب خانہ کی ایک ایک کتاب جو ہزاروں کی تعداد میں تھیں مولانا کی نظر سے گذری ہوئی تھی ۱۲۔

تو سمجھا بجھا کر ان کو ہجرت کے عزم سے باز رکھا، اور صندوقچہ جس حال میں دیا گیا تھا واپس کر دیا گیا حالانکہ جہاں تک میرا خیال ہے پانچ چھ لاکھ روپے سے کم کا وہ سرمایہ نہ تھا، چاہتے تو اس کو لے کر بہار کے رئیسوں میں جا کر شریک ہو جاتے۔ لیکن "غنیمت است کہ مارا ہمیں باز بخشند" کو جو لوگ غنیمت بارده یقین کر چکے تھے ان کے لیے تو اس قسم کے خطرات کا بھی احتمال نہیں[1]، یہ کیوں تھا کیا تھا؛ لوگوں کا ہندی اسلام کے متعلق کچھ بھی خیال ہو کسی کو اس میں عجمیت اور تاتاریت نظر آتی ہو کوئی اس میں ہندویت، اور بودھیت کے جراثیم پاتا ہے لیکن اپنا خیال تو یہی ہے کہ زندگی کے اور شعبوں کے متعلق خواہ کچھ ہی کہا جائے کہ اس وقت ان سے بحث نہیں لیکن علم و دین کی خدمت کے ایک استوار و محکم نظام کا جو خاکہ کھجور کے تنوں پر کھڑی مسجد میں بنایا گیا تھا، اس وقت تک جب تک مسلمان سیاسی طور پر دنیا میں مغلوب نہیں ہوئے تھے کسی نہ کسی شکل میں اسی "خاکہ" کی راہنمائی میں مسلمان چلتے رہے، حتیٰ کہ ہندوستان کے بھی یہ سارے قصبے

[1] اپنی خاندانی خودنمائی کا خیال بار بار بعض عجیب وغریب واقعات کے ذکر میں مانع آجاتا ہے۔ مولانا محمد احسن گیلانی جن کے مدرسہ گیلانی کا ذکر کسی موقع پر کیا گیا ہے؛ ایسے معتبر ذرائع سے یہ خبر مجھ تک پہنچی ہے جس کا انکار مشکل ہے، واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مولانا گیلانی جب لکھنؤ کی ایک مسجد جو دبیر الدولہ کی مسجد کے نام سے موسوم ہے قیام فرما تھے۔ اتفاقاً ان ہی دنوں میں بادشاہ وقت غالباً واجد علی شاہ کا عتاب کسی وجہ سے دبیر الدولہ پر نازل ہوا، قید کر دیے گئے، خاندان پر مصیبت ٹوٹ پڑی اس موقعہ پر مولانا نے قدیم آشنائی کا خیال کر کے دبیر الدولہ کے اہل خاندان کے لیے ممکنہ امداد بہم پہنچائی تھی۔ چند ہی دن کے بعد عتاب شاہی کا ازالہ ہوا، دبیر الدولہ جیل سے رہا ہو کر گھر آئے تو مولانا کی مواساۃ و ہمدردی کی خبر ہوئی بہت متاثر ہوا، اور ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم جو اس وقت اس کے پاس موجود تھی اس کا حکم لے کر مولانا کے پاس حاضر ہوا، پہلے تو مولانا نے رسمی لیت ولعل سے کام لیا لیکن وہ بجد تھا کہ اس کی حقیر رقم کو قبول کیا جائے، آخر جان چھڑانے کے لیے مولانا نے فرمایا آج شام ہو گئی ہے، کل صبح لینے دینے کا نظم کرونگا، شب درمیان تھی اسی سے نفع اٹھا کر لکھنؤ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد فرما دیا گیا کہ دبیر الدولہ کے اس روپے سے نجات حاصل ہو۔ اپنی کتابیں جن کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا سرمایہ نہ تھا مولوی جان علی صاحب گیلانی جو بعد کو مراد آباد میں متوطن ہو کر وہیں متوفی ہوئے ان کے حوالہ کر کے سیدھے رام پور تشریف لے گئے، اور پھر دبیر الدولہ کو اس کا پتہ چلنے نہ دیا کہ بہار کا وہ مولوی کہاں غائب ہو گیا۔ ساری عمر گیلانی جیسے کوردہ گاؤں میں گذار دی۔ رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

اگر غور کیا جائے تو ان میں بھی اسی خاکہ کی جھلک کے سوا آپ کو ان شاء اللہ اور کچھ نظر نہ آئیگا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرام کو ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر یہ حکم دیا تھا کہ

ان رجالا یاتون من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاستوصوا بھم خیرا۔ (مشکوٰۃ)

زمین کے اقطار سے لوگ تمہارے پاس دین سیکھنے کے لیے آئینگے، تو ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کیجیو۔

علم کے طلبہ کے متعلق مسلمانوں کے قلوب میں یہ عقیدہ بٹھایا گیا تھا۔

ان الملائکۃ لتضع اجنحتھا رضی لطالب العلم (مشکوٰۃ)

فرشتے علم کے طلب کرنے والوں کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں تاکہ اُن کو راضی رکھا جائے۔

اور اس بنیاد پر مسجد نبوی میں جو صفہ (چبوترہ) چھپروں کے نیچے اس لیے قائم کیا تھا کہ باہر سے جو لوگ طلب علم کے لیے آئیں، اُنہیں اسی میں ٹھہرایا جائے اور تعلیم دی جائے۔ اس صفہ کے رہنے والوں کی خبر گیری مسلمانوں کے سپرد تھی، کم و بیش اسلام کی اس پہلی تعلیم گاہ میں مختلف اوقات کے اندر طلبہ کی تعداد ستر اسی تک پہنچ جاتی تھی، کچھ تو لکڑیاں جنگل سے لاکر اور اُس کو بیچ کر اپنا کام چلاتے تھے، جیسا کہ بخاری میں ہے کہ دن کو صفہ والے لکڑیاں چنتے تھے اور رات کو پڑھتے تھے لیکن اصحاب ثروت و وسعت کی طرف سے باشارۂ نبوت ان کی امداد بھی ہوتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست ان لوگوں کے کھانے پینے کے مسئلہ کی نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ کوئی خراب چیز اگر ان کے لیے بھیجتا تو حضور اس پر تنغص کا اظہار فرماتے، مدرسہ کے بعض ممتاز طلبہ مثلاً معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر کیا گیا تھا کہ جو امداد ان طلبہ کے لیے کہیں سے آئے اس کی حفاظت بھی کریں اور طلبہ میں تقسیم بھی کریں، یہ ساری باتیں صحاح کی کتابوں میں آپ کو مل جائینگی۔ ایک طرف عام مسلمانوں کو تو ان طلبہ کے ساتھ استیصاء خیر کا یہ حکم تھا، مگر دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اسی صفہ کے ایک طالب العلم کا انتقال ہوتا ہے غسل کے وقت کمر سے ایک اشرفی نکلتی ہے پیغمبر کی زبان سے کیۃ من النار (آگ میں داغنے کا ایک آلہ) کی آواز سُن کر مجمع تھرا اٹھتا ہے کہتے ہیں کہ دوسری

دفعہ ایک اور طالب العلم کی کمر سے دُو اشرفیاں برآمد ہوئیں کیتان من النار (آگ میں داغنے کے دو نسلے) کی آواز لسانِ نبوت سے پھر سُنی گئی، جس کا مطلب یہی تھا کہ مسلمانوں کو تو یہی چاہیے کہ علم کے ان پیاسوں کے ساتھ اپنی اپنی استطاعت کی حد تک نیکی کا برتاؤ کریں، لیکن خود طلبہ کو چاہیے کہ اپنی نگاہ بلند رکھیں۔ طلبِ علم کو زرطلبی کا ذریعہ نہ بنالیں، اور جو ایسا کریگا، اسی کے متعلق فرمایا گیا کہ اس کی یہ آمدنی آخرت میں کیۃ من النار بن جائیگی یعنی اُسی روپے سے جہنم میں وہ داغا جائیگا۔

اسلام کے اس قسم کے احکام کا ایک سلسلہ ہے، توانا تندرست آدمی کو کہا گیا ہے کہ بھیک اُس کے لیے حرام ہے لیکن مسلمانوں کو کہا گیا کہ مانگنے والوں کو جھڑکنا نہ چاہیے۔ مردوں کو کہا گیا کہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکیں، لیکن عورتوں سے کہا گیا کہ ان کی نماز گھر کی، مسجد کی نماز سے بہتر ہے، اور یہی طریقۂ عمل طلبہ کے علم کے ساتھ اختیار کیا گیا کہ مسلمانوں کو تو چاہیے کہ ان کی امداد جس حد تک کرسکتے ہوں کریں، لیکن طلبہ کو چاہیے کہ حتی الوسع منت پذیری سے بچ سکتے ہوں تو بچیں اور سچ پوچھیے تو قرآن کی اس آیت کی ہی یہ تفسیر ہے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ	(صدقہ خیرات کا استحقاق) ان فقیروں کو ہے جو اللہ کی راہ
لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ	میں گھیر لیے گئے ہیں زمین میں چل پھر کر معاش مہیا
الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ	نہیں کرسکتے، جو نہیں جانتا وہ توان کو تونگر سمجھتا ہے
تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ	کیونکہ وہ سوال کرنے سے بچتے ہیں، تم انہیں ان کی
النَّاسَ إِلْحَافًا	پیشانیوں سے پہچان سکتے ہو، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں
	سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ اس آیت کا تعلق مسجد نبوی کی اسی تعلیم گاہ (صفہ) کے طلبہ سے بھی ہے، آیت بالا میں ایک طرف تو مسلمانوں کو کہا گیا ہے کہ ان کے سلوک کے مستحق طلبہ بھی ہیں جو تحصیل علم کے مشغلہ کی وجہ سے گھر گئے ہیں اوروں کی طرح تلاش معاش میں گھوم پھر نہیں سکتے، لیکن دوسری طرف ان طلبہ کے جو صفات بیان کیے گئے ہیں کہ تعفف و استغنار کا اظہار ان سے ایسا ہو

کہ جو حال سے ناواقف ہو سمجھے کہ یہ لوگ تو خوش حال، تونگر غنی ہیں، اور اگر کسی سے کچھ کہنے کی بھی ضرورت ہو تو پیچھے جھاڑ کر ان کے پیچھے نہ پڑ جائیں کہ گویا اس کو کمبل اڑھا رہے ہیں یا لحاف بن کر چھا جانا چاہتے ہیں، جیسے عام بازاری بھک منگوں گداگروں کا حال ہے، قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تعلیم کے وہ نتائج ہیں کہ ہر زمانہ میں ہر ملک کے مسلمانوں، اور وہاں کی حکومتوں کو ہم پاتے ہیں کہ طلبۂ علم کے ساتھ استبصار خیر اور حسنِ سلوک کو اپنا ایک مذہبی فریضہ خیال کرتے ہیں، مبالغہ نہیں ہے کہ لاکھوں لاکھ روپیہ سالانہ حکومتوں کی طرف سے بھی اور عام مسلمانوں کی طرف سے بھی تعلیمی مدہیں خرچ ہوتے تھے مگر باوجود اس کے ایک گروہ ان میں ایسا ہوتا تھا جو باوجود ضرورت و حاجت کے اسی تعفف اور استغنا کو اپنا شعار بنائے ہوئے رہتا تھا، اور جو ایسا نہیں کرتے تھے سوسائٹی میں ہمیشہ بری نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ فوائد الفواد میں سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کا ایک واقعہ درج ہے کہ حضرت والا سے ملنے کے لیے ایک طالب العلم حاضر ہوا، حضرت نے دریافت فرمایا، ان دنوں کس فکر میں ہو۔ بولا

"بدرسرائے آمد دشدمی کنم تامرا نانے دفراغتے حاصل آمد"

یہ سُن کر سلطان جی خاموش ہو گئے، متعلم بھی اُٹھ کر چلا گیا، حضرت والا تب اہل مجلس کی طرف مخاطب ہوئے اور یہ شعر پڑھا۔

در وصف حال بس ہنراست ~~~ چوں بخواہش رسید مسخرہ ایست

مطلب یہ ہے کہ حال اپنا جب بیان کرتے ہیں تو لوگ اپنے کو کھرے سکّے کی صورت میں پیش کرتے ہیں، لیکن جب نفسانی خواہشوں کا غلبہ ہوتا ہے تو وہی آدمی صرف ایک "مسخرہ" بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ

شعر چیزے لطیف ست اما چوں مدح می کنند و بر ہر کسے می برند سخت بے ذوق است"

مقصد مبارک یہ تھا کہ شاعری ایک بڑا کمال ہے لیکن اس کمال کو امیروں اور بادشاہوں کی تعریف میں جب استعمال کیا جائے تو اس سے شاعر کی کتنی بے ذوقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی حال علم کا ہے

طالب علم کے کیا کہنے، لیکن جب اس کو "نانے و فراغتے حاصل آمد" کا ذریعہ بنانے کے لیے در بدر آدمی مارا پھرے تو اس کی کور ذوقی میں بھی کیا شبہ ہے حضرت نے خود اپنے منشا کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا:۔

"علم ہمچنیں نفس خویش بس شریف چیزے ست اما چوں آنرا کسب سازند بدرہا می روند عزت آں می رود" (ص ۱۸۲)

پنڈت اور برہمن ہونا جس ملک میں ہر قسم کی خیرات کا آدمی مستحق بنا رہتا تھا اُسی ملک میں اب یہ خیال پھیلایا جا رہا تھا، لیکن ان کہنے والوں کو کیا کہیے کہ جنہوں نے اس ملک میں اسلامی اصول کی اشاعت کی ان پر الزام دھرا جاتا ہے کہ اسلام میں ہندی خصوصیات کو اُنھوں نے بھر دیا۔ گر ہم کہنے والوں کی سنیں یا جو واقعات اس ملک میں پیش آرہے تھے اُنہیں دیکھیں، خیال تو کیجیے کہ بلبن کا زمانہ ہے مسلمانوں کے عروج و اقبال کا آفتاب اس ملک میں نصف النہار پر ہے، بادشاہ کی یہ حالت ہے کہ علماء کا وعظ سنتا ہے اور روتے روتے اُس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہے۔ علم و طلبۂ علم کی ہر طرف عزت ہو رہی ہے عظمت ہو رہی ہے لیکن انہی دنوں میں اسی علم دین کے کچھ مخلص ایسے بھی تھے۔ فوائد الفواد میں ہی سلطان المشائخ کے حوالہ سے یہ قصہ منقول ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مولانا عزیز زاہد نے سلطان جی سے یہ واقعہ نقل کیا کہ مولانا برہان الدین کابلی نے ان سے اپنے طالب العلمی کے دنوں کا یہ ماجرا ایک دن بیان کیا کہ کسی ضرورت سے

"بر سپہ سالار جمال الدین نیشاپوری کہ کوتوال حضرت دہلی بود رفتہ بودم"

کوتوال کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ دسترخواں چنا گیا مولانا برہان سے کوتوال نے شرکت کی درخواست کی اصرار جب حد سے زیادہ بڑھا تو بیٹھ گئے کھانے میں کہتے ہیں کہ "حلوائے گدر بنرلو" یعنی گاجر کا حلوہ بھی تھا،

"کوتوال آں حلوہ آنرا پیش مولانا برہان الدین بنہاد و گفت ایں حلوہ چگونہ است"

دلّی کے پولیس کمشنر نے ایک غریب طالب العلم کے سامنے حلوا کی تشتری خود پیش کی ہو اس سے ایک طرف اگر اس کا پتہ چلتا ہو کہ اسی دلّی میں کبھی ان ہی طالب العلموں کا کیا عروج تھا لیکن اس سے زیادہ دلچسپ یہ ہو کہ کوتوال کے اس سوال پر کہ یہ حلوا کیسا ہو؟ مولانا بُرہان الدین نے جواب دیا :-

متعلمان نان خشک راہچناں خورند کہ	طلبۂ علم تو خشک روٹی کو اس طور پر کھاتے
حلوا گزرتواں دانست پس حلوائے	ہیں جیسے گاجر کا حلوا کھاتے ہوں، بھلا
گزرچہ گونہ خورند۔	ان بیچاروں کو گاجر کا حلوا کہاں سے
	مل سکتا ہو۔

مطلب یہ تھا کہ "ایں حلوا چہ گونہ است" کا جواب تو وہی دے سکتا ہو جس نے گاجر کا حلوا پہلے چکھا بھی ہو، وہ البتہ بتا سکتا ہو کہ آپ کا حلوا اچھا تیار ہوا نہیں ہو اور جن کے لیے خشک روٹی ہی حلوائے گزر کی قائم مقام ہو، ان سے آپ یہ کیا سوال کرتے ہیں، اور یہ کوئی اپنا ذاتی حال نہیں بیان کر رہے ہیں، عام متعلمین و طلبہ کو یہ حالت اس وقت بھی تھی جب دلّی کا کوتوال لندن اور مانچسٹر، گلاسگو کے باشندے نہیں، نیشاپور اور کابل کے باشندے ہوتے تھے، دلّی التمش اور بلبن کی دلّی تھی "آب اندر" کے باوجود اپنے آپ کو لب تشنگی کے اصول پر قائم رکھنا، یہ تھی اس زمانہ کی خصوصیت، سب کچھ بنٹ رہا ہو، لینے والے سب کچھ لے رہے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ہیں، مذہب نے ان کو تعفف کا حکم دیا ہو، ایسے تعفف کا کہ دوسروں کو اس کا پتہ نہ چلے کہ کس حال میں ہیں، علاء الدین خلجی کا زمانہ وہ زمانہ ہو کہ برنی کا یہ بیان اگر صحیح ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ علم اور دین کی قدر افزائیوں میں اس وقت ہندوستان کا ہمسر کوئی دوسرا اسلامی ملک نہ تھا، البرنی کے الفاظ یہ ہیں۔

"در تمامی عصر علائی در دار الملک دہلی علمائے بودند کہ آنچناں استاداں کہ ہر یکے علامۂ وقت بود در بخارا و در سمرقند و بغداد و مصر و خوارزم و دمشق و تبریز و صفاہان و رے و روم و در ربع مسکوں

نباشند، ہر علمے کہ فرض کنند از منقولات و معقولات تفسیر و فقہ، اصول فقہ و معقولات و اصولِ دین و نحو و لغت و معانی و بیان و بدیع و کلام و منطق موے می شگافند و ہر سالے چندیں طالبان ازاں استاداں سرآمدِ درجہ افادت می رسیدند و استحقاق دادن جواب فتوی می شدند و بعضے ازاں در فنونِ علم و کمالات علمی درجۂ غزالی و رازی می رسیدند (ص ۳۵۲ تا ۳۵۳) (فیروز شاہی)

یہ شنیدہ نہیں بلکہ مورخ کی "دیدہ" گواہی ہے، اور مورخ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں فیروز شاہی کا مصنف ہے جس سے اس کی قابلیت و ذہانت، وسعتِ نظر سب ہی کا پتہ چلتا ہے۔

مگر اسی عہد میں اودھ کے دو شریف لڑکے پڑھنے کے لیے آتے ہیں، انہی پڑھنے والوں میں ایک ہندوستان کے وہ تاریخی عالم تھے جن کے متعلق حضرت چراغ دہلوی کا مشہور شعر ہے:-

سالت العلم من احیاک حقا — فقال العلم شمس الدین یحییٰ

میں نے علم سے پوچھا تجھے واقعۃً کس نے جلایا — تو علم بولا کہ شمس الدین یحییٰ نے

شیخ محدث نے انہی کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے زمانہ میں

"از مشاہیر علما شہر (دہلی) بود بیشتر مردم شہر تلمیذ بانتساب او می کردند"

اور میر خورد نے تو خود ان کے عروج علمی کا معائنہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔ سیر الاولیاء میں لکھتے ہیں

بیشتر علمائے شہر منسوب بہ شاگردی ایں بزرگ اند و سند علم ہائے ظاہری و تحقیق علوم دینی نسبت بداں بزرگ می کنند و فخر و مباہات بمجلس رفیع آں بزرگ می دانند، کسے کہ بہ شاگردی آں منسوب است میان علما مبجل و مکرم است" (سیر الاولیاء ص ۲۲۶)

بہرحال یہی مولانا شمس الدین یحییٰ اپنے خالہ زاد بھائی مولانا صدرالدین نادلی کے ساتھ دلی میں پڑھنے کے لیے آئے تھے، مگر جانتے ہو علاء الدین خلجی والی علم دوست دلی میں علم ہی کے ان طالب علموں کے تعفف کا کیا حال تھا، سفید پوشی نباہنا چاہتے تھے لیکن اتنے پیسے بھی پاس نہ تھے کہ دھوبی کو اجرت دے کر کپڑے دھلوا لیا کریں۔ دستور تھا دونوں بھائیوں کا کہ

"در آوان تعلم در ایام تعطیل (جمعہ کے دن) برائے جامہ شستن حوالی غیاث پور برلب آب جون (جمنا) آمدند (ص ۲۲۳۔ سیر الاولیاء)

اور ان کے پاس تو شاید صابن بھی ہوگا لیکن ہم آج جس بزرگ کے نام نامی سے برکت حاصل کرتے ہیں یعنی خود سلطان جی نظام الدین اولیاء کا حال اپنی طالب العلمی کے زمانہ میں کیا تھا؟ میر خورد ہی نے اپنی سگی دادی کی زبانی یہ روایت لکھی ہے کہ حضرت والاجب اجودھن میں اپنے پیرِ طریقت بابا فرید شکر گنج سے تمہید ابوالشکور اور عوارف پڑھتے تھے، عمر بیس سال سے زائد نہ تھی، جوانی کا شوق مگر میر خورد کی دادی جو اجودھن ہی میں مقیم تھیں کہتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ

"جامہائے سلطان المشائخ بغایت رنگین (چکٹ) شدہ بود وسبب آں کہ صابون نہ بود کہ سپید کنند"

میر خورد لکھتے ہیں کہ میری دادی صاحبہ سے ان کا حال دیکھا نہ گیا اور بولیں۔

"اے برادر جامہائے تو بغایت رنگیں شدہ و پارہ ہم گشتہ اگر بدہی من بشویم و پیوند آں بر زنم"

بڑے ردوکد کے بعد سلطان جی اس منت پذیری پر راضی ہوئے اور

"جدہ رحمۃ اللہ علیہا.... چادر خود داد کہ ایں را بپوشند تا ایں غایت کہ جامہا را بشویم"

جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بدن پر جو جوڑا تھا سلطان جی کے پاس اس کے سوا کوئی دوسری چادر وغیرہ بھی نہ تھی، اس حکم کی تعمیل کی گئی، کپڑے اتار کر بوڑھی بی بی کے حوالے کیے گئے۔ اور ان کی چادر لپیٹ کر خود سلطان المشائخ

"کتابے در دست داشت و گوشہ گرفت و بمطالعہ آں مشغول گشت"

بڑی بی بیچاری نے کپڑے بھی دھو دیے، جہاں جہاں سے پھٹ گیا تھا ان پر پیوندزنی کر کے سلطان جی کے حوالہ کیا۔

بعد معذرت آں جامہا پوشیدہ (سیر الاولیاء ص ۳۱۸)

کہیں کسی کے دل میں اس کا خیال نہ گذرے کہ اس زمانہ میں کپڑوں کی قلت تھی اور اس لیے یہ حال تھا، اسی سیر الاولیاء میں میر خورد نے ہی اپنے حقیقی چچا کا حال یہ لکھا ہے کہ:۔

"بیش ترکسوت ایں سید پاک صوفیانہ صوفہائے رنگا رنگ کمخاب وچینی ومقطاع ومہین بود"

اور پہننے کی کیا حالت تھی۔

ازجنس جامہا چیزے پوشیدے آں راکرت دیگر نپوشیدے وبہرکہ خاطر مبارک او اقتضا کردے عطا فرمودے۔ (سیرالاولیاء ص ۱۸۱) — کپڑوں میں جو چیز بھی پہنتے تو پھر دوبارہ ان کا استعمال نہیں کرتے جسے جی چاہتا دے ڈالتے

کپڑوں کی اس ارزانی اور فراوانی کے باوجود کہ چالیس چالیس گز ایک ایک تنکے میں مل سکتے تھے، اس وقت بھی علم و دین کے طلبہ کی مستی و سرشاری کا یہ حال تھا، صفہ کی تعلیم گاہ ہی سے اس تعفف کی ابتدا ہوئی تھی، وہی روایتیں تھیں جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں، جن میں

لہ دلی میں خصوصاً اور ہند میں عموماً اس زمانہ میں کس کس قسم کے کپڑوں کا رواج تھا اس کا کچھ تو اندازہ میر خورد کی مذکورۂ بالا عبارت سے ہو سکتا ہے۔ مولانا عبدالحیی ناظم ندوہ مرحوم نے نزہۃ الخواطر میں عہدِ علائی کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کپڑوں کے متعلق لکھا ہے، فی تھان ان کپڑوں کی اس زمانہ میں کیا قیمتیں تھیں ترجمہ اس کا یہ ہے۔

چیرۂ دہلی = ۲۰ تنکہ، چیرۂ کوکرہ ۔ ۲ تنکہ۔ سرٹی صاف اعلیٰ قسم پانچ تنکہ، متوسط تین، اونیٰ دو تنکہ، سلاٰئی اعلیٰ چار تنکے، متوسط تین، اونیٰ دو۔ الکرباس الاعلیٰ بیس گز کا تھان ایک تنکہ، کرباس متوسط تیس گز کا تھان دو تنکے کرپاس اونیٰ چالیس گز کا تھان = ایک تنکہ۔ سادہ کرپاس دس جیتل۔

اور یہ فہرست تو اس زمانہ کی ہے جب مسلمان ہندوستان پہنچ کر یہاں نئے صناعات اور دستکاریوں کو مروج کیا ہے، اس کے بعد مغلوں کے عہد تک ان میں جو ترقیاں ہوئی ہیں صرف کپڑوں ہی کے متعلق ان کی فہرست طویل ہے۔ آئین اکبری میں ابوالفضل نے عہد اکبری کے ریشمین اور سوتی کپڑوں کی جو فہرست دی ہے اسی کو پڑھ جایئے آپ کو ریشمی کپڑوں میں مخمل، زربفت، فرنگی، گجراتی، کاشی، ہردی، طاس گجراتی، داراتی، مشجر فرنگی، دیبائے فرنگی، دیبائے یزدی، فارا، اطلس خطائی، خز، مخمل فرنگی، خاتی، سہ رنگ قطنی، کتان، تافتہ، ابری، مطبق۔ یہ پچاسوں نام تو صرف ان کپڑوں کے ہیں جو ریشم یا ریشم کی ترکیب سے تیار ہوتے تھے۔ سوتی کی فہرست بھی کچھ چھوٹی نہیں ہے۔ چوتار، ململ، نین سکھ، مسری صاف، گنگاجلی، بھروتی، سیالور، بہادر شاہی گریہ سوتی، شیلہ دکن، بہرکل، سہن، جیونہ، اسادنی، محمودی، پنچتولیہ، جھولہ، چھینٹ وغیرہ وغیرہ

فائدہ۔ تنکہ کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ تنخواہ کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے اور اب وہی ٹکہ بن گیا۔ ایک تولہ کا سکہ تھا، چاندی کا ایک سکہ، چالیس جیتل کے مساوی تھا۔ جیتل تانبہ کا سکہ ایک تولہ کا تھا، لیکن ملفوظات عزیزیہ میں جیتل و تنکہ کے متعلق شاہ صاحب کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے "جیتل بجائے دمڑی از قسم فلوس خرد ومضروب در زمانِ سابق رائج بود و تنکہ از قسم ہشدہات چنانچہ ہم در بخارا رائج ست"۔ ص ۳ ملفوظات۔

صلاحیت تھی وہ اس کو قبول کرتے تھے، اور سچ تو یہ ہے کہ جس زمانہ میں تربیت کا حال یہ ہو، جیسا کہ چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے میر خورد نے سلطان المشائخ ہی کا واقعہ نقل کیا ہے کہ جن دنوں اجودھن میں تھے: "دانشمندے کہ یار و ہم سبق من بود و بجہا ایک جا گردہ پیش آمد" یعنی دلی کے زمانہ تعلیم کا ایک ساتھی اجودھن پہنچا پڑھ لکھ کر وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہو چکا تھا، سلطان المشائخ اپنے پھٹے پرانے حال میں اس سے ملنے گئے: "چوں مرا با جامہائے رنگیں دپارہ دید پرسید کہ مولانا نظام الدین ترا چہ روز پیش آمد" تم پر کیا وقت پڑا کہ اس حال میں ہو، اس بیچارے کو جو اس راہ کی لذتوں سے نا آشنا تھا، کیا جواب دیتے مگر وہ کہتا جاتا تھا "اگر در شہر تعلیم می کردے مجتہد زمانہ شدے و اسبابے و روزگارے بہتر شدے" خاموشی کے سوا اس کا جواب اور کیا ہو سکتا تھا خود فرماتے ہیں "از آں یار ایں سخن شنیدم و ہیچ نہ گفتم"

مل کر بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، اب آپ اسے کشف سمجھیں یا ایمانی فراست کہ بابا صاحب سلطان جی کو دیکھتے ہی فرماتے ہیں "نظام اگر کسے از یاراں تو پیش آید و گوید کہ ایں چہ روز ست کہ ترا پیش آمدہ" سلطان جی چپ رہے، ایک طالب العلم کو سلطان الہند بنانے کا کام جس کے سپرد تھا اس نے کہا، بابا صاحب نے فرمایا کہ

بگو ؎ نہ ہمرہی تو مرا راہ خویش گیر برو   ترا سعادت باد امرا نگونساری   (سیر ص ۲۳۹)

ساری کدورت دھل گئی، اور جامہ رنگیں ہی میں وہ مسرت ہاتھ آئی جو خلعت شاہانہ والوں کو عمر بھر میسر نہیں آسکتی، اور بابا صاحب کی اس تربیت کے متعلق تو شاید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت پیر ہونے کے مرید کی تربیت ان طریقوں سے فرماتے تھے، مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ کی مائیں بھی اپنے بچوں میں چاہتی تھیں کہ اسی جذبہ کی پرورش ہو، خود سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا، والدہ صاحبہ کے زیر تربیت بچپن کا سارا زمانہ گذرا لیکن کس طریقہ سے؟ خود ان ہی کا بیان ہے "والدہ مرا با من چناں معہود بود" یعنی دستور مقرر تھا کہ "روزے کہ در خانہ ما غلہ نہ بودے مرا گفتے" یعنی گھر میں جس دن کھانے کو نہ ہوتا تو اپنے یتیم بچے کی اسلام کی وہ خاتون نظر میں بلندی کن الفاظ سے پیدا کرتی تھیں، کہتیں "امروز ما مہمانِ خدا ایم"

اس لہجہ میں یہ فقرہ ماں کی زبان سے بچہ کے کان میں پہنچتا تھا کہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب زمانہ میں مسلسل کھانا ملنے لگتا، تو میں دل میں کہتا "من تنگ آمدم (روز روز کھانے سے تنگ آگیا) والدہ کہے، خواہند گفت من مہمان خدائم"

حضرت فرماتے ہیں کہ پھر یہ صورت جب پیش آجاتی اور من مہمان خدائم" والدہ فرماتیں "یک ذوقے و راحتے درمن پیدا شد" (ص ۱۱۳ - سیر)

یہ تھے وہ عقاب کے بچے جن کی فلک پیما نگاہوں میں قوت ان راہوں سے پیدا کی جاتی تھی، اس طالب العلم پر جس نے سلطان المشائخ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ "برد رسرائے آمد و رفت می کنم نانانے فراغتے دست آمد"

حضرت نے ناراضگی کا جو اظہار کیا تھا، یہ موروثی تربیت و تعلیم کا نتیجہ تھا، ورنہ آج یہ بات کیا قابل قناعت قرار پاسکتی ہے، سیر الاولیا میں اسی کے بالمقابل ایک اور واقعہ کا ذکر ہے، اودھ کے ایک عالم مولانا جمال الدین اودھی کمسنی میں فاتحہ فراغ اور تحصیل علم سے فارغ ہوچکے تھے، نوجوان ہی تھے کہ اودھ سے دلی سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اسی زمانہ میں ایک خراسانی مولوی دلی آیا ہوا تھا، بہ ظاہر جھگڑے اور مناظرہ و مجادلہ میں شہرت حاصل کی تھی، لوگوں میں "مولٰنا بحاث" کے نام سے مشہور ہوگیا تھا، کبھی حضرت والا کی خانقاہ میں بھی آتا جاتا رہتا تھا، مولانا جمال الدین جب خانقاہ میں موجود تھے کہ یہ خراسانی بحاث بھی کہیں سے آگیا، اور خانقاہ کے علماء سے مختلف مسائل پر الجھنے لگا، مولانا جمال الدین نے اس رنگ کو دیکھ کر خراسانی کو اپنی طرف متوجہ کیا اور چند ایسی گرفتیں کیں کہ "اورا ملزم گردانید"

ہندی مولوی کے پنجوں میں یہ خراسانی کچھ ایسا بُری طرح پھنسا کہ لاکھ نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن گرفت اتنی سخت تھی کہ سٹ پٹا کر رہ گیا۔ علماء کا جو مجمع موجود تھا "جملہ انصافہا کردند و گفتند کہ رحمت بر شما باد و علم شما کہ رعونت از سرایں عزیز دور گردید"

سلطان المشائخ کے خادم خاص و مشہور میاں اقبال بھی موجود تھے ان کو تو اتنی

مسرت ہوئی کہ بھاگتے ہوئے حضرت والا کے پاس اوپر پہنچے اور ہانپتے ہوئے عرض کیا کہ
جوان (مولانا جمال الدین) دانش مند است، با مولانا بحاث بحث کرد و در بزودی بحاث
را الزام داد، چنانکہ مولانا وجیہ الدین پائلی و یاران دیگر ہمہ انصافہا دادند"
اس خبر سے حضرت کو بھی خاص مسرت ہوئی، آپ واقف نہ تھے کہ مولانا جمال الدین فارغ التحصیل
عالم ہیں، میاں اقبال سے ارشاد ہوا، لالا جوان (مولانا جمال الدین) را با یاراں طلب کن"
میاں اقبال سب کو بلا کر اوپر لے گئے، اس وقت سلطان المشائخ نے مولانا جمال الدین
کو خطاب کرتے ہوئے جو بات فرمائی اس کا پیش کرنا یہاں مقصود ہے، فرمایا "ہمت بر آمدن نوکر
علم خود را نفروختی" (سیر۔ ص ۳۱۹)
مطلب یہ تھا کہ اس علم و فضل کے ساتھ تم دلی (پایہ تخت خلافت) پہنچے لیکن بجائے
اس کے کہ اپنے علم کا ڈنکا پیٹتے اور حکومت میں کوئی عہدہ اس ذریعہ سے حاصل کرتے تم ایک
عامی آدمی کی شکل میں میرے پاس آئے، اتفاق سے تمہارے علم کا اظہار ہو گیا، دیر تک ان کی
ہمت افزائی مختلف الفاظ میں فرماتے رہے۔
لیکن اسی کے ساتھ میں اس کو صرف مبالغہ اور غلو ہی نہیں بلکہ غلط بیانی قرار دونگا
اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ علم اور دین کے دائرہ میں جو لوگ زندگی بسر کرتے تھے سب کا یہی حال تھا
کچھ لوگ ایسے بھی تھے اور ایک گروہ ان ہی ملاؤں اور مولویوں میں ان کا بھی تھا، جو علم ہو یا دین
دونوں کو صرف حصول دنیا کا شبکہ یا جال قرار دیے ہوئے تھا۔ عہد اکبری مشہور قاضی نظام
بدخشی جن کے متعلق ملا عبد القادر نے لکھا ہے۔ "بر شرح عقائد حاشیہ و در تصوف رسائل متعدد تصنیف نمود"
لیکن یہی حضرت ہیں جنھوں نے "اول کسے کہ اختراع سجدہ پیش بادشاہ کرد در فتح پور او بود۔ ص ۱۵۲"

ؔ لالا شاید اس زمانہ میں پیار کا کوئی کلمہ تھا، بڑے چھوٹوں کو اس لفظ سے تعبیر کرتے تھے، غالباً بداؤں کا للا کا
لفظ اسی کی یادگار ہے "یاران" سلطان المشائخ کے جماعت خانہ کی اصطلاح تھی "مریدانِ خاص جو عموماً صحبت
عالی میں رہتے ان کو آپ "یاران" کے لفظ سے موسوم کرتے تھے۔
ؔ جس سے معلوم ہوا کہ بادشاہوں کے سامنے سجدہ گذاری کی رسم اکبری بدعات میں سے (بقیہ بر صفحہ ۳۸۱)

اور ایک بیچارہ یہ قاضی کیا؟ اکبری فتنہ میں جیسا کہ معلوم ہے زیادہ دخل انہی دنیا ساز عباد الدراہم والدنانیر علماء کا تھا، دین اور علم والے جب گرتے ہیں تو کہاں تک چلے جاتے ہیں۔ ملا عبد القادر بدایونی نے لکھا ہے کہ دربار میں ایک دن بایں شکل دو صاحب تشریف لائے کہ [illegible]

سر و بروت و ابرو را حلق موافق ریش ساختند (ص ۳۸۸) سر مونچھ بھاؤں سب کو منڈوا کر منڈی ہوئی ڈاڑھی کے برابر کیے ان میں ایک قرآن کے مفسر جناب مولانا فیضی فیاضی ہیں اور دوسرے علامی فہامی جناب مولانا ابو الفضل ہیں۔ آپ کے والد جناب مولانا مبارک محدث ناگوری کا آج انتقال ہوا ہے اسی سوگ میں ان علماءِ دین نے مچھندروں کی یہ صورت بنائی ہے،

اور سچ تو یہ ہے کہ ان بیچاروں کو کیا کہیے ان لڑکوں کے سامنے باپ نے اپنے جس کردار کو پیش کیا تھا اس کا نتیجہ اگر ان شکلوں میں ظاہر ہوا تو غالباً یہ محل تعجب بھی نہیں ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے تو صرف اپنے باپ کو دیکھا تھا لیکن خود ملا مبارک نے جن بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں جن کی صحبتوں میں بیٹھے تھے حتیٰ کہ ابو الفضل کا اگر یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت عبید اللہ احرار سے ملا مبارک کو بیعت کا شرف حاصل ہوا تھا، حافظ ابن حجر کے بدو واسطہ حدیث میں شاگرد تھے لیکن بایں ہمہ جس قسم کی زندگی انہوں نے گذاری اس کا اثر بیٹوں پر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، ملا عبد القادر جو ملا مبارک کے براہ راست شاگرد ہیں وہی ان کے متعلق یہ لکھ کر کہ

"از علماء کبار روزگار است در صلاح و تقویٰ و توکل ممتاز اہل زمان و خلائق دوران است، در ابتداء حال ریاضت و مجاہدہ بسیار کرد"

اسی لیے ابتداء میں آپ کے مذہبی جوش کا یہ حال تھا کہ اگر کسے در مجلس وعظ انگشتری طلا و حریر یا موزۂ سرخ یا جامۂ سرخ یا زرد پوشیدہ می آید فی الحال می فرمود کہ از تن برآرد و ازارے کہ از پاشنہ گذشتہ بودے حکم بہ پارہ کردن آں میکرد"

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۰) ایک بدعت ہے اسلاطین اسلام میں اس کا رواج نہ تھا، اکبر کے زمانہ میں اسی قاضی بدخشی نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ جہانگیر کے عہد میں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اس رسم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اس کی وجہ سے گو کچھ دنوں کے لیے حضرت کو جیل کی سزا بھگتنی پڑی جس کی تفصیلات مجدد نمبر الفرقان میں ملینگی۔ بحمد اللہ مجدد صاحب کی کوشش بارآور ہوئی اور شاہجہاں بادشاہ جس وقت تخت نشین ہوئے۔ اول حکمے کہ اصدار یافت منع سجدہ بود

[illegible]

"سماع" اور نغمہ سے ایسی نفرت تھی کہ اگر آواز نغمہ در رہ گذرے شنود سے جست نمودے" یعنی کود کر اس مقام سے دور بھاگتے تھے۔ ایک حال تو ملا صاحب کا یہ تھا، اس کے بعد قلابازیوں کا سلسلہ شروع ہوا، مآثر الامراء میں ہے:-

در عہد سلیم شاہ (پسر شیر شاہ سوری) بربط شیخ علائی[1] مہدوی بمہدویت شہرت گرفت، و در عہد آغاز اکبر کہ امراء چغتائیہ تر در عرصہ بودند بطریقہ نقشبندیہ خود را وانمود پس ازاں بسلسلہ مشائخ ہمدانیہ منسوب می کرد، و چوں عراقیہ (شیعہ) در بار را گرفتند برنگ ایشاں سخن راند چنانچہ بہ تشیع اشتہار یافت (مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۸۵)

اور آخر میں تو "دین الٰہی" کی تمہید لے کر اکبر کے دربار میں حاضر ہو گئے، پھر ہوا جو کچھ ہوا، بادشاہ کو پہلے

---

[1] یہ شیخ علائی سید محمد جونپوری کے خلفاء میں ہیں، مخدوم الملک سلطان پوری کے اشارہ سے سلیم شاہ نے شیخ علائی کو کوڑے سے پٹوایا، کمزور آدمی تھے، چند کوڑوں کے بعد روح پرواز کر گئی۔ امراء چغتائی سے مراد تیموری اور مغل امراء ہیں، ان تورانی امیروں پر حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کا بہت اثر تھا، اسی لیے ان کے دیکھا دیکھی نقشبندیوں میں شریک ہو گئے، ہمدانیہ درویشوں کا ایک خاص گروہ ہندوستان میں تھا جن کے سرخیل حضرت سید علی ہمدانی تھے بعض خاص اشغال و اوراد کی وجہ سے ان لوگوں کو ایک امتیاز کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ عراقیہ سے مراد شیعہ ہیں۔ ہمایوں کی آخری کامیابی چونکہ ایران کے قزلباشوں کی امداد سے ہوئی تھی جس کی وجہ میرے خیال میں ایرانیوں کا وہ خطرہ تھا، جو شیر شاہ سے ان کو پیدا ہو گیا تھا، مولانا رفیع الدین صفوی کے حالات میں لکھا ہے کہ شیر شاہ نے ان سے کہا تھا کہ ہندوستان کے چند باغیوں سے فرصت ہو لے تو میں آپ کو سلطان ترکی کے پاس بھیجونگا کہ وہ ایران پر اس طرف سے حملہ کریں اور میں ہندوستان سے بڑھونگا۔ یوں قزلباشوں کا جو فتنہ ایران میں اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ زبردستی لوگوں کو شیعہ بنایا جا رہا ہے ختم ہو جائیگا۔ غالباً اس خطرہ نے ایرانی حکومت کو ہمایوں کی امداد پر آمادہ کیا لیکن ہندوستان میں شیعوں کے اقتدار حاصل کرنے کا یہ ذریعہ بن گیا، ورنہ ہمایوں سے پہلے شمالی ہندوستان ہمیشہ ایک ہی حنفی عقیدہ کے مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ مولانا رفیع الدین صفوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ شاید کتاب میں کسی اور موقع پر بھی ہے۔ سطور بالا میں جس اہم تاریخی انکشاف کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے یعنی ہمایوں کی امداد ایرانی حکومت نے دوبارہ ہندوستان کے واپس دلانے میں کیوں کی۔ تاریخ کا یہ کتنا اہم سوال ہے۔ نیز ہندوستان خصوصاً شمالی ہند میں شیعہ مذہب کی تاریخ کا بھی یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ میں نے اسی کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے اس لیے کہ اسے میرا ذاتی خیال نہ سمجھا جائے۔ ملا عبدالقادر بداؤنی جو شیر شاہ کے عہد میں پیدا ہوئے ہیں ان کی بجنسہ عبارت درج کرتا ہوں۔ یہ لکھ کر مولانا رفیع الدین صفوی جنہیں سکندر لودی نے "الحضرة القدسیہ" کا خطاب دے رکھا تھا، آگرہ میں درس حدیث کا حلقہ قائم کیے ہوئے تھے۔ شیر شاہی عہد میں انہوں نے بادشاہ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ حجاز میں قیام کرنا چاہتے ہیں جس کی اجازت دی جائے۔ جواب میں شیر شاہ نے کہا شمارا بہ مصلحتے نگاہ داشتہ ہم وآں این است کہ داعیہ (ارادہ) دارم کہ در اندک فرصت بعون اللہ تعالیٰ و تقدس عرصۂ دل کشائے ہندوستان را از خار کفر پاک ساختہ و چند قلعہ کہ ماندہ عنقریب باندک توجہے تسخیر کردہ (باقی بر صفحہ ۳۸۳)

مجتہد بنایا گیا آگے بڑھایا گیا تا اینکہ وہاں پہنچایا گیا کہ اگر رحمت الٰہیہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ہاتھ مجدد الف ثانی کو پیدا کرکے نہ پکڑتی تو اس ملک میں اسلام کا نام لیوا بھی کوئی باقی نہ رہتا۔[1] میرا تو خیال ہے کہ ملا مبارک کے لڑکوں پر ملا صاحب ہی کی اس عجیب و غریب سیرت کا یہ اثر پڑا تھا، پسر نے اسی چیز کی تکمیل کی تھی جسے پدر نامکمل چھوڑ کر چلا گیا تھا، ایک دلچسپ لطیفہ باپ بیٹوں کا وہ ہے جس کا ابوالفضل نے آئین اکبری میں ذکر کیا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ جب ملا مبارک کے نت نئے فتنوں نے مسلمانوں کو پریشان کرنا شروع کیا تو علماء نے اکبر تک ان کے حالات پہنچائے۔ اس وقت تک اکبر محمد اکبر تھا، اس نے گرفتاری کا حکم دیا رات کا وقت تھا فیضی کو سب سے پہلے اس حکم کی خبر ملی، اب تک ان لوگوں کی رسائی دربار تک نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال فیضی نے باپ کو اٹھایا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۲) از کنار دریائے شور گذشتہ تا قزلباش (صفویہ ایران) کہ سد راہ جماعت حاج و زوار بیت الحرام گشتہ بدعتے در دین قویم و ملت مستقیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کردہ محاربہ کنم و شما را (از انجا بوکالت و رسالت نزد سلطان روم فرستم تا میان من و او عقد برادر دینی و ابستہ خدمتے از در حرم زادہا اللہ شرفا از دالتماس برائے من بگیرید آں گاہ من ازیں طرف و خوندگار روم ازاں طرف آمدہ قزلباش را در میان برادریم و ہر گاہ سلطان روم برسر او می آید قزاق شدہ رو باین طرف می نہد و بعد از معاودت رومی باز بہ مکان خویش مراجعت می کند اما اگر از ہر دو جانب احاطہ کنیم باین لشکر و کثرت جمعیت کہ در ہندوستان ست و بآں شوکت دانش باری کہ در روم است طاقت مقاومت قزلباش است معلوم ست ہر چند ملاحظہ می کنم برائے ادائے این پیغام غیر از شما کسے را لائق نمی بینم و چشم برائے حصول این مطلب دل بر رخصت شما نمی توانم نہاد (ج ۱ ص ۱۰۳) اور اس سے وہ راز سامنے آجاتا ہے جس نے قزلباشوں کو ہمایوں کی امداد پر آمادہ کیا۔ شیر شاہی حکومت ان کی راہ کا کانٹا تھی، اور تیمور کی اولاد سے ان کو اطمینان تھا کہ یلدرم کی اولاد یعنی سلاطین ترکی سے یہ ساز باز نہیں کر سکتے، لیکن افسوس فلک حقہ باز نے کالنجر کے قلعہ کے سامنے شیر شاہ کے اس عجیب و غریب پروگرام کو جلا کر خاک کر دیا۔ ورنہ میں نہیں جانتا کہ اگر کچھ بھی فرصت اس بہاری بادشاہ کو مل جاتی تو جس جنگی مہارت کا ثبوت اس نے کل آٹھ دس سال میں پیش کیا تھا ان کو دیکھتے ہوئے دنیا کے نقشہ کو کس حال میں چھوڑ کر وہ جاتا۔ ولکن ما قدر اللہ فسوف یکون ۱۲۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فقیر نے ایک مستقل مقالہ لکھا ہے جس میں اکبر کے دین الٰہی کی پوری تفصیل کی گئی ہے۔ اسلام سے نفرت کرنے میں اکبر کو کہاں تک پہنچا دیا گیا تھا۔ حال میں ایک اور چیز اس باب میں ملی جو باعث عبرت ہے۔ راجہ سابھر کا بیٹا منوہر نامی نے فارسی میں بہت اچھی دستگاہ پیدا کی تھی، توسنی تخلص کرتا تھا اور فارسی میں شعر کہتا تھا، اکبر اس کو بہت مانتا تھا۔ ملا عبدالقادر نے لکھا ہے: صاحب حسن غریب و ذہن عجیب است۔ محبت کی وجہ سے اکبر شروع میں اس کو "محمد منوہر" کے نام سے پکارتا تھا لیکن جب اس کا دوسرا رنگ ہوا تو بجائے محمد منوہر کے مرزا منوہر نام رکھا گیا۔ ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ منوہر کا باپ راجہ سابھر جس کا لون کرن نام تھا "باوجود کفر شرف و افتخار و مباہات ہمیں محمد منوہر می گفت" کا فر تو اس پر فخر و مباہات کرتا تھا۔ اور جو ہمایوں کے گھر پیدا ہوا تھا اس کو اتنا برگردہ کیا گیا کہ "ہر چند می

اور مشورہ دیا کہ گھر سے نکل کر کہیں روپوش ہو جانا چاہیے۔ فیضی کی اس گھبراہٹ کو دیکھ کر تجربہ کار بوڑھے باپ نے تسلی دی اور کچھ صبر و توکل وغیرہ کی تلقین کی۔ اس وقت فیضی نے اپنے باپ سے جو بات کہی وہ یہ دلچسپ فقرہ ہے: "کار معاملہ دیگر است و داستان تصوف دیگر"

ان لوگوں کے اندر دین کی پرورش جس رنگ میں ہو رہی تھی اس کا اندازہ اسی فقرہ سے ہو جاتا ہے۔ تصوف کی تعریف انہی لوگوں نے یہ کی ہے کہ "برائے شعر گفتن خوب است" اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ملا عبدالقادر کی یہ چشم دید گواہی اگر جھوٹی نہیں ہے کہ فیضی نے جو تفسیر لکھی تھی کہ العیاذ باللہ۔

دراں حالت مستی و جنابت می نوشت و سگاں آں را از ہر طرف پائمال می ساختند (ج ۳ ص ۳۰۰)

ان بدبختوں کا دین ان کا تصوف ان کا علم نہ دین ہوتا ہے نہ تصوف اور نہ علم بلکہ "اکل" کی جہاں بیسیوں شکلیں ہیں، کورنصیبوں کا یہ گروہ اسی کی ایک "شکل" اپنے علمی و دینی سرمایہ کو بنا لیتا ہے۔

بہر حال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ فیضی و ابوالفضل، ملا مبارک، قاضی بدخشی جیسے لوگ پرانی تعلیم سے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ واقعات کا بھلا کون انکار کر سکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ابتداء اسلام سے اس وقت تک کا یہ تجربہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک

---

[1] ملا صاحب نے اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ "بادشاہ بہ عیادت او (فیضی) در دم اخیر رفتند بانگ سگ بروے بلند کرد" یعنی بحران اور بیہوشی کی حالت میں کتے کی آواز منہ سے نکال رہا تھا، ملا صاحب نے لکھا ہے کہ اکبر ایں معنی را خود بر سر دیوان نقل می فرمودند" یہ بالکل ممکن ہے کہ آخر زندگی کے ان ہی دردناک تجربوں نیز ان بیٹوں (دانیال و مراد) کا شراب خواری کی لت میں گرفتار ہو کر عین شباب میں یکے بعد دیگرے اکبر کے سامنے مرنا جس میں نہ جوگ کام آیا اور نہ کایا پلٹ کے بلند بانگ دعوے، جہانگیر کا بھی شراب میں استغراق اور اس کے ساتھ علانیہ بوڑھے باپ سے سرکشی یا اور اسی قسم کی بیسیوں ناکامیاں اکبر پر اثر انداز ہوئی ہوں، پنڈتوں کے مواعید کہ آپ کی عمر ہزار سال کی ہوگی ان کا جوش یہی کہتا تھا۔ ان سب کا راز کھلا ہوگا اور وہ غرور و استکبار جو ابتدائی زندگی کی غیر معمولی فاتحانہ کامیابیوں نے اس میں پیدا کر دیا تھا اس کا نشہ ہٹا ہوگا، کہنے والے جو کہتے ہیں کہ آخر میں اس کی زندگی میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی کچھ عجب نہیں کہ ایسا ہوا ہو۔ اس کے فرزانہ ابوالفضل، بیربر نامرادی کی موت سے مر چکے تھے اب ورغلانے والا بھی تو کوئی باقی نہ رہا تھا۔ کوئی مارا گیا کوئی گم ہو گیا کوئی خون تھوک تھوک کر دنیا سے روانہ ہوا، اکبر اب تنہا تھا، نورتن کے ایک ایک رتن جدا ہو چکے تھے۔

میں علم و دین کے خدام کا ایک طبقہ ایسا باقی رہا ہے جس کا دامن اس قسم کے دنی چھچھورے اغراض سے پاک تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان ایک ایسے نظام تعلیم کے مروج کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جس میں کام کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت کے سامنے مزد اور صلہ کا سوال کبھی نہیں آیا، میں یہ مانتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ کہ قرآن و حدیث کی تعلیم و تبلیغ پر معاوضہ لینا ناجائز ہے، عملاً مسلمانوں میں امام کا یہ فتویٰ مقبول نہ ہو سکا، مجبوراً خود حنفی علماء کو دوسرے ائمہ کے نقطۂ نظر ہی کی پناہ ڈھونڈھنی پڑی، لیکن باوجود فتویٔ جواز کے ایک معقول تعداد ہمیشہ ان لوگوں کی پائی گئی، جنہوں نے یہ دیکھ کر کہ معاشی ضرورتیں جب دوسری راہوں سے پوری ہو رہی ہیں تو تعلیم و تعلم کے کاروبار کو رضاکارانہ طور پر انجام دینے کے لیے انہوں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔

اس سلسلہ میں موروثی روایات اور ماحولی آثار کا ہی یہ نتیجہ تھا، ہندوستان میں جب حکومت پر زوال آیا، اور دوسری مسلط حکومت نے پرانی تعلیم کی سرپرستی کو ترک کر کے ملک میں جدید جامعاتی نظام تعلیم کو مروج کیا، تو باوجودیکہ اس تعلیم کا مسلمانوں کے دینی علوم سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن محض اس لیے کہ اسکول اور کالج میں پڑھنے والے طلبہ بھی طالب العلم ہی کہلاتے تھے، شروع شروع میں مسلمان اپنے پرانے دستور کے مطابق ان طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام بغیر کسی معاوضہ کے اپنے گھروں میں کرتے تھے، اور صوبوں کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن صوبۂ بہار کے متعلق تو میں کہہ سکتا ہوں کہ بیس پچیس سال پیشتر تک شہروں اور قصبوں میں شاید ہی کسی مسلمان وکیل[1]

---

[1] پٹنہ میں خان بہادر مولوی محمد حسین وکیل مرحوم جو آخر میں بہار گورنمنٹ میں تعلیمات کے وزیر بھی ہو گئے تھے کم از کم تیس پینتیس سال تک میں نے ان کو دیکھا کہ دس بارہ طالب العلموں کو وہ اپنے یہاں کھانا بھی دیتے تھے اور رہنے سہنے کا ان کے نظم بھی فرماتے تھے، خدا ہی جانتا ہے کہ اللہ کے اس بندہ کی خاموش امداد نے کتنے غریبوں کو بی اے اور ایم اے پاس کرنے کا موقع دیا ان کی وجہ سے کتنے غریب مسلمان خوش حال زندگی تعلیم پانے کے بعد گذار رہے ہیں۔ مولوی صاحب کی یہ واحد مثال نہ تھی بلکہ پٹنہ، مونگیر، بھاگلپور ہر شہر میں ایسے مسلمان ارباب خیر پائے جاتے تھے اور یہ اسی پرانے دستور کا اثر تھا۔

یا مختار کا ڈیرہ اسکولوں یا کالجوں میں تعلیم پانے والے غیر مستطیع طلبہ سے خالی رہتا تھا، اگرچہ رفتہ رفتہ بہ تدریج زمانہ نے اس رواج کو مٹانا شروع کیا اور اب اس کی مثالیں کم ہوتی جاری ہیں۔ پھر بھی مسلمانوں میں ابھی اس کی جرأت نہیں پیدا ہوئی ہے کہ یورپ کے رواج کے مطابق معاوضہ لے کر اپنی فیملی میں طالب العلموں کو رکھنے کی ہمت کریں، ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہ حجاب بھی اٹھ جائے لیکن ابھی لوگوں کو شرم آتی ہے کہ طالب العلم سے معاوضہ لے کر اس کو دو وقت اپنے ساتھ کھانا کھلائیں، حالانکہ سنا جاتا ہے کہ یورپ میں بہت سے خاندانوں کی گذر بسر کا ذریعہ یہی رہ گیا ہے، بہرحال اس بحث کو اب اسی نقطہ پر ختم کرتا ہوں، اس کے بعد دوسرے حصہ میں نظام تعلیم کے دوسرے ابواب سے بحث کی جائیگی۔ ان شاء اللہ۔

تم المجلد الاوّل